ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے مؤرخین

ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے مؤرخین

ترتیب وتدوین

محبّ الحسن

محبّ الحسن

ترقی اردو بیورو نئی دہلی

پیش لفظ

کوئی بھی زبان یا معاشرہ اپنے ارتقاء کی کس منزل میں ہے، اس کا اندازہ اس کی کتابوں سے ہوتا ہے۔ کتابیں علم کا سرچشمہ ہیں، اور انسانی تہذیب کی ترقی کا کوئی تصور ان کے بغیر ممکن نہیں۔ کتابیں دراصل وہ صحیفے ہیں جن میں علوم کے مختلف شعبوں کے ارتقاء کی داستان رقم ہے اور آئندہ کے امکانات کی بشارت بھی ہے۔ ترقی پذیر معاشروں اور زبانوں میں کتابوں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ سماجی ترقی کے عمل میں کتابیں نہایت موثر کردار ادا کرسکتی ہیں۔ اردو میں اس مقصد کے حصول کے لیے حکومت ہند کی جانب سے ترقی اردو بیورو کا قیام عمل میں آیا جسے ملک کے عالموں، ماہروں اور فن کاروں کا بھرپور تعاون حاصل ہے۔

ترقی اردو بیورو معاشرہ کی موجودہ ضرورتوں کے پیش نظر اب تک اردو کے کئی ادبی شاہکار، سائنسی علوم کی کتابیں، بچوں کی کتابیں، جغرافیہ، تاریخ، سماجیات، سیاسیات، تجارت، زراعت، لسانیات، قانون، طب اور علوم کے کئی دوسرے شعبوں سے متعلق کتابیں شائع کرچکا ہے۔ یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ بیورو کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہونے والی کتابوں کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ مختصر عرصے میں بعض کتابوں کے دوسرے تیسرے ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ بیورو سے شائع ہونے والی کتابوں کی قیمت نسبتاً کم رکھی جاتی ہے تاکہ اردو والے ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔

زیر نظر کتاب بیورو کے اشاعتی پروگرام کے سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ امید کہ علمی حلقوں میں اسے پسند کیا جائے گا۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم

ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو

فہرستِ مضامین

مقالہ نگاروں کی فہرست

قیام الدین احمد	لیکچرر تاریخ، پٹنہ یونیورسٹی
سید حسن عسکری	ڈائرکٹر کے۔پی۔ جیسوال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پٹنہ
زیڈ۔ ایچ۔ فاروقی	ڈین فیکلٹی آف ہیومینیٹیز اینڈ سوشل سائنس، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
سریندر گوپال	لیکچرر تاریخ، پٹنہ یونیورسٹی
بی۔ این۔ گوسوامی	ریڈر، شعبۂ فنونِ لطیفہ، پنجاب یونیورسٹی
جے۔ ایس۔ گریوال	لیکچرر تاریخ، پنجاب یونیورسٹی
بی۔ آر۔ گروور	ریڈر، شعبۂ تاریخ و تہذیب ہندوستان، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
محب الحسن	پروفیسر، شعبۂ تاریخ و تہذیب ہندوستان، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
ظہیر الدین مَلک	ریڈر تاریخ، علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی
ایس۔ سی۔ مسرا	پروفیسر تاریخ، یونیورسٹی آف بڑودہ
محمد مجیب	شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ
کے۔ اے۔ نظامی	پروفیسر تاریخ، علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی
بدھ پرکاش	پروفیسر تاریخ اور ڈائریکٹر انسٹی ٹیوٹ آف انڈک اسٹڈیز کرکشیتر یونیورسٹی
ایس۔ اے۔ اے۔ رضوی	ریڈر تاریخ، جموں و کشمیر یونیورسٹی
پی۔ سرن	ایسوسی ایٹ پروفیسر تاریخ، عثمانیہ یونیورسٹی

جگدیش نرائن سرکار	پروفیسر، دورِ وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ، جادو پور یونیورسٹی
کے۔کے۔شرما	صدر شعبۂ تاریخ کے۔اے۔ایس۔کالج، میرٹھ
ایچ۔کے۔شیروانی	سابق پروفیسر تاریخ، عثمانیہ یونیورسٹی
نعمان احمد صدیقی	ریڈر تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
گنڈا سنگھ	ڈائرکٹر پنجاب ہسٹوریکل انسٹی ٹیوٹ، پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ
پُشپا سوری	لیکچرر تاریخ، رامہ گورنمنٹ کالج، یونیورسٹی آف دہلی
رومیلا تھاپر	ریڈر تاریخ، یونیورسٹی آف دہلی
محمد عمر	لیکچرر تاریخ، رورل انسٹی ٹیوٹ، جامعہ ملیہ اسلامیہ

دیباچہ

1965ء کی ابتدا میں جامعہ ملیہ کے شعبۂ تاریخ نے لیکچروں کا ایک سلسلہ قایم کیا۔ جن کے بعد بحث و مباحثہ ہوتا تھا۔ ایک بات جس پر سب متفق نظر آتے تھے یہ تھی کہ جامعہ کے ماحول میں کوئی ایسی چیز موجود ہے جس کے باعث کھل کر بات کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اِسی باعث 1966ء کی ابتدا میں شعبۂ تاریخ ایک سہ روزہ سیمینار کا انتظام کرنے پر آمادہ ہوگیا۔

ایسا لگتا ہے کہ گول میز مباحثہ جس میں ذہنی تحفظات اور ذہنی رُکاوٹوں کے بغیر نظریات کا اظہار کیا جاسکتا ہے، وہ طریقہ ہے جس کی مدد سے ہمیں یہ سمجھنے میں جو دُشواریاں پیش آئیں ان پر قابو پاسکیں کہ دَورِ وسطیٰ پر لکھنے والے وہ کون سے مورّخین تھے جنہوں نے واقعتاً تاریخی ادب تخلیق کیا۔ ہمیں اپنے ذہن کو ان کے اس بنیادی تصوّرِ تاریخ کا پابند نہیں بنانا چاہیے کہ تاریخ سیاسی قوّت کے حصول کی جدوجہد کا نام ہے، اور ہمیں اِن حالات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے جنہوں نے ان کی تحریروں کو متاثر کیا۔ درباری مورّخ کو درباری شاعروں کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا، شرنگار کے ذہن پر یہ خیال طاری رہتا تھا کہ اسے اس وقت لایق مطالعہ نہ سمجھا جائے گا۔ جب تک وہ ساری تشبیہیں اور استعارے اور شاعروں کی ساری مبالغہ آمیزی صَرف نہ کردے گا۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہمیں مورّخ کو اس کی قوم کا نمایندہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس کا تعلق اس چھوٹی سی اقلیت سے ہوتا تھا جس کے پاس قوّت ہوتی تھی، جو چاہتی تھی کہ یہ فطرت برابر بڑھتی رہے، اور ان سارے واقعات سے ہوتا تھا جو اس خواہش سے

نتیجے میں رونما ہوتے تھے۔ اس کا تعلق کچھ مخصوص قسم کے حقایق سے ہوتا تھا۔ سچائی اور انصاف سے یقیناً اس کا کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔ اسے یہ دکھانا ہوتا تھا کہ وہ ایک اخلاقی نظام میں یقین رکھتا ہے، اور اس لیے حالات کے تقاضوں یا امکانات پر نظر رکھتے ہوئے وہ سیاسی اقتدار اور سیاسی اُمنگوں پر مذہب کی بھرپور رنگ آمیزی کرتا تھا۔

مورخوں پر بحث کرتے وقت، جن میں سے بہت سے مسلمان تھے، ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں ان قوتوں کے بارے میں صحیح تحقیق کی ضرورت ہے۔ جو قوتیں ان لوگوں کے اندر جنہیں ایک قوم کہا جاتا ہے کام کر رہی تھیں۔ اگر ہم نے یہ کام کر لیا تو مجھے یقین ہے کہ ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ بہت سی باتوں کو سہل سمجھنے کے باعث ہم گُم کردہ راہ ہو گئے تھے اور چونکہ ہم نے اندرونی تناؤ کو نظر انداز کر دیا تھا، اس لیے مُسلمانوں کا اتحاد و اتفاق ایک دعوے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ جن حکومتوں نے خود کو مُسلم کہا ان کی کوئی اخلاقی یا مذہبی بُنیاد نہیں تھی، اور وہ محض قانونی افسانوں کے بل بُوتے پر ہی یہ وضع قایم کیے ہوتے تھیں۔ مُسلم شریعت پر قانون کی حیثیت سے کبھی عمل نہ ہوا، حالانکہ بعض اوقات تعزیر نافذ کرتے وقت یہی جواز پیش کیا گیا ہے۔ سرکاری علما خاص طور سے تقلید کے حامی تھے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسلامی عقیدے اور عمل کے سُنّی منفی مفہوم کی حمایت کرتے تھے، اور بدعت اور اختلاف کو دبانے کے لیے اتنے فکرمند رہتے تھے کہ مذہبی اتحاد میں وہ خود ہی حائل رُکاوٹ بنے رہتے تھے۔ مذہبی معنوں میں صوفی سب سے زیادہ سرگرم عمل تھے۔ اور ان میں ہمیں ایسے حضرات نظر آتے ہیں جنھوں نے مسلمان حکومتوں اور فرمانرواؤں سے اس لیے ناتہ توڑ لیا کہ وہ بُنیادی طور پر غیر مذہبی اور غیر منصف مزاج ہوتے تھے اور ان میں ایسے حضرات نظر آتے تھے جنہوں نے راسخ العقیدگی کو اس لیے مسترد کر دیا کہ اس میں دوسروں سے علاحدگی پر زور دیا جاتا تھا۔ مسلمانوں کی عمومیت آپس کے ان ناگوار اثرات کا شکار تھی اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے جذبات ایک خاص سمت ہی میں رواں تھے۔ سماجی اعتبار سے مُسلم قوم کبھی بھی

ایک ہم آہنگ جماعت نہیں رہی ہے۔ ان میں نسل، طبقے اور پیشے کی بنیادوں پر اختلافات رہے ہیں۔ اور مذہبی اہمیت کی باتوں کے مقابلے میں نسلی اختلافات خصوصاً ان لوگوں کے معاملے میں بڑے فیصلہ کن ثابت ہوتے رہے ہیں۔ جو لوگ حصولِ قوت کی جدوجہد میں مصروف رہتے تھے۔

لیکن ضرورت صرف یہی نہیں ہے کہ ہندوستان کے مسلم سماج کا مطالعہ کیا جائے "مسلم" کی طرح لفظ "ہندو" کو بھی سہل بنا لیا گیا ہے۔ میں غلطی کر سکتا ہوں، لیکن میرے خیال میں اس سہل مفہوم کا ہندو دھرم سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے۔ ان لوگوں کے درمیان جنہیں ہم ہندو اور مسلمان کہتے رہے ہیں تصادم ہوتے رہے ہیں۔ اور اب بھی ہوتے رہتے ہیں لیکن ان تصادموں کی قسمیں جدا ہوتی ہیں، اور انھیں ایک دوسرے میں ملانا نہیں چاہیے۔ دھرم نے ایک سماجی نظام بنایا تھا اور یہی نظام اس کی ظاہری صورت ہے۔ ہمیں اس نظام کو اس شکل میں دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے جس شکل میں وہ تاریخ میں نظر آتا ہے، اور یہ جانچ کرنی چاہیے کہ ہر سطح پر حصولِ قوت کے واسطے جو جدوجہد ہوتی اس پر اور سماجی نیز اقتصادی زندگی پر اس نظام نے کیا اثر ڈالا۔ تب شاید ہمیں یہ نظر آئے گا کہ وہ لوگ جن کو دھرم نے یہ حق دیا تھا کہ وہ اپنا سیاسی اختیار استعمال کریں ان لوگوں کے خلاف لڑتے رہے جو انھیں اس حق سے محروم کر دینا چاہتے تھے، جب کہ وہ لوگ جن کو دھرم نے کاروبار کرنے اور دولت کمانے پر مامور کیا تھا اپنے اسی مخصوص کام میں مصروف رہے اور اس بات کی فکر نہ کی کہ جس سیاسی قوت کے تحت وہ یہ کام کر رہے ہیں وہ سیاسی قوت کیسی ہے۔ دہلی اور شمالی ہند کے دوسرے بڑے شہروں کے سرمایہ دار ترکوں کی کامیابی پر خوف زدہ ہو سکتے تھے، اور دہلی سلطنت کے قیام کے بعد اپنی ذات کے اصولوں پر زیادہ سختی سے کاربند ہو سکتے تھے، لیکن اسی سب کے باوجود وہ اپنی تجارت کرتے رہے، اور نئے حالات کی بنیاد پر انھیں جو مواقع ملے ہوں گے ان سے انھوں نے ضرور فائدہ اٹھایا ہوگا۔ دیہاتی سردار اور

کسان ہر بیرونی حاکم سے آزاد رہنا چاہتے تھے، اوران کے تصور دھرم نے انھیں اس خیال کی جانب مائل نہ کیا ہوگا کہ چھتری اور مسلمان حملہ آوروں میں فرق کریں۔ اہل حرفہ کو بحیثیت مجموعی ان سیاسی تبدیلیوں سے فائدہ ہوا ہوگا، کیونکہ نیا حکمراں طبقہ خرچیلی زندگی بسر کرنے کا قائل تھا۔ اور اسے اپنی نازک مزاجی کی تسکین کے واسطے انواع واقسام کے سامان کی ضرورت تھی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مسائل کا پورے طور سے مطالعہ کیا جائے اور انھیں مفصل طور سے لکھا جائے۔ میں نے ان کا ذکر محض اس مشورے کے طور پر کیا ہے کہ اگر ہم اپنی تاریخ کے صرف چند ہی حصوں پر نظر ڈالنا نہیں چاہتے اور پوری تاریخ کی بابت تناظر واقعی پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اس طرح دیکھنے پر ہماری تاریخ کا منظر بالکل ہی مختلف نظر آسکتا ہے۔ ہمیں اس میں وہ چیزیں نظر آسکتی ہیں۔ جو ہم اپنی آج کی زندگی کے منظر میں دیکھتے ہیں۔

مجھے ایک احساس اکثر بے چین کرتا رہتا ہے ـــــ پتہ نہیں اور کتنے لوگ اس بے چینی کا شکار ہیں ـــــ کہ ہماری تاریخ ہمارے زمانے کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی، وہ ابھی تک ہم سے جدا کوئی علاحدہ شے ہے۔ علمی معنی میں وہ ایک تاریخ ہے ایسی ہی جیسے یونان، روم یا دورِ وسطیٰ کے یورپ کی تاریخ، جس سے ہم تخیلی طور پر محض اس لیے خود کو وابستہ کرسکتے ہیں کہ وہ پورے انسانی تجربے کا ایک جز ولاینفک ہے۔ لیکن وہ ہماری تاریخ نہیں ہے۔ اس لیے ہمیں ایسا لگتا ہے کہ ہندوستانی دَورِ وسطیٰ کے سیاسی مدبرین ہمارے مسائل حل کرنے کے واسطے فکر مند نہیں تھے، ان کی کوشش اوران کے کارنامے انہی کے واسطے تھے، اور انہی کے ساتھ ختم ہوگئے۔ بھگت اور صوفی زیادہ خوش قسمت ہیں، لیکن وہ بھی اب تک ان لوگوں میں بٹے ہوئے ہیں جو ان سے عقیدت رکھتے ہیں، اور بعض خاص موقعوں پر ہی انھیں قومی حیثیت دی جاتی ہے۔ اگر ہم کسی ایک رُوحانی یا سماجی اثر کا سُراغ لگانا چاہیں تو یہ کوشش کسی ایک اندرونی ہم آہنگی کی تلاش نہ ہوگی جو ہم آہنگی بنیادی اختلافات کے پیچھے موجود ہو، بلکہ یہ کوشش کچھ

اس انداز کی ہوگی کہ خطوطِ تقسیم کو کبھی اِدھر سے ہٹا دیا کبھی اُدھر سے ہٹا دیا۔ ہم میں سے کچھ لوگ جب عہدِ وسطیٰ کے اشخاص اور واقعات سے رشتہ قایم کرنے میں ناکام رہتے ہیں تو اس حد پر جا پہنچتے ہیں کہ ماضی بعید میں ان چیزوں کے جواب دیکھنے لگتے ہیں جنھیں آج کے دور میں لائق تعریف سمجھا جاتا ہے۔ ان چیزوں میں اگر نہایت جدید سائنسی دریافتیں اور صنعتی ایجادیں شامل نہیں کی جاتی ہیں تو مذہب، قومیت، جمہوریت، مقامی حکومت، خود اختیاری ضرور شامل کر لی جاتی ہیں اور ان لوگوں کو یقین سا ہو جاتا ہے کہ انھوں نے ایسے عناصر پا لیے ہیں جو ہماری تاریخ میں ہمیشہ موجود رہے ہیں۔

اپنے ملک کی وسعت، خود کفیل سیاسی اکائیوں اور ان تہذیبوں کو اگر نظر میں رکھا جائے جو تہذیبی پانچ ہزار برسوں میں پیدا ہوئی، پھلی پھولیں اور مرجھا گئیں، تو پھر یہ الزام شاید ہی دیا جا سکے کہ ہمارے رویّے میں اتنا انتشار کیوں ہے۔ یہاں متحد کرنے والی ایسی قوتیں بھی رہی ہیں جیسے دھرم کا تصور، لیکن ایک اعلا قسم کا تخیل ہی الہامی لمحے میں ہندوستانی زندگی کی اس بیش قیمت گوناگونی کو روشنی کے ایک ہی دائرے میں لا سکتا تھا، اور اگر ایسا ہو بھی جاتا تو اس تقریباً رُوحانی تجربے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی تھی جب تک اس میں تجریدی اور تعیماتی باتیں شامل نہ کی جائیں۔ مزید یہ کہ اپنی تاریخ لکھتے وقت ہم اس نوع کے دوسرے بیانات سے گریز نہیں کر سکتے، جن میں سے بعض ایسے انحرافِ بیان بھی ہو سکتے ہیں جیسے کہانی کہنا، یا موضوعات میں سے موضوعات نکالنا، لیکن اس بیانِ تاریخ کا پورا ڈھانچہ کم و بیش اس انداز کا ہو سکتا ہے جیسے کتھا سرت ساگر، جو پیچ در پیچ کہانیوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں ہر کہانی دوسری کہانی سے قاری کی دلچسپی کے باعث جُڑی ہوتی ہے۔ ہماری تاریخ یونانی مفہوم تاریخ کے مطابق تحقیق اور تفتیش بھی ہو سکتی ہے، لیکن کیا وہ کبھی "نہایت عمدہ انداز میں کہی جانے والی عظیم کہانی" بن سکے گی؟

ہم اس سوال کا جواب اس وقت تک نہیں دے سکتے جب تک کوشش نہ کر لیں،

اور میں نہیں سمجھتا کہ ہم نے یہ کوشش واقعی کرلی ہے۔ اگر ہندوستان کی محبّت، جو مذہب، علاقے اور زبان کی مخالفانہ اور عیارانہ اطاعت سے متاثر نہ ہوتی ہو، کبھی کسی مورّخ کو اس کام کے لیے آمادہ کرسکی، اور فیصلے کرتے وقت عالمی انسانی قدروں نے اس مورّخ کی رہنمائی کی، تو ہمیں یقین ہے کہ ہندوستان کی تاریخ "نہایت عمدہ انداز میں کہی جانے والی عظیم کہانی" بن جائے گی۔ لیکن اس دوران میں جب ایک مثالی مورّخ کا انتظار کیا جارہا ہے، ہم خود دیانت داری کے ساتھ تاریخ کو سمجھنے اور اس کی ترجمانی کرنے کی کوشش کریں تاکہ اس کے لیے زمین ہموار ہوجائے۔ اس مشق کے لیے ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے مورّخین نہایت عمدہ مواد فراہم کرتے ہیں۔ ہمیں ہر طرح سے انھیں جاننا چاہیے، ان کی کتابیں ہی نہیں ان کے ذہن پڑھنا چاہیں، اور اسی کے ساتھ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تاریخ کی بابت ہمارا اندازِ نظر بھی اتنا ہی محدود ہوسکتا ہے جتنا ان کا تھا، ہمارے فیصلوں پر ہمارے مقاصد اسی طرح اثر انداز ہوسکتے ہیں جیسے ان کے ہوتے تھے۔ ایسی جانچ اور خود اپنی جانچ صرف تاریخ کے مطالعے میں مفید ثابت ہوگی بلکہ خود ہماری نظر کو صاف کرے گی۔ ہم واقعات بعینہٖ اس طرح دیکھ سکیں گے جیسے وہ رونما ہوتے تھے، اور ہمیں لیاقت حاصل ہوجائے گی جس کی مدد سے معقول قسم کے قیاس قایم کیے جاسکیں، کیونکہ بغیر معقول قیاس کے تاریخ بعض اوقات غیر متعلق حقائق کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہے۔ تاریخ مردہ ماخذی اشیا سے دوبارہ زندگی حاصل نہیں کرتی، وہ مورّخ کے ذہن میں پیدا ہوتی ہے۔

م۔ مجیب

تعارف

تاریخ کا احساس مسلمانوں میں ہمیشہ سے بہت زیادہ رہا ہے، اور اس احساس کی ابتدا خود حضرت محمدؐ سے ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی زمانے ہی سے حضرت محمدؐ، خلفا، سلاطین اور اُمرا کی زندگیوں پر کتابیں لکھی جانے لگی تھیں۔ پہلے یہ صرف عربی میں لکھی گئیں، جو قرآن اور دانشور طبقوں کی زبان تھی۔ لیکن دسویں صدی کے دوسرے نصف سے، جب ایران میں جذبۂ قومیت کی تجدید ہوئی اور ترک حکومتوں نے فارسی زبان اور تہذیب اپنائی، تو تاریخی کتابیں فارسی میں بھی لکھی جانے لگیں۔ جب مسلمان ہندوستان آئے تو تاریخ نگاری کی فارسی روایت بھی اپنے ساتھ لائے، اور اس روایت کو ایران اور وسطِ ایشیا سے ہجرت کرنے والوں نے قائم رکھا۔ اس لیے گیارھویں صدی سے اٹھارھویں صدی تک ایسے تاریخی ادب کا انبار لگ گیا جس میں عام تاریخیں، حکومتوں کی تاریخیں اور علاقائی تاریخیں نیز سوانحیں اور تزکیں شامل تھیں۔

فارسی میں لکھی ہوئی یہی وہ تاریخیں ہیں جو ہندوستانی دورِ وسطیٰ کی تاریخ کے خاص ماخذوں کی طرح استعمال کی جاتی ہیں۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ انھیں ان کے مصنفوں کے سماجی، ثقافتی اور مذہبی پس منظر نیز ان کے طریقوں، اظہارِ بیان کی شکلوں اور ان کے تصورِ تاریخ کے حوالے سے اچھی طرح جانچا اور پڑھا نہیں گیا ہے۔ جس کا نتیجہ ماضی کی ایک نامکمل اور مسلم شدہ تصویر کی شکل میں نکلا ہے۔

اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز، یونیورسٹی آف لندن نے ایک کانفرنس کا اہتمام کیا جس میں ہندوستانی مورخین پر تحقیق کی پہلی کوشش کی گئی لیکن ہندوستانی

دورِ وسطیٰ اس کانفرنس کا ایک چھوٹا سا حصہ تھا۔ اس موضوع پر پہلی بڑی اور باقاعدہ کتاب پیٹر ہارڈی نے ہسٹوریَنس آف میڈیول انڈیا کے نام سے لکھی تھی۔ گو اس کتاب نے دَورِ وسطیٰ کے مورخوں کی بابت تحقیق کا راستہ کھول دیا' لیکن اس کا دائرہ مضامین بہت محدود ہے ــــ اس میں دَورِ وسطیٰ کے صرف پانچ مورخوں کا ذکر ہے ــــ اور اس میں وہ ساری خامیاں موجود ہیں جو پہلی کتاب میں ہوسکتی ہیں۔ اس لیے جامعہ ملیہ کے شعبۂ تاریخ و تہذیب ہندوستان نے ایک سیمینار منعقد کرنے کی تجویز پیش کی تاکہ دَورِ وسطیٰ کے فنِ تاریخ نگاری کے بعض مسائل پر مزید بحث و مباحثہ ہوسکے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے بڑی فیاضی سے مالی امداد دی جس کے باعث سیمینار کا انتظام اور اس کتاب کی اشاعت ہوسکی۔ اس سیمینار میں موضوعات ذیل کے عنوانات کے تحت مجتمع کیے گئے تھے۔

(1) قبلِ سلطنت دَور کے مورخین

(2) دہلی سلطنت کے مورخین

(3) صوبائی حکومتوں کے مورخین

(4) مغل مورخین

(5) فارسی کے علاوہ دوسری زبانوں کے مورخین

(6) ہندوستانی دَورِ وسطیٰ کے جدید مورخین

حالانکہ زیرِ مطالعہ کتاب' جیسا کہ عنوانوں سے ظاہر ہے' خاصے وسیع علاقے اور لمبی مدت کا احاطہ کرلیتی ہے' پھر بھی اس میں بعض ایسے خلا رہ گئے ہیں جو اہم ہیں۔ بہرحال' مجھے توقع ہے کہ ہندوستانی دَورِ وسطیٰ پر لکھنے والے جدید اور وسطی دَور کے کچھ ممتاز مورخوں کے رُجحانوں اور طریقوں کو سامنے لانے کی وجہ سے' یہ کتاب ہندوستانی دَورِ وسطیٰ کو سمجھنے میں اور اس کی بابت ایک بہتر بصیرت پیدا کرنے میں طلبہ کی معاون ثابت ہوگی' اور وہ ان لغزشوں سے بچ سکیں گے جو اسی موضوع پر لکھتے وقت سابق طلبہ سے سرزد ہوتی ہوں گی۔

— اس بارے میں پہلے ہی اشارہ کیا جا چکا ہے (مسلمانوں کو ماضی کا احساس ہمیشہ رہا ہے۔ لیکن
— یہ بات ہندوؤں پر صادق نہیں آتی۔ ہندوستان کا وہ واحد حصہ جہاں قبلِ سلطنت دور میں تار
— نگاری کی روایت ملتی ہے کشمیر ہے۔ اس کا سبب وادیِ کشمیر میں بُدھ دھرم کا قیام تھا، جس میں برہ
دھرم کے مقابلے میں تاریخ کا احساس کہیں زیادہ تھا، اور یونانی، چینی پھر اسلامی تہذیبوں کا ا
بھی اس کا سبب تھا۔ اسی سے اس بات کی تشریح ہو جاتی ہے کہ کلہن کی راج ترنگنی کے بارے میں
کیوں سمجھا جاتا ہے کہ وہ "سنسکرت کے بچے کھچے سارے ادب میں صحیح تاریخ پیش کرنے کی واحد
کوشش کے لحاظ سے ایک بے مثال کتاب ہے"۔ یہ صحیح ہے کہ کلہن بہت سے محدودات کا شکار رہا۔
روایتوں اور پُرانے قصّوں کی بنیاد پر تحریر کرتا ہے، اور واقعات کی تشریح کرتے وقت کرم، مقدّ
اور جادو ٹونا جیسے ما فوق الفطرت اسباب کا سہارا لیتا ہے۔ لیکن وہ تحریری اندراجوں اور کتبوں
کا استعمال بھی کرتا ہے، اور اپنی آخری دو کتابوں میں کچھ اور سبھی تشریحات بھی دیتا ہے۔ کلہن
ذہن تحریاتی تھا، اور اس کی تحریر سے تاریخی ادراک کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن اس کے جانشین جو تارا
سری ور، پراجیہ بھٹ اور شُکا، جنھوں نے اس کی ہمسری کی کوشش کی، تاریخی عمل کو کلہن کی گہرا
تک نہیں سمجھتے تھے۔

— دہلی سلطانوں اور مقامی حکومتوں کا دورِ تاریخی تحریروں کے اعتبار سے بہت مالامال
لیکن ان تحریروں کو صحیح طور سے استعمال کرنے کے لیے ضروری ہوگا کہ ان اشخاص کی ذہنیت صاف طو
— سے سمجھی جائے جنھوں نے یہ تحریریں چھوڑی ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ انھوں نے لکھا ہی کیوں؟ اس
— جواب یہ ہے کہ انھوں نے مختلف اسباب کی بنا پر لکھا، شہرت کے واسطے، انعام کے لالچ میں اپ
— سرپرست کو خوش کرنے کے لیے، اپنے ہمعصروں اور آیندہ نسلوں کے اخلاق کی اصلاح کے واسطے
مسلمان فرمانرواؤں کے کارناموں کی یاد محفوظ رکھنے کی خاطر اور انسان کے تئیں خُدا کے طریقوں کو عا
ثابت کرنے کے لیے۔

— دورِ وسطیٰ کے مورّخوں نے اپنے فن پر سنجیدگی سے کام کیا اور تاریخ کی بابت نہایت اعلیٰ

ہر یہ قایم رکھا۔ مثال کے طور پر برنی نے تاریخ اور علم الحدیث کو جڑواں تصور کیا، اور اس پر یقین رکھا کہ
رخ کو سچائی کے لیے وقف ہو جانا چاہیے اور مبالغہ آمیزی اور طول گوئی سے پرہیز کرنا چاہیے۔ لیکن بدقسمتی سے
نکہ دورِ وسطیٰ کے بیشتر مؤرخین دربار سے وابستہ رہے اس لیے وہ نہ لکھ سکتے تھے جو سچ سمجھتے تھے اور اپنے
ـــر پرستوں کی مدح سرائی کرنے لگتے تھے۔ اس کے علاوہ ان میں سے بہت سے، جیسے منہاج السراج
ن نظامی، امیر خسرو اور برنی امرا کی اولاد تھے، جس کی وجہ سے وہ اپنی کہانیوں کا تانا بانا بادشاہوں
ر امیروں کے گرد بنتے تھے اور عام آدمیوں کی زندگی اور حالات کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ مزید برآں،
نکہ وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور ایسے زمانے میں رہتے تھے جس زمانے میں انسانوں کے ذہن پر
ہب کا غلبہ رہتا تھا، اس لیے انھوں نے ایسی زبان اور ایسا طریقہ اختیار کیا جس کی مدد سے ان کا
یان ان کے قاریوں کی سمجھ میں آ سکے اور پسند کیا جائے۔ اس سے اس بات کی بھی وضاحت ہو جائے
لی کہ انھوں نے دورِ وسطیٰ کے فرمانرواؤں کو مذہب کا حامی کیوں ظاہر کیا، اور یہ ثابت کرنے
کے لیے انتہائی مبالغہ اور خطابت سے کام لیا۔ اسی لیے ضروری ہے کہ ان کے بیانات کو متوں کے
ول تسلیم نہ کیا جائے۔ اور ضروری ہے کہ ان کی طول گوئی اور مبالغہ آمیزی کی سطح سے نیچے جا کر سچائی
یکھی جائے۔ جیسا کہ پیٹر ہارڈی کا خیال ہے کہ وہ تاریخ کے لیے خام اشیا فراہم کرتے ہیں، لیکن
صلی مال تیار کرنا اسے بنانا سنوارنا اور صاف کرنا بہت ضروری ہے۔

دورِ وسطیٰ کے مورخ بار بار خدا کا حوالہ دیتے ہیں کہ ہر واقعے کا اصل سبب وہی ہے لیکن ایک
سماج میں، جس سماج پر شرعی علم دین کا غلبہ ہو، ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ بہرکیف، اس کا یہ مطلب نہیں کہ
انھوں نے مادی اسباب یکسر نظر انداز کر دیے تھے۔ یہ دکھانے کے لیے بہت سی مثالیں دی جا سکتی
ہیں کہ دورِ وسطیٰ کے مصنفوں نے واقعات کی تشریح انسانی افعال کے ذریعے کی — درباری سازشیں،
انتظامی اقدامات، خارجی حکمت عملی یا بادشاہوں اور امیروں کی امنگیں۔ کیونکہ اپنی ساری مذہبی
ظاہرداری کے باوجود وہ دنیادار لوگ تھے جو دنیاوی چیزوں کے بارے میں دنیادار لوگوں کے واسطے دنیاوی
مقاصد کے حصول کی خاطر لکھ رہے تھے۔

دَورِ وسطیٰ کے مورخوں میں سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ انھیں ان سماجی اور اقتصادی قوتوں
ادراک نہیں تھا جو سماج میں زبردست تبدیلیوں کا اور حکومتوں کے زوال کا سبب بنتی ہیں۔ بہرحال
یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ "تاریخ کو ایک ایسا سلسلۂ واقعات سمجھتے ہیں، جس کے واقعات اکثر اوقات
ایک دوسرے سے جدا اور تعلقات اور ظاہری سے مبرا ہوتے ہیں۔" اس عہد کی تاریخی تحریرو
سے ظاہر ہوتا ہے کہ دَورِ وسطیٰ کے مورخ ــــ اور اس میں مغل مورخ بھی شامل ہیں ــــ ایک
دَورِ حکومت اور دوسرے دَورِ حکومت کے درمیان خیالات، واقعات اور اداروں کے رشتوں
اور تبدیلیوں سے باخبر تھے۔ صرف یہی حقیقت، کہ ان میں سے بہتوں نے صرف ایک دَورِ حکومت کی تاریخ
لکھنے پر قناعت نہ کی بلکہ حکومتوں کے سلسلوں کا حال لکھا، اس بات کی مظہر ہے کہ وہ سماجی، سیاسی
اور مذہبی تبدیلیوں سے اور واقعات کے درمیان تعلقات سے واقف تھے۔

جب ہم مغل دَور میں داخل ہوتے ہیں تو تاریخی تحریروں میں معیار کے اعتبار سے ایک تبدیلی
نظر آتی ہے۔ ابوالفضل، اکبر کا دوست اور مشیر، وہ شخص تھا جو اس تبدیلی کا ذمہ دار تھا۔ اس میں
شک نہیں کہ ابوالفضل کی بہت سی محدودات ہیں۔ اس کی زبان مرصع اور طولانی ہے۔ وہ اکبر کی
خوبیوں کو ابھارتا اور اس کی غلطیوں پر پردہ ڈالتا ہے۔ وہ اپنے آقا کے کارنامے بیان کرنے میں اتنا
غرق رہتا ہے کہ عام انسانوں کی زندگی اور حالات نظرانداز کر دیتا ہے۔ برنی اور بدایونی کی طرح اس
کا بیان بھی نہایت داخلی ہے، لیکن ان کے برخلاف اس کی تحریریں اس کے زمانے کا عکس نظر نہیں
آتا۔ لیکن اس سب کے باوجود ابوالفضل ہی وہ شخص تھا جس نے پہلی بار تاریخ نگاری کے تسلیم
شدہ رجحان اور طریقے کے خلاف بغاوت کی اور ایک نئی راہ نکالی۔ وہ پہلا ہندوستانی مورخ تھا
جس نے تاریخ کے بارے میں عقلی اور غیرمذہبی اندازِ نظر اپنایا۔ وہ تاریخ کو علمِ دین کا شریک نہیں
سمجھتا، بلکہ تاریخ اور فلسفے کے درمیان قریبی رشتہ قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک
ہندوستانی تاریخ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تصادم پر نہیں بلکہ استحکام اور انتشار کی قوتوں کے
تصادم پر مشتمل تھی ــــ اوّل الذکر قوتوں کی نمائندگی مغل حکومت اور آخرالذکر قوتوں کی

یدگی زمیندار کرتے تھے۔ وہ اپنے سابقہ مصنفوں کے اس روایتی نظریے کو تسلیم نہیں کرتا کہ ہندوستانی
یخ کا تعلق صرف مسلمان فرمانرواؤں کے کارناموں سے رہنا چاہیے، بلکہ یہ سمجھتا ہے کہ اس میں
ہندوؤں کی تاریخ، فلسفے اور مذہب کا ذکر بھی ہونا چاہیے۔ اس نے اپنی کتابوں کی تیاری میں بنیاد
وسعت دی اور محافظ خانے کے پرانے کاغذات اور دوسرے ایسے بیانوں سے استفادہ کیا جو
ریری اور زبانی دونوں طرح کے تھے، لیکن انھیں ایسی صورت میں تسلیم کیا جب چھان بین کے
ہد ان کی اچھی طرح تصدیق ہوگئی۔ عبدالحمید لاہوری، خافی خاں اور سترھویں نیز اٹھارھویں صدیوں
دوسرے دیگر مورخوں نے اس کے طریقے کی تقلید کی، لیکن انھوں نے فن تاریخ نگاری میں کوئی اہم
اضافہ نہیں کیا۔

جدید خطوط پر دورِ وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ کے مطالعے کی ابتدا برطانوی محققوں نے
اٹھارھویں صدی کے اواخر میں کی، اور مطالعے کی اس قسم کا پہلا دور انیسویں صدی کے وسط تک
چلتا رہا۔ ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے برطانوی مورخین اس زمانے کے برطانیہ کی تاریخی تحریروں
کے طریقے، رجحانوں اور خیالوں سے متاثر تھے۔ حالانکہ وہ مغرب کے سماجی، سیاسی اور ثقافتی اداروں
کو برتر سمجھتے تھے لیکن ان کا اندازِ نظر ـــــ یہ بات خصوصاً ڈاؤ۔ ڈف۔ ارسکائن اور الفنسٹن پر
صادق آتی ہے ـــــ بحیثیتِ مجموعی ہمدردانہ تھا۔ ان میں سے بعض جیسے جون برگس اذعانی فیصلوں
کے خلاف تھے، اور اس نظریے کے حامی تھے کہ ہندوستان کے ماضی کی بابت اخلاقی فیصلے صادر
کرنے کے لیے کافی ثبوت موجود نہیں ہیں۔ وہ نہ صرف جنگوں اور فتوحات میں دلچسپی لیتے تھے بلکہ
انتظامِ حکومت، سماجی رواجوں، مذہبی عقیدوں اور ہندو دھرم پر اسلام کے اثرات جیسی باتوں
میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ اور انھوں نے دورِ وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ لکھتے وقت نہ صرف
فارسی کی تاریخی کتابوں اور یورپی سیاحوں کے سفرناموں پر زور دیا، بلکہ فرمانوں ادبی ماخذوں
اور آثارِ قدیمہ کی شہادتوں پر بھی زور دیا۔

ہندوستانی دورِ وسطیٰ پر برطانوی تاریخ نگاری کی تاریخ کا دورِ آزاد خیالی الفنسٹن سے

ساتھ ختم ہوگیا۔ ایلٹ، جس نے دوسرے دور کا آغاز کیا، دورِ وسطیٰ کے مورخوں کے بارے میں بڑی خراب رائے رکھتا تھا۔ اسے نہ صرف یہ کہ دورِ وسطیٰ کے ہندوستانی ماضی سے نہ کوئی ہمدردی تھی نہ اس کا ادراک تھا، بلکہ اس نے اس دور کے بارے میں پرتعصب اور قدرے حقارت آمیز رویہ اختیار کرلیا تھا۔ بعد کے برطانوی مورخین نے اس کی تقلید کی، اور اس زمانے کی یورپی فنِ تاریخ نگاری کے زیادہ صحت مند رجحانوں اور طریقوں کو نظرانداز کردیا۔ چونکہ ان میں سے زیادہ تر خود منتظم رہ چکے تھے، اس لیے انھوں نے زندگی کے دوسرے پہلو نظرانداز کرکے تاریخ کو سیاست اور انتظام تک محدود کردیا، اور یہ نہ سمجھ سکے کہ انسانی سماج کس طرح کام کرتا ہے۔ انھوں نے خصوصاً فارسی کی تاریخی کتابوں پر تکیہ کیا اور تجزیے، ترجمانی یا ادراک کی کوشش کیے بغیر انھیں تسلیم کرلیا۔

جہاں تک سوویت مورخوں کا معاملہ ہے، انھوں نے ہندوستانی دورِ وسطیٰ اور خصوصاً مغل دور میں ابھی حال ہی میں دلچسپی لینا شروع کی ہے۔ لیکن اس دور میں ان کی دلچسپی محض ضمنی ہے، اور ان کی اس خواہش کا نتیجہ ہے کہ جدید ہندوستانی تاریخ کے ان پہلوؤں کو بہتر طور سے سمجھیں جن کی جڑیں ماضی میں ہیں۔ حالانکہ وہ بڑا مفید کام کر رہے ہیں، لیکن ان کی تحقیقات میں تین خامیاں ہیں۔ پہلی یہ کہ ہندوستانی حالات پر انھوں نے مارکسی خیالات کا جو اطلاق کیا ہے وہ خاصہ بے لچک ہے۔ دوسری یہ کہ مغل تاریخ سے وہ صرف ایسی ہی مثالوں کا انتخاب کرتے ہیں جن سے ان کے نظریوں کی تائید ہوسکے۔ تیسری یہ کہ وہ زیادہ تر یورپی سیاحوں کے سفرناموں اور مطبوعہ فارسی متنوں اور ان کے انگریزی ترجموں پر تکیہ کرتے ہیں، غیر مطبوعہ مسودوں اور تحریروں کی اس بڑی تعداد سے استفادہ نہیں کرتے جو مغل دور کی اقتصادی تاریخ پر خاصی روشنی ڈالتے ہیں۔

ہندوستانی دورِ وسطیٰ کی تاریخ نگاری کا آغاز انیسویں صدی کے ابتدائی حصے میں ہوا تھا۔ لیکن پہلا تخلیقی کام سر سید احمد خاں کی آثار الصنادید تھی جو 1849ء میں لکھی

گئی تھی۔ دَورِ وسطیٰ کے موّرخوں کی کتابیں سر سیّد کے لیے مثالی نمونے تھیں، اور تاریخ نگاری کے مغربی طریقوں سے وہ کافی بعد میں آشنا ہوئے تھے۔ فارسی کے مختلف تاریخی متنوں کی تدوین کرتے وقت انھوں نے غالباً انہی طریقوں سے کام لیا تھا۔ بہرحال، یہ بدقسمتی ہی تھی کہ علی گڑھ تحریک میں مصروف رہنے کی وجہ سے بحیثیت موّرخ ان کی ترقی رُک گئی۔

دو اور مصنّف جو لائقِ ذکر ہیں، ذکا اللہ اور شبلی ہیں۔ ذکا اللہ نے بہت کچھ لکھا لیکن ان میں تنقیدی طور سے فیصلہ کرنے کی صلاحیت کم تھی، اور وہ دَورِ وسطیٰ کے موّرخوں کا محض مفہوم ادا کردیتے تھے۔ شبلی نے بیرونِ ہند کے اسلامی ماضی کی بابت جتنا کچھ لکھا اُتنا اندرونِ ہند کی بابت نہیں لکھا۔ بہرحال، انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ایک حمایتی کی طرح لکھا۔ حالانکہ وہ اپنے اس تعلق کا اعلان کرتے تھے کہ ایک موّرخ کو حق اور معروضیت کے لیے وقف ہو جانا چاہیے، اور انھوں نے موّرخوں کی رہنمائی کے لیے کچھ اصول بھی وضع کیے تھے، لیکن خود انھوں نے سائنٹفک انداز کے اصولِ تاریخ نگاری پر عمل نہیں کیا۔

انیسویں صدی کے ابتدائی حصّے میں جن ہندوستانی محققوں نے مغربی خطوط پر انگریزی زبان میں دَورِ وسطیٰ کے ہندوستان پر تحقیق شروع کی وہ ہندوستانی دَورِ وسطیٰ کے برطانوی موّرخوں کے نقشِ قدم پر گامزن ہوئے۔ بیسویں صدی کا تیسرا عشرہ وہ زمانہ تھا جب قومی خیالات سے متاثر ہوکر اور یورپی فنِ تاریخ نگاری کے جدید ترین رُجحانات قبول کرکے ان میں سے بعض محقّقوں نے تحقیق کے جدید طریقے اپنانے شروع کیے اور تفتیش کے واسطے نئے میدان ڈھونڈ نکالے۔ حالیہ برسوں میں ہندوستانی تاریخ نگاری نے سر لیوس نیمئر، مارک بلوخ اور لیفیبرے جیسے موّرخوں سے اثر لے کر مزید ترقی کی ہے۔ لیکن یہ بات ابھی پورے طور سے نہیں سمجھی گئی ہے کہ ہندوستانی دَورِ وسطیٰ کی تاریخ اس وقت تک از سرِ نو نہیں لکھی جاسکتی جب تک دَورِ وسطیٰ کی تاریخی کتابیں، دَورِ وسطیٰ کی رُوح اور اُس دَور کے موّرخوں کے

سماجی اور مذہبی پس منظر، ان کی نفسیات، ان کے خیالات، عادات اور طریقوں کو سمجھ کر نہیں پڑھی جائیں گی۔ اگر زیرِ نظر کتاب فکر و خیال کو ان خطوط پر تحریک دِلا سکی، تو اِس سیمینار کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

ایم۔ حسن
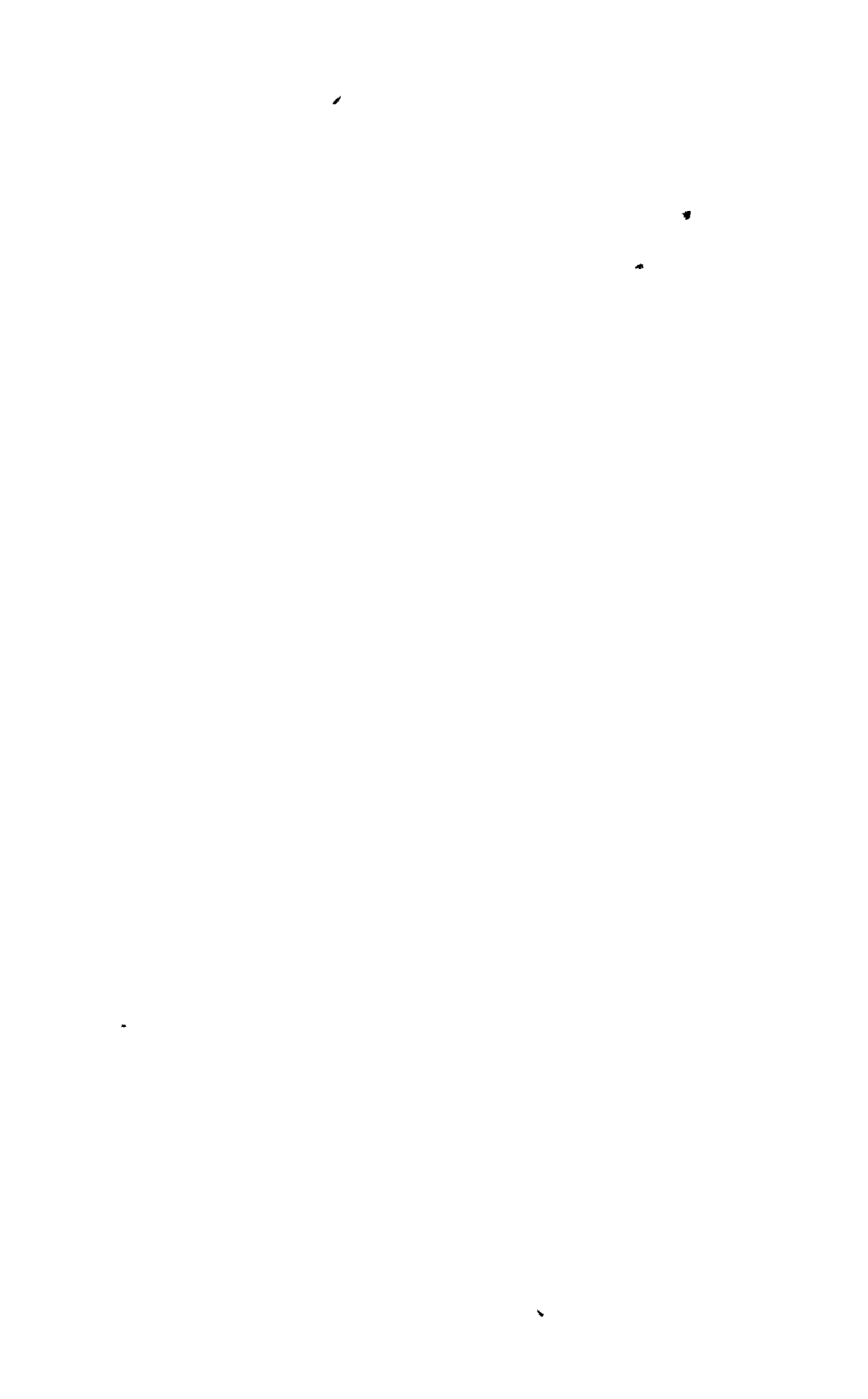
تاریخ کے بارے میں کلہن کے وہ خیالات
جو راج ترنگنی میں بیان کیے گئے ہیں

رومیلا تھاپر

کلہن نے لوکیکا دَور کے 4224 ویں برس میں جس کا سن عیسوی 49-1148ء بنتا ہے
شمیر کی تاریخ کے بارے میں اپنا روزنامچہ لکھا، جس کا نام اس نے راج ترنگنی رکھا۔ کتاب کے آخر
ں بتایا گیا ہے کہ وہ کشمیر کے ایک عظیم منتری اور مشہور و معروف حاکم کمپاکا کا بیٹا تھا۔ یہی قیاس
یا جاتا ہے کہ کمپاکا کشمیر کے راجہ ہرش (1101-1089ء) کا منتری تھا۔[1] یہ بات بڑی حد تک
رست معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہی صورت ایسی ہو سکتی ہے جس سے کلہن کی رسائی اِن سیاسی اور
سرکاری معاملات تک ہوئی ہوگی۔ یہ بات ظاہر ہے کہ ان ہی کی بنیاد پر اس نے دَورِ وسطیٰ کے
کشمیر کی تاریخ کا تجزیہ کیا ہے۔ اگر وہ محض ایک معمولی مصنّف ہوتا، جیسا کہ اکثر اس کے قریبی دَور
کے دوسرے ہمعصروں کی تحریروں میں کیا گیا ہے، تو یہ تجزیہ یا تو سارے بیان کا ایک چھوٹا سا
جز ہوتا یا پھر سرے سے ہوتا ہی نہیں۔ روزنامچے کی ادبی شکل وہ ہے جسے کاوے (نظم) کہا
جاتا ہے۔

راج ترنگنی ایک لمبی بیانیہ نظم ہے جس میں ابتدائی زمانے سے لے کر بارھویں صدی عیسوی تک
کشمیر کی تاریخ کے واقعات قلم بند کیے گئے ہیں۔[2] یہ روایتوں، قصّوں، تحریری دستاویزوں
کتبوں پر مبنی ہے۔ کلہن کا بیان ہے کہ اس نے بڑی کاوش سے ایسی مقبول عام روایتیں اکٹھا
کیں جن کا تعلق ان مقامات سے ہے جو تاریخی اعتبار سے دلچسپ رہے ہیں۔ اس نے ایسی

شری تصنیفات سے بھی رجوع کیا ہے جو کسی علاقے کے بارے میں لکھی گئی ہیں جیسے نیل ماتا پران کسیندر کی تصنیف ترپاولی، ہیل راجہ کی تصنیف پرتھوی داولی، چھویلاکار وغیرہ۔ ان سارے ماخذوں میں نیل ماتا پران کشمیر کی ابتدائی تاریخ پر سب سے اہم روایتی ماخذ ہے، گو درست تاریخی ماخذوں کی حیثیت سے اس میں بھی وہ ساری کمزوریاں موجود ہیں جو اور دوسرے پرانوں میں ہیں۔ ماخذوں کی ایک اور قسم مہتمے اس بنا پر باعثِ دلچسپی ہے کہ یہ خاندانوں سے تعلق رکھنے والے ان پروہتوں کی دستی کتابیں ہیں جو مختلف تیرتھ استھانوں میں رہتے تھے۔ مثال کے طور پر وتست مہتمے میں وتست یا دریائے جہلم کے کنارے کشمیر کے اہم تیرتھ استھانوں کا ذکر ملتا ہے، اور ان تاریخی واقعات کا ذکر ملتا ہے۔ (جو روایت کے طور پر نسلوں میں منتقل ہوتے رہے) جن کا تعلق ان مقامات سے ہے۔

مادی اشیا کے طور پر کتبات کا استعمال کر کے کلہن نے اپنی تاریخی تحریر میں ایک نہایت جدید عنصر شامل کر دیا ہے۔ وہ ان کتبوں کا حوالہ دیتا ہے جو مندروں میں ملے، گذرے ہوئے راجاؤں پر لکھی جانے والی پرستاستیوں (قصیدوں) کا حوالہ دیتا ہے۔ اور ان کتبوں کا حوالہ دیتا ہے جن میں پرانے راجاؤں کے عطیوں، خصوصاً زمین یا گاؤں سے متعلق عطیوں کا ذکر ہے۔ کتبوں کا حوالہ بذات خود اتنا اہم نہیں ہے جتنی یہ حقیقت کہ ان میں دی ہوئی معلومات کو وہ تاریخ کے ایک جائز ماخذ کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے۔

کلہن تاریخ نگاری کے مقاصد سے واقف تھا، اور اپنے روزنامچے کے یہ مقاصد واضح طور سے بیان کرتا ہے: کشمیر کے راجاؤں کا سلسلۂ حکومت اور صحیح تاریخ وار تسلسل قائم کرنے کی کوشش گذرے ہوئے زمانے کا ایک ایسا بیان جو پڑھنے کے لائق ہو، اور گذرے ہوئے زمانے کی ایک ایسی تشریح جس کی بنا پر پڑھنے والے زندگی کے مزاج اور اس کی ثباتی پر غور کر سکیں۔ سب سے آخری مقصد سے ہمیں اس کے فلسفۂ تاریخ کے بارے میں ثبوت ملتا ہے۔

دھرم کا خیال کلہن کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ اس کے بموجب تاریخی واقعات کا بنیادی کام دھرم کے نظام کے سارے پہلوؤں یعنی مذہبی، سماجی نیز قانونی پہلوؤں

صول کو سامنے لے آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ نہ صرف مذہب کی روایتوں سے وابستہ رہا جائے
سماجی اداروں کو بھی اسی طرح برقرار رکھا جائے جیسے شاستروں میں لکھا ہوا ہے۔ لیکن، جیسا کہ
دہ معلوم ہوگا، خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ کلہن اس معاملے میں غیر استدلالی نہیں تھا۔ پھر بھی
کی تاریخ میں نظریۂ کرم کا کوئی نہ کوئی مقام ہونا ہی چاہیے تھا۔ چنانچہ کسی بھی حکمراں کے بارے
شکل تشریحات سے بچنے کا یہی راستہ نظر آیا کہ اس حکمراں کی موجودہ زندگی پر سابقہ پیدائشوں
رد کھا دیا جائے۔ اس کے دوسرے ہمعصروں نے بھی اکثر یہی راستہ اختیار کیا ہے کہ راجاؤں
سیاست دانوں کے افعال کی اسی طرح توجیہہ کردی ہے۔ جو انسانی واقعات کی توجیہہ کے
سلے میں کرم کے تصور سے وابستہ کرکے قسمت کے رول کو بھی خاصی اہمیت دی جاتی تھی۔ کلہن
مت کی دخل اندازی کے بارے میں تو اتنا زیادہ لکھتا پھر بھی یہ تصور کہیں کہیں کارفرما نظر آجاتا ہے۔
کے طور پر، اس بات کی توجیہہ ہیں کہ کشمیر کا راجہ ہرش کیوں کمزور ہوگیا اور بالآخر اپنے دشمنوں
ر گیا، جو مختلف اسباب بتائے گئے ہیں ان میں سے ایک قسمت کی طاقت بھی ہے مندرجہ
صور سے متعلق ایک تصور خدائی انتقام کا ہے جو بُرے راجاؤں کے سلسلے میں خصوصیت سے
رما نظر آتا ہے۔ یہ رویہ جزوی طور سے اس ناکامی کے باعث بنتا ہے۔ جو خراب راجاؤں کو نکال
ے میں لوگوں کو ہوتی ہے۔ لیکن خدائی انتقام کے ساتھ ہی خوشنودیٔ بھگوان کا عقیدہ بھی ملتا
خود دینداری کے نیک کام کرکے حاصل کی جاسکتی ہے، جیسے برہمنوں کو معقول قسم کے تحائف
ر جادو ٹونے کا استعمال بھی، خصوصاً انتقامی حربے کی حیثیت سے، ان بہت سے ممکنہ تاریخی
سباب میں شامل رکھا گیا ہے جو واقعات کا جواز بتانے کے لیے بیان کیے گئے ہیں۔

یہ بات خلاف توقع نہیں ہے کہ کلہن بغیر کسی جھجک کے ماضی کے واقعات سے اخلاقی سبق
ر لیتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ یاد رکھنا بھی بیحد ضروری ہے کہ وہ ایک ایسے دور میں لکھ رہا
جو کشمکش، خانہ جنگی اور سیاسی انتشار کا دور تھا۔ اور مصنفین کے لیے یہ تقریباً لازمی تھا
ود ان خطرات سے واقف کرائیں جو اسی قسم کے حالات کی بنا پر پیدا ہوتے، اور خواہ انھیں

اخلاق پرست اور ناصح ہی کیوں نہ کہا جائے، مگر وہ لوگوں کو ان خطرات کے نتائج سے ضرور آگاہ کر دیں۔ غالباً یہ خوف، کہ اگر خانہ جنگی ہوتی رہی تو کشمیر کا کیا ہے گا، اس بات کا سبب بنا کہ کسی مافوق الفطرت ہستی پر بھروسہ کیا جائے۔

تاریخ نویس کے بارے میں کلہن کے خیالات پر ہندوستانی روایت کے ان دو سلسلوں دھاروں نے براہِ راست اثر ڈالا جو ماضی کا حال درج کرنے سے تعلق رکھتے تھے، یعنی برہمن اور بدھ روایتوں نے۔ برہمی روایت سے تعلق رکھنے والے خیالات رامائن و مہابھارت، پران اور گپتا دور کے بعد کی ان تاریخی سوانحوں، جیسے بان کی ہرش چرتر وغیرہ، سے اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے کسی بھی کتاب سے وقت کا صحیح شعور نمایاں طور پر ظاہر نہیں ہوتا۔ ان کتابوں میں ماضی ایسے کائناتی سلسلوں کی شکل میں پھیلا ہوا ایک دَور ہے جس میں اہلِ باطن نظر آتے ہیں۔ شجرے بڑی احتیاط سے تیار کیے گئے ہیں لیکن اس بات پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے کہ افراد اور واقعات کو ماضی میں صحیح مقام دیا جائے، خصوصاً وقت کے تسلسل کے اعتبار سے ان کے مقام کا تعین نہیں کیا گیا ہے۔ پرانوں میں تاریخی حصّوں کو دیومالا کی کہانیوں کا تقریباً حصہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اس حقیقت کی بنا پر کہ گذرے ہوئے اصلی واقعات کے صریحی حوالے دینے کے باوجود انھیں پیش گوئی کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، قاری کی توجہ واقعات سے ہٹ جاتی ہے اور وہ یہ نہیں سمجھ پاتا کہ یہ دراصل تاریخی واقعات بیان کیے جا رہے ہیں۔ ان کا فلسفہ اور سماجی ڈھانچہ دھرم کے تصوّر نے فراہم کیا ہے۔ اگر ان میں ورن، آشرم، دھرم کے نظام ہی کو پیشِ نظر رکھا جاتا تو سارے واقعات کی تشریح اس نظام کے تحت ہو سکتی تھی۔ لیکن اس روایت میں سارا زور گروہوں پر یعنی کنبہ، ذات، قبیلے پر تھا، فرد پر نہ تھا۔

بدھ روایت نمایاں طور پر مختلف تھی۔ اس میں وقت کا احساس بڑا نمایاں ہے، اور ہر واقعے کا تعلق بدھوں کے ماضی کے مرکزی واقعے یعنی مہاپرنروان سے ہے جو تاریخی اعتبار سے گوتم بدھ کی تاریخ وفات ہے۔ لنکا کے دو روزنامچوں دیپاوامس اور مہاوامس میں تاریخوں کا حساب اسی

واقعے کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔ حالانکہ اس روایت میں کرم کے تصور کو مانا گیا ہے لیکن ہر فرد کے کرم کو سماجی اعتبار سے بھی دیکھا گیا ہے۔ اس روایت بموجب ماضی اخلاقی اور سماجی دونوں طرح کے سبق سکھا سکتا ہے۔ چونکہ بدھ مذہب عملی طور پر تبلیغی مذہب تھا اور اس کے مبلغ ایشیا کے مختلف حصّوں میں بھیجے گئے تھے، اس لیے یہ ضروری تھا کہ اُستادوں اور مبلغوں کے بارے میں صحیح اندراجات رکھے جائیں اور انھیں محفوظ رکھا جائے۔ یہی ریکارڈ بعد میں تاریخ لکھنے اور اس پر بہت کچھ غور و فکر کرنے کی بنیاد ثابت ہوا۔

غور و فکر کی انھی دو روایتوں کا اثر کلہن کی تحریر کی اس بتدریج تبدیلی میں دیکھا جا سکتا ہے جو راج ترنگنی میں نظر آتی ہے۔ روز نامچے کا ابتدائی حصّہ نہ صرف یہ کہ برہمنی مواد پر مبنی ہے بلکہ تاثیر بھی دیتا ہے کہ اس کا تاریخی ڈھانچہ بھی برہمنی ہے۔ پہلی تین کتابیں صاف طور سے نیم تاریخی مواد پر مبنی ہیں، جن میں ایسی کتابوں پر بہت کچھ بھروسہ کیا گیا ہے جیسے نیل ماتا پران۔ چوتھی کتاب کرکوٹ عہدِ حکومت کے بارے میں ہے اور اس میں تقریباً آٹھویں صدی تک کا بیان ہے تحریر سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس میں بدھوں کی شمالی ہند کی روایت استعمال کی گئی ہے، کیونکہ یہ بات بڑی واضح ہے کہ بیان کسی تاریخی بنیاد پر کیا جا رہا ہے۔ کشمیر کی تاریخ کے اس دَور کے بارے میں کچھ ثبوت چین کے تانگ دَورِ حکومت کے وقائع میں ملتے ہیں (مثال کے طور پر ہمیں بتایا گیا ہے کہ تقریباً
میں جب غالباً عربوں نے سندھ پر حملہ کیا اور سندھ کے اُوپری علاقوں کو ان سے خطرہ پیدا ہوا تو چین۔ تو۔لو۔پی۔لی۔ نے، جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ راجا کا مدراپد تھا، عربوں کے خلاف مدد مانگی تھی) اگر اس وقت چین سے رسل و رسائل اس درجہ آسان تھے (اور اس بات پر شبہ کرنے کا کوئی سبب نظر نہیں آتا) تو عین ممکن ہے کہ چین میں اندراجات رکھنے پر اور شاہی وقائع نگارہ پر جو زور دیا جاتا تھا اس کا اثر کشمیر کی تاریخ نویسی کی روایتوں پر پڑا ہو۔ اگلی تین کتابوں (پانچویں سے ساتویں تک) میں تاریخی واقعات کو ان کے سیاق و سباق میں سمجھنے اور ایسی تشریحات کے علاوہ جو عام طور پر دھرم و کرم کی بنیاد پر کی جاتی تھیں دوسری قسم کی تشریحات کی جانب ایک

نمایاں رجحان ملتا ہے۔ بہت سے نئے سببی عناصر ملتے ہیں (جیسا کہ آیندہ معلوم ہوگا) جن سے یہ پتہ لگتا ہے کہ مصنف تاریخی ماضی میں اور زیادہ تلاش و تحقیق کرنا چاہتا تھا اور خود کو محض معلومات دینے تک محدود کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تاریخ کے بارے میں کلہن کے غور و فکر کی پختگی کا ثبوت راج ترنگنی کی آخری جلد (آٹھویں کتاب) میں ملتا ہے۔ یہ سب سے زیادہ طویل کتاب ہے اور اس عہد کے بارے میں ہے جو کلہن سے فوراً پہلے کا عہد تھا۔ ظاہر ہے کہ اس عہد سے اس کی واقفیت سب عہدوں سے زیادہ رہی ہوگی۔ توقع کے مطابق اس کتاب میں تجزیے کا معیار پہلی ساری جلدوں کے مقابلے میں واضح طور سے مختلف ہے۔

یہ روز نامچہ قاری کو ارضِ کشمیر کی ابتدا کی طرف لے جاتا ہے جب وادیٔ کشمیر اندرونِ ملک قسم کی ایک جھیل تھی۔ بالآخر اس کا پانی ایک گھاٹی کے راستے باہر نکالا گیا جو بارہ مولا سے اُوپر کی طرف واقع تھی، اور روایتی مآخذوں میں بڑے فطری طور پر اس کام کو کسی مافوق الفطرت ہستی کا کرشمہ بتایا جاتا ہے۔ کشمیر کے قدیم ترین راجاؤں، جیسے گناڈ اول، کا تعلق رامائن اور مہابھارت کے بہادروں اور روایتی تاریخ سے اسی انداز سے قایم کیا گیا ہے جیسے پرانوں میں کیا جاتا ہے۔ چنانچہ گناڈ اول کا تعلق جارا سندھ سے قایم کیا گیا ہے، اور وہ مہابھارت کی مختلف لڑائیوں میں حصّہ لیتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ بیان نیل ماتا پران پر مبنی ہے جس میں یقیناً اس بات کی کوشش کی گئی ہوگی کہ کشمیر کے قدیم راجاؤں کا تعلق اسی روایتی تاریخ سے قایم کیا جائے جو بڑے پرانوں میں ملتی ہے۔ مزید یہ کہ، بحیثیت فرمانروائے کشمیر، موریہ راجہ اشوک کے دورِ حکومت کے حوالے دے کر کشمیر ہندوستان کی تاریخ کے دائرے میں لایا گیا ہے۔ استوپ بنوانے اور سری نگر کا شہر آباد کرانے کے سلسلے میں اس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ بیانات صاف طور سے مُدھ مآخذوں پر مبنی ہیں، کیونکہ پرانوں میں اشوک کا محض یہ تذکرہ ہے کہ وہ ایک موریہ راجہ تھا۔ اس کے علاوہ اس کے بارے میں کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔

اس سے پہلے کی کتابوں میں فوق الفطرت اسباب کو ایک اہم درجہ دیا گیا ہے۔ چنانچہ

ہمیں بتایا جاتا ہے کہ قحط دیوتاؤں کی ناراضگی کی وجہ سے آتے ہیں[6]۔ جب رانی دیوتاؤں کی پوجا کرتی ہے تو غذا کی یہ کمی رفتہ رفتہ دور ہونے لگتی ہے۔ اس سے ہمیں کہیں زیادہ عجیب کہانی سندھی ماتا[6] کے دوبارہ زندہ ہونے کی ہے۔ اِسے پہلے جلاوطن کہا جاتا ہے، پھر قید کیا جاتا ہے، اور پھر راجہ اسے مار ڈالتا ہے۔ یتینا آتی ہیں اور اس کی ہڈیوں کو جوڑ کر ڈھانچہ بنا دیتی ہیں اور دوبارہ زندہ کر دیتی ہیں۔ اس کے بعد وہ راجہ جتیندر کا جانشین بن جاتا ہے۔ یہاں نہ صرف ایک مافوق الفطرت ہستی شامل بیان ہے بلکہ قسمت بھی بیان میں شامل ہے کیونکہ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ سندھی ماتا کی قسمت میں یہ لکھا تھا کہ وہ کشمیر کا راجہ بنے گا، اور اس دیش کو بہت سی بُری رسموں اور رواجوں سے چھٹکارا دلائے گا۔ قسمت کی دخل اندازی کی ایک اور مثال[7] راجہ وجے مل کا عین اس وقت برف کے تودوں میں دب کر مر جاتا ہے جب وہ اور بہت سے دوسرے جاگیردار راجہ ہرش پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ بدھ دھرم کی بڑھتی ہوئی مقبولیت برہمنوں اور ناگاؤں (مقامی دیویاں اور دیوتا) دونوں کو برہم کر دیتی ہے۔ اس مقبولیت کو روکنے کے لیے ناگا ایک خاص وقت پر برف کے بڑے بڑے تودے لٹکا دیتے ہیں، جنھیں برہمن بڑی چالاکی سے بدھوں[8] کے خلاف استعمال کر لیتے ہیں۔ ایک اور انوکھا واقعہ چوتھی کتاب میں دیا گیا ہے۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ راجہ للت دت اس بنا پر بہت مشہور ہوا ہے کہ اس نے اپنے اِردگرد بہت سے عقلمند آدمی جمع کر لیے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام تخارا (وسطِ ایشیا) تھا جسے کنکونا کہا جاتا تھا۔ کسی خاص موقعے پر اس نے پنجاب کی ایک ندی کے آبِ سرکش پر جادو کیا جس سے پانی بیچ سے جدا ہو گیا اور فوج کو ندی پار کرنے کے لیے راستہ مل گیا[9]۔ یہ واقعہ پڑھنے کے بعد خیال ہوتا ہے کہ کہیں موسیٰ اور بحرِ احمر کی کہانی کی بازگشت کشمیر نہ پہنچ چکی ہو۔

اس جنم اور پچھلے جنموں کے افعال، کرم اور ثواب یعنی پن کو بھی عمل تاریخ کا حصہ سمجھا گیا ہے۔ خواہ راجہ کی نیت کتنی ہی اچھی ہو اس کے کاموں میں اس لیے بھی رکاوٹ پڑ سکتی تھی کہ اس نے یا اس کی رعایا نے کم پن کیے ہوں[10]۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اسی بنا پر راجہ کوئی کام نہیں کر پاتا تھا بلکہ

شاید یہ ان رکاوٹوں کی تشریح کرنے کی کوشش ہے جو ایک اچھے ارادے کی تکمیل کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔

۳۔ ساتویں آٹھویں جلدیں کلہن کے بعد کے دور کے تاریخی غور و فکر کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان میں بھی فوق الفطرت عناصر اور قسمت کے رول پر زور دینے سے گریز نہیں کیا گیا ہے، لیکن اور دوسری سبھی تشریحات کی موجودگی کی بنا پر ایسا لگتا ہے جیسے انھیں پس پشت ڈال دیا گیا ہو۔ تاریخی واقعات پر مختلف زاویوں سے بحث کی گئی ہے، جیسے واقعات میں ملوث ہونے والے افراد اور اُن کی اُمنگوں پر، اُن کی کمزوریوں اور طاقت پر، جاگیرداروں کے ظہور اور راجہ سے اُن کے تعلقات پر، کشمیر کی سیاست میں ڈماروں اور برہموں کے حصّے پر، کشمیر کی معاشی حالت پر۔ کلہن جب گیارھویں اور بارھویں صدیوں پر لکھ رہا تھا تو گویا وہ خود اپنے دور کے بارے میں لکھ رہا تھا، اور ان مختلف پہلوؤں سے واقف تھا جو تاریخی صورتِ حال بنانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ ان سارے اسباب کو سمجھ لیتا ہے۔[11]

راجہ ہرش کے زوال کی بابت غور کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ پیدائش کے وقت ستارے اس کے حق میں نہ تھے، اور اسی وجہ سے قسمت نے اس کا ساتھ نہ دیا۔" لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ ہرش کمزور تھا کیونکہ اس نے جنگوں سے گریز کیا، اور اس زمانے کے حالات میں بہت سے مسائل محض جنگوں کے ذریعے ہی حل کیے جا سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ہرش میں قوّتِ فیصلہ کم تھی، خصوصاً اشخاص کے بارے میں۔ اس نے غلط قسم کے لوگوں کو منتری بنایا اور ان کے مشوروں پر عمل کیا۔ کسی بھی راجہ کی کمزوری کی ایک قابلِ مذمّت وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ چالباز عورتوں کے اثر میں آ جاتا ہے۔[12]

قرونِ وسطیٰ کے کشمیر کی سیاست پر درباری فرقے حاوی تھے۔ دونوں فوجی قسم کے تھے۔ ایک تانترین تھا اور دوسرا ایکانگا۔ دسویں صدی کے پہلے نصف میں یہ فرقے حاکموں کو اُتارتے بٹھاتے رہے۔ درباری سیاست میں ان کے بڑی ہوشیاری کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔[13] اس

کے بعد کی صدی میں طاقت کے مرکز صرف راجہ اور منتری ہی نہیں بہت سے ڈمارے بھی بن گئے تھے۔
ڈمار مخصوص کشمیری لفظ ہے اور لگتا ہے یہ دراصل کوئی قبائلی نام ہے۔ راج ترنگنی کے بیان سے اندازہ ہوتا
ہے کہ یہ لوگ بہت کم مدت میں زمینوں کی ملکیت کے باعث جاگیردار بن گئے تھے[14]۔ ایسا لگتا ہے کہ
اس زمانہ ملازمت میں انھوں نے زمینیں حاصل کر لی تھیں اور وادی کے زرخیز خطوں میں رفتہ رفتہ
نہایت طاقتور ہو گئے تھے۔ ان کا سماجی مرتبہ اسی بات سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ انھوں نے راجپوت
عورتوں سے اور اکثر شاہی خاندان میں شادیاں کی تھیں۔ یہ لوگ راجہ کی مخالفت کا ایک بڑا ذریعہ
تھے اور اس دور کے کشمیر کی تاریخ ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات سے بھری پڑی ہے جن کا تعلق ڈماروں
سے ہے۔

کلہن انتظامیہ پر بحث کرتے وقت کائستھوں کی سرگرمیوں کو بالکل پسند نہیں کرتا
اور ریاست کی بدنصیبی کی بہت کچھ ذمہ داری انہی لوگوں پر ڈالتا ہے۔ کائستھ اندراجات رکھتے
تھے، اور منشیوں کا کام کرتے تھے، اور اسی وجہ سے ریاست کی انتظامیہ کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی
حیثیت رکھتے تھے۔ کلہن لکھتا ہے کہ کائستھ نہ صرف سیاسی سازشوں[15] کے لیے بہت کچھ ذمہ دار
ہیں۔ بلکہ اس سے بھی بُری بات یہ ہے کہ وہ راجاؤں کو رعایا پر ظلم کرنے کے لیے اُکساتے ہیں اور
اسی طرح سارے دیش میں سیاسی بے چینی اور مخالفت پھیلاتے ہیں[16]۔ راجہ شنکر ورمن
(نویں صدی) کے بارے میں لکھا ہے کہ "غلاموں کے بیٹوں اور احمقوں کا سردار تھا" کیونکہ اس
نے کائستھوں کے ناپاک مشورے پر توجہ دی[17]۔ انھوں نے اسے مشورہ دیا کہ مندروں کو لوٹے اور اپنی
رعایا پر دباؤ ڈال کر زیادہ دولت حاصل کرے۔ ڈمارے اور کائستھ مل کر لوگوں کا خون چوس
رہے تھے۔

کائستھوں کے خلاف کلہن کی زہر افشانی غالباً کسی حد تک پیشہ ورانہ رقابت کا نتیجہ تھی۔
انتظامیہ میں سب سے اونچے عہدے برہمنوں کا روایتی حق سمجھے جاتے تھے اور غالباً ان عہدوں،
[illegible] پر کائستھوں کے دخل کی وجہ سے ناراضگی پیدا ہونی [illegible]

تعریف کرنا چاہیے کہ اس نے برہمنوں کی سرکاری تنظیموں، جیسے پروہت، پریشدوں کو بھی ہدف تنقید بنایا (گو ایسا نہیں تھا اور دوسری تنظیموں کو)۔ پروہت پریشد پروہتوں کی بنائی ہوئی منظم جماعتیں تھیں جو بعض مدرسوں اور تیرتھ استھانوں سے وابستہ کردی گئی تھیں جماعت کے افراد اس ساری جائداد اور املاک کے مشترکہ مالک ہوتے تھے جو مدرسے کے لیے وقف کی جاتی تھی اور اس ساری آمدنی کے بھی مالک ہوتے تھے جو عطیات کی شکل میں حاصل ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے پریشد کے افراد مادی اعتبار سے بڑی اچھی حالت میں ہوتے تھے اور سیاسی اعتبار سے بڑے طاقتور ہوتے تھے۔[18] کلہن کے خیال میں یہ لوگ ایک اور ایسا عنصر تھے جو ریاست کے کام میں دخل انداز ہوتا تھا۔ لیکن پروہت پریشدوں کے خلاف اس کا غصہ اس نظریے کو بے چون وچرا مان لینے کی وجہ سے کسی حد تک نرم پڑ گیا تھا کہ اچھے راجہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے دیش کی برہمن برادری کو فیاضی کے ساتھ مراعات دے۔[19]

۱۔ برہمن کے رول کو جس طرح ہر سطح پر روایتی سیاسی نظریے میں پیش کیا گیا ہے کلہن نے اس کی تصدیق کی ہے۔ وہ تانتریوں، اکانگوں، دماروں اور ان شاہی راج کماروں کو جن کی مدد منتری اور برہمن کرتے تھے، بغاوت کے کارکن کہتا ہے۔ وہ ان بغاوتوں کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ جو سروع کی تین قسموں کے لوگ کرتے تھے کیونکہ یہ طاقتیں تفرقہ انگیز تھیں، لیکن جب برہمنوں کا ذکر آتا ہے کہ انھوں نے کسی سیاسی قوت یعنی کسی مخصوص راجہ یا منتری[20] کے خلاف اپنا روایتی حربہ 'برت' استعمال کیا، تو اس بات کو وہ محض اس مفروضے پر چپ چاپ مان لیتا ہے کہ برت ضرور کسی نہ کسی منصفانہ سبب کی بنا پر رکھا جاتا ہے جیسے کسی ظالم راجہ یا منتری کو گدی سے اتارنے کے لیے۔

۲۔ کلہن نے پہلے ہی محسوس کر لیا تھا کہ ان گروہوں کی سیاسی قوت اور معاشی حالت میں ایک تعلق ہے۔ ایک عبارت جو روزنامچے کے دوسرے نصف میں ٹیپ کے بند کی طرح دہرائی جاتی ہے یہ ہے کہ کسی گاؤں کو ایک سال کے خرچ سے زیادہ اناج جمع کرنے کی اجازت نہیں

دی چاہیے۔ یہ اس سے زیادہ مویشی رکھنے کی اجازت نہ ہونی چاہیے جو کھیت جوتنے کے لیے کافی ہوں۔ کیونکہ سرمائے کی فراوانی سے دماروں کو عروج ملتا ہے اور وہ فطری طور پر راجہ کی نافرمانبرداری کرتے ہیں[21] اسی کے ساتھ راجہ کی پریشانی کا سبب بننے والی چیزوں کی فہرست میں وہ گاؤں کی اس حالت کو بھی شامل کرلیتا ہے جب وہاں شہروں کی سی سہولتیں مہیا ہوجائیں جب گڑھیوں اور حصاروں کی ٹھیک طرح نگہبانی نہ ہو، جب افسران آپس میں شادی بیاہ کرنے لگیں۔ اسی طرح کے اور دوسرے اسباب بھی اس فہرست میں شامل ہیں۔

کلہن ایسی باتوں کو بڑی نفرت سے دیکھتا ہے جیسے راجہ کا عوام پر ظلم کرنا اور مدروں کو لوٹنا۔ شاستروں میں کہا گیا ہے کہ ظالم راجہ کو برداشت نہیں کرنا چاہیے۔ شنکر اورمن کے ظالمانہ اعمال کی ایک لمبی فہرست تیار کی گئی ہے جس میں مدروں کو لوٹنے سے لے کر بھوں کی کی لی اور بے گار تک درج ہیں[22] ہرش کے زوال کے اسباب میں ایک سبب یہ دیا گیا ہے کہ اس نے نہ صرف مدروں کو لوٹا بلکہ ایسے افسروں کا تقرر کیا جن کا کام مقدس موریوں کی بیح کنی کرنا تھا[23]، ان افسروں کو دیوت پتنا نئک کہا جاتا تھا۔ شاستروں کے بموجب راجہ کی اوّلیں ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے عوام کی نگہداشت کرے اور ان کی فلاح و بہبود کا خیال رکھے۔ اسی لیے اگر ظالم راجہ کو مصیبتیں گھیر لیں تو وہ اس کا مستحق ہے۔

روز نامچے کے بعد کے حصے میں جو تاریخی ذکر ملتا ہے اس سے اس بارے میں کہ' تاریخی عمل کن باتوں پر مبنی ہوتا ہے' کلہن کے غیر معمولی حد بد ادراک کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے کلہن کی تاریخی تحریر سنسکرت کی روایتی انداز کی تاریخی تحریروں سے مختلف سمجھی جاتی ہے۔ اسی دور میں دوسرے علاقوں کی تاریخیں لکھی گئی تھیں' اور گپتا دور کے بعد سے تاریخی سوانح ادبی اظہار کے لیے اکثر استعمال ہونے لگی تھی۔ نسب ناموں کی شکل میں مختلف حکومتوں کا تذکرہ اور وم ساولی اور زیادہ عام ہوگئے تھے۔ جدید محققوں کو ان میں سے بہتوں پر ابھی تحقیق کرنا باقی ہے۔ اب تک جو مواد حاصل ہوا ہے اس سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ اس طرح کے ادب میں راج ترنگنی کو ایک

نہایت ممتاز مقام حاصل ہے۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے کشمیر میں اس انداز کی تاریخی تحریر کیوں لکھی گئی۔ اس کے بہت سے اسباب پہلے ہی دیے جا چکے ہیں[24]۔ کشمیر کی جغرافیائی علاحدگی نے ـــــ ایک ایسی وادی جو چاروں طرف اونچے پہاڑوں سے گھری ہے ـــــ یہاں کے لوگوں میں قوم پروری کا ایک قومی احساس پیدا کر دیا تھا۔ ایک اور عنصر یہ بھی تھا کہ بدھ دھرم کشمیر میں ثابت قدمی سے جما رہا۔ بدھ دھرم میں تاریخ کا احساس برہمن دھرم کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ کشمیر بہت سی غیر ہندوستانی تہذیبوں جیسے یونانی، چینی اور غالباً ترکستانی کے زیرِ اثر بھی رہا، اور ان میں ہر تہذیب کی اپنی ٹھوس تاریخی روایتیں تھیں۔

کشمیر کی جغرافیائی علاحدگی یقیناً ایک مثبت عنصر تھی، لیکن کشمیر ملک سے پورے طور پر کبھی علاحدہ نہ رہا۔ کشمیر کی تہذیب کے آثارِ باقیہ سے پتہ لگتا ہے کہ گندھارا اور شمالی ہندوستان، وسطِ ایشیا اور چین سے اس کے قریبی تعلقات تھے[25]۔ جغرافیائی علاحدگی میں اس ضمنی نتیجے کا اور اضافہ کر لیا جائے کہ وہ دور جب کلہن لکھ رہا تھا پورے شمالی ہندوستان میں شدید علاقائی وفاداریوں کا دور تھا۔ چھوٹے چھوٹے رجواڑوں کے درباروں میں، جو تعداد میں برابر بڑھ رہے تھے، لوگوں کو خاص سرکاری سرپرستی حاصل تھی، اور مقامی تہذیب، مقامی مسائل اور مقامی واقعات سے لگاؤ پیدا ہو جانا ناگزیر تھا۔ ہر رجواڑہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ وہ کوئی بہت بڑا راج ہے، لیکن حقیقت یہ تھی کہ ہر رجواڑے کے لوگوں کے تجربات کا دائرہ علاقائی تھا۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ اس زمانے کے اہلِ فکر و نظر کو ایک چھوٹی سی تصویر پر اپنی ساری توجہ مرکوز کرنے اور بڑی گہرائی تک اس پر غور کرنے کا موقع ملا۔ ہمارے سارے ہندوستان کا نہیں صرف کشمیر کے راجاؤں کا مسئلہ تھے، اور کلہن نے ان کو بس اتنی ہی اہمیت دی۔

بدھ دھرم نے کلہن پر غالباً غیر شعوری طور سے اثر ڈالا۔ متن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بدھ دھرم کا حامی نہیں تھا، بلکہ اسے بڑے شبہے کی نظر سے دیکھتا تھا[26]۔ لیکن کشمیر کی تاریخ کے بعض حصوں

کے بارے میں اسے بدھ تحریروں سے رجوع کرنا پڑا ہوگا۔ اس کے اندر ماضی کا زیادہ حقیقی احساس پیدا کرانے میں ان چند تحریری روایتوں کا حصّہ بھی رہا ہوگا جو خود کشمیر میں (بدھ راہبوں کے مرکزوں میں) درج کی گئی تھیں۔ اسی طرح، ضروری نہیں کہ یونانی، چینی اور اسلامی (جو وسط ایشیا کے ترکوں سے حاصل ہوئی تھی) تاریخی روایتوں کا اثر یونانیوں، چینیوں اور ترکوں کی تاریخی تحریروں کے علم کی بنا پر براہِ راست پڑا ہو، بلکہ اس تہذیبی نظام سے واقفیت کی بنا پر پڑا ہو جس کے تحت تاریخی تحریریں وجود میں آئی تھیں۔ یہ واقفیت دونوں زمانوں کے ذریعے ہو سکتی ہے، یعنی زمانۂ ماضی (یونانی) کے ذریعے اور زمانۂ حال (چینی و ترکی) کے ذریعے۔ کلہن کسی بھی مقام پر یہ اظہار نہیں کرتا ہے کہ وہ ان زبانوں سے یا ان زبانوں کے ادب سے واقف ہے، اس لیے یہ اثر نفوذِ تہذیب کے عمل کا نتیجہ ہوگا۔

وہ ذاتی تعریف کا مستحق ہے کیونکہ اس نے ایک خاص زمانے میں ایسی تحریر پیش کی۔ راج ترنگنی میں تاریخ کی بابت جو احساس ملتا اور ادراک ملتا ہے وہ نہ ان پہلے کی تحریروں میں ملتا ہے جنھیں کلہن نے ماخذوں کی طرح استعمال کیا اور نہ ان روزنامچوں میں ملتا ہے جو اس کے بعد لکھے گئے۔ بعد کے مورخوں اور روزنامچہ نگاروں، جیسے جوناراج، سری ور، پراجیا بھٹ اور شکار، میں وہ تاریخی بصیرت نہیں ملتی ہے جو کلہن میں تھی حالانکہ ان پر بھی وہی اثرات پڑے تھے جو اس پر پڑے تھے۔ کلہن یقیناً تجرباتی ذہن کا مالک تھا۔ بعد کے مورخین میں یہ خوبی نہیں تھی۔ وہ ایک ایسی ریاست کی تاریخ لکھ رہا تھا جو زوال کے دور سے گزر رہی تھی۔ خود ان حالات نے بھی اس حساس اور غور و فکر کے عادی شخص کو سوالوں کے جواب ڈھونڈنے اور مطالعۂ باطن کرنے پر آمادہ کیا ہوگا۔ کلہن ایک ایسے منتری خاندان کا چشم و چراغ تھا جو کبھی بڑا طاقتور تھا، لیکن رفتہ رفتہ اپنی طاقت کھو چکا تھا۔ اس لیے، گو وہ کسی قوت کا مالک نہ تھا، لیکن ان قوتوں سے خوب واقف تھا جو تاریخ اور سیاست کو جنم دیتی ہیں۔ وہ ساری صورتِ حال کو ایک غیر جانبدار شخص کی نظر سے دیکھ سکتا تھا، لیکن ساتھ ہی اس بصیرت کو بھی برقرار رکھ سکتا تھا جو

صورتِ حال کے بناؤ بگاڑ میں شامل رہنے والے شخص میں ہوتی ہے۔ یہ طے کر لینے کے بعد کہ وہ چاپلوس والی تاریخ نہیں لکھے گا، اس کے ذہن میں یہ گنجائش پیدا ہوگئی تھی کہ ذاتی فوائد اور نقصانات سے اُوپر اُٹھ کر اپنے زمانے کے حالات کی تحقیق اور تحریر کر سکے۔

سب سے آخری بات یہ ہے کہ کشمیر جیسے علاقوں کو، جو بدھ، یونانی، چینی اور ترکی اثرات کے لیے کھلے ہوتے تھے، سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہندوستانی روایت پر غیر تقلیدی یا خارجی اثرات پڑے، اور اسی بنا پر غیر تقلیدی اندازِ فکر کی تربیت ہوسکی۔ اس سے یہ مطلب نہیں نکالنا چاہیے کہ کلہن نے ایسی تاریخ اس وجہ سے لکھی کہ وہ غیر مقلد تھا۔ وہ ہرگز ایسا نہ تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اس کی تحریر کے بہت سے ایسے پہلو ہیں جن سے راسخ العقیدگی صاف ظاہر ہوتی ہے۔ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ کلہن ایک ایسا شخص تھا جس کا ذہن سدھا ہوا تھا، اور بہرکیف، ایک اچھے اور لائق مورخ کے لیے یہی ایک لازمی شرط سمجھی جاتی ہے۔
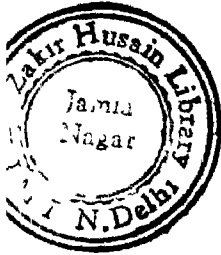
حوالہ جات

۱- Stein, Introduction, p 6

2- اس مقالے کے لیے راج ترنگنی کا وہ معیاری ایڈیشن استعمال کیا گیا ہے جس کی ترتیب و تدوین M A Stein نے کی ہے۔ حوالے اصل متن کے کتاب نمبر/ سلوک نمبر کے مطابق دیے گئے ہیں۔ جہاں جہاں ترجمے دیے گئے ہیں وہاں یکسانیت کے خیال سے Stein کا مندرجہ ذیل ترجمہ استعمال کیا گیا ہے:

Kalhan's Raj tarangni, a chronicle of the Kings of kashmir, (Westminister 1900).

3 یعنی ملہن کی وکرمی کا دیو چرتر۔

4 VIII 1715

5 II 17-55

6 II 92

7 VIII 916-917

8 I 179

9 IV 248-251

10 I 158

11 VIII 1715

12.	VII	449
13.	V	248, V 255, V 259, VI 121
14	VII	494 sq
15	VIII	258
16	IV	621-163, VII 1226, VII 89-94.
17	V	180-181
18	II	132, V 465, VIII 900.
19	VIII	76
20	VII	13, VII 400, VIII 890-900, VIII 2224
21.	IV	347-348
22	V	165-177
23	VII	1087-1091

24 A L Basham, 'The Kashmir chronicle' in *Historians of India, Pakistan and Ceylon* (ed C H Philips), p 57 ff

25. ان تعلقات کے بارے میں، مارتنڈ کے مندر، ہروان میں بدھوں کے آثار قدیمہ اور برزہوما میں پتھر کے زمانے کے آثار سے پتہ لگتا ہے۔

26 I 177.

بدہ پرکاش

رشید الدین 1247 میں ہمدان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے علم طب پڑھا اور اس میں اتنی قابلیت پیدا کی کہ ایل خان اباقہ نے انھیں درباری طبیب مقرر کر دیا۔ غازان کے دور حکومت میں انھیں بڑی شہرت ملی، اور 1298 میں انھیں وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ 1303 میں وہ غازان کے ساتھ ایک مہم پر گئے۔ اور اسی دوران عربی میں خط و کتابت کی۔ الجائیتو خدا بندہ کے زمانے میں ان کی شہرت اور زیادہ بڑھ گئی۔ نئے دارالسلطنت سلطانیہ کے نواح میں ایک علاقے کا نام ان کے نام پر رشیدیہ رکھا گیا، اور وہاں بڑی عالیشان عمارتیں، مسجدیں، مدرسے اور ہسپتال بنائے گئے۔ 1309 میں انھوں نے ایک اور شہر ربع رشیدی کے نام سے بسایا، جو تبریز کے مشرق میں غازان کے مقبرے کے قریب تھا، دریائے سراورد کا پانی لانے کے لیے چٹانوں کو کاٹ کر بہت زیادہ لاگت سے ایک نہر بنوائی۔ چونکہ وہ شہر تیس ہزار مکانوں پر مشتمل تھا اس لیے اسے بہت سے قطعوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ کوچۂ علما کے نام سے ایک علاحدہ قطعہ تھا جس میں چھ سات ہزار علما اور طلبہ رہتے تھے۔ اس کے بازاروں میں 1500 دوکانیں تھیں، اس میں 24 کارواں سرائیں تھیں اور بہت سے باغات، مسجدیں، حمام، مال گودام، کارخانے، کاغذ کی ملیں اور ایک ٹکسال تھی۔ اس کے ہسپتال (دارالشفا) میں ہندوستان، چین، مصر اور میسوپوٹامیہ کے بہت سے جراح اور طبیب کام کرتے تھے، اور ان میں سے ہر ایک پانچ طالب علموں کو پڑھاتا تھا۔ شہر کے کتب خانے کی عالیشان عمارت اس دور کا

ایک مجوبہ تھی۔ تاریخِ وصاف کے بموجب ان کی (رشید الدین کی) کتابوں کی کتابت، توضیح، جلد بندی پر 60000 دینار کی رقم خرچ کی جاتی تھی۔ لیکن ان کی ترقی کا راستہ ہموار نہیں تھا۔ ان سے علی شاہ کا جھگڑا ہوا جس کی وجہ سے دربار میں ان کے خلاف سازش ہوئی۔ اکتوبر 1317 میں ابوسعید خاں نے انھیں معزول کر دیا اور جولائی 1318ء میں انھیں پھانسی کا حکم دے دیا گیا۔ عوام کی بھلائی کے ان کے سارے کام ہیچ قرار دیے گئے، اور یہ بات مشتہر کی گئی کہ وہ ایک یہودی کے گھر پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ تیمور کے لڑکے میراں شاہ نے ان کی لاش قبر سے نکلوا کر یہودیوں کے قبرستان میں دفنا دی۔ اس طرح اس بڑے آدمی کی بے قدری کی گئی۔

رشید الدین اپنے زمانے کے بڑے عالم اور بہت زیادہ لکھنے والوں میں سے تھے۔ ان کے ادبی کاموں میں سب سے اہم کتابیں یہ ہیں: جامع التواریخ، جس کے ضمیمے میں عالمی جغرافیہ شامل ہے، اس کی مدد سے تاریخِ عالم بیان کی گئی ہے: کتاب الاحیا والاثار (عمارتوں اور جانوروں پر رسالہ) جس کے 24 ابواب میں زراعت، ساتات، کان کنی اور خام دھاتوں کی صفائی، جانوروں کی دیکھ بھال، بے ریڑھ کے حیوان، موسمیات، عمارت سازی، قلعوں کا استحکام، جہاز سازی وغیرہ کا ذکر ہے۔ توضیحات (تشریحات) میں 19 خطوط اور ایک دیباچہ ہے، ان خطوط میں دینیات اور تصوف کے مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ مفتاح التفاسیر (تفسیروں کی کلید) جو گناہ و ثواب، جنت و دوزخ، قسمت و آخرت اور قرآن کے بارے میں بہت سے سوالوں پر بڑی پُراز فہم تحقیق ہے، ان میں ایسے خیالوں کو مسترد کیا گیا ہے جیسے آواگون اور تناسخ الارواح۔ رسالۂ سلطانیہ (شاہی رسالہ) جو دینیات سے متعلق ان خطبات کا انتخاب ہے جو 1307 کے رمضان میں اُلجائتو کی موجودگی میں دیے گئے تھے، لطائف الحقائق (گہری سچائی) جو دینیات کے مختلف مسائل پر چودہ خطوط کا مجموعہ ہے۔ بیان الحقائق (سچائی کی تشریح) جس کے سترہ خطوط میں دینیات کے مسائل چیچک اور گرمی کی قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے دواؤں پر اور منگولوں کے انتظامِ حکومت پر چار رسالے لکھے اور انھیں عربی، فارسی اور چینی زبانوں میں چھپوایا تھا،

لیکن یہ تلف ہو چکے ہیں۔ ان کے کوئی 53 خطوط کا مسودہ جس کا نام منشآت ہے اب بھی موجود ہے۔ انھوں نے یہ خطوط اپنے بیٹوں اور عہدیداروں کے نام لکھے تھے، اور ان میں سیاسی سیر مالی معاملات کا ذکر ہے۔ ان سے اس زمانے کے واقعات اور انتظامی حالات پر بڑی روشنی پڑتی ہے۔ خط نمبر   اپنے بیٹے مجدالدین کے نام لکھا ہے جس میں ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے فوجی تیاریاں کرنے کے حکم کی اطلاع دی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کے خلاف مہم شروع کرنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ خطوط نمبر 29 انھوں نے سندھ کے مقام ملتان سے شیراز کے مولانا قطب الدین مسعود کو لکھا تھا۔ اس میں ان کے سفرِ ہندوستان کا حال ہے۔ یہ سفر انھوں نے ایل۔خان کے حکم پر کیا تھا تاکہ ہندوستان کے فرمانرواؤں سے سفارتی تعلقات قایم کیے جائیں۔ اس سفر کے نتیجے میں انھیں ایسی بہت سی دواؤں اور مفردات کا علم ہوا جن سے ایرانی لاعلم تھے۔ اس سفر نے ہندوستانی زندگی اور تہذیب کے بارے میں ان کے شوق کو جگا دیا ہوگا اور انھیں ایسے مواقع فراہم کیے ہوں گے کہ وہ اِن چیزوں کا مطالعہ کر سکیں۔ ان خطوط سے اس عالم کی بے مثل لیاقت، وسیع النظری اور شوق و مشاغل کی بے کراں وسعت کا اظہار ہوتا ہے۔

رشید الدین نے اپنی کتابیں چھپوانے اور انھیں محفوظ رکھنے کے لیے بڑی کاوش کی۔ انھوں نے اپنی عربی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں اور فارسی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کیا، اور طب سے متعلق تحریروں کی اشاعت چینی زبانوں میں کی، اور ان سب کتابوں کی بہت سی جلدیں ربعِ رشیدی کے کتب خانے میں جمع کروائیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی ساری تصنیفات جامع التصانیف الرشیدی کے عنوان سے ایک جگہ جمع کیں۔ اس میں نقشے، تصویریں اور ضمیمے شامل کرائے اور اسے بھی اسی کتب خانے میں جمع کروا دیا۔ ان میں سے ہر ایک کتاب کی دو جلدیں ہر سال [illegible] خرچے سے بغداد کے معیاری کاغذ پر چھپوائی جاتی تھیں۔ ہر شخص کو اجازت تھی کہ کتب خانے [illegible] ان کو نقل کرے۔ لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود ان کے ہم وطنوں کی

لاپرواہی کے باعث ان کی بہت سی کتابیں تلف ہوگئیں۔

رشیدالدین کو علم سے کتنا لگاؤ تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے نجی کتب خانے میں شعروشاعری، تاریخ اور سائنس پر ۶۰۰۰۰ جلدیں تھیں، جن میں ممتاز خوش نویسوں کے مصحف رسم الخط میں لکھے ہوئے قرآن کے سولہ نسخے بھی شامل تھے۔ اس سے اس بات کی تشریح ہو جاتی ہے کہ انھیں اپنی قاموسی تحریروں کو محفوظ رکھنے کے واسطے لیے جانے والے اقدامات کے بارے میں کتنی تشویش رہتی تھی۔

حالانکہ رشیدالدین نے انواع واقسام کے مضامین لکھے، لیکن جامع التواریخ ان کی شہرت کا مینارہ ثابت ہوئی۔ اس کا پہلا حصہ ترکوں اور منگولوں کی تاریخ پر مشتمل ہے، اور اس میں چنگیز خاں سے لے کر غازان خان تک کے واقعات کا بڑا تفصیلی بیان ہے۔ اس کے دوسرے حصے میں حضرت آدم سے حضرت محمدؐ تک کا سلسلہ نسب ہے، اسلام کی آمد سے پہلے ایران کی کہانی ہے، ہلاکو کے حملے کے وقت تک خلافت کے وقائع ہیں، اس کے بعد کی فارس حکومتوں کا روزنامچہ اور یہودیوں، فرنگیوں، چین اور ہندوستان کی تاریخ ہے، ساتھ میں شاکیہ منی، بدھ اور ان کے مذہب کے بارے میں ایک طویل بیان ہے۔ منگولوں کی تاریخ لکھتے وقت انھوں نے اس معلومات سے فائدہ اٹھایا جو غازان خاں اور پلاد چنگ چانگ کے ذریعے حاصل ہوئی تھی۔ چین کے بارے میں انھیں دو چینی عالموں لی تا-جی اور ماک یسن سے معلومات حاصل ہوئی تھی۔ فرنگیوں کے بارے میں انھیں بہت کچھ آئیولس سے حاصل ہوئی تھی، جو پیسا کا ایک تاجر تھا، اور ہندوستان کے بارے میں جو تحریر کیا ہے اس میں کمالا شری نے ان کی مدد کی تھی، جو کشمیر کا ایک بدھ عالم تھا۔ اسی لیے یہ کتاب انسانی تاریخ کے بین الاقوامی احساس کا پہلا اظہار سمجھی جاتی ہے۔ اس کے بارے میں رشیدالدین یوں اظہار رائے کرتے ہیں:

"جب چنگیز خاں، اس کے عظیم الشان خاندان اور اس کی عظیم نسلوں نے ساری

"دنیا کی بادشاہت حاصل کی تو دُنیا کے سارے ممالک، چین اور ماچین (جنوبی چین)، ختائی (شمالی چین)، ہند اور سندھ، مُغلستان، ترکستان، شام (مسولو نامسہ)، روم، آس (آلائن) روس، سرکاس، کیچاک، کالار، لسکر، ایک لفظ میں یوں کہنا چاہیے کہ چار دانگ عالم کے سارے ممالک اس کے زیرنگیں ہوگئے۔ چنگیز خاں نے دُنیا کو ایک شکل دے دی اور سارے لوگوں کے دِلوں میں مساوات کا احساس پیدا کر دیا۔ اب جب کہ ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ساری دُنیا چنگیز خانیوں کی کسی نہ کسی شاخ کے تحت ہے، ہر مذہب و ملّت (ارباب والملل) سے تعلق رکھنے والے فلسفی، نجومی، علما اور مورّخین (حکما ومنجمین و ارباب دانش و اصحابِ تواریخ) جن کا تعلق ختائی، قدیم ہندوستان، کشمیر، تبت، اوئی غور سے ہے، اور دوسرے لوگ جیسے ترک، عرب، فرینک، بڑی تعداد میں ہماری نظروں کے سامنے ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کی ایسی ایسی کتابیں ہیں جن میں ان کے ملکوں کی تاریخ، تاریخ وار سلسلۂ واقعات اور مذہبی خیالات لکھے ہوئے ہیں، اور یہ لوگ خود بھی ان مضامین سے واقف ہیں۔"

جامع التواریخ مغول دَور کے اسی بین الاقوامی ماحول اور وسیع المشرب نظریے کی تجسیم اور اظہار ہے۔ اس مقالے میں ہمارا مقصد کتاب کے اس حصّے پر مختصراً بحث کرنا ہے جو ہند و سندھ کے بارے میں دیا گیا ہے۔ اس حصّے کے دو جُز ہیں (قسم ہیں) جو بالترتیب دس اور بیس ابواب (فصل) پر مشتمل ہیں۔ دوسرے جُز (قسم) کا ضمیمہ ایک رسالہ ہے جو لورا کا پورا آواگون اور تناسخ الارواح (تناسخ، نسخ) کے عقیدے کی تردید میں ہے۔ پہلے جُز کے پہلے چار باب البیرونی کی کتاب الہند پر مبنی ہیں اور ہندوستان کے بارے میں عام معلومات دیتے ہیں۔ پانچویں باب کا تعلق ... سے ہے، میں سلاطین دہلی (در تاریخ سلاطینِ دہلی) کا روزنامچہ ہے، البیرونی اور جرجانی

سے اخذ کیا گیا ہے اور یہاں رشید الدین نے خود بھی کچھ رائے زنی کی ہے۔ چھٹا باب کشمیر کے بارے میں ہے
جس میں کشمیر کی تاریخ، خصوصاً منگول دَور کی تاریخ کے بارے میں بالکل نئی معلومات دی گئی ہے۔
ابواب سات تا دس میں چار زمانوں یا یگوں کا اور ان بادشاہوں کا ذکر ہے جنھوں نے اس
دَوران میں حکومت کی ہے۔ یہ ابواب رشید الدین کی اپنی تخلیق ہیں۔ دوسرے جُز کے بیس
ابواب میں گوتم بدھ کی زندگی اور تعلیمات کا ذکر ہے۔ فارسی زبان میں بدھ دھرم پر یہ ایک بے مثل
کام ہے۔

ہندوستانی تاریخ کے بارے میں ہمیں رشید الدین سے جو نئی معلومات حاصل ہوئی ہے
اس کی ایک خصوصیت یہ بیان کی جا سکتی ہے کہ انھوں نے ہندوستان کو بدھوں کی عینک
سے دیکھا ہے، بالکل اس طرح جیسے البیرونی نے ہندوستان کو کٹر ہندوؤں کے نقطۂ نظر سے
دیکھا ہے۔ ترتیا زمانے کے راجہ ہرش چندر کے بیان کے سلسلے میں یہ کہا گیا ہے کہ اس کی بیوی اور بیٹا
"تناسخ الارواح کی اسی منزل پر ہیں جس پر شاکیہ منی تھے۔" یہ اکسواکو خاندان کے راجاؤں کا دَورِ
حکومت تھا۔ ترتیا زمانے کی خصوصیت دلیپ اور اس کے بیٹے رگھو کے دَورِ حکومت ہیں۔ آخر الذکر
کے ایک بیٹی سُدروتی تھی جس کی شادی باپ کی لاعلمی میں ہرہما کے بیٹے وِدالک یا دلک (۹) سے
ہوئی تھی، اور اس سے ایک بیٹا پیدا ہوا تھا۔ اس بیٹے نے جب راج گدی کا دعوا کیا تو رگھو نے اسے
نرک کا سراپ دے دیا۔ اس نے نرک کے باسیوں کی خدمت کی اور بدھ استوا اور لوکتیشور
(امیتا بر غان) کے رُتبے پر پہنچا۔ یہ کہانی ہندوستانی دیو کہانیوں سے میل نہیں کھاتی اور شاید
کسی بدھ ماخذ سے لی گئی ہے۔ اس کے بعد رامائن کی کہانی اختصار کے ساتھ دی گئی ہے۔ دواپر۔
یگ کا حال کرت ویراور، پرشورام کی لڑائی کی کہانی سے شروع ہوتا ہے اور کورو پانڈو سے
زمانے کے واقعات بیان کرتے ہوئے مہابھارت کی جنگ پر پہنچ جاتا ہے۔ کالی یگ کی تاریخ بُدھ
ہشتری سورگ یاترا اور ان کی حکومت اولادوں میں بٹ جانے سے شروع ہوتی ہے۔ [illegible]
میں ملک شاکیہ تھے جنھوں نے کپل وستو کا شہر بسایا اور جن سے بدھ مودھ [illegible]

پیدا ہوئے۔ یہاں بھی کورو پانڈو کے خاندان کو گوتم بدھ کے خاندان سے ملانے کی جو کوشش کی گئی ہے اس سے رشید الدین کے بدھ نظریے کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے بعد مگدھ کے موریوں اور نندوں کی تاریخ آتی ہے۔ اس میں مصنف چندر گپت کو سابق نندا خاندان کا رکن بتاتا ہے۔ وہ اس کے بارے میں ایسی معلومات دیتا ہے جو کسی اور مآخذ سے نہیں ملتی، یعنی یہ کہ اس کے منتریوں نے اس کی رانی کو قتل کر دیا کیونکہ اپنی بڑھی ہوئی محبت کے باعث چندر گپت ریاست کے معاملات کو نظر انداز کرنے لگا تھا۔ چندر گپت کے جانشین بندوسار کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ اس کے برہمن رانی سے دو بیٹے تھے، ایک اشوک اور دوسرا وگت اشوک۔ راجہ بڑے بیٹے کو جانشین بنانا چاہتا تھا، لیکن منتریوں نے اس وقت تک کے لیے چھوٹے کو راجہ بنا دیا جب تک دوسرے بیٹے محاذ جنگ سے واپس نہ آجائیں۔ لیکن اس عرصے میں اس نے اتنی اچھی طرح چلایا کہ دوسرے بیٹے مادہ پر گئے۔ اس لیے حکومت اسی کے ہاتھوں میں رہی اور اس کا چھوٹا بھائی وگت اشوک برہمن بن گیا۔ پھر رشید الدین اشوک کے بعد کے چھ سو برسوں کا عرصہ چھوڑ جاتے ہیں اور کشمیر کے شری ہرش دیو کے زمانے میں جا پہنچتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی بیویوں میں سے ایک بیوی اس کے دربار کے ایک شاعر کو بہت پسند تھی۔ شری ہرش دیو نے وہ عورت اُسے دے دی اور دونوں کو سزا کے طور پر ترکستان چلے جانے کا حکم دیا۔ منگول انہی کی اولاد ہیں۔ منگولوں کا تعلق ہندوستان سے پیدا کرنے کی یہ ایک عجیب و غریب ترکیب ہے۔ غالباً یہ ان کشمیری بدھوں کے دماغ کی ایک انوکھی اختراع تھی جنھوں نے اپنے منگول آقاؤں کی عنایتیں حاصل کرنے کے لیے ان کے آباؤ اجداد کے ہندوستانی ہونے کے بارے میں یہ کہانی گڑھ لی تھی۔ منگولوں یا تاتاریوں نے اس زمانے میں کشمیر پر حملہ کیا جب ہندوستان پر وکرمادتیہ حکومت کرتا تھا۔ اس نے انھیں شکست دی۔ اس جگہ واضح طور پر گپتا خاندان کے چندر گپت وکرمادتیہ اور شاکا حملہ آوروں کی اس جنگ کا حوالہ دیا گیا ہے جو وشاکھ دت کی دیوی چندر گپت میں بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد رشید الدین کشمیر کے للتادتیہ کا حوالہ دیتے ہیں اور اسے سکندر کہتے ہیں۔ یہاں بھی ہمیں ہندوستانی فاتحوں

کو مغربی فاتحوں کے متوازی لانے کا رُجحان نظر آتا ہے۔ رشید الدین کی کتاب کا سب سے زیادہ قابلِ ذکر حصہ وہ ہے جس میں وہ منگول حملے اور کشمیر کی فتح کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ مکمل سنہری کی سند پر ہمیں بتلاتے ہیں کہ کشمیر کے راجہ رام دیو کے دَورِ حکومت میں اوگودے خاں کے حکم پر ایک بہت بڑی منگول فوج نے، جس کی سربراہی اُوکُو تونویون کر رہا تھا، کشمیر پر حملہ کیا۔ فوج نے راجدھانی کا محاصرہ کر لیا اور پھر فتح کر لیا۔ رام دیو ایک کالے خچّر پر سوار ہو کر منگولوں سے بھاگا، اور پھر گھوڑے پر سوار ہو کر چوڑی کالی ندی کو ایک دلیرانہ چھلانگ لگا کر پار کیا، اور اس طرح تعاقب کرنے والوں سے اپنی جان بچائی۔ یہ ندی غالباً کتسپتک تھی جو جہیلم کی ایک معاون ندی ہے۔ اس کے بعد منگولوں نے مسلسل چھ مہینے تک شہر کو لوٹا، اور بعد میں ایک گورنر مقرّر کر کے واپس چلے گئے۔ سات سال کے بعد رام دیو اس گورنر کو نکالنے اور اپنی حکومت دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ منگو خاں کے زمانے میں سالی نویون اور تاکودر کے تحت ایک اور منگول فوج نے کشمیر پر حملہ کیا، اس کے شہروں کو لوٹا، لوگوں کو مارا اور قیدی بنایا۔ رام دیو مر گیا اور اس کے بیٹے لکشمن دیو (1273 - 1286) نے منگولوں کی سرپرستی قبول کر لی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بیٹے سمہا دیو (1286 - 1301) اور اس کے بعد سہا دیو (1301 - 1320) کے زمانے میں کشمیر نے برائے نام منگولوں کی ماتحتی قبول کر لی تھی۔ اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے کارل جہن اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ رشید الدین کے بیان میں رام دیو دراصل دو راجاؤں کے لیے استعمال ہوتا ہے، جن کو راج دیو کہا جاتا تھا، اور جنھوں نے بالترتیب 1212 سے 1235 تک اور 1252 سے 1273 تک راج کیا تھا۔ پہلے راج دیو کے دَورِ حکومت میں کشمیر پر منگولوں کا پہلا حملہ ہوا تھا۔ ان کے کہنے کے مطابق منگولوں کو نکالنے کا سہرا دراصل راج دیو کے جانشین سنگرام دیو (1235 — 1252) کے سر بندھنا چاہیے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ لکشمن دیو (1273 — 1286) کی مسند نشینی کی اجازت قبلائی خاں (1259 — 1294) اور اباقہ خاں (1265 — 1282) نے دی تھی نہ کہ منگو خاں اور ہلاکو خاں نے۔ بہت ممکن ہے کہ

لکشمن دیو کا کوئی مورت ہو جس کو منگولوں سے مسند شمسی کی امارت ملی ہو، اور اس کے جانشینوں نے ان سے اس کی تجدید کرائی ہو۔ بہر حال رشید الدین نے یہ بات صاف طور سے لکھی ہے کہ تیرھویں صدی میں کشمیر ایران کے منگول ایل خانوں کی ماتحتی میں آ گیا تھا۔

رشید الدین کی تاریخ ہندوستان کے دوسرے حصہ میں، جو بیس ابواب پر مشتمل ہے، گوتم بدھ کی زندگی اور تعلیمات کا ذکر ہے۔ یہ بڑی جانی بوجھی بات ہے کہ تیرھویں صدی میں بدھ دھرم منگولوں میں بہت مقبول تھا۔ ینان اور جنوبی چین کے خلاف اپنی مہم شروع کرنے سے پہلے منگو خان نے قراقرم میں ساگا مونی برکان کے نام پر، جو ساکیہ منی بدھ کا منگول نام ہے، ایک عظیم الشان استوپ بنوایا تھا کہ اسے اپنی مہم میں کامیابی ہو۔ ہلاکو، جو بدھ استو پہتری کا فاتح تھا، ارغون (1291 - 1284) اور غازان (1304 - 1295) ــــــ آخر الذکر اسلام قبول کرنے سے پہلے ــــــ اس عقیدے کے پُر جوش حامی اور ماننے والے تھے۔ اس دور میں ایران بدھ یادگاروں سے اور بہت بڑی تعداد میں بدھ راہبوں سے، جنھیں بھکشی کہا گیا ہے، بھرا ہوا تھا۔ فارسی مورخ علا الدین عطا ملک جوینی نے بدھوں کے بارے میں لفظ توئن استعمال کیا ہے، جو چینی لفظ تاؤ۔جین سے اخذ کیا گیا ہے، اور اپنی تاریخ جہاں کشائے (144 ۱) میں ان کے مذہب کی یوں تعریف کی ہے کہ یہ مذہب نیک زندگی کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس میں بہت سے اچھے احکامات اور تعلیمات ہیں جو سارے پیغمبروں کے نظریوں اور عقیدوں سے میل کھاتی ہیں۔ ان میں سے بہت سی تعلیمات انسان کو گناہ اور برائیوں سے گریز کرنے اور دوسروں پر ظلم نہ کرنے کی تلقین کرتی ہیں، اور اسے ہدایت کرتی ہیں کہ وہ برائی کا بدلہ اچھائی سے دے، اور دوسرے جانداروں کے تئیں ظالمانہ رویہ نہ اپنائے۔ ایران میں بدھوں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1295 میں غازان کے قبول اسلام کے بعد دوسرے مذاہب کے لوگوں پر جو جبر کیا گیا اس کے باوجود انھوں نے 10 - 1309 میں یہ کوشش کی کہ الجائتو ان کا مسلک اختیار کر لے۔ بہر کیف، چودھویں صدی کے پہلے نصف میں بدھ دھرم اسلام

کے اثر سے مغلوب ہو گیا تھا۔

عالم منگول میں بدھ دھرم کی اشاعت کرنے میں کشمیر کے راہبوں نے بڑا اہم رول ادا کیا۔ دو کشمیری راہبوں نے، جن کے نام چینی ترجموں میں وتوچی اور ناموددیے ہوئے ہیں، منگولوں کو لاما دھرم سے متعارف کرایا۔ مارکو پولو کا کہنا ہے کہ وہ بدھ لوگ جن کی قیادت کشمیر کے راہب کر رہے تھے اپنے تقدس اور دانائی کے لیے مشہور تھے۔ انہی راہبوں میں کمل شری تھا جس نے رشیدالدین کے ساتھ مل کر ہندوستان کی تاریخ اور بدھ دھرم پران کے رسالے کی تالیف کی۔ کمل شری اور اس کے ہم چشموں کے کام ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ ایران کا بدھ دھرم تبت کے مقابلے میں کشمیر سے زیادہ قریب رہا۔ اس لحاظ سے وہ مشرقی منگولوں کے بدھ دھرم سے مختلف تھا، جنھوں نے زیادہ تر تبت کے لاما دھرم سے فیض حاصل کیا تھا۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رشیدالدین نے کمل شری کے ایما پر بدھ دھرم کا اتنا تفصیل سے کیوں اور کیسے ذکر کیا۔ اس کا جواب تیرھویں صدی کی آخری دھائی اور چودھویں صدی کی پہلی دو دہائیوں میں ایران کے مذہبی بحران میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ 1295 میں غازان کے قبولِ اسلام کے بعد محض سیاسی وجوہات کی بنا پر بدھوں کو جبر کا سامنا کرنا پڑا، اوران کی بہت سی یادگاریں تباہ کر دی گئیں۔ اسی لیے، اس سماج میں اپنی حیثیت برقرار رکھنے کے واسطے بدھ دھرم کے پیرو مسلمانوں کے سامنے اپنے دھرم کی تشریح کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اور اسلام اور بدھ کی مشترکہ باتوں پر زور دے رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ رشیدالدین کے رسالے میں بدھ اصطلاحات اسلامی اصطلاحات میں بدل کر پیش کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر، بدھوں کو پیغمبر کہا گیا ہے، دیوتاؤں کے حوالے اس طرح دیے گئے ہیں جیسے فرشتوں کے، شموتوں کو خبیث کہا گیا ہے، اور مار کا ذکر ابلیس کے نام سے کیا گیا ہے۔ اس میں دوسرے پیغمبروں کے مقابلے میں، جو غرور، انانیت اور خود غرضی کے لیے مشہور ہیں، بدھ شاکیہ منی کو اخلاص اور مہربانی کے پیغمبر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اشاعتِ اسلام

سے پہلے مکّہ اور مدینے کے لوگ بُدھ تھے' اور کعبے میں ایسی مورتیوں کی پوجا کرتے تھے جو بُدھ سے ملتی جلتی تھیں۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ترکستان کے لوگ پہلے پہل بُدھ تھے اور یہ کہ ان کے قبولِ اسلام کے بعد بھی اس ملک میں بُدھوں کے بہت سے مندر موجود ہیں ۔ اس کے مطابق بُدھ دھرم حبشہ کے اندرونی علاقوں اور کچھ دیگر ممالک میں پھیلا ہوا تھا ۔ اس میں یہ بات صاف طور سے دی ہوئی ہے کہ مانری کے لوگ ہنایان کے ماننے والے تھے' جب کہ تبت اور منگوت مہایان سے وابستہ تھے۔ بُدھ کی زندگی' جو باب چہارم سے شروع ہوتی ہے' کم و بیش اسی کہانی جیسی ہے جو مہایان حلقوں میں عام ہے' فرق صرف اتنا ہے کہ کہیں کہیں اسلامی خیالات نظر آتے ہیں جیسے مُریدوں اور پیروں' مدرسوں اور خانقاہوں' بہشت اور حُوروں اور معبود کے رسولِ وحی والے کردار' اور ایسی ہی دوسری باتوں کے حوالے دیتے وقت۔ اس کے ضمیمے میں کتابوں کی جو فہرست دی گئی ہے اس میں اس طرح کے حوالے ہیں کہ بُدھ خالقِ باری' اللہ تعالیٰ کے حکم سے کام کر رہے تھے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ یوں لکھا ہوا ہے: "شاکیہ منی نے کہا کہ اللہ کے حکم سے' جو سب سے افضل ہے' اور جس کی گواہی فرشتے دیتے ہیں' میں عارفِ کل اور صاحبِ کرامات ہوں اور سارے جبلتوں پر حکومت کرتا ہوں۔" ایک اور رسالے میں بتایا جاتا ہے کہ: "شاکیہ منی کہتے ہیں کہ خالقِ افضل نے مندر بنانے اور شاکیہ منی کی مورتیاں ان میں رکھنے کا حکم دیا۔" ایسی تقریریں ان پیغمبروں کی یاد دلاتی ہیں جو خالقِ اعلا اللہ تعالیٰ کے حکم سے کام کرتے تھے۔ اس لیے مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بُدھ دھرم پہ رشید الدین کا رسالہ ان بُدھ راہبوں کے رُجحانات کی عکاسی کرتا ہے جن کی قیادت کمل شری جیسے لوگ کر رہے تھے۔ یہ راہب چاہتے تھے کہ مہایان قسم کے بُدھ دھرم کے خاص خاص اصولوں میں اسلامی تصوّرات کی آمیزش کر کے پیش کریں' جس میں تاترک خیالات کی خفیف سی جھلک بھی نہ ہو' کیونکہ ایسے خیالات مسلم عوام کے لیے فطری طور پر مکروہ تھے۔ ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ کمل شری کا منصوبہ یہ تھا کہ رشید الدین کے ذریعے بُدھ دھرم پر ایک ایسا رسالہ نکالا جائے جو عوام اور ایک ایسے دربار پر اثر ڈال سکے جس نے حال ہی میں اسلام قبول کیا تھا۔ منصوبہ واقعات

کی اس زنجیر میں ایک کڑی کی حیثیت رکھتا ہے جس کی انتہا ۱۰-1309 میں الجا ئتو کو بدھ دھرم میں واپس لینے کی کوشش تھی۔

رشید الدین کی جامع التواریخ میں ہندوستان پر جو جز ہے اس کے مضامین کا خلاصہ دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ہندوستانی تاریخ اور ہندوستانی مذہب اور تہذیب کے مسلم ادراک کی بعض تفصیلات کے لیے یہ کتنی اہم کتاب ہے۔ وہ تمام معلومات جو اس میں فراہم کی گئی ہے اس لائق ہے کہ اس کا ان تمام سوتوں اور شہادتوں کے ساتھ بغور مطالعہ کیا جائے جو ہمارے پاس موجود ہیں۔ مثال کے لیے میں یہاں ایک ایسی عبارت کا مطالعہ تحریر کرتا ہوں جس کا تعلق مسلم حکومت کے قیام کے بعد کی ہندوستانی تاریخ سے ہے۔ یہ معلومات بڑی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ یہ تقریباً عصری مآخدوں پر مبنی ہے۔ میرا یہ بیان ایک مسودے پر مبنی ہے جو رام پور کی رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس مسودے میں سے مناسب اقتباسات جناب امتیاز علی عرشی لائبریرین نے میرے لیے نقل کیے ہیں۔ میں ان کا بیحد ممنون ہوں۔

یہ اقتباسات (فن تاریخ فارسی نمبر 186، نمبر اکائی 121) شہاب الدین غوری سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ ایک جنگ سے شروع ہوتے ہیں جو اس کے اور ایک ہندوستانی راجہ کے درمیان ہوئی، اور جس میں آخر الذکر مارا گیا۔ بتایا گیا ہے کہ اس جنگ میں ہندوستانی راجہ کے ساتھ سات سو ہاتھی اور "الف ہزار آدمی" تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہاں تراوڑی کی اس لڑائی کا حوالہ دیا گیا ہے جو شہاب الدین اور پرتھوی راج چوہان کے درمیان ہوئی۔ یہ لکھا گیا ہے کہ لڑائی کے خاتمے قریب شہاب الدین نے پرتھوی راج کو قیدی بنا لیا اور یہ سوچا کہ اسے دوبارہ اجمیر کے تخت پر بٹھا دے۔ پرتھوی راج رسو کے مطابق اسے غزنہ لے جایا گیا، اور بعض مسلم مصنفین، جیسے حسن نظامی، کا خیال ہے کہ اسے اجمیر لے جایا گیا۔ ایک سکے کی بنیاد پر، جس پر شہاب الدین غوری اور پرتھوی راج کو تابعدار سردار کی حیثیت سے دوبارہ تخت نشین کرادے (D Sharma,

(Early Chauhan Dynasties, p 87, D C Ganguly, the Struggle for Empire, p. 112

لیکن مہناج السراج قطعی طور پر کہتا ہے کہ "تھوڑا اپنے ہاتھی سے اُترا، ایک گھوڑے پر سوار ہوا اور سر پٹ دوڑا دیا، لیکن سرسوتی (سرسی) کے قریب پکڑا گیا اور جہنم رسید کر دیا گیا۔"
(Tabaqat-i-Nasiri, Elliot and Dowson, History of India II, p. 297)
یہ مصنف واقعات کے اسی بیان کی تائید کرتا ہے۔
اسی مسودے کی جلد اوّل کی اکائی نمبر 165 تا 167 میں شہاب الدین کے آخری ایام اور وفات کے بعد کے واقعات کا ذکر ہے۔ جب خار اختائی (قراختائی) کی فوج نے، جو سلطان محمد خوارزم شاہ کی مدد کے لیے آئی تھی، شہاب الدین کو شکست دی اور مار بھگایا، تو یہ افواہ اُڑ گئی کہ وہ مارا گیا۔ چنانچہ ہندوستانی قبیلوں اور سرداروں نے، جنھیں شہاب الدین نے محکوم سا لیا تھا، یہ سوچا کہ اس کا جوا اتار پھینکنے کے لیے یہ موقع غنیمت ہے۔ دیبل کے بیٹے نے جو کوہ جود پر حکمراں تھا اور مسلمان ہو چکا تھا، اپنے آباد کا مذہب دوبارہ اختیار کر لیا۔ خصوصاً کھوکروں نے جو اسے خراج دیا کرتے تھے، بغاوت کر دی اور لوٹ مار شروع کر دی۔ ایک شخص اِلک مل نے مُلتان پر قبضہ کر لیا۔ شہاب الدین نے مُلتان کی صورتِ حال کو اوّلیت دی، اور باغی کو پکڑوا کر قتل کرا دیا اور محمد بن ابو علی کو مُلتان اور لاہور (لاہاوار) کا صوبے دار مقرر کر دیا، اور اسے یہ اختیار دیا کہ خراج کی رقم اکٹھی کر کے بھجوائے جو دو سال سے بقایا تھی۔ لیکن نیا صوبے دار کھوکروں کے خطرے پر قابو پانے میں ناکام رہا، اور یہ اطلاع بھجوائی کہ راستے پر ان کے خطرے کی وجہ سے خراج بھیجنا ممکن نہیں۔ اس پر شہاب الدین نے قطب الدین ایبک کو، جو ہندوستان میں اس کی فوجوں کا سپہ سالار تھا، کھوکروں سے نمٹنے کا حکم دیا، لیکن اس کی دھمکیوں اور وعدوں سے بھی کچھ زیادہ فائدہ نہ ہوا۔ ہندوستان میں چاروں طرف شورش اور ہنگامے بپا تھے۔ چنانچہ شہاب الدین کو اپنی وہ مہم جو ختائی کے خلاف ہونی تھی ملتوی کرنی پڑی، اور وہ پانچ ربیع الاوّل 602ھ کو ہندوستان میں داخل ہو گیا۔ تیز رفتاری سے بڑھتے ہوئے 25 ربیع الآخر کو ایک سخت مقابلے کے بعد اس نے کھوکروں کو مغلوب کر لیا۔ دوسری نماز کے وقت تک قطب الدین بھی اپنی فوج کے ساتھ پہنچ گیا اور کھوکروں پر ٹوٹ پڑا۔ وہ لڑتے ہوئے میں گھر کر کھوکر ہار گئے۔ اس کے بعد بڑے پیمانے پر ان کا قتلِ عام ہوا۔ بچے کھچے

کھوکر ایک اُونچی پہاڑی کی طرف بھاگے اور آس پاس میں آگ لگادی۔ لیکن جب مسلمان ان کے قریب پہنچے تو انھوں نے ہتھیار ڈالنے یا دُشمن کے ہاتھوں مارے جانے پر خودکشی کو ترجیح دی، اور سارے کے سارے زندہ جل جانے کے لیے آگ میں کُود پڑے۔ یہ الوکی معلومات اس کے خلاف ہے جس کے مطابق مسلمانوں نے کھوکروں کی پناہ گاہ میں آگ لگادی اور انھیں زندہ جلا دیا۔

جواں مردی کے ساتھ قربانی دینے کی یہ ایک اعلا مثال ہے۔ یہ ایک قسم کا اجتماعی جوہر تھا، جو مردوں نے اپنی عزت بچانے کے لیے انجام دیا۔ اس طرح کی مثال کسی اور جگہ مشکل ہی سے ملے گی۔ لیکن شہاب الدین کی زندگی کے دن بھی تھوڑے ہی رہ گئے تھے۔ لاہور میں مختصر قیام کے بعد جب وہ گھر کی طرف روانہ ہوا اور دریائے سندھ کے کنارے دامل کے گاؤں میں خیمہ زن ہوا، تو دو یا تین ہندو، جو کھوکروں کی شکست اور قتلِ عام سے جھلائے ہوئے تھے، دریا میں چھپی ہوئی کسی جگہ سے نمودار ہوئے اور اس کے جسم پر خنجر سے اندھا دُھند میں زخم لگائے۔ وزیر معید الملک اور امراء اور رُوسا نے اس کے زخم سیے اور یہ بہانا کر کے کہ وہ بیمار ہے اسے غزنہ لے گئے۔ لیکن جونہی لوگوں کو اس کی موت کا حال معلوم ہوا چاروں طرف مخالفتیں پھوٹ پڑیں۔

شہاب الدین کی موت کے بارے میں جیسے ہی علم ہوا، کچھ فقیہوں نے یہ افواہ اُڑا دی کہ استاد السر فخر الدین ر۔ ری خوارزم شاہ کے بڑے گہرے دوست ہیں، اور اسی کے کہنے پر انھوں نے شہاب الدین کو مروا دیا۔ اس طوفان سے بچنے کے لیے مولانا نے وزیر کے ہاں پناہ لی، جو حقیقتِ حال سے واقف تھا، اور اسی وجہ سے اس نے انھیں ایک دُور دراز مقام پر بھیج کر اس شرارت سے بچالیا۔ اس زمانے میں غوری حکومت میں بھی دو گروہ بڑے نمایاں تھے ـــــ ایک وہ جو حاکم بامیان، بہاالدین کے موافق تھا، اور دوسرا وہ جو سلطان غیاث الدین کے بیٹے غیاث الدین محمود کا حامی تھا۔ بامیان کا بہاالدین شمس الدین محمد بن مسعود کا بیٹا تھا، اور اس بیوی سے تھا جو غوری سردار، سلطان غیاث الدین اور شہاب الدین کی بہن تھی۔ غوری اسے اچھی نظر سے

دیکھتے تھے، اور انھی کی مدد سے، اس نے اپنے ہم جدی بھائی عبّاس سے، جو اس کے باپ کی ایک ترک بیوی سے تھا، تخت چھینا تھا۔ چنانچہ شہاب الدّین کی موت کے بعد غوریوں نے اسے غزنہ آنے کی دعوت دی، لیکن غزنہ پہنچنے پر اسے دردِ سر کا ایک خوفناک دورہ پڑا جس کی بنا پر اسے لگا کہ اس کی موت قریب ہے۔ اس نے اپنے بیٹوں، علاالدّین اور جلال الدّین، کو بلایا اور انھیں نصیحت کی کہ وہ اس سمجھوتے کے ساتھ غیاث الدّین محمود سے صلح کر لیں کہ غزنہ اور ہندوستان ان کے پاس رہے گا، اور غور اور خراساں غیاث الدّین محمود کے پاس۔ اس نے علاالدّین کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ لیکن ہندوستان میں امیروں نے قطب الدّین کو تخت پر بٹھا دیا، جو شمسِ ہندوستان کے لقب سے پکارا گیا۔ اس نے سندھ، لاہور اور ملتان پر اپنا قبضہ مستحکم کر لیا۔ تاج الدّین یلدورنے زابلستان اور غزنہ پر قبضہ کر لیا۔ امیر محمود جو سلطان غیاث الدّین کا بیٹا تھا، ہرات اور فیروز کوہ پر قابض رہا، اور عزیز الدّین حسین خیرمال نے، جو ہرات کا حاکم تھا، خود کو سلطان محمد خوارزم شاہ سے وابستہ کر لیا۔ اس طرح، مخالفتوں کی وجہ سے غوری حکومت کا زوال ہو گیا، اور ان کے بجائے خوارزمیوں کی حکومت شروع ہو گئی۔ چونکہ خوارزم شاہوں کو منگولوں کا خطرہ ہر وقت رہتا تھا اس لیے وہ ہندوستان میں کوئی دلچسپی نہ لے سکے، اور ایبک کے جانشینوں نے ایک محفوظ حکومت کا لطف اٹھایا۔

غوریوں کے بارے میں اس تھوڑی سی معلومات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایشیا اور ہندوستان کی تاریخ کے لیے اس بیان کی کتنی اہمیت ہے۔

منتخب کتابیں

E Quantremere — Histoire des Mongols de la Perse par Rashid-al-Din.

F G. Brown — Literary History of Persia, Vol III

K Jahn — Histoire universelle de Rashid-al-Din Fadl Allah Abul Khair, I Histoire Des Francs

K Jahn — Rashid-al-Din's History of India, Collected Essays with Facsimiles and Indices.

T Olschki — Marco Polos Asia

B Spuler — Die Mongolen in Iran.

W Barthold — Turkestan down to the Mongol Invasion

P Ratchnevsky — 'Die mongolischen grosskhane und die buddhistische Kirche,' Asiatica (1956) p 491

Arnold. J. Toynbee — A Study of History, Vol X

امیر خسرو بحیثیت مؤرخ

سید حسن عسکری

فلسفی ہندوؤں کے برعکس، جنھوں نے اس دنیا کو سراب سمجھا اور اسی بنا پر تاریخ سے ایک قسم کی غفلت برتی، مسلمان شروع ہی سے قدیم چینیوں اور یونانیوں کی طرح، ماضی کا علم، اشخاص اور واقعات، حادثات اور سانحات کا حال، محفوظ رکھنے کی ایک شدید خواہش کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ تلاش و جستجو اور علم تاریخ کے ایک طبعی احساس کی بنا پر انھیں واقعاتِ انسانی کے دھارے میں دلچسپی، اور ماضی کو اندھیروں میں گم ہو جانے سے بچانے کی فکر پیدا ہو گئی تھی۔ انھوں نے ایسی کتابوں کی تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا جیسے سوانحیں، تاریخی حکایتیں اور ذاتی یا عوامی واقعات کے روزنامچے۔ اسی وجہ سے ہندوستان میں ابتدائی ترکوں کی سرپرستی میں تاریخ نگاری کو فروغ ہوا۔ دورِ وسطیٰ کے ابتدائی زمانے میں ہندوستان میں مختلف قسم کا تاریخی ادب پیدا ہوا۔ اس دور کی تاریخی تحریریں اسلوبِ بیان، صنفِ ادب، نظریہ، طریقہ تحریر اور مضمون کے لحاظ سے بڑی مختلف تھیں۔ منہاج سراج، حسن نظامی، فخر مدبر کے تحریری کام ایک دوسرے سے بڑے مختلف ہیں، اور برنی اور عفیف نیز دوسروں سے بھی بہت مختلف ہیں۔ لیکن یہ سارے لوگ پیشہ ور مؤرخ تھے، اور ان کو اسی حیثیت سے تاریخ کے جدید یورپی مصنفین نے تسلیم بھی کیا ہے۔ بعض مصنفین کے نزدیک امیر خسرو کا معاملہ ذرا مختلف ہے، (امیر خسرو پانچ دیوانوں کے علاوہ چار تاریخی مثنویوں جن کے بارے میں ہم بعد میں بات کریں گے)

اور ایسی روشوں کے خالق تھے جن کا مواد تاریخی ہی ہے حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں نظریہ تاریخ بحیثیت مجموعی اس سے بہت مختلف تھا جو آج ہے۔ دَورِ وسطیٰ میں تاریخ نگاری کی یہ پُرانی روایت کہ تاریخی دستاویزیں ایک خاص طرز میں لکھی جاتی تھیں جن میں خطابت اور شاعری بھی ہوتی تھی، جدید ذہن کو پسند نہیں آسکتی، کیونکہ مُبالغہ آمیز تاریخ کے پُرانے نمونوں سے اُسے کراہت ہوتی ہے اور انھیں پڑھنے میں سخت دُشواری پیش آتی ہے۔ یہ بڑی فطری بات ہے کہ تاریخ اور دوسرے مضامین کے بارے میں جدید مفکّروں کے نظریات بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ بدل جائیں، اور مورّخین کا تناظر وہی نہ رہے جیسا پہلے تھا۔

تاریخ کے معنی اب زیادہ جامع ہو گئے ہیں۔ کچھ لوگ اپنے بیانات کا محور کرتے ہیں، اور فتوحات کو ساتے ہیں، کچھ لوگ اقتصادی، سماجی، مذہبی اور تہذیبی عناصر کو اہم اور فیصلہ کُن سمجھتے ہیں۔ آج کل ہم لوگ اس طرح سوچتے ہیں کہ حقائق کی تفصیلات اور خشک انداز میں واقعات کے ان سلسلوں کا خالی خولی بیان، جو واقعات درحقیقت پیش آچکے ہیں، نہ ضروری ہے اور نہ ان تفصیلات سے تاریخ بنتی ہے۔ یہ بتانا زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ ان کی بنا پر ایسا کیوں ہوا۔ ایک مورّخ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اسباب و نتائج کی کھوج کرے گا، اور ان قوتوں کو تلاش کرنے میں کوشش کرے گا جنھوں نے واقعات کو ایک مخصوص شکل دینے میں مدد دی۔ تاریخ کی رُوح "تحقیقِ ماضی، پاسِ صداقت، معروضیت، واقعات اور تحریکات کے سبب و اثر کے رشتوں، صحت مواد و تنقیدی فیصلوں اور تاریخ کی ترجمانی کرتے وقت احساسِ معقولیت" میں ملتی ہے۔ مورّخ کا کام وکیل کی طرح کسی بڑے واقعے یا حقیقت کا بطلان یا اسے صحیح ثابت کرنا نہیں ہوتا، بلکہ مختلف النوع اور کثیر التعداد ماٰخذی اشیا کی چھان بین اور جانچ پڑتال کرنا ہوتا ہے، اور ایک جج یا جیوری کی حیثیت سے ان پر فیصلہ دینا ہوتا ہے۔ اس کو خاص فکر اس بات کی ہوتی ہے کہ ان ثبوتوں اور شہادتوں کی مدد سے پوری صورتِ حال کو سمجھے جو ثبوت و شہادت موجود ہوں اور لائقِ تصدیق ہوں۔ اسے

ساری ماخذی اشیا کو تلاش کرنا چاہیے اور پھر انھیں بیان کرنا چاہیے۔

مندرجہ بالا معیار سے موازنہ کرنے کے بعد کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ امیر خسرو نے تاریخ میں کچھ قابلِ قدر اضافے کیے؟ کیا ان کے بارے میں وہی کہا جا سکتا ہے جو ایلیٹ اور ڈاؤسن نے بیاکتی[2] کے بارے میں کہا ہے کہ وہ شاعر بھی تھا اور مورخ بھی؟ ایک جدید مورخ کی رائے تو یہ ہے کہ امیر خسرو نے تاریخ نہیں نظم لکھی۔ ایک مورخ کا کام یہ ہے کہ وہ ماضی کی از سرِ نو تعمیر کرے۔ وہ کہی ہوئی اور کی ہوئی باتوں کی تحقیق کرنا چاہتا ہے تاکہ حال کو سمجھ سکے اور مستقبل کے بارے میں پیشین گوئی کر سکے۔ لیکن امیر خسرو کے لیے ماضی میں سوائے اس صورت کے کوئی کشش نہ تھی جب حکمراں بادشاہوں کے احکام بجا لانے کی وجہ سے انھیں انعام و اکرام کی توقع ہوتی یا ایک غیر فانی شہرت کی خواہش ہوتی۔ ان کی ساری چھ تاریخی کتابیں بے ربط موضوعات سے بھری ہوئی ہیں، جن میں رنگین، خیالی اور طوالت آمیز اندازِ بیان، مبالغہ آمیز لہجے، فنی اور ادبی ترکیبوں، شاعرانہ تشبیہوں اور استعاروں اور مختلف اصنافِ سخن کے استعمال کی وجہ سے، تاریخوں کا تسلسل کم ہے، اور انھی چیزوں پر تاریخی اور جغرافیائی باریک بینی، درستی اور تسلسل قربان کر دیے گئے ہیں۔ امیر خسرو کی زندگی اور نشو و نما، ان کی شخصیت پر پڑنے والے اثرات اور ان اصولوں پر جنھوں نے ان کی علمی رہنمائی کی ہوگی، اگر جدید ذہن رکھنے والا کوئی شخص نظر ڈالے، تو اسے یقیناً طور پر بڑی ناامیدی ہوگی۔ انھوں نے خاصی لمبی عمر پائی۔ ان میں اپنے ماحول کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے کی بڑی صلاحیت موجود تھی۔ ان میں یہ پوشیدہ صلاحیت بھی خوب تھی کہ وہ گزری ہوئی نسلوں کے مجموعی تجربات استعمال کر سکتے تھے، اور انھیں اس صورت سے ادا کر سکتے تھے کہ وہ واقعی تاریخ کا نمونہ بن جائیں اور آنے والی نسلوں کے لیے معنی خیز اور فائدے مند ثابت ہوں لیکن انھوں نے یہ مواقع گنوا دیے۔ جیسا کہ شاید امیر خسرو نے سوچا ہو، تاریخ میں ایسے مفروضات یا قسمت کے ناقابلِ فہم و ادراک طور و طریق اور انسانی معاملات میں مقدس چیزوں کی جلوہ گری شامل نہیں ہوتی، نہ ایسے واقعات کا رسمی بیان شامل ہوتا ہے جس کا تعلق

بادشاہوں، درباریوں اور امیروں کے افعال سے ہو۔ صاحبِ اقتدار لوگوں کی مدح خوانی کی جاتی ہے، اور نہ ایسے لوگوں کو اچھے اور بُرے، مناسب اور غیر مناسب، مذہبی اور غیر مذہبی اعمال کی ذرہ برابر پرواہ کیے بغیر ہدفِ ملامت بنایا جاتا ہے جن کی زندگی میں ان کی بے جا تعریف کی گئی ہو۔ مورخ کا تعلق جتنا جماعتوں سے ہوتا ہے اتنا افراد سے نہیں ہوتا، جتنا انسان کے اپنے فیصلوں سے ہوتا ہے اتنا علمی اسباب و علت سے نہیں ہوتا، جتنا ماضی کے مطالعے سے ہوتا ہے اتنا کسی ایک شخص کی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات اور تبدیلیوں کے بیان اور ان کی جانچ پرکھ سے نہیں ہوتا۔

کوئی شخص مندرجہ بالا فقروں کی موزونیت سے خصوصاً اس صورت میں انکار نہیں کر سکتا جب وہ تیرھویں صدی کے مزاج اور اس زمانے کی صورت حال اور ماحول سے نگاہیں پھیرے جو امیر خسرو کی حیات کارنامہ ہے۔ ان کے کارناموں کا اندازہ ان کی نثر اور نظم کی بنیاد پر کیا گیا ہے، اور اس لحاظ سے انھیں بلاشبہ ایک باکمال ادیب اور فنکار کا نہایت اونچا مقام حاصل ہے جس اعلا مقام کے وہ یقیناً مستحق ہیں مگر بحیثیت تاریخ نگار ان کی لیاقت مشتبہ ہے۔ پھر بھی کیا یہ کہنا جائز ہوگا کہ ان کے تاریخی کاموں میں وہ کچھ نہیں ملتا جسے ایک جدید ذہن والا تاریخ کی تعریف اور تاریخ کے تصور سے وابستہ کر سکے۔ ہم ان پر یہ الزام رکھنے میں کہاں تک حق بجانب ہوں گے کہ وہ ایک وسیع تاریخی نظارے کی ضرورت محسوس کرنے میں ناکام رہے، ورنہ ان کا بیان مسلسل، معروضی، تنقیدی، تاریخ وار، حقیقی، درست حقائق پرمبنی اور اخلاقی اعتبار سے تعلیمی ہوتا؟ اور ان پر یہ الزام کس حد تک رکھا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کی رسموں، روایتوں، احساس فخر اور تعصبات سے اُوپر نہ اُٹھ سکے؟ کیا واقعی انھوں نے وہ موقع، جو انھیں ملا تھا، گنوا دیا؟ یہ درست ہے کہ التمش کے ایک لاچین ترک نسل کے درباری کے بیٹے، اور ماں کی طرف سے، بلبن کے دربار کے ایک ہندی النسل اعلا عہدے دار کے نواسے، ہونے کی بنا پر سیاسی حلقوں میں ان کے بڑے عمدہ تعلقات تھے۔

انھیں بہت سے اہم واقعات خود دیکھنے' اور ان صاحب علم اور قابلِ ذکر لوگوں سے جن سے ان کے تعلقات تھے نہایت اہم تاریخی معلومات حاصل کرنے کے بڑے موقعے حاصل تھے۔

لیکن انھیں تاریخ سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ مذہب' فن اور ادب کا شوق' حُسن کی تلاش اور اپنی مالی ضروریات جائز طور سے پوری کرنا ان کے مقاصدِ خاص تھے۔ اس بات کا پورا امکان تھا کہ اپنی پرورش اور سماج میں اپنے مقام کی بنا پر وہ اس زمانے کی سیاست میں ملوث ہوجاتے' لیکن نظام الدّین اولیا کے ایک مشہور شاگرد اور صوفی ہونے کے باعث وہ اس اعتبار سے دُنیا کے اندر بھی تھے اور باہر بھی کہ ہرچند انھیں روزی کمانے کے لیے ادبی کاروبار کا سہارا لینا پڑا لیکن میدانِ مذہب اور سیاست کے نشیب و فراز پیدا ہونے والی نزاعی صورتوں اور مسئلوں سے انھوں نے خود کو علاحدہ رکھا۔ وہ ذہین اور صاحبِ علم تھے اور ان میں یہ لیاقت تھی کہ تاریخی موضوعات پر تاریخ وار اور تنقیدی بحث کرسکیں' ماضی کا ایک مربوط اور باقاعدہ حال لکھ سکیں۔ لیکن امیر خسرو کی نظر میں تاریخ صرف عصری تاریخ تھی' اور ان پر ادبی کارنامے انجام دینے کا جو غلبہ طاری تھا وہ اس سے کبھی پیچھا نہ چھڑا سکے۔

(امیر خسرو نے کہیں بھی مورّخ ہونے کا دعوا نہیں کیا ہے' اور بڑی صاف گوئی سے ہمیں بتادیا ہے کہ اہم تاریخی موضوعات پر انھوں نے جو بے ترتیب تحقیقی کام کیے ہیں وہ یا تو حکمران بادشاہوں کے مشورے پر یا پھر ان کی نذر کرنے کے لیے کیے ہیں۔ ایسا کرنے کی کوئی اندرونی خواہش نہ تھی۔ تاریخ اس وقت تک نہیں لکھی جاسکتی جب تک ان بے شمار واقعات میں' جن سے مخزنِ معلومات مرتب ہوتا ہے' انتخابِ حقائق کے واسطے کوئی بنیاد تلاش نہیں کی جاتی۔ امیر خسرو کا انتخاب بڑا من مانا ہے' اور جن واقعات اور موضوعات پر انھوں نے بحث کی ہے ان میں پوشیدہ بنیاد ان کے انتخاب سے میل نہیں کھاتی۔ لیکن بیشتر معاملات میں ا

اصولِ انتخاب انھوں نے اپنی مرضی سے نہیں دوسروں کے کہنے سے بنایا ہے۔ وہ نہ صرف علاالدین کی بڑائی اور مدح خوانی کرتے ہیں، جو کئی اعتبار سے عظیم تھا، بلکہ نوح سپہر، اور اعجاز خسروی کے دیباچے میں بھی[5]، اس کے نکمے اور حقیر جانشین کی مبالغہ آمیز تعریف اور بڑائی کرتے ہیں۔ بڑے سے بڑے اور اچھے سے اچھے بادشاہ میں خوبیوں کے ساتھ خرابیاں موجود تھیں، لیکن امیر خسرو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھیں صرف خوبیوں سے سروکار تھا اور برائیوں کو نظرانداز کرتے تھے۔ اعجاز خسروی کی وزنی جلد[6] کے چند صفحات پر ایک سرسری نظر، اور ان کی رومانی مثنویوں ہشت بہشت[7] اور مطلع الانوار[8] میں عورتوں کی بابت ان کے مشاہدات، کسی بھی شخص کو اپنی یہ رائے بدل دینے کے لیے کافی ہوں گے۔

(بہت سے متعلقہ حقائق انھیں معلوم ہوں گے، لیکن اپنے حالات کی بنا پر ان حقائق کا دہرانا خود ان کے لیے پریشانی کا سبب بن سکتا تھا۔ خزائن الفتوح یا تاریخ علائی میں علاالدین کے ہاتھوں، 16 رمضان 695ھ کو، اپنے چچا اور خسر، جو ایک نرم و نیک طبیعت سلطان اور بانی خلجی حکومت تھا، کے ظالمانہ قتل کا ذکر کرنے کی وہ شاید ہمت نہ کر سکے۔ وہ اس تاریخ کا ذکر علاالدین کی تخت نشینی کی تاریخ کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنی غیر سرکاری کتاب اعجاز خسروی میں بھی وہ اپنے سرپرست سلطان کے نفرت انگیز کاموں کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ ہمیں اس نازک صورتِ حال کے بارے میں برنی سے معلوم ہوتا ہے جو قتلغ خواجہ اور ترغی کی قیادت میں آئے ہوئے منگولوں نے پیدا کر دی تھی، لیکن امیر خسرو اس ہولناک اور بے ایمان سلطان کی ان ہزیمتوں کے بارے میں کچھ نہیں لکھتے جو اسے اپنے داخلی اور خارجی دشمنوں کے ہاتھوں اٹھانی پڑتی تھیں۔ ان کے روحانی رہنما[10] اور کیقباد، مبارک خلجی اور غیاث الدین تغلق کے درمیان جو پریشان کن تعلقات رہے ان کا حوالہ قرآن السعدین، نوح سپہر اور تغلق نامہ کسی میں کہیں نہیں ملتا ہے۔)

(لیکن اپنے شاعر و مورخ کے کردار کو چیلنج کرنے اور ان کی علمی راستبازی پر شبہ کرنے

سے پہلے ہمیں ان دونوں کے ماحول کو نظر میں رکھنا چاہیے جب حکمراں جابر اور دخل در معقولات کے عادی ہوتے تھے اور قابلِ گرفت باتوں کو راز رکھنا ضروری تھا۔ وقت کے مضحکہ خیز رواجوں کے مطابق اس بات کی اجازت تھی کہ استعمال انگیز تفصیلات کے بعض حصوں کو چھوڑ دیا جائے، بڑے رنگین انداز میں طول نویسی کی جائے، حقائق کو ادب کی چاشنی کے ساتھ پیش کیا جائے اور اعلا عہدیداروں کے کردار اور سیرت کے بارے میں لکھا جائے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حقائق کو جان بوجھ کر چھپانے کا رجحان عام تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض جگہ جہاں امیر خسرو نے بظاہر بڑھ چڑھ کر ڈراما نگاری کی ہے، یا ضرورت سے زیادہ سہل نگاری اختیار کی ہے، یا واقعات کو بیان میں شامل نہیں کیا ہے اور ان کی درمیانی کڑیاں نہیں ملائی ہیں وہاں ان سب باتوں کا اصل معنی پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا ہے، کیونکہ ان کی مرصع اور مزین عبارت کے باوجود عام طور سے دُرست تاریخی حالات سامنے آتے ہیں، جن میں ایسے حقائق بھی شامل ہوتے ہیں جن پر دوسروں کی نظر نہ پڑ سکی۔ امیر خسرو ایک ایسے مذہبی آدمی تھے جن میں احساسِ وقار اور احساسِ ذمہ داری خوب تھا۔ ہم ان کے اندر ایسے مورخ کو شاید اس لیے معاف نہ کر سکیں کہ اس نے وہ سارے حقائق بیان نہیں کیے جو اسے معلوم تھے، لیکن ان کی مشکلات اور محدودات نظر میں رکھی جائیں تو ان پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ انھوں نے حقائق جان بوجھ کر مسخ کیے۔ اس کے برعکس ہمارے پاس ایسے ثبوت موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک کھلے ہوئے غیر جانبدار ذہن کے مالک تھے، بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ وہ بڑے عالی ظرف تھے۔ ان مرتدوں، قاتلوں اور علائی خاندان کے بیخ کنوں کے بارے میں لکھتے وقت، جن کو اس زمانے کے مسلمان اپنا بدترین دشمن خیال کرتے تھے، وہ ایک تازگی بخش اور معروضی رویے کا کھلا ہوا ثبوت دیتے ہیں۔

جن لوگوں نے برنی کے ان صفحات کا مطالعہ کیا ہے جو خسرو خاں اور اس کے شریکِ جرم لوگوں کے بیدردانہ افعال کے بارے میں لکھے گئے ہیں، وہ ان لوگوں کے بارے میں، جن کو

اس نے ملعون، بے خانماں، غلیظ، بدکاری اور مردار خور لکھا ہے۔ اس کے بعد ان ملعونوں اور ملا عنوں کا مقابلہ امیر خسرو کے مندرجہ ذیل مصرعوں سے کریں جو تغلق نامہ کے صفحہ 19 پر دیے ہوئے ہیں: بہت سے ہندو جو براد وس کہلاتے ہیں اس کے ساتھ ہو گئے تھے اور اس نمک حرام کے کاموں میں شریک جرم بن گئے تھے۔ براد وان نڈر ہندوؤں کا سماتی لقب ہے جو اپنے سر ہاتھوں پر رکھے پھرتے ہیں۔ یہ جنگجو لوگ اپنے سروں کی پرواہ نہیں کرتے اور دوسروں کے سر اتارنا بھی جانتے ہیں۔ اس فرقے کے لوگ ہمیشہ اپنے حکمرانوں کی اگلی صفوں میں رہتے ہیں اور ان کے حکم پر اپنی جانیں قرباں کرنے کے لیے سدا تیار رہتے ہیں۔ یہ سکوں بد اکھار دس سروں والے خبیثوں کی طرح تھے جو مستقل سے آنکھیں پھیر کر ایک ایسی جنگ میں شامل ہونے کو تیار تھے جو یک لخت شروع ہو گئی۔ جس (خسرو خاں) نے ان سب کو ایک جگہ (حرانے کے پاس) روک کر جمع کر لیا اور ان کے پیروں میں سونے کی بیڑیاں ڈال دیں۔ پھر صفحہ 124 پر ہمیں ان جانباز سورماؤں کے غضبناک جارحانہ حملے اور ان کی ابتدائی کامیابی کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ جب دونوں قومیں اس مصمم ارادے کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے آئیں کہ مخالف کی صفوں کو تتر بتر کر دیں، ان پر فتح حاصل کر لیں اور انھیں الٹ دیں، تو بد قسمت خسرو کی فوج کا ایک برا اس تیزی سے باہر نکلا جیسے غضبناک لہروں کا ایک پورا دریا امڈ آیا ہو۔ اس تند و تیز حملے میں انھوں نے وہ ثابت قدمی اور استقلال دکھایا کہ ملک غازی کی فوج کا ایک بازو ٹوٹ کر الٹ گیا۔ مخالف فوجوں کی صفوں میں اندر تک گھس جانے کے بعد انھوں نے لشکر کے عقب پر حملہ کر دیا۔ لوگوں میں اس قدر شور و غل اور ہنگامہ سا ہوا کہ ایک برا دوسرے پر گر پڑا۔ فوج کے بہت سے قوی اور مضبوط دستے بھاگ کھڑے ہوئے، اور جس سوار کا جس سمت منہ اٹھا باگیں اٹھا دیں۔ لیکن ملک غازی اپنے مٹھی بھر سواروں کے ساتھ میداں میں ڈٹا رہا کیونکہ اسے اپنی زندگی داؤں پر لگانے میں مزا آتا تھا۔ تین سو سواروں کے ایک دستے کے علاوہ جو اس کی کمان میں تھا، میدان جنگ میں آگے پیچھے کوئی نہ رہا۔ جب ملک غازی نے یہ صورتِ حال دیکھی تو غیض و غضب میں بھر گیا، اور جو لوگ موجود تھے ان

سے غصّے میں چیخ کر کہا" میں اس وقت تنہا نہیں جب تک میرا سر کاندھوں پر موجود ہے۔ مجھے دوسروں کی مدد درکار نہیں، خدا میرا مددگار ہے۔"

(یہ اقتباسات امیر خسرو کے سنجیدہ اور معقول رویّے اور ان کے طریقہ بیان کے خود ہی شاہد ہیں۔ لیکن شاید وہ لوگ ان پر غور کرنا پسند نہ کریں جو یہ سمجھتے ہیں کہ "امیر خسرو کے افراد یا تو نہایت نیک سیرت ہوتے ہیں یا نہایت بدسیرت، وہ یا تو فرشتے ہوتے ہیں یا شیطان ہوتے ہیں، انسان نہیں ہوتے۔" آخری جملے میں مستقبل کے تعلق سلطان نے خدا پر جو بھروسہ ظاہر کیا ہے وہ اس شخص کے لیے اشتعال انگیز ہو سکتا ہے جس کا کہنا یہ ہے کہ "نہ صرف امیر خسرو بلکہ دورِ وسطیٰ کے سارے مورخ اور سوانح نگار یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کی خوبیاں اور خرابیاں وقت اور واقعات کی اس دنیا سے کہیں دور رہتی ہوئی ہیں، یعنی انھیں خدا طے کر دیتا ہے۔" مغربی تہذیب کے پیروں اور مستشرقین کا طور و طریق اور ان کا مذہبی اور سماجی نظام فکر ہمیشہ ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے۔ مستشرقین کا نظریہ ہے کہ تاریخ میں غیر معمولی افراد کی حیثیت اہم ضرور ہوتی ہے، لیکن بعض اوقات ان کی قسمت بنانے یا بگاڑنے میں ایک ان دیکھی قوت کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ واقعات اور حادثات کے نتائج کی ذمہ داری انسان کی سعی اور کوشش پر موقوف ہوتی ہے، لیکن خود انسانی افعال ہمیشہ فرمانِ الٰہی کے تابع ہوتے ہیں۔ چوتھے خلیفہ حضرت علی کا کہنا ہے کہ: "میں نے قوتِ الٰہی کو اس وقت محسوس کیا جب عزم ارادوں کے باوجود ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔" قرآن کہتا ہے کہ: "اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ کم تعداد فوج ان فوجوں پر فتح یاب ہوتی ہے جو تعداد میں بہت زیادہ اور بہتر ہوں۔" مغرب کے وہ عالم جو زندگی اور افعالِ انسانی کے مادی نظریے سے منسلک ہو چکے ہیں ان بیانات کو سراہ نہ سکیں گے۔ لیکن تاریخی ادب میں غیر متوقع حادثات کی بہت مثالیں موجود ہیں۔ اسی مثنوی میں سے کچھ اور مصرعوں کا حوالہ دینا کارآمد ثابت ہوگا۔

اس دوسری لڑائی کا بیان جاری رکھتے ہوئے، جس لڑائی میں پہلے کے دن کلو شعبان

کی پہلی تاریخ، 720ھ کو حوص خاص سے نزدیک خسرو خاں نے پیش قدمی کی تھی، ہمارا مصنّف کہتا ہے کہ غاصب کی فوج سے تقریباً ایک ہزار خنگو بر رو (اس لفظ کا تلفظ بروز بھی ہے) گھوڑ سواروں کا ایک بڑا دستہ غازی ملک کی فوجوں میں گھس پڑا اور انھیں بے دست و پا کرکے رکھ دیا غازی ملک کے پاس صرف تین[12] سو سوار ایسے رہ گئے تھے جن پر وہ بھروسہ کرسکتا تھا۔ اس نے ہمّت نہ ہاری اور اپنے مقام پر جما کھڑا رہا۔ اس کی پامردی اور اس کے دلیرانہ الفاظ نے اس کے کچھ سپاہیوں کی ہمّت بدھائی جن کی قیادت سہرام آئنہ، بہاالدّین سائستہ اور ملک شادی کر رہے تھے لیکن یہ سب افراد مشکل سے کُل پانچ سو ہوں گے۔ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اس سلسلے میں امیر خسرو نے تعلق نامہ میں کیا لکھا ہے: "جب ملک غازی نے اپنے آگے پیچھے نظر دوڑائی تو اپنی چھوٹی سی فوج کے سوا کوئی دکھائی نہ دیا۔ لیکن اس نے اس جمِ غفیر کی ذرا بھی پرواہ نہیں کی جو اس کے خیال میں چھتر کو گھیرے ہوئے تھا۔ اس نے پورے زور سے "اللہ اکبر" کا نعرہ لگایا اور چھتر بنر چھتر بردار کی طرف کف اُڑاتا (لہروں کی طرح) ہوا جھپٹا۔ اس نے غیض و غضب کے ساتھ ایسا شدید حملہ کیا کہ سارا میدانِ جنگ آوازوں سے گونج اُٹھا۔ اس نہایت صاحبِ ایمان شخص کے تند و تیز حملے نے بے ترتیب فوجوں کا انتشار دو چند کردیا۔ . . . . ملک غازی نے جس طرف باگیں اُٹھائیں دشمن کی ہمّت اسے دیکھتے ہی پست ہوگئی۔ یک بیک ایک آدمی سامنے آیا جس کے اس نے تیر سے ایک جان لیوا زخم لگایا۔ پھر اس نے بڑی دلیری سے ایک شدید حملہ کیا اور چھتر پر ایسی ایک ضرب کاری لگائی کہ چھتر الٹ کر اس بدبخت شخص (خسرو) کے سر پر گر پڑا۔ چھتر کے زمین پر گرتے ہی دشمن کی فوجوں کا سارا نظم و نسق اور ترتیب اور رسمی وقار اور نشانِ شاہی (جو ٹیلوں کی طرح ہاتھیوں پہ لے جائے جاتے تھے) تہس نہس ہوگئے۔ اُدھر حسن (خسرو) اپنی مفرور فوجوں کے ساتھ سر بہ پاؤں رکھ کر بھاگ رہا تھا، اور اِدھر فرمانِ شاہی (فتح کا) سُنانے کے لیے نقارے پر چوٹ پڑ رہی تھی۔"

بہادر تغلق کی خوش قسمتی تھی کہ اس کا حریف خاص کم حوصلہ اور مرعوب ہوجانے والی

ذہنیت کا شخص تھا جمع شدہ خزانے کی تھیلیوں کے منہ کھول دیئے" اور شاید اپنے سابقہ ہم مذہبوں کے جلد مشتعل ہو جانے والے جذبات سے کھیلنے کی وجہ سے اس نے اپنے گرد ایک بہت بڑا گروہ جمع کر لیا تھا۔ اس کے ساتھ نڈر، بے باک بردو تھے جو جنگی ہاتھیوں کے سامنے صفیں باندھے کھڑے تھے۔ "دس ہزار رانا اور راوت گھوڑ سوار تھے" اور خود غرض مسلمان تھے "جو ہندوؤں کے خادم اور خدمت گار بن گئے تھے" حقیقت یہ ہے کہ اس کی فوج میں اتنے بہت سے ہندو اور مسلمان تھے کہ کافر اور مسلمان دونوں کو سخت تعجب تھا۔[13] "بردو لوگوں نے، جن میں سے ہر ایک پشت پر (گھوڑے کی) چست اور پھرتیلا بن جاتا تھا، اپنی ابتدائی ہزیمتوں کے باوجود ہمت نہیں ہاری تھی۔" جب ملک عاری کے شہسوار لوٹ مار اور غارت گری میں مصروف تھے تو وہ خود میدانِ جنگ میں موجود تھا۔ دفعتاً شور و غل کرتے ہوئے ہندوؤں کا ایک گروہ، جو کہیں گھات لگائے بیٹھا تھا، سخت حملے کے ارادے سے نمودار ہوا۔ ایک ہزار سے زیادہ سیاہ فام بردوں نے نہایت غضب ناک حملہ کیا، اور ہندی پیش قبض خون بہانے کے لیے تیزی سے چلنے لگے۔ بردوں کی فوج کا یہ دستہ جھنڈے پر حملہ آور ہوا اور جھنڈے کا ڈنڈا ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ملک عاری کا جھنڈا اور شاہی نشان ریس لوس ہو گئے لیکن اللہ جلّ شانہٗ نے "ملک عاری کے سینے میں نہ جانے کتنا مضبوط دل ہے کہ اس شدید اور ناگہانی حملے کے باوجود وہ اسی جگہ کھڑا رہا جہاں کھڑا تھا۔" اس کے بعد وہ سطریں ہیں جن میں ان اقدامات اور کوششوں کا ذکر ہے جو بگڑتی ہوئی صورتِ حال کو بہتر بنانے کے لیے کی گئیں۔ اس جگہ ہمارا شاعر و مورّخ فلسفیانہ انداز میں کہتا ہے کہ: "جب قسمت کسی شخص کے سر پر تاجِ شاہی رکھتی ہے، تو غنیم جو نقصان پہنچانا چاہتا ہے اس کے نتیجے میں خود ہی تباہ ہو جاتا ہے۔ دشمن کوئی بھی تالا لگائے، اس کی ہر انگلی تالے کی کنجی بن جاتی ہے۔ اگر نگاہِ بصیرت سے دیکھو تو معلوم ہو جائے گا کہ ہر چیز کو صلاحیت اور درستی کے ساتھ کرنے کی خوبی احکامِ الٰہی سے پیدا ہوتی ہے۔"[15]

کیا تغلق کی فتح اور بعد میں اس کی تخت نشینی محض ایک حادثہ تھی، یا حسب الاستحقاق

نے یہ مقسوم کر دیا تھا کہ وہ ایسا طریقہ اپنائے گا جس سے دوسروں پر فتح یاب ہوگا۔ جب قسمت کے نشیب و فراز کو سبب بنا کر علائی خاندان کی بربادی پر ماتم کیا تو امیر خسرو کے نقاد کی تیز نظروں نے دیکھ لیا اور اسے اسلامی اخلاقی انداز کہہ دیا، لیکن اس کی پُرتجسس نظریں بعض ان قابلِ ذکر سطروں پر نہیں پڑیں جو اس کے الزامات میں سے ایک الزام کہ 'امیر خسرو نے اپنی معلومات کے مآخذوں کا ذکر نہیں کیا ہے' کا جواب فراہم کر سکتی ہیں۔ وہ سطریں یہ ہیں کہ "وہ بدنصیبیاں اور آفات سماوی جن کے متعلق پہلے کبھی سنا کرتا تھا اب خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لی ہیں[16]۔" یہ بات دو شہزادوں، فرید اور ابوبکر، عمر پندرہ اور چودہ سال، کے ہولناک قتل کے تفصیلی اور افسوسناک بیان کے ضمن میں کہی گئی ہیں۔ ان دونوں نے اچھی تعلیم پائی تھی اور قرآن حفظ کیا تھا۔ ایک تیر چلانے کی مشق کرتا تھا، اور دوسرے کو جو بڑا ذہین لڑکا تھا، خوشنویسی کا شوق تھا۔ دونوں پانی کی کمی کے باعث مٹی سے وضو (تیمم) کر کے نماز پڑھ رہے تھے کہ بدمعاشوں کی تلواروں نے ان کے ٹکڑے کر دیے۔ تین بچے ہوئے شہزادے، علی، بہا اور عثمان تھے جن کی عمریں آٹھ اور پانچ سال کے درمیان تھیں۔ ان کو اندھا کر دینے کی غمگین اور دل سوز داستان ایک قابلِ اعتبار چشم دید گواہ کی شہادت پر بیان کی گئی ہے۔" یہ باتیں اس شخص کے دکھے ہوئے دل سے نکلی ہیں جو اس حادثے کا چشم دید گواہ تھا[17]۔" ایک اور مقام پر، خلوص اور وفاداری کی خوبیاں تفصیل سے بیان کرنے کے بعد ہمارا مصنف ایک بہت ماہر گواہ کا حوالہ دیتا ہے: "اس پر ایک شخص نے جو معاملات سے بہت اچھی طرح واقف تھا یہ بتایا کہ جب غازی ملک کو یہ معلوم ہوا کہ خسرو سرسوتی تک پہنچ چکا ہے تو غنیم کی کثیر التعداد فوج سے خوف زدہ ہونے کے بجائے وہ خوش ہوا۔ اپنی توقعات کی کمی کی بنا پر اس نے اس طرح کی خوشی اور دل لگی کا اظہار کیا جیسے ایک خونخوار بھیڑیا بھیڑوں اور مینڈھوں کی کثیر تعداد دیکھ کر کرتا ہے[18]۔"

(امیر خسرو پر ایک الزام یہ رکھا جاتا ہے کہ "انھوں نے افراد کو تاریخی صورت حال میں اس طرح شریکِ کار یا ان کے بموجب عمل کرتے نہ سمجھا جس طرح جدید مؤرخین سمجھتے ہیں۔" اس سلسلے میں

ان کی کچھ سطریں لائق غور ہیں۔"اس داستان کا بیان اتنا حکمی اور قطعی ہے کہ جو کچھ قطب الدین (مبارک خلجی) پر گزری وہ حق تعالا کی طرف سے پہلے ہی مقدر میں لکھا جا چکا تھا۔"[19] صرف ایک ہی قابل ذکر سطر خسرو خاں کے واقعے کے پورے پس منظر کے بارے میں بہت کچھ بتا دیتی ہے: 'اگر میرے پاس ناموزوں حرکتیں نہ کی گئی ہوتیں تو ایسی باتیں مجھ میں پیدا نہ ہوئی ہوتیں مجھ سے یہ غداری سرزد نہ ہوئی ہوتی'[20]۔ یہ مختصر لیکن پر معنی جواب جو اس نے اپنے جرائم کی وضاحت کے لیے دیا اصل سبب اور شاید ایک جائز شکایت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ برنی جس بات کو بالکل عریاں کر کے دکھاتا ہے ہمارے شائستہ اور مہذب شاعر و مورخ نے اسے نیا تسریح کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ انھوں نے 'سرکیعت' اپنے سابق مرحوم سرپرست کچھ بخشا نہیں ہے۔ اس کے کردار اور اطوار کا پردہ فاش کر دیا ہے جو اس کی تباہی کا سبب ہے' اور انھوں نے حکمرانوں کی بدعملی اور لاپرواہی کے نتائج پر اپنی فصاحت خوب صرف کی ہے۔" شراب اور عشق، شباب اور ہوس، لطف اور انبساط، حکومت اور کامیابی، جس کا سر ان ہواؤں سے بھرا ہو وہ مستقبل کا خیال اور فکر کیسے کر سکتا ہے؟ ایک حکمراں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ عشق اور ہوس میں غرق ہو جائے۔ ایک بادشاہ خدا کی مخلوق کا مستقل محافظ ہوتا ہے۔ ایسے سرپرست کے لیے شراب میں دُھت رہنا غلط ہوگا۔ اگر گدڑیہ خالص شراب کے استعمال سے اپنے آپ کو تباہ کرتا ہے تو اس کا ریوڑ بھیڑیے کے پیٹ میں ابدی پناہ سو جاتا ہے۔ قانون کے ذریعے جس کے معنی حکومت کے مانے ہوئے والوں اور قواعد ہیں، معاملات (سیاسی) میں استحکام چوکس اور خبردار رہنے سے رہتا ہے۔ جو شخص علاقوں کی ساری دولت اپنی مٹھیوں میں دبائے بیٹھا ہو اس کے لیے یہ کہاں تک موزوں ہوگا کہ لاپرواہی سے پلنگ پر پیٹھ لگا کر سو جائے۔ کیونکہ بالآخر وہ ندامت کے بوجھ سے دب جائے گا۔ یہ بات بادشاہ پر خاص طور سے صا[illegible] کے نزدیک دوستوں سے زیادہ دشمن ہوتے ہیں[21]۔" اگر تاریخ کا کوئی اخلاقی مقصد ہے تو سیا[illegible] منظر کے ساتھ ایسے مشاہدات اور نظریات، جو ہمیں اس مقام کے علاوہ اور جگہوں پر بھی ملتے ہیں، محض یہ کہہ کر کہ یہ معمولی غیر حقیقی

اور روایتی ہیں، رد نہیں کیے جاسکتے۔

امیر خسرو کے نقاد کو علاقوں کی وہ خصوصیات اور جغرافیائی تفصیلات واضح اور مفید نہیں لگتی ہیں جو انھوں نے دی ہیں۔ دہلی، مسجدوں میں ادا کی جانے والی نمازوں، بلند و بالا اور مزین میناروں، حوضِ شمسی یا سلطانی کے بارے میں بڑی مرصع زبان میں جو بیان دیے گئے ہیں ان پر جوش محسوس کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ دار الخلافہ کے اندرونی اور بیرونی حصار جو پہاڑیوں پر بنے تھے، یا شہر جس کے بارے میں غلط کہا گیا ہے کہ کیقباد نے بنوایا تھا، روضہ باغ اور اس کے قریب ندی، دہلی سے اودھ (قران السعدین)، دیپالپور سے دہلی (تغلق نامہ)، دہلی سے دریائے نربدا اور کوہ وندھیاچل کے پار دور افتادہ علاقوں (خزائن الفتوح) کے لیے جو راستے اختیار کیے گئے تھے، ان سب چیزوں کے بیان سے محض چند ہی لوگوں کو دلچسپی نہیں ملتی۔ اس کی فوج کے کوچ کا تفصیلی حال، جو منزل بہ منزل ایک جگہ سے دوسری جگہ چل رہی تھی جیسے عالم پور، بانسی، ندیہ، روہتک، سڈولی، پالم، کشن پور، لہراوتی (تغلق نامہ) شاید اتنا اہم نہ ہو کہ نقاد کی لٹریچر کا اور دور افتادہ علاقوں کے صوبائی حکمرانوں کے خطوط کی حتی الامکان طور پر کم سے کم وقت میں وصولی، چودھویں صدی عیسوی کے ذرائع آمد و رفت اور رسل و رسائل پر روشنی ڈال پاتی ہے۔ جہاں تک سمال اور جنوب میں علاء الدین کی مہموں کا معاملہ ہے، گو ان کی تاریخیں اور مہینے تک دیے گئے ہیں، مقاموں، دریاؤں اور دروں کا ذکر کیا گیا ہے، اور بعض ایسے اشارے بھی ہیں جیسے ہیروں اور جواہرات کی فراوانی کا حوالہ، لیکن جغرافیائی تفصیلات اور واقعات کی تاریخ وار ترتیب ویسی نہیں ہے جیسے ایک مورخ کرتا ہے۔ اس بات کو محسوس نہیں کیا گیا ہے کہ بہت سے مقامات جن کا ذکر کیا گیا ہے اس بنا پر نہیں پہچانے جاسکتے کہ جدید نقشوں میں ان کے نام بدل دیے گئے ہیں۔

اگر مورخ کا کام یہ ہے کہ تازہ اور تقریباً نئی روشنی ڈال کر اور ماضی کے ذخیرۂ علم میں اضافہ کرے واقعات کی اور زیادہ تشریح کرے، تو ٹھوس، حقیقی معلومات کا جو خزانہ امیر خسرو کی تصانیف

خصوصاً مفتاح، خزائن اور تغلق نامہ میں ملتا ہے اور کسی کتاب میں نہیں ملتا۔ اور اس بنا پر وہ مورخ کہلانے کے حقدار بن جاتے ہیں، حالانکہ عاشقہ، نہ سپہر، قران السعدین اور کسی حد تک رسائل الاعجاز میں بھی سیاسی اہمیت کی قابل قدر معلومات کچھ کم نہیں ہے، لیکن یہ کتابیں ان لوگوں کو بڑی ٹھوس معلومات فراہم کر سکتی ہیں جو سماجی اور تہذیبی تاریخ پر کام کر رہے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ طوالانی، پر تصنع اور تھکا دینے والا انداز رسائل میں ملتا ہے۔ اس کی چار ضخیم جلدوں میں خطوط کے نمونوں اور ایسی دستاویزوں کی بھرمار ہے جن کا ظہور امیر خسرو کے ایجادی دماغ اور بہت لکھنے والے قلم کے ذریعے 1283/682 اور 1325/725 کے درمیان ہوا۔ اسی انداز تحریر اور طوالت بیان نے محققین کو خوف زدہ کر دیا ہے، اور انھوں نے یہ کہہ کر کتاب رد کر دی ہے کہ اس میں ایسی خیالی اور انشائی خط و کتابت دی ہوئی ہے جو لغو اور لاحاصل معلومات سے پر ہے، اور جس کا اس زمانے کی سیاسی سماجی، عقلی اور تہذیبی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ معدودے چند لوگوں نے تنقید اور احتیاط کے ساتھ اس کے مضامین کی جانچ پرتال کی ہے، اور اس میں تاریخ کے کسی پرجوش طالب علم کو یقیناً ایسی مفید معلومات مل سکتی ہے جو اس کے صفحات پر ادھر اُدھر بکھری ہوئی ہے۔

یہ بات آسانی سے ثابت کی جا سکتی ہے کہ امیر خسرو کی کتابیں حقیقی معلومات کی سنی سنائی کان ہیں، اور انھیں یہ کہہ کر کہ تاریخی اعتبار سے بے تکی باتیں لکھی ہیں، رد نہیں کرنا چاہیے۔ مورخ برنی اپنے نظریات کے ثبوت میں بعض اوقات انہی کے حوالے دیتا ہے۔ بہت سی تفصیلات کے سلسلے میں برنی کے دعووں کو ان حقائق سے تقویت ملتی ہے جو امیر خسرو نے دیے ہیں۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں جو مؤلف انہی کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ ضروری ہوگا کہ یہاں ایک مثال پیش کی جائے۔ تغلق حکومت کے بانی سلطان کے بارے میں برنی ہمیں بہت کم بتاتا ہے۔ امیر خسرو نے ان لوگوں کے نسب۔ امداد کہلواتے ہیں جنھوں نے اسے تاج شاہی پہننے پر آمادہ کیا، جب سنجیدہ مشورہ دینے والوں نے ... تو انھوں نے کہا کہ جو کچھ آپ کہتے ہیں وہ درست ہے اور آپ کو یہ کہنا زیب

دیتا ہے لیکن اس منصب سے منہ موڑ کر آپ ایک موتی کو، صرف تودے سے جدا کر رہے بلکہ دوسروں
کو دے رہے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ آپ کی تلوار نے جو کر دکھایا وہ نوکِ قلم سے بیان نہیں
کیا جا سکتا۔ جب خان (علاالدین) نے رنتھمبور کے قلعے پر حملہ کیا اور اس کا محاصرہ کر لیا تو رائے
کردے یہ سمجھ کر ایک بڑا طوفانی حملہ کیا کہ تلوار کے فولاد سے لوہے کے محاصرے کو کاٹ پھینکے گا۔
اس نے قلعے کے اندر سے ایک بہت بڑی فوج بھیجی جو پہاڑی چشمے کی طرح خس و خاشاک کو بہا
لے جاتی۔ خان کے پڑاؤ میں وہ انتشار پھیلا اور شور و غل بپا ہوا کہ ایک دوسرے پر گرے لگا۔ خان
نے آپ کو حملہ کرنے کا حکم دیا، اور آپ نے سب سرداروں سے آگے بڑھ کر حملہ کیا۔ آپ نے
جنگ میں ایسے وار کیے کہ ساری دُنیا بیدم ہو کر رہ گئی۔ رائے کی فوج کے دو تہائی سپاہی کٹ
گئے اور ایک تہائی سینکڑوں بہانے بنا کر پیچھے کھڑے رہے۔ جب آپ فاتح کی حیثیت سے
واپس ہوئے تو آپ خان کے ہاتھوں کا (نہایت پسندیدہ) ستارہ بن گئے۔ یہ آپ کی خوش
نصیبی کی شروعات اور بلند بختی کی صبح کا دب تھی۔ جب سلطان رحلت فرما گئے تو تعلقوں کی وفا داری
اور اعتماد آپ کے ساتھ رہا . . . . جب ایک اور کافر (منگول) نے رن (ملتان) پر حملہ کیا
اور ہندوؤں کی طرح بہت سے مسلمانوں کو بھی غلام بنا لیا تو بادشاہ (علاالدین) نے آپ کو
اس کی سمت بھیجا۔ ان کے خون کے جتنے بہانے کے ذمہ دار آپ ہی تو ہیں۔ ان میں چار تومان (جن
میں سے ہر ایک میں دس ہزار تھے) اور چار میر (سردار) تھے جن میں سے ہر ایک تاتاری حکومتوں
کا شہزادہ تھا۔ جب آپ نے بدبخت اقبال کا سامنا کرنے کا فیصلہ کیا تو آپ کو اس پر فتح نصیب
ہوئی، جس فتح میں نوش قیمتی کا بھی ہاتھ تھا۔ پھر ترتاق اور علی بیگ کی جنگ میں بھی اس طرح
سر لڑھکائے جیسے دیگ لڑھکائی جاتی ہیں۔ اس کے بعد کپک[23] اور تائبو کی فوجیں آپ کا نشانہ
بنیں۔ ان کافروں کو ایک ایک کرکے مارنے کی ذمہ داری بھی آپ ہی پر ہے۔ پھر جبل کے نزدیک،
دریا (سمندر) کے کنارے، کافروں کی فوج دریا کی چڑھائی تھی۔ اس میں ہنگو کافروں کا ایک
تومان (10,000) تھا۔ اتنی ہی تعداد رائے بنبل کے ساتھ تھی۔[24] زمین کافروں کے بوجھ سے اس

طرح دب گئی تھی جیسے دریا کے نیچے تہہ دب جاتی ہے۔ آپ کا مشہور و معروف نام تغلق غازی ہے اور اس مغل کا نام بھی تغلق تھا۔ آپ (تغلق) نے جہاد کے لیے تلوار اٹھائی تھی۔ اس تغلق نے کافروں کی مدد کے واسطے اپنی کمان پر تیر چڑھایا تھا۔ ۔ ۔ آپ نے اپنی نگاہ تیر سے کافروں کے دل چھید دیے اور ان سب کو قیدی یا غلام بنا لیا۔ آپ نے راۓ منسل سے دولت وصول کی اور ان دلیروں کی فوجوں کی صفیں توڑ دیں۔ اس طرح آپ نے اِدھر اُدھر اٹھارہ جنگیں لڑیں اور ان میں سے ہر ایک میں فتح یاب ہوئے۔"

تغلق نامہ میں بھی دوسری کتابوں کی طرح، ایسی باتوں کی کمی نہیں جن سے تہذیبی اور سماجی معنی اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ شہزادہ ابوبکر کے ان رحم انگیز الفاظ سے، جو اس نے عین اس وقت اپنی ماں سے کہے تھے جب قاتل اسے مارنے والے تھے، اس زمانے میں مروج یہ رسم اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جونہی مسیں بھیگنا شروع ہوں ایک شاندار ضیافت کا انتظام کیا جائے اور مہمانوں کی خاطر مدارات کی جائے۔ "جو ان رخساروں پر سبزہ آغاز جشنِ مہمان داری کے لیے اشارہ ہوتا ہے۔ مجھ پر تم ہی توجہ کرو گی کوئی اور نہ ہوگا۔"[26] یہاں ہمیں ایک اور مروجہ رسم کی جھلک ملتی ہے۔ "ہوس پرستوں سے بھرے اس شہر میں صدریاں (ڈھیلے ڈھالے جامے) پہنے بہت سی دلہنیں تمہیں سڑکوں پر گھومتی نظر آئیں گی۔"[27] جنگجو ہندوؤں کا حوالہ دیتے وقت امیر خسرو لکھتے ہیں: "وہاں ابیر دیو، ابر دیو، امر دیو، خبیث در خبیث موجود تھے، نرسی سائیں سی، برسی، باتر بیمار، برمار، سب ناگوں کی طرح چلا رہے تھے مار، مار (مارو، مارو)۔ ان کے جسم پر صندل کے رنگ کے چغے دیکھ کر صندل کی گیلی لکڑی شرم کے مارے سوکھ گئی تھی۔ مرنے کے لیے تیار، ان سب نے اپنے گرد ریشم کے ٹکڑے لپیٹ رکھے تھے، اور اس بات پر انھیں غرور تھا کہ ان کے پاس ہیرے جواہرت لگی تلواریں تھیں لیکن ہندوؤں میں یہ راج کہ جب جنگ کے لیے باہر نکلتے ہیں تو اپنے سروں کے گرد ایک قسم کے ریشم کا ٹکڑا باندھ لیتے ہیں جسے بہاراس (غالباً یہ لفظ براہمن ہے) کہتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنے جھنڈوں سے گالوں کا دہیں باندھ کر وہ دم کے لیے تندے کے بیشکاروں فعل بھی باندھ لیتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے گلوں میں تسور کے

دانتوں کے ہار بھی لٹک رہے تھے، جو ان کے خونخوار ہونے کی علامت تھی اور اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ وہ شیروں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ ان نکمّے لوگوں کے ساتھ جو جنگی بھاٹ (رجز گانے والے) تھے وہ ان کے بچاؤ کے لیے جادو ٹونے میں مصروف تھے۔" ہمیں تغلق کے نشان اور جھنڈے کے بارے میں کچھ نہیں کہا، سوائے اس کے کہ ہندوؤں کے برعکس اس کے جھنڈے کا امتیازی نشان مور پنکھ تھا۔ جہاں تک ہندی الفاظ اور محاوروں کا تعلق ہے، وہ کافی بڑی تعداد میں بڑے موزوں طریقے سے استعمال کیے گئے ہیں۔ اس ضمن میں، ایک بہت قابلِ ذکر سطر کا حوالہ دینا کافی ہوگا:" چو تخشد تیرے خطارا یہ رازی گفت" (ہائے ہائے تیر مارا)[29]

(اس سے پہلے کہ یہ مضمون ختم کیا جائے یہ بتا دینا ضروری ہوگا کہ امیر خسرو کے تاریخی کاموں میں خوبیاں بھی ہیں اور خرابیاں بھی۔ تقریباً چار دہائیوں پر پھیلے ہوئے تاریخی سلسلے کے جن جُدا جُدا حصّوں پر انھوں نے کام کیا ہے ان کتابوں کی زبان اور اندازِ بیان نہایت پرتصنع، ساوٹی اور غیر واضح ہے، اور اس کا مقابلہ دَورِ وسطیٰ کے دوسرے مورّخوں کے تاریخی کاموں سے نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخ کے بارے میں ان کا ادراک اُن تاریخی دستاویزوں پر مبنی نہیں ہے جن میں واقعات اور حادثات باقاعدہ اور تاریخ وار ترتیب میں دیے ہوئے ہیں بلکہ باقاعدہ خیالات پر مبنی ہے، بلکہ اشخاص اور سرگزشت عنوانات پر مبنی ہے۔ وہ ہمیشہ سیدھے سادے انداز میں نہیں لکھتے، اور اپنے جذبات کا اس شاعرانہ و نادر ہی اظہار کرتے ہیں کہ کہیں ان لوگوں کو گراں یا ناگوار نہ گذرے جو صاحبِ اقتدار ہیں۔ انھوں نے ان لوگوں کے بارے میں بھی بڑے ضبط کے ساتھ لکھا ہے جن کے برتاؤ یا کردار کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ ملک کافور اور مبارک خلجی کے ظالمانہ اعمال سے نظریں نہ پھیر سکے، لیکن آخر الذکر کے بارے میں عدم رنگ پیش کرنے میں ذرا نہیں جھجکے۔ انھوں نے عاشقہ[30] میں جلال الدین کے نکمّے بیٹے اور جانشین کی زندگی میں لکھی گئی تھی یہ لکھا ہے کہ "جب وہ بے رحم اور سنگ دل (بے مہر) سلطانِ بدخو و بدمزاج (ترش چہر) ہوگیا اور اپنے اعزا اور اقربا کی طرف سے دل میں کینہ رکھنے لگا، تو اس نے اپنی سلطنت کے لیے ان کا خون بہانا مناسب سمجھا اور انھیں شمشیرِ آبدار کے لیے موزوں

جانا۔ اس نے انتقام جو کنبہ پرور بننے کا فیصلہ کرلیا تاکہ ملک میں کوئی اور حصہ دار نہ رہے۔ اس نے خفیہ طور سے کسی شخص کو خضر خاں کے پاس بھیجا اور معذرت کے ساتھ اسے یہ بتایا کہ اس کے دل میں خضر خاں کے خلاف کینہ ہے (بُرا خیال) جسے وہ پال رہا ہے۔" ہر شخص کو تعریف یا ملامت کرتے وقت توازن برقرار رکھنا چاہیے اور غیر ضروری شدت اور ناپسندیدگی کا رویہ نہیں اپنانا چاہیے۔ حال کے معیار سے ماضی کو جانچنا مناسب نہ ہوگا۔ یہ تو کہا نہیں جا سکتا کہ امیر خسرو کو ان لوگوں سے کوئی خاص مخاصمت تھی جو بدسیرت اور نکمے تھے، لیکن قومی زندگی میں صاف گوئی ہمیشہ ہی خطرناک رہی ہے۔ دہلی کے عظیم صوفی حضرت نظام الدین اولیا کے منظورِ نظر خرقہ پوش درویش (جو پیوند لگے صوفیوں والے کپڑے پہنے) نہیں تھے، اور ہم ان سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ اپنے زمانے کے بڑے لوگوں کے کردار اور ارادوں کو کھول کر رکھ دیں گے، یا انسانی واقعات کے اسباب و نتائج کے اُلجھاؤ کو سُلجھا دیں گے۔ ان کو محض اس بات کی فکر تھی کہ اپنی ادبی لیاقت کا مظاہرہ کریں اور غیر فانی شہرت حاصل کریں نیز اپنے ادبی کارناموں پر انعام و اکرام بھی حاصل کریں۔ جانبداری کی نظر سے دیکھا جائے تو وہ مورخ تھے۔ یہ بہرحال ماننا پڑے گا کہ ان کے کاموں کی بڑی تاریخی اہمیت ہے اور انھوں نے تاریخی ادب کو جو کچھ دیا ہے وہ کسی صورت سے کم نہیں ہے۔

حوالہ جات

1 P Handy, Historians of Medieval India, chepter V

مندرجہ بالا کتاب کے باب پنجم میں امیر خسرو کی تاریخ نگاری کا تذکرہ ہے۔

2 H Elliot and Dowson History of India as told by its own Historians, Vol III, Chapter XII

3 Handy Historians of Medceral India, p 43

4۔ وہ اور ان کے نانا ہندوستان کے مخصوص 'چھلیے' کے بڑے شائق تھے۔ اس ضمن میں مصنف کا ایک خاصہ طویل مقالہ دیکھیے جس کا عنوان 'Betal Chewing and Early Muslims' ہے۔ امیر خسرو راوت عرض یا عارض ممالک "الملک والملک" کے بارے میں لکھتے ہیں: "اس بارے میں میری معلومات سب سے افضل ہے کہ میرا سلسلۂ نسب اس سیاہ رخسار (عارض سیاہ) والے سے ملتا ہے، اور میں نے اپنے خاندان کی ابتدا اور سلسلۂ نسب سے تعلق رکھنے والی معمولی ترین تفصیلات بھی بتا دی ہیں۔ وہ سیاہ فام سلطنت کا سب سے شستہ تمہیدی بیان تھا۔ میں خود قسمت کے نوکِ قلم کی تخلیق ہوں اور اس سیاہ فام کا مقولہ ہوں میں سرۂ خشک (حقیر ادنا اور معمولی چیز) کو ڈبو دیتا ہوں اور موتی نکال لاتا ہوں۔ دیکھو اس کالے بادل سے کتنی عمدہ (ہمیشہ بہنے والی) ندی پھوٹ پڑی ہے۔"

5۔ خسرو، اعجازِ خسروی (لکھنؤ 1865) جلد اوّل صفحات 28 تا 31۔

6۔ ایضاً، جلد چہارم صفحات 40 تا 44، مضبوط اور کمزور بادشاہ، وزرا اور عہدے دار۔

جلد چہارم، 48 اور 49، اچھے اور بُرے کاریگر، ان کے علاوہ بُرے قاضی، بداطوار عہدیدار، اُدنا قسم کی موشگافیاں کرنے والے وکلا، عالم دین۔ اچھے اور بُرے مشائخ اگرے ذوق کے لوگ، مخنث، رقاصائیں، غلام، عورتیں اور مرد وغیرہ۔

7۔ انھوں نے اپنی صاحبزادی مستورا کو جو خط لکھا اس کے لیے دیکھیے: خسرو، ہشت بہشت (لکھنو 1273) صفحات 21 تا 25۔

8۔ خسرو، مطلع الانوار، (لاہور 1280ھ) دسواں مقالہ، صفحات 192 تا 193۔

9۔ 697ھ سے 705ھ کے دوران وہ جہاں تک پیش قدمی کر چکے تھے اور دارالسلطنت کا محاصرہ کر چکے تھے۔ تفصیلی بیان کے لیے برنی کو دیکھیے۔

10۔ دربار کی حاضری کا سوال، رہائش کی تبدیلی، خضر خاں سے مقابلہ، صوفی سے عقیدت، خسرو خاں کی رقم قبول کرنا اور سماع خاص باتیں تھیں۔

11۔ ان کی بعض روایتوں کی تصدیق دوسرے مآخذوں سے بھی ہوتی ہے، جیسے خسرو خاں کے ساتھیوں کے بارے میں ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ نہایت بہادر اور شجاع تھے، انھوں نے تغلق کے دستوں کو شکست دی اور اس کے خیمے لوٹے۔

12۔ دیکھیے خسرو، تغلق نامہ، مدیر سید ہاشم فرید آبادی (اورنگ آباد 1933) چھپے ہوئے متن میں، جس میں بہت سی غلطیاں ہیں، سی سعد (3000) غلط دیا گیا ہے۔

13۔ ایضاً صفحہ 112۔

14۔ ایضاً صفحات 128، 129۔

15۔ ایضاً صفحہ 132۔

16۔ ایضاً صفحہ 23۔

17۔ ایضاً صفحہ 232۔

18۔ ایضاً صفحات 83، 84۔

19۔ ایضاً صفحہ 23۔

20۔ ایضاً صفحہ 149۔

21۔ ایضاً صفحہ 16۔

22۔ ایم الیف میں ایک قابلِ ذکر سطر دی ہوئی ہے "کارلے نامی سہادر شاہ سواراں بروں زد نوبت باچند یاراں" (کارلے جو مشہور و معروف سہادر سورما اور تنگ سوار تھا باہر نکلا اور اپنے چند ساتھیوں کی مدد سے سارے مجمع کو پسپا کر دیا) لیکن 'کارلے' کر نہیں ہو سکتا۔

23۔ امیر خسرو' جو ذومعنی الفاظ استعمال کرنے کے بڑے شائق تھے' نے کابک (تیتر) اور تے ہو (کوئل) لکھا ہے۔ کے' الیف میں انھوں نے منگول سرداروں کے نام اقبال' تائی' لو اور کپک لکھے ہیں۔

24۔ رائے بیسل' حیدر' رک حتیٰ کہ کادر کے بارے میں بھی وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ کون تھے۔

25۔ اس کا مقابلہ آج کل کی رسم "موچھوں کے کونڈے" سے کیجیے۔

26۔ تغلق نامہ' صفحہ 5۔

27۔ ایضاً' صفحہ 86۔ ایسی اور بہت سی باتوں کے حوالے اعجاز خسروی مطلع الانوار اور ہشت بہشت میں ملتے ہیں۔

28۔ بھاٹ عموماً گوییے شاعر ہوتے تھے جو نسب نامے' شجرے اور خاندان کی تعریف گا کر سناتے تھے۔ یہ افسوں گر یا جادوگر نہیں ہوتے تھے۔

29۔ یہ 'ہائے' 'ہائے' کھڑی بولی کے فعلِ امدادی 'ہائے' سے مختلف ہے۔ دیوانِ حافظ کے اس نسخے میں جو ہندوستان میں طبع ہوا ہے' یہ سطر موجود ہے' جو اگر اصلی ہے تو ان لوگوں کے لیے بڑی قابلِ توجہ ہے جو لسانی تحقیقات کے شائق ہیں۔ ساقی اگارت ہوائے ما ہائے جہ بدا معیار نہیں ماتائی۔ پندرھویں صدی کے بہاری سوفی' قاضی علا شتاری' چودھویں صدی

کے اُچھ کے صوفی مخدوم سید جلال بخاری نے یہ الفاظ دُہراتے ہیں "خندہ ہائے پھندہ کہاں" (معدن الاسرار)۔

30۔ بعض لوگوں کے مطابق مبارک خلجی کی موت کے بعد عاشقہ میں اضافہ کیا گیا۔ کیوں کہ امیر خسرو سلطان کے زمانۂ حیات میں اس کی بات بدنامی کی کوئی کہنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔

ضیاالدین برنی

کے۔ اے۔ نظامی

برنی بڑے واضح طور سے لکھتا ہے کہ "یہ ایک بڑا بیش قیمت کام ہے جس میں متعدد خوبیاں ہیں۔
اگر آپ نے اسے تاریخ کی حیثیت سے دیکھا ہے تو آپ کو اس میں بادشاہوں اور ملکوں کا بیان ملے گا۔
اگر آپ نے اس میں قوانین، حکومت کے ضابطوں اور انتظامی معاملات کی کھوج کی تو یہ کتاب ان
سے معمور ہوگی۔ اگر آپ بادشاہوں اور حکمرانوں کے لیے پند و نصائح چاہتے ہیں تو اس کتاب میں
انھیں جتنی بڑی تعداد میں اور جتنے بہتر انداز سے پیش کیا گیا ہے اس کا مقابلہ کوئی دوسری کتاب نہیں
کر سکتی۔ اور چونکہ ہر وہ بات جو میں نے لکھی ہے درست اور صحیح ہے، اس لیے یہ تاریخ بڑی قابلِ
اعتبار ہے۔ مزید یہ کہ چونکہ میرے تھوڑے سے لفظوں میں بڑے معنی پنہاں ہیں اس لیے [illegible] مثال
لائق تقلید ہے۔" تاریخ فیروز شاہی کے بارے میں یہ خیال خود برنی کا ہے۔ لیکن جدید دور کا کوئی
بھی مصنف اس بات کا صحیح تعین کرنے سے پہلے کہ اس کے کام کی تاریخی اہمیت کتنی ہے، بہت سے
اہم نکات کے بارے میں اس سے سوال و جواب کرنا چاہے گا۔ خود تاریخ کے بارے میں برنی کا کیا
خیال تھا؟ اس نے معلومات کس طرح حاصل کیں، انھیں جانچا اور اس کی ترجمانی کی؟ وہ کون سے
داخلی عناصر تھے جو اس کی فکر میں شامل تھے اور حقائق کے حصول، انتخاب، اور بیان پر انھوں
نے کس طرح اثر ڈالا؟ تاریخ اس کے نزدیک کس حد تک ماضی کے تجربے کو دہراتی تھی؟ وہ فوائد اگر
تھے تو کیا تھے جن کو برنی اپنی تاریخی تحریروں کی مدد سے حاصل کرنا چاہتا تھا؟ دورِ وسطیٰ کی
ہندوستانی تاریخ نگاری میں برنی کی دین، اور اس دور کے مورخین میں اس کے مقام کا تعین

ان ہی سوالوں کے کسی جواب کی بنا پر کیا جا سکتا ہے۔

جہاں تک فلسفۂ تاریخ اور اس کے مطالعے سے حاصل ہونے والے فوائد کے بارے میں برنی کے خیالات کا تعلق ہے۔ تاریخ فیروز شاہی کے دیباچے میں ان پر ایک بڑی سیر حاصل بحث موجود ہے۔ عہد وسطیٰ کے بیشتر علما کی طرح اس نے بھی ہر علم کی ابتدا قرآن سے کی ہے۔ مسلمانوں میں تاریخی رویے کی نشوونما کا آغاز بھی وہ ان آیات قرآنی سے کرتا ہے جن میں بنی آدم سے کہا گیا ہے کہ ان لوگوں اور تہذیبوں کے انجام سے سبق لیں جن کا کبھی دنیا میں دور دورہ تھا لیکن جو اب ایک عرصہ ہوا داستانِ پارینہ بن چکی ہیں۔ دورِ وسطیٰ کا مُسلّم تعلیمی نظام، چونکہ دینیاتی طرز کا تھا، اس لیے اس رویے کے منبع کا سُراغ لگانا کچھ مشکل نہیں۔ لیکن یہ بات کہ اس رویے کا اس کی تاریخی فکر پر اثر تھا، ایک حد کے بعد نہیں کہی جا سکتی۔ مذہبی اصطلاحات کا استعمال اس نے محض ادبی روایات طور پر کیا[2] اس سے زیادہ نہیں۔

برنی تاریخ کو اعمالِ انسانی کے ایک بہت بڑے سطر کی صورت میں دیکھتا ہے جو اس لیے انسان کے سامنے لایا گیا ہے کہ زندگی کے سفر میں اُس کے بھٹکتے قدموں کو رہنمائی مل سکے[3]۔ اس کے [illegible]انہ حال کو دُرست کرنے میں ماضی کے تنقیدی مطالعے کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ بات کہ سلطنتوں، حکومتوں اور افراد کا عروج اور زوال کس بنا پر ہوتا ہے ان لوگوں پر واضح ہو جاتی ہے جو تاریخی تبدیلیوں کا مطالعہ غور سے کرتے ہیں۔ تاریخ کے ذریعے انسانی معاملات کے بارے میں ایک غیر معمولی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے اور اچھے و بُرے، نیک و بد، دوست و دشمن میں تمیز کرنے میں مدد ملتی ہے۔ وہ انسان کے نظریے کو حقیقت پسندانہ بنا دیتی ہے۔ کیونکہ وہ دوسروں کے تجربات سے سیکھتا ہے۔ اس کے مطالعے سے حکمراں میں وہ جرأت پیدا ہو جاتی ہے جو مشکلات کا سامنا کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہے اور اسے وہ بصیرت ملتی ہے جو مملکت کے مختلف امراض کی تشخیص و علاج کے لیے درکار ہوتی ہے[4]۔ اسے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ بدی کا بدلہ بدی اور نیکی کا بدلہ نیکی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ برنی لکھتا ہے کہ تکلیف میں مبتلا ایک معمولی شخص کو جب تاریخ

کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو بھی زندگی کی صعوبتوں اور امتحانوں سے نہ بچ سکے تو اس میں صبر کی ایک بے پناہ قوت پیدا ہو جاتی ہے۔[5] لیکن بد قسمتی سے تاریخ کا علم بُرے دنوں میں خود برنی کے کام نہ آسکا۔

تاریخ کے بارے میں برنی کے دو خیال بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور اتفاق توجہ ہیں۔ (1) اس کا کہنا ہے کہ تاریخ کی بنیاد سچائی پر ہوتی ہے۔[6] مورخ کے بیانات عملی طور پر درست اور اس قسم کے مبالغوں اور اسراف سے پاک ہونے چاہئیں جو شاعروں کے کلام کا خاصہ ہوتے ہیں۔[7] غلط بیانات سے مورخ کا وقار گر جاتا ہے۔ اور اس کے کام کی قدر کم ہو جاتی ہے۔ مزید برآں دروغ گوئی کی سزا کے طور پر آخرت میں اسے نجات نہیں ملتی۔[8] اس سے پتہ لگتا ہے کہ مورخ کی حیثیت سے برنی کا احساسِ ذمہ داری عملی اور مذہبی دونوں طرح کے خیالات سے متاثر ہوتا ہے۔ (2) برنی علمِ حدیث اور تاریخ کو جڑواں سمجھتا ہے[9] اور یہ کہتا ہے کہ تاریخ کا مطالعہ اس لیے بھی ضروری ہے کیونکہ روایات اکٹھا کرنے والا کوئی عالم اس وقت تک اچھا عالم نہیں بن سکتا جب تک اُسے تاریخ پر پوری دسترس حاصل نہ ہو۔ برنی نے علمِ حدیث اور علمِ تاریخ کے درمیان جس طرح کی مناسبت ظاہر کی ہے اس سے ڈاکٹر ہارڈی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تاریخ کے بارے میں برنی کا رُجحان دینیات سے متاثر تھا لیکن ایسا نہیں ہے۔ برنی کو جو چیز مجبور کرتی ہے کہ مطالعۂ تاریخ اور مطالعۂ احادیث ایک ہی قوسین میں رکھے جائیں وہ دینیات کا مواد نہیں اصولِ اسناد ہے۔ جس کے بارے میں ہتی کے الفاظ یہ ہیں کہ "حدیث نگاری کی نہایت بنیادی شرائط پوری کرنا ہے"۔ جیسے کسی بھی واقعے کا سُراغ اس شخص تک لگانا جو یا تو خود اس واقعہ میں شریک رہا ہو یا اُس نے دوسروں کو شریک ہوتے دیکھا ہو، اور ان سارے لوگوں کی صداقت اور راست گوئی ان کے کردار، برتاؤ، حالات اور پس منظر کی تحقیق کے ذریعے جانچنا جنھوں نے اس واقعے کا دوسروں سے بیان کیا ہو۔ احادیث کے جامع عالموں نے تصدیق تحقیق کے جو اصول واضع کیے تھے ان کا اطلاق تاریخ پر بھی تھا۔ برنی کی نظر میں تاریخ اور حدیث جڑواں علوم ہیں، اور اس کے خیال میں تصدیقی اصولوں کا اطلاق دونوں پر

یکساں طور سے ہوتا ہے۔

پھر بھی یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ اس کتاب کے دیباچے میں جن تجریدی اصولوں کا ذکر ہے وہ فکر و خیال کی سطح پر برنی کے سارے بنیادی اصولِ موضوعہ کا احاطہ کر لیتے ہیں یا محض ان کا حوالہ دے کر تاریخ فیروز شاہی کی تکنیک اور ہیئت کا تجزیہ کرنا ممکن ہے۔ تاریخ فیروز شاہی کا مطالعہ ایک نہایت پر پیچ عمل ہے، اور اس کے لیے برنی کے فکر و خیال کی بنیادی اقسام کی جانچ کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا اس کے بدلتے ہوئے جذبات کا تجزیہ کرنا۔ اس مقالے میں برنی کی فکر سے تعلق رکھنے والے وہ مخصوص رجحانات تلاش کیے گئے ہیں جن کی پرورش ایک خاص سماجی پس منظر میں ہوئی اور یہ کہ بدلتی ہوئی ہر مختلف صورتِ حال میں کس طرح کی حساس طبیعت کے ردِ عمل نے تاریخ کے بارے میں اس کے خیالات اور رجحانات کو متاثر کیا۔

برنی ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھتا تھا جس نے دورِ سلطنت میں حکمرانوں کے تین شاہی سلسلوں، الباریوں، خلجیوں اور تغلقوں کی خدمت کی تھی۔ اس کے نانا سپہ سالار حسام الدین بلبن کے دور میں ایک اہم عہدیدار تھے جنھوں نے وکیلِ دار بربک سلطانی[12] کے فرائض انجام دیے تھے۔ سلطان کو ان پر پورا اعتماد تھا، اور اسی لیے انھیں لکھنوتی[13] کا شحنہ مقرر کیا تھا، اور چونکہ تغرل کی بغاوت کے بعد سلطان کو بنگال میں اپنی طاقت مضبوط کرنے کی بڑی فکر تھی اس لیے یہ عہدہ نہایت اہم تھا۔ برنی کے والد مؤید الملک ارکلی خاں کے نائب کے عہدہ پر فائز تھے، اور دورِ وسطی کی دہلی کے سب سے شاندار علاقے کلوگڑھی[15] کے ایک عالی شان مکان میں رہتے تھے۔ اس کے چچا علاء الملک اس وقت سے علاء الدین کے ہم راز تھے جب وہ کڑہ کے صوبیدار تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جلال[16] کے خلاف کی جانے والی سازش میں انھوں نے علاء الدین کی مدد کی تھی۔ جب علاء الدین دہلی کے تخت پر بیٹھا تو اس نے پہلے انھیں کڑے اور اودھ پر مامور کیا اور بعد میں مملکت کی سب سے بڑی ذمہ داریوں میں سے ایک یعنی دہلی کی کوتوالی سونپ دی۔[18] وہ ان سے ہر نازک مسئلے پر مشورہ کرتا تھا خواہ اس کا تعلق اس کے ذاتی مذہب[19] سے ہو یا منگولوں کے حملے سے۔[20] برنی کے

والد موید الملک کو برن کی نیابت اور خواجگی ملی[21] محمد بن تغلق کے دور میں برنی نے خود بھی دربار سے ناتا جوڑ لیا اور سترہ برس تک سلطان کا ندیم رہا[22]۔ یہ ایک ایسی عزت تھی جس کا لطف دل و دماغ کی غیر معمولی صلاحیتیں رکھنے والا شخص ہی اُٹھا سکتا تھا۔ سلطان اکثر اس سے مشورہ کرتا تھا[23] اور اس کے علم تاریخ کا معترف تھا[24]۔ جب فیروز شاہ تغلق تخت پر بیٹھا تو دربار پر برنی کا سارا اثر زائل ہو گیا اور ان اسباب کی بنا پر جن پر بعد میں بحث کی جائے گی، اس کی سیاسی ترقی یک لخت ختم ہو گئی کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس کے بعد اس کے خاندان کا کیا حشر ہوا کیونکہ اس زمانے کی اور بعد کی دستاویزات اسی بارے میں بالکل خاموش ہیں۔ ایسے زمانے میں جب بدلتے ہوئے سلسلۂ سلاطین کے ساتھ حکمراں طبقے کا رنگ بدل رہا تھا اس کے خاندان میں وہ سیاسی سوجھ بوجھ موجود تھی جس کی بنا پر فیروز شاہ تغلق کے عروج کے زمانے تک اس خاندان نے اپنی حیثیت برقرار رکھی۔ لیکن وقت آیا جب برنی کے ایک غلط سیاسی اندازے سے کچھ ایسے عناصر نے خوب فائدہ اُٹھایا جو ملک کی سیاسی زندگی میں نئے نئے اُبھرے تھے۔ برنی اپنا کھویا ہوا وقار پھر کبھی حاصل نہ کر سکا۔

درباری تعلقات کے علاوہ برنی اور اس کے خاندان کے افراد کو ملک کے اعلاترین تعلیمی حلقوں میں جانے اور اس زمانے کے بہترین داناؤں سے ملنے کے موقعے ملے۔ علائی دور کے چھیالیس عالموں میں سے کچھ عالم، جن کو برنی عراقی اور رازی کا ہم پلہ سمجھتا تھا، اس کے اساتذہ میں شامل تھے[25]۔ امیر خسرو اور امیر حسن سجزی اس کے نہایت قریبی دوست تھے۔ برنی کہتا ہے "وہ میری اور میں ان کی صحبت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے[26]۔" دہلی کے اعلاترین سیاسی اور تعلیمی دونوں حلقوں میں برنی اپنے شائستہ آداب، بڑھتی ہوئی مجلسی دلکشی اور بذلہ سنجی و ظرافت کے لیے مشہور تھا[27]۔ خاندانی پس منظر اور ذاتی حیثیت نے اسے سماج کے اوپر کے طبقے کا فرد بنا دیا تھا۔ اگر کوئی مقام ایسا تھا جہاں وہ عوام سے قریب ہو سکے تو وہ شیخ نظام الدین اولیا کی خانقاہ تھی۔ لیکن یہاں بھی، اپنی زندگی کے آخری برسوں میں، جو شکست خوردگی اور ہمت شکنی کے احساسات سے بھرے تھے، وہ اس

روحانی سکون کی تلاش میں آیا تھا جو مادی شان و شوکت کی خواہشات میں ڈوبی ہوئی روح کبھی حاصل نہ کر سکی۔

اسی لیے اس کا سماجی نقطۂ نظر سماج میں خود اس کے مقام سے متاثر ہوا۔ سماج کے بارے میں اس کا سارا تصور شاہی خاندان اور اونچے طبقے کی زندگی سے ہم آہنگ ہو کر رہ گیا۔ اس سماجی رویے کے لیے تصوراتی غذا اس نے ایران کی معیاری تاریخ نگاری سے حاصل کی؛ وہ یہ حوالے دیتے کبھی نہیں تھکتا کہ فارسی کے ساسانی ہیرو بادشاہت کے بہترین نمونے تھے۔[28] اس نے تاریخی منظر کو شاہی کے قدموں میں بیٹھ کر دیکھا اور ساری توجہ شاہی خاندان اور حکمران طبقوں پر مرکوز کر دی۔ اس کے نزدیک تاریخ ان کی تاریخ تھی اور اقتدار صرف ان ہی کا حق تھا۔ اسے یہ بات کبھی نظر نہ آ سکی کہ عظمت انسانی بادشاہت سے جدا اور خود مختار بھی کوئی شے ہے۔ اس کی نظروں میں پیغمبر اسلام بھی سلطان پیغمبران تھے۔[29] اور اسے اپنے روحانی پیشوا شیخ نظام الدین اولیا کی عظمت وجود باری تعالیٰ پر اس کے ایمان میں نہیں ان کی خانقاہ کی ظاہری شان و شوکت میں نظر آئی کہ بے شمار لوگ وہاں آتے جاتے تھے۔[30] اپنی زندگی کے آخری برسوں میں بھی جب وہ اپنے غم زدہ وجود کا بار شیخ نظام الدین اولیا کی خانقاہ کے ایک کونے میں لیے بیٹھا تھا، خود کو امیرانہ پیچیدگیوں سے آزاد نہ کر سکا۔ طاقت کا ہی وہ خمار تھا جس نے اس کی روح کو پژمردہ کر رکھا تھا۔ اس نے کبھی قسمت سے مصالحت نہ کی چنانچہ اس کی اندرونی بے اطمینانی بڑھتی چلی گئی ظرافت طنز میں بدل گئی اور محرومیت نے خوش مزاجی کی جگہ لے لی۔ اگر وہ اپنے ذہن کی امیرانہ پیچیدگیوں سے چھٹکارا حاصل کر لیتا تو سلطانوں کی تاریخ لکھنے کے بارے میں کبھی نہ سوچتا۔ اس کے برخلاف اس نے چشتی صوفیوں کی تاریخ لکھی ہوتی، جو سیاسی طاقت اور اقتدار سے بے پرواہ اور زمانے کی حکومت سے دور رہے۔[31] لیکن ایسا کرنے کے بجائے اس نے ایک تاریخ، ایک فتاوائے جہانداری اور ایک حسرت نامہ کی تالیف کے بارے میں سوچا، جن میں سے ہر کتاب اس شکستہ اور محروم شخص کا کرب اور مصیبت ظاہر کرتی ہے جو اپنی کھوئی ہوئی حیثیت دوبارہ حاصل کرنے کے لیے مایوسی کے ساتھ

موجود کر رہا ہو۔ اس نے برمکیوں کا بیان عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا کیونکہ ان کی تاریخ میں اُسے
وہ اپنے انجام کا عکس نظر آیا۔ اس نے پیغمبر کی سوانح 'ثنائے محمدی'[52] اس وقت لکھی جب خود اس کے
الفاظ میں اسے صبح تک زندہ رہنے کی امید نہ تھی۔ یہ سوانح اس نے کسی تحریک علمی کی بنا پر نہیں
بلکہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے اس امید کے ساتھ لکھی تھی کہ اس کی روحانی برکت سے
اسے بڑھاپے کے قید خانے سے چھٹکارا مل جائے گا۔ وہ لکھتا ہے کہ "اس کتاب کی تالیف کی بنا پر' جو
میرے مذہبی اور دنیاوی معاملات میں میری محافظ، پُشت پناہ ہے، میں وقتاً فوقتاً اپنے اندر
ایک نئی طاقت محسوس کرتا ہوں۔" لیکن ناموافق حالات اس کی ذہنیت نہ بدل سکے۔ وہ جس
امیرانہ ذہن کے ساتھ پیدا ہوا تھا اسی ذہن کے ساتھ مر گیا اور تمام عمر انسانیت کو امرا کی عینک سے
دیکھتا رہا۔

یہ طبقاتی شعور بالآخر ایک ذہنی پیچیدگی بن گیا اور اسی بنا پر سماج کے نچلے طبقوں کے
بارے میں اس کا رویہ تلخ ہو گیا۔ اس کی تلخی کی بنیاد مذہبی یا سماجی نہیں، سیاسی تھی۔ جب
عہدیداروں کا ایک نیا طبقہ، جس میں لدھا، نجیا، منکا، شیخ بابو نائک، پیرا وغیرہ قسم کے
اشخاص شامل تھے، محمد بن تغلق کے زمانے میں اُبھرا، تو برنی نے اپنی تلخ سیاسی حقیقت پسندی
کی بنا پر آنے والے اس طوفان کی گڑگڑاہٹ سُنی۔ جو مستقبل قریب میں منتظمین کے سارے پرانے
خاندانوں کے پاؤں اکھاڑ دینے والا تھا۔ تاریخ سے محمد بن تغلق کا لگاؤ، ادب میں اس کی
دلچسپی، اور سب سے زیادہ خود برنی سے لگاؤ ان سب باتوں کی وجہ سے دربار میں برنی کی حیثیت
مسلّم رہی، لیکن برنی اس ماحول میں اپنے کو اجنبی پاتا تھا جس میں اَدنا لوگ اور نو دولتیے پرانے
امرا کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہوتے تھے۔ محمد بن تغلق کی موت کے ساتھ برنی کے وقار کا سب سے بڑا
سہارا ٹوٹ گیا اور حالات کچھ اس تیزی سے ناموافق ہوئے کہ رات وہ ایک نہایت طاقتور امیر کی
طرح سے سویا اور صبح ایک غریب گداگر کی طرح اُٹھا۔ اس پر یہ ساری مصیبت ایک چھوٹی فاش
غلطی کی وجہ سے آئی۔ جب سندھ میں محمد بن تغلق کی یکایک موت ہوئی، تو خواجہ جہاں نے

دہلی کے تخت پر ایک کم عمر لڑکے کو بٹھا دیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ سندھ میں شیخ نصیر الدین چراغ اور دوسرے لوگوں نے فیروز کو پہلے ہی تخت نشین کرا دیا ہے۔ برنی نے براہِ راست یا بالواسطہ خواجہ جہاں کے فعل کی حمایت کی، اور اس طرح خود کو ایک ایسے امیر سے وابستہ کر لیا تختہ دار جس کا مقدر بن چکا تھا۔ دہلی میں فیروز کی آمد پر خواجہ جہاں اور دہلی میں ان کا حامی گروہ بڑے خطرے میں پڑ گیا۔ اگر فیروز خود فیصلہ کرتا تو شاید ان امیروں کو معاف کر دیتا جنھوں نے صدقِ نیت سے یہ کام کیا تھا؛ لیکن امرا کے ایک نئے گروہ نے، جس نے اس دوران میں سیاسی خلا پُر کر لیا تھا اور نئے انتظامیہ میں بڑا ممتاز مقام حاصل کر لیا تھا فیروز شاہ کو مجبور کر دیا کہ امرا کے ساتھ سخت رویّہ اختیار کرنے۔ خواجہ جہاں مروا دیا گیا اور اس کے ساتھ بہتوں کے سر قلم ہوئے، لیکن برنی اپنے دشمنوں کی کوششوں کے باوجود[34] اپنی جان بچانے میں کامیاب رہا۔ خود فیروز شاہ کے دخل دینے پر اس کی جان بچی[35]، لیکن اسے اپنی سابقہ حیثیت، رُتبے اور جائداد سے محروم کر دیا گیا۔ وہ نہایت رنج کی حالت میں لکھتا ہے کہ "خدا نے مجھے زندگی کی ابتدا میں عزت بخشی اور آخر میں ذلیل و خوار کر دیا۔"[36] نئی صورتِ حال نے برنی کو بڑی المناک حالت پر پہنچا دیا تھا۔ کم نسلوں کے امیر اور سابق سلطان کے ندیم کو نیچے گرا کر سخت محتاجی کی حالت پر پہنچا دیا گیا تھا[37]، دوستوں نے کنارہ کر لیا تھا، رشتے دار نظر انداز کرتے اور مخالفین ذلیل کرتے تھے۔ سخت نا امیدی کی حالت میں وہ لکھتا ہے کہ "مچھلیاں اور چڑیاں بھی اپنے گھروں میں خوش ہیں۔ ایک میں ہی نہیں ہوں۔" اُداسی اور شکست خوردگی نے بالآخر اس کے دماغ پر سایہ کر لیا۔ اب جو شخص سیاسی منظر پر چھایا وہ خان جہاں مقبول تھا۔ یہ پیدائشی ہندوستانی تھا جس نے سارے پرانے ممتاز خاندانوں کو قوت اور اقتدار کے مقام سے دھکا دے کر اپنے لیے ایک اونچا مقام حاصل کیا تھا۔ برنی کے شکست خوردہ ذہن نے اب رشتہ اسباب کی ایک پوری نئی زنجیر بنانی شروع کی۔ اگر سابقہ سلطانوں نے کم نسل لوگوں کو ترقی دینے کی حکمت عملی نہ اپنائی ہوتی تو خان جہاں مقبول کو یہ مقام کبھی حاصل نہ ہوتا۔ اس معاملے میں محمد بن تغلق بہت بڑا مجرم تھا۔ اس نے طبقہ امرا میں نئے عناصر

شامل کرے، اور خصوصاً سماج کے نیچے طبقوں کے اشخاص شامل کرکے، پرانے اور باعزت خاندانوں کا زور توڑ دیا تھا۔ وہ فلسفی[38] جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے، اس کے ذہن میں یہ خیالات ڈالنے کے ذمہ دار تھے۔ ان فلسفیوں کو، جو دشمنِ استحکام و عزت ہیں، سماج سے باہر نکال دینا چاہیے اور استحکام کے خیال سے فلسفے کو ممنوع قرار دینا چاہیے[39]۔ کم نسل لوگوں کو تعلیم حاصل کرنے کی ممانعت ہونی چاہیے کیونکہ اسی سے یہ لوگ انتظامیہ کے عہدوں کے لائق بن جاتے ہیں۔ انھیں مستقل لاعلمی کی حالت میں رکھنا چاہیے۔ اس طرح تعصبات یکے بعد دیگرے برنی کی فکر کے تار و پود میں داخل ہوتے گئے اور زندگی اور سماج کے بارے میں اس کے پورے نقطۂ نظر اور میلان کا رنگ بدلنے لگا۔ اس نے کم نسل لوگوں اور فلسفیوں سے نفرت کرنا شروع کر دی، اور اس بات کی مخالفت کرنے لگا کہ تعلیمی سہولتیں عوام تک پہنچائی جائیں۔ برنی کی صورتِ حال کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ وہ بھی اسی طرح سے سوچنے لگے۔ زیادہ گہرائی سے تجزیہ کیا جائے تو ظاہر یہ ہوتا ہے کہ اس کے تعصبات کی بنیاد مذہبی نظریات نے نہیں بلکہ اس کی شکست خوردہ زندگی نے کی تھی۔ اس حقیقت سے واقف ہونے کی بنا پر کہ اونچی اور نیچی نسل کا فرق مسلمانوں کے مذہبی تصورات کی روشنی میں جائز قرار نہیں دیا جا سکتا، اس نے اسے کفر اور ایمان کے تصادم کی شکل دینے کی کوشش کی۔ لیکن ان نام نہاد کم نسلوں میں سے بہت سے افراد، جن کو وہ ایک اصول کی آڑ میں برا بھلا کہہ رہا تھا، مسلم تھے۔ انھیں کافر کیسے کہا جا سکتا تھا؟ یہاں برنی اپنے اس نظریے کا سہارا لیتا ہے کہ کم نسلوں کی تبدیلیِ مذہب ہمیشہ ادھوری اور نا تمام رہتی ہے۔ وہ کبھی صدقِ دل سے مذہب تبدیل نہیں کرتے۔ وہ ریاکار ہوتے ہیں۔ پھر وہ اپنے اس نظریہ تردید کی آڑ لینے کی کوشش کرتا ہے جو فتاوائے جہانداری میں پیش کیا گیا ہے، لیکن اپنے نقطۂ نظر کی حمایت میں کہیں بھی کسی مذہبی سند کا سہارا نہیں لیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے پورا احساس تھا کہ نسل کی بنیاد پر کیا جانے والا فرق دراصل دنیاوی ہوتا ہے۔ مذہبی نہیں، اور اپنے اس راز کو وہ شہزادہ محمد کی سیرت بیان کرتے وقت افشا کرتا ہے[40]۔

یہ سب تو ان حالات کے بارے میں تھا جن میں برنی کے خیال و فکر کی بنیادی قسموں کی نشوونما ہوئی۔ اب چند لفظ اسی سلسلے میں کہ تاریخ کے بارے میں اس کا کیا رُجحان تھا۔ اس دور کی تاریخ میں برنی نے خود اپنے عروج و زوال کے اسباب ڈھونڈے، اور اس تلاش نے اس کے بیان میں داخلیت کے باریک دھاگے شامل کر دیے۔ اسے حکمرانوں اور ملکوں کے رویّوں اور افعال میں اپنی زندگی کا المیہ اور اس کے اسباب بڑے نمایاں طور پر نظر آئے۔ وہ بلبن کے بارے میں لکھ رہا ہے۔ یکایک اس کے ذہن میں ایسی صورتِ حال کے مطابق یا مخالف کوئی صورتِ حال نظر آجاتی ہے اور وہ اپنی بات کرنے لگتا ہے۔ وہ کہتا ہے' اس فلک نا ہنجار نے مجھ پر جو ظلم توڑے ہیں اگر لکھوں تو دو کتابیں تیار ہو سکتی ہیں"[41] وہ جلال الدین خلجی کی خاص مجالس کا ذکر کرتے وقت اپنی قسمت کا رونا روئے بغیر نہیں رہ سکتا[42] یہ ماتم بار بار دُہرایا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پوری کتاب میں مورخ اپنی شکست خوردہ زندگی کا بوجھ کاندھوں پر اُٹھائے موجود ہے' اور ذرا سا طیش آنے پر دل کا غبار نکالنے لگتا ہے' گریہ و ماتم کرنے لگتا ہے اور سوال کرنے لگتا ہے کہ کیا تاریخی معلومات اس کی زندگی کے المیے کی تشریح میں مدد دے سکتی ہے' وہ لکھتا ہے کہ "وہ مایوسی جو میرے دل میں گھر کر گئی ہے لہو کے آنسو بن کر میری آنکھوں سے بہتی ہے۔ لہو کے دریا کی ایک لہر میری آنکھوں میں اُٹھتی ہے' میرے قلم سے ٹپکتی ہے اور کاغذ کو داغدار کر دیتی ہے"[43] کوئی کتاب اگر ایسے ذہنی اور جذباتی ماحول میں لکھی جائے تو اس پر داخلیت یقیناً ناقابلِ تلافی حد تک چھائی ہوئی ہوگی۔ اس کے بیان میں داخلیت کے ان دھاگوں کی تلاش بڑا دلچسپ عمل ہے کہ وہ انتظام کے بارے میں محمد بن تغلق کے تقریباً ہر فعل اور حکمت عمل کو برا بھلا کہتا ہے لیکن جب اس کی موت کا حال بیان کرنا شروع کرتا ہے تو اس کا دل خون بہانے لگتا ہے[44] یوں کہ ایسے بھی سلطان گزرے جو محمد بن تغلق سے زیادہ المناک حالات میں فوت ہوئے۔ ان کے بارے میں اس نے ان احساسات کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے علاوہ اس نے سلطان کے سے تب جو رویّہ عام طور پر رکھا ہے اس کے لحاظ سے بھی صدائے ماتم کی جگہ اطمینان کا ایک

سائنس زیادہ موزوں رہتا۔ لیکن محمد بن تغلق کی موت میں اسے اپنے وقارِ زیست کی ماتمی صدا سنائی دی۔ وہ سلطان کے لیے اس قدر رویا ہے جتنا خود اپنے لیے۔ محمد بن تغلق کے بارے میں اس کا سارا بیان نفسیاتی کیفیات سے پیدا ہونے والے واہموں سے لبریز ہے۔ وہ اس پر تعریفوں کی بارش کرتا ہے اور اسے پیغمبروں اور صوفیوں کے معبد میں جگہ دیتا ہے۔ اور پھر یک لخت ایک دوسرا موقف اختیار کرکے اسی پر طعنوں کی بوچھار کرنے لگتا ہے' اور اسے اس میں نمرود اور فرعون کی برائیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ محبت اور نفرت کی اس عجیب دو رنگی نذر کی جڑیں بھی برنی کی اپنی نفسیات میں تھیں۔ سلطان کی شخصیت اتنی زیادہ بے جوڑ خصوصیات کا انبار یا مجموعۂ اضداد' نہ تھی جتنی خود مورخ کی شخصیت جو قابلِ رحم حد تک شکست تھی۔ اس نے سلطان کی سیرت کا تعین اپنی نفسیاتی کیفیات کا سایہ ڈال کر کیا ہے۔ محمد بن تغلق نے بڑے بڑے عہدوں کے دروازے لائق افراد کے لیے کھول دیے' کثرتِ تحکیمات مجدد کو اپنایا[45]' بلا کسی امتیاز کے لوگوں کو بڑی تعداد میں امراکے طلسماتی' حلقے میں داخل کرلیا' الہامی کتابوں اور پیغمبروں کی حدیثوں کو فلسفیانہ دلچسپیوں کی بنا پر شک وشبہ کی نظر سے دیکھنے لگا (کتبِ سماوی واحادیثِ انبیا)۔ اسی حکمتِ عملی کی بنا پر چاروں طرف انتشار پھیل گیا اور برنی کے اپنے خاندان کی طرح پرانے اور باعزت خاندان بڑے کمزور ہوگئے۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر وہ سخت ملامت کا مستحق تھا۔ اور برنی سلطان کو بدنام کرنے لگتا ہے۔ لیکن یہ مزاجی کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی۔ مورخ محمد بن تغلق کے دور پر اپنی ذہنی یلغار کے بعد جونہی پلٹتا ہے اور یکایک اپنی موجودہ قابلِ رحم حالت کا احساس کرتا ہے' تو اس کے جذبات کا رخ بدلنا شروع ہوجاتا ہے۔ "محمد بن تغلق کے دورِ حکومت میں میرا بڑا مرتبہ اور حیثیت تھی[46]"' ایسا سرپرست اور مربی لائقِ تعریف ہے اور ہمارا مورخ سلطان کی تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے ملانے لگتا ہے۔ جب برنی دورِ حال میں ہوتا ہے تو اسے محمد بن تغلق سے لگاؤ رہتا ہے۔ جب وہ دورِ ماضی میں ہوتا ہے تو اس کے لیے نفرت کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ نفرت اور محبت مورخ کی مزاجی کیفیات کے

ساتھ بدل بدل کر ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ مورخ کی یہ لطیف نفسیاتی کیفیت جونہی سمجھ میں آجاتی ہے اس کی فراہم کردہ ساری معلومات درست تناظر کی وجہ سے بڑی بامعنی اور موزوں لگنے لگتی ہے۔

محمد بن تغلق اور برنی کے خیالات اور نظریات میں جتنا بنیادی فرق تھا اتنا کسی دو اشخاص میں نہیں ہو سکتا۔ وہ دونوں دو مختلف دنیاؤں کے باشندے تھے سلطان سیاست کے معاملے میں انقلابی اور مذہب کے معاملے میں عقلیت کا قائل تھا۔ برنی سیاست کے معاملے میں ایک تنگ خیال رجعت پسند اور مذہبی معاملات میں روایت کی اندھی تقلید کا حامی تھا۔ برنی کی تعریف کرنی چاہیے کہ سلطان اور اس کے اپنے خیالات کے درمیان بہت بڑا فرق ہونے کے باوجود وہ محمد بن تغلق کی مکمل شبیہ پیش کر دیتا ہے۔ دو اور اہم ہمعصر مورخین، عصامی اور ابن بطوطہ محمد بن تغلق کے بارے میں بڑی مفید معلومات فراہم کرتے ہیں جس سے ہمیں اس کے دورِ حکومت کی تاریخیں متعین کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے، لیکن سلطان کی بابت برنی کا مطالعہ جس حد تک زود فہم، واضح اور جامع ہے اس حد کو ان دونوں میں سے کوئی چھو بھی نہیں پاتا۔ ابن بطوطہ کا محمد بن تغلق ایک عالمانہ مزاج کا شخص ہے جو کمزوری کی حد تک فیاض لیکن بنیادی طور پر ایک جابر فرماں روا ہے عصامی کا سلطان ناعاقبت اندیش، لادین ظالم اور من موجی بادشاہ ہے۔ تاریخ فیروز شاہی کے صفحات کے ذریعے ہی سلطان کی اصلی اور متحرک شخصیت ہم پر ظاہر ہوتی ہے۔ پڑھنے والے کو کہیں کہیں درشت، تلخ اور سخت تنقید ملتی ہے، لیکن ان سب کے بیچوں بیچ سے سلطان کی فکر اور شخصیت اپنے سارے تاریک اور روشن پہلوؤں کے ساتھ ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ ایسا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ کسی خاص دعوے کے ثبوت میں حقائق کو توڑ موڑ کر پیش کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے اور نہ ظلمت کی دخل اندازی گوارہ کی گئی ہے[47]۔ یہ بات عجیب ضرور لگے گی لیکن حقیقت یہی ہے برنی کے گہرے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ داخلی عناصر حقائق کی ترتیب میں نہیں بلکہ صورت کے

تعیّن میں کارفرما نظر آتے ہیں۔

اس کے اس میلانِ طبع سے قطع نظر کہ وہ تاریخ کے نشیب و فراز میں خود اپنی قسمت کے نشیب و فراز ڈھونڈنے لگتا ہے، برنی عملاً ایک خاصہ دیانت دار مورخ تھا۔ حقائق اس کے اپنے یا اس کے خاندان کے لیے خواہ کتنے ہی ناخوشگوار کیوں نہ ہوں وہ نہ انھیں چھپاتا ہے اور نہ مسخ کرتا ہے۔ وہ بڑی راستبازی سے اعتراف کر لیتا ہے کہ چونکہ محمد بن تغلق کے سامنے اسے سچ بولنے کی جرأت نہ ہوئی اس لیے اس نے ریاکاری سے کام لیا[48]۔ کٹرہ میں علاء الدین خلجی کی سازشانہ سرگرمیوں کا ذکر کرتے وقت جس کو بُرا کہتے ہوئے وہ ذرا نہیں جھجکتا اپنے چچا علاء الملک کی شمولیت پر پردہ ڈالنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا[49]۔ اس کے ذہن کی سطح پر جو بھی حقائق اُبھرے جوں کے توں درج کر دیے اور اپنے کسی دعوے کے بطلان یا ثبوت میں حقائق کو منتخب یا رد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بڑھاپے کی وجہ سے وہ واقعات کی تاریخ وار ترتیب اکثر بھول جاتا ہے۔ وہ وہی کچھ لکھتا ہے جو اسے یاد آ جاتا ہے اور یاد اسے وہی آتا ہے جو اس کے دماغ پر گہرا نقش چھوڑ چکا ہوتا ہے۔ برنی کے کام میں یہ ایک بڑی خامی ہے۔ تاریخوں کی ترتیب کا کمزور رہنا بلاشبہ کسی بھی تاریخی کام کا عیب سمجھا جاتا ہے۔ لیکن برنی کا مقصد اپنے قاریوں کو واقعات کی کوئی فہرست مہیا کرنا نہیں، بلکہ اس زمانے کے مزاج کی ایک جھلک دکھانا ہے۔ وہ ماضی کو دوبارہ جنم دیتا ہے اور اپنے قاری کو اس میں ملوث کر لیتا ہے۔ برنی ایک ایسا مورخ ہے جس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب تاریخ وار ترتیب کا خاکہ دوسرے مآخذوں سے مل جائے۔ منہاج نے اپنی طبقاتِ ناصری میں التمش کی زندگی اور سرگرمیوں کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے، لیکن یہ ذکر اتنے بے جان انداز میں کیا گیا ہے کہ قاری کے ذہن میں فوجی مہمات کے ایک لمبے اور نہ ٹوٹنے والے سلسلے کے علاوہ التمش کی سیرت یا شخصیت یا اس کے دور کے مسائل کے بارے میں کوئی تاثر پیدا نہیں ہوتا۔ برنی بلبن کے سلسلے میں اتفاقی طور پر التمش کا حوالہ دیتا ہے، لیکن اس کے چند ہی حوالہ جات اتنے جاندار اور بامعنی ہیں کہ ان کی مدد سے

وہ پورا دَور منور ہو جاتا ہے۔ منہاج ان مہموں کا ذکر تو کرتا ہے جو التمش نے اپنے سابقہ رفیقوں یعنی معزالدین اور قطب الدین کے غلام عہدیداروں کو جو بڑی تعداد میں تھے کس طرح کچلا اور راضی کیا۔ برنی لکھتا ہے کہ التمش دربار میں اس طرح کے فقرے استعمال کرتا تھا: جب میں ان بڑے امیروں کو اپنے سامنے کھڑا دیکھتا ہوں تو میرا دل چاہتا ہے کہ تخت سے اُتر کر ان کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دوں۔ ایسا لکھ کر برنی ہمیں اس زمانے کی صورت حال کے بارے میں کسی بھی ہمعصر مورّخ سے کہیں زیادہ بتا دیتا ہے۔ یہ ایک مختصر اور اتفاقی فقرا ہے لیکن اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ التمش کو اپنے ملکوں کا اعتماد اور اشتراک حاصل کرنے کے لیے کس طرح کام کرنا پڑتا تھا اس بارے میں کہ التمش صوفیوں اور مذہبی لوگوں کی سرپرستی کرتا تھا، منہاج کا بیان بڑا معمولی اور مبہم ہے اور سلطان کی شخصیت اور سیرت کو سمجھنے میں اس سے کوئی خاص مدد نہیں ملتی۔ برنی کے حوالہ جات سے سلطان کی شخصیت نہایت اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ منہاج کی نسبت برنی اس بارے میں زیادہ لکھتا ہے کہ التمش کے سامنے کون کون سے مذہبی رویّے اور عقیدے پیش کیے گئے اور ان پر اس کا کیا ردِ عمل ہوا۔ اس بارے میں جو کچھ برنی لکھتا ہے وہ ہمیں اس زمانے کے مزاج سے زیادہ نزدیک لے جاتا ہے' اور ایسا لگنے لگتا ہے کہ ہمیں اس زمانے کے مسائل کا ادراک ہو گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی تاریخ اور اس کے مزاج کے بارے میں برنی کا ادراک ابتدائی دَورِ وُسطیٰ کے کسی بھی فارسی روزنامچہ نگار کے مقابلے میں بہتر تھا۔ اپنی تمام ترخامیوں کے باوجود اس دَور کا کوئی اور مورّخ اس کی بلندیوں کو چھو بھی نہیں پاتا۔ منہاج جس نے واقعیات کی تاریخ وار ترتیب کا بڑی سختی سے خیال رکھا ہے۔ اس نے تاریخ کو بڑی بے لطف، رُوکھی پھیکی اور اُکتا دینے والی چیز بنا دیا ہے۔ اس کے بیانات کا اس دَور کے اقتصادی اور سماجی پسِ منظر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ طبقاتِ ناصری سے کوئی شخص یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ قرونِ وُسطیٰ کی عظیم ترین حکومتوں میں سے ایک جب قائم کی جا رہی تھی تو اس وقت کونسی تہذیبی اور سماجی قوتیں بروئے کار تھیں نئے ماحول سے مطابقت اور مصالحت کے عمل کس طرح شروع ہوئے اور کام کرنے لگے۔

ایک غیر ملکی انتظامیہ اس ملک میں اپنی جڑیں گہری کرنے میں کس طرح کامیاب ہوا؟ یہ وہ سوالات ہیں جو کسی شخص کے ذہن میں بار بار آتے ہیں لیکن منہاج کے صفحات میں کہیں ان کا جواب نہیں ملتا۔ برنی نے دَورِ وُسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ کی ایک اور اہم تبدیلی یعنی خلجی شہنشاہیت کے عروج پر بحث کی ہے۔ اس نے بڑی کامیابی کے ساتھ اس تبدیلی کی رُوح اور اس کے فوجی، تہذیبی اور معاشی سارے پہلوؤں کو اُجاگر کر دیا ہے۔ علاالدین خلجی نے جو جنگیں لڑیں اُن کی تفصیلات غلط ہو سکتی ہیں لیکن اس نے خلجی دَور کے بارے میں جو مکمّل تاثر دیے ہیں وہ تاریخی اعتبار سے اتنے اہم ہیں کہ امیر خسرو بھی اپنی خزائن الفتوح میں اس معیار تک نہیں پہنچ پاتے۔

ڈاکٹر پی۔ ہارڈی کا کہنا ہے کہ برنی تاریخ کو دینیات کی ایک شاخ سمجھتا ہے اور ماضی کو نیکی اور بدی کے میدان کار زار کے نظریے سے دیکھتا ہے۔[50] بدقسمتی سے ان کا یہ نظریہ حقائق سے ثابت نہیں ہوتا۔ برنی اِس بات سے خوب واقف تھا کہ سیاسی زندگی میں تبدیلیاں کس طرح آتی ہیں چنانچہ اس کا ہر صورت حال کا تجزیہ بنیادی اور لازمی طور پر سیاسی ہے اس بات کا یقین کرنے کے لیے کہ وہ ان قوتوں کو کتنا سمجھتا تھا جن کی وجہ سے سیاسی اقتدار کا زوال اور خاتمہ ہوتا ہے، ہمیں بلبن کی وصایا کے بارے میں اس کے ان بیانات پر نظر ڈالنی ہوگی جو سیاسی اقتدار کے استحکام کے بارے میں ہیں[51]، اور ملک نظام الدین[52]، احمد چپ[53]، الماس بیگ[54] اور ملک کافور[55] کی سیرتوں اور سرگرمیوں کے جو تجزیے اس نے کیے ہیں انہیں بھی دیکھنا ہوگا۔ انتظامیہ اور اس کے مسائل کو برسوں تک بہت نزدیک سے دیکھنے کی وجہ سے اسے ان عناصر اور قوتوں کا عملی اندازہ کرنے میں بڑی مدد ملی، جو اس زمانے کی سیاست پر قابو رکھنے والی حکومتوں کی زندگی پر اثرانداز ہوئیں۔ دَورِ وُسطیٰ کے سارے مُسلم مصنفوں میں صرف اُسی نے یہ سوال پُوچھا تھا کہ کیا شریعت کے قوانین اپنی ساری جزویات کے ساتھ نافذ کیے جا سکتے ہیں؟ اپنی راسخ العقیدگی اور قدامت پسندانہ نظریات کے باوجود وہ یہ اعلان کرتے

ذرا نہیں جھجکتا کہ اب انتظامیہ کے لیے شریعت کے قوانین نافذ کرنا ممکن نہیں کیونکہ وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ ریاست کے قوانین (ضوابط) کا سہارا لیا جائے۔ صرف وہی شخص ایسا بیان دے سکتا تھا جس میں تاریخ کا گہرا احساس موجود ہو، اور اسلام کے سیاسی نظام میں جو تبدیلیاں صدیوں میں ہوئی تھیں اُن سے واقف ہو۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک علیم تھا، لیکن اُسے سید نورالدین مبارک اور قاضی مغیث کی قوسین میں نہیں رکھا جا سکتا، کیونکہ اسے حقائق کا احساس ان سے کہیں زیادہ تھا۔ اس مسئلے کا ایک اور پہلو بھی قابلِ غور ہے۔ فتاوائے جہانداری، جس میں اس نے یہ رائے پیش کی ہے، فیروز شاہ کے دَورِ حکومت میں لکھی گئی تھی، اور عام طور پر یہ یقین کیا جاتا ہے کہ اس کے دَور کا انتظامیہ مذہبی طرز کا تھا۔ اس زمانے میں یہ بات کہنا کہ شریعت کے قوانین کا نفاذ عملی سیاست کی حدود کے باہر جا چکا ہے، فیروز کے انتظامیہ کی اصلی رُوح اور مزاج پر ایک نہایت صحیح فیصلہ صادر کرنے کے مترادف ہے۔ پروفیسر حبیب کا یہ کہنا درست ہے کہ برنی کے واسطے "تاریخ کوئی ریکارڈ یا کوئی روزنامچہ یا کوئی کہانی نہ تھی۔ وہ یقیناً ایک سائنس تھی، طبقاتِ عمرانی کی سائنس اور اس کی بنیاد مذہب یا روایات پر نہ تھی بلکہ مشاہدے اور تجربے پر تھی"۔[56]

برنی نے بلبن سے فیروز شاہ تغلق تک دہلی کے نو حکمرانوں کا تذکرہ کیا ہے۔ بلبن کے بارے میں اس کا خیال ان باتوں پر مبنی ہے جو اس نے اپنے نانا سپہ سالار حسام الدین سے سُنیں۔ التمش کے دربار میں سید نورالدین مبارک غزنوی کی تقریروں پر بلبن کی رُودادیں ان ہی کی سند پر بیان کی گئی ہیں۔[57] اس نے اِسی ذریعے سے بلبن کی وصایا کے بارے میں معلومات حاصل کی۔ حسام الدین بلبن کے ساتھ لکھنوتی گئے جہاں تغرل کی بغاوت کچلنے کے بعد اس نے انھیں وہاں کا شحنہ مقرر کیا۔ لکھنوتی مہم کے بارے میں اس کا نہایت صاف ستھرا بیان غالباً اس کے نانا کی رودادیوں پر مبنی تھا۔ اس کے علاوہ بلبن نے بغرا خاں کے لیے ہدایتیں شمس دبیر کو تحریر کرائیں، جو امیر حسن سنجری کا رشتہ دار تھا اور امیر حسن سنجری

بلبن کا دوست تھا۔ حسن اور خسرو سے اسے شہزادہ محمد کی زندگی اور سرگرمیوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی، علاالدین خلجی کے زمانے سے فیروز تغلق کے دور حکومت تک کا حال وہ ذاتی مشاہدے اور ذاتی تجربے کی بنا پر لکھتا ہے۔ اس نے اپنے چند ہی ہمعصروں کی سندیں پیش کی ہیں[58] اس نے خلجی کی مہموں کا بیان فضول سمجھا کیونکہ تاج الدین پہلے ہی یہ منزل طے کر چکا تھا۔ اور برنی کسی پٹے ہوئے راستے پر چلنے کا عادی نہ تھا۔ اسی لیے حن باتوں کی بنا پر اس نے معلومات کا انتخاب کیا ان میں سے ایک بات یہی تھی کہ آیا اسی عنوان پر پہلے سے کچھ تحریریں موجود ہیں یا نہیں۔ اگر کسی عنوان پر پہلے سے مواد موجود ہوتا تو وہ تفصیلات سے اجتناب کرتا تھا۔ اگر نہ ہوتا، تو ضروری تفصیلات بڑے شوق سے دیتا تھا۔ ترکان چہل گانی کے ایک اہم فرد، ملک قطب الدین حسن کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ ملک پر کئی جلدیں لکھی گئیں ہیں۔[59] لیکن اس کے بارے میں میرا اپنا بیان تقریباً ترسانے کی حد تک مختصر ہے۔ گو برنی اس کا ذکر نہیں کرتا، لیکن یہ تمام عصری ادب اس نے کبھی پہلے پڑھا ہوگا۔

جب برنی نے تاریخ فیروز شاہی لکھی تو اس کے پاس کچھ یادداشتیں رُوداد یں یا اندراجات تھے ؟ پروفیسر حبیب کا خیال ہے کہ اس کے پاس خود اپنی یادداشت اپنے قلم، دوات اور کاغذ کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کی کتاب کے بڑے حصّے کے بارے میں یہ بات دُرست لگتی ہے۔ لیکن تاریخ فیروز شاہی میں بعض ایسے مقامات آتے ہیں جب پڑھنے والے یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ برنی کے پاس کچھ تحریری معلومات موجود تھی۔ جیسے مخصوص عہدیداروں، صُوبیداروں وغیرہ کی فہرستیں جو ہر سلطان کے بیان سے پہلے لکھی ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ محض اس کی یادداشت کا کمال نہیں ہو سکتا۔ چونکہ یہ فہرستیں مَتن میں شامل نہیں ہیں۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ یہ کبھی بعد میں اس کے ہاتھ لگیں اور اس نے ان کو محض موزوں مقامات پر جوڑ دیا۔

کیا تاریخ فیروز شاہی فتاوائے جہانداری سے پہلے لکھی گئی یا بعد میں ؟ یہ سوال بڑا

معقول ہے کیونکہ اس بنا پر یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ کیا برنی ایک سیاسی مفکر تھا جس نے تاریخ کو اپنا لیا۔ یا وہ دراصل مورخ تھا اور بدل کر مفکر بن گیا۔ کیا اس نے تاریخ کو اپنے سیاسی خیالات کے قالب میں ڈھال لیا یا تاریخ کے علم نے اس کے سیاسی خیالات کو جنم دیا۔ داخلی شہادتوں سے۔ اسلوبِ بیان، عبارت اور مضمون سے۔ ثابت ہوتا ہے کہ فتاویٰ جہانداری تاریخ کے بعد تالیف کی گئی۔

تاریخ فیروز شاہی کی تالیف کے پیچھے برنی کے کیا مقاصد تھے؟ اس نے یہ تاریخ اس لیے لکھی کہ اس کی مایوس رُوح کو اس کام میں سکون ملا، خود کو ترقی دینے کا احساس پیدا ہوا۔ اور اس بات کا ایک موقع ملا کہ اپنے نام اور اس شہرت کو غیر فانی بنا سکے جو اس سے چھینی جا رہی تھیں۔ یہ خیال دُرست نہیں لگتا کہ اس نے فیروز شاہ کی عنایتیں حاصل کرنے کے لیے ایسا کیا۔ وہ تاریخ فیروز شاہی میں جگہ جگہ لکھتا ہے کہ اس کی خواہش ہے کہ فیروز شاہ اس کی تاریخ پر ایک نظر ڈالے۔ لیکن یہ چیز محض ایک خواہش سے زیادہ نہ تھی، جو کتاب شروع کرنے کے بعد پیدا ہوئی اور تالیف کا اصلی مقصد ہرگز یہ نہ تھا۔ اس ضمن میں ایک اور بات کی طرف توجہ دِلائی جا سکتی ہے۔ برنی اپنی کتاب میں محمد بن تغلق پر بڑی لعن طعن کرتا ہے۔ ہمیں فتوحات اور دوسرے مآخذوں سے یہ پتہ لگتا ہے کہ فیروز شاہ اس کی بڑی عزت کرتا تھا اور اس کے لیے خداوند نعمت اور مخدوم و مربیّ من، جیسے الفاظ استعمال کرتا تھا۔ برنی ایک ایسی کتاب کے ذریعے فیروز کی عنایتیں کیسے حاصل کر سکتا تھا جس کتاب میں اس نے اپنے مخدوم میں نمرود اور فرعون کی سی بُرائیاں بتائی ہوں؟ ہاں یہ ممکن ہے کہ فیروز اپنے سے پہلے والے ممتاز فرمانروا کا دل سے قائل نہ ہو اور محمد بن تغلق سے دلی لگاؤ کے ظاہری دعوے تو کرتا ہو لیکن حقیقتاً نہ اس کی عزت کرتا ہو اور نہ اس سے محبت کرتا ہو۔

ایک اور بات کا امکان بھی ہے۔ تاریخ فیروز شاہی غالباً ایک نہیں دو کتابیں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف دو علاحدہ علاحدہ تاریخیں لکھنا چاہتا تھا۔ ایک جس میں بلبن

سے محمد بن تغلق تک ابتدائی فرماںرواؤں کا تذکرہ ہو، اور دوسری جس میں صرف فیروز شاہ تغلق کا تذکرہ ہو۔ چونکہ وہ دوسری کتاب مکمل نہ کر سکا اس لیے دونوں کو ملا کر تاریخ فیروز شاہی کا نام دے دیا۔ اس سلسلے میں کئی باتیں غور طلب ہیں: (1) ایسا لگتا ہے کہ برنی کے ذہن میں تاریخ لکھنے کے کئی مختلف منصوبے تھے۔ کسی وقت اس نے ایک عالمی تاریخ '' لکھنے کا خیال کیا لیکن دو وجوہات کی بنا پر یہ خیال ترک کر دیا: لائق تعظیم پیش رو منہاج السراج کا پاس و لحاظ اور تاریخ کے بارے میں عام طور پر لوگوں کی بے اعتنائی۔ (2) کیقباد کے بارے میں برنی کے بیان سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ وہ اس سلطان کے بارے میں الگ سے ایک رسالہ لکھنا چاہتا تھا۔ (3) تاریخِ فیروز شاہی کے شروع اور بعد کے وہ دونوں حصے جن میں فیروز شاہ کا ذکر ہے عبارت کے لحاظ سے اور طریقۂ فکر، تحریر اور رنگ بیان کے نقطۂ نظر سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ پہلے حصے کا برنی بڑا تیز فہم، چبھتی ہوئی تنقید کرنے والا نقاد اور بعض مقامات پر تلخی برتنے والا شخص ہے۔ دوسرے حصے میں وہ ایک سیدھا سادھا چاپلوس ہے۔ (4) برنی موضوعات کی ایک فہرست دیتا ہے جن کا تذکرہ وہ فیروز شاہ کے بیان میں کرنا چاہتا ہے۔ اس فہرست سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اس کے ذہن میں الگ سے ایک کتاب لکھنے کا منصوبہ تھا اور کسی بڑی کتاب میں محض ایک باب لکھنے کی نیت نہ تھی۔

تاریخِ فیروز شاہی کے آخری حصے کا برنی ایک بے شرم خوشامدی لگتا ہے۔ اسے فیروز شاہ کی شخصیت میں ملکوتی خوبیاں نظر آتی ہیں اور اس کے دربار کو وہ اللہ کے دربار سے تعبیر کرتا ہے جہاں امرا ایسے کھڑے ہوتے ہیں۔ جیسے عرش پر جبرائیل کھڑے ہوں[53]۔ وہ فیروز کو آسمان پر چڑھا دیتا ہے اور خواجہ جہاں پر لعنت بھیجتا ہے تاکہ خواجہ جہاں کے ساتھ مل کر فیروز شاہ کے خلاف سازش کرنے کا وہ پُرانا الزام دُھل جائے۔ یہاں برنی ان معیاروں سے خود بخود گر جاتا ہے جو اس نے اپنی کتاب کے دیباچے میں تحریر کیے ہیں۔ لیکن خان جہاں مقبول کے بارے میں اس کا حوالہ بڑا معنی خیز ہے۔ یہ ایک ایسی تاریخ ہے جو فیروز شاہ کے لیے تنبیہ کا کام بھی دے

سکتی ہے اور زوجۃ الصفائے مصنف کے اِن قولوں میں سے ایک کی یاد دِلاتی ہے کہ موّرخین کو اپنے حقیقی جذبات کا اظہار کرنے کے لیے کیا طریقے اختیار کرنے چاہئیں (اس کے بارے میں برنی کے فقرے یہ ہیں "پچھلے چھ برس سے وزارت اس کے سپرد کر دی گئی ہے۔ اسے دیوانِ وزارت پر بیحد اور کامل اختیار ہے اور اسے مطلق العنان بنا دیا گیا ہے۔ شہنشاہ نے اِسے اپنی مرضی سے جو رعایتیں دے رکھی ہیں دہلی کے کسی سابقہ سلطان نے اپنے وزیر کو کبھی نہیں دیں[66]۔ وہ جو کچھ کرتا ہے اس کی تعریف بھی کرنی چاہیے اور اس سے خبردار بھی رہنا چاہیے۔"

تاریخِ فیروز شاہی کو سمجھنے کے لیے برنی کے اسلوبِ بیان اور اس کی اصطلاحات کا سمجھنا ضروری ہے، جو اصطلاحات اس نے استعمال کی ہیں ان میں سے بعض کا مفہوم خصوصی ہے۔ اور برنی کے خیالات سمجھنے کے لیے اس مفہوم کا سمجھنا ضروری ہے جب وہ یہ کہتا ہے کہ خلجی ترک نہیں تھے[67] تو لفظ ترک کو نسل کے معنی میں استعمال نہیں کرتا[68]، جب وہ ہندوؤں کے خلاف علاالدین کے سخت ضابطوں کا حوالہ دیتا ہے تو وہ ہندوؤں کی اصطلاح فرقہ وارانہ معنی میں استعمال نہیں کرتا، جب وہ محمد بن تغلق کے ٹیکس بڑھانے کی بات کرتا ہے کہ دس گُناہ بڑھا دیا[69] تو وہ اس محاورہ کا استعمال ریاضی کے معنی میں نہیں کرتا۔

ایک ہی مقالے میں برنی کے ساتھ انصاف کرنا مشکل ہے اس مقالے میں اس کے فکر و خیال اور شخصیت کے بعض بُنیادی پہلوؤں پر توجہ دِلائی گئی ہے۔ برنی ان موّرخین میں سے ہے جو اس وقت تک قاری کی سمجھ میں نہیں آسکتے جب تک وہ ان کے فکر و خیال کی بُنیادی قسموں اور ان کی شخصیتوں کے خصوصی پہلوؤں سے واقف نہ ہو جائیں۔ تاریخ فیروز شاہی وہی سمجھتا ہے جو ضیاالدین برنی کو سمجھتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ برنی، تاریخ فیروز شاہی (بب، انڈ، 1860 تا 1862) صفحہ 23۔

2۔ ایضاً صفحات 1 تا 23۔

3۔ ایضاً صفحہ 1، صفحہ 48 بھی دیکھیے، جہاں وہ اقدامات بیان کرنے کے بعد جو بلبن نے اپنی قوت کو مستحکم کرنے کے لیے اٹھائے، وہ بلبن کی موت کے صرف ستر برس بعد اس کے پورے خاندان کے خاتمے کا حوالہ دیتا ہے۔

4۔ ایضاً صفحہ 11

5۔ ایضاً صفحہ 12

6۔ ایضاً صفحات 12، 13

7۔ ایضاً صفحہ 16

8۔ ایضاً

9۔ ایضاً صفحات 10، 11

10۔ تاریخ فیروز شاہی، صفحات 10، 11

11۔ Balazuri, the Origins of Islamic state, trans, Hitti (New york 1916), Introduction, p 3

12۔ ایضاً صفحات 32، 41

13۔ ایضاً صفحہ 87

14۔ ایضاً صفحہ 209

15۔ ایضاً

16۔ ایضاً صفحہ 222

17۔ ایضاً صفحہ 248

18۔ ایضاً صفحہ 250

19۔ ایضاً صفحات 265، 266

20۔ ایضاً صفحہ 255

21۔ ایضاً صفحہ 248

22۔ ایضاً صفحہ 504

23۔ ایضاً صفحات 509 تا 511 اور 516، 517

24۔ ایضاً صفحہ 521

25۔ ایضاً صفحہ 354

26۔ ایضاً صفحہ 116

27۔ میر خورد، سیر الاولیا، (دہلی 302 ہجری) صفحہ 312

28۔ تاریخ فیروز شاہی، صفحات 18، 20 وغیرہ

29۔ ایضاً صفحہ 2

30۔ ایضاً صفحات 343، 344

31۔ جیسا کہ برنی کے دو اور ہمعصروں، میر خورد اور حمید قلندر نے کیا تھا۔

32۔ اس کتاب کا اکیلا مسودہ رضا لائبریری، رامپور میں محفوظ ہے۔

33۔ تاریخ فیروز شاہی، صفحہ 505۔ برنی کے مطابق یہ سارے لوگ کم نسل تھے جنہیں ملک بنایا گیا اور گجرات، ملتان اور بدایوں پر مامور کیا گیا، ایک ماہر موسیقی کا بیٹا تھا دلدھا

ایک مالی تھا اور شیخ بابو نائک ایک جولاہے کا بیٹا تھا۔

34۔ ایضاً صفحات 556، 557

35۔ ایضاً صفحہ 557

36۔ ایضاً صفحہ 166

37۔ ایضاً صفحات 204 تا 205

38۔ ایضاً صفحات 43، 464 تا 465۔ برنی نے خصوصیت سے ذیل کے فلسفیوں کے نام لیے ہیں: سعد، عبید، نجم انتشار، مولانا نجم الدین۔

39۔ ایضاً صفحات 43، 465

40۔ ایضاً صفحہ 68

41۔ ایضاً صفحہ 69

42۔ ایضاً صفحہ 200

43 ایضاً صفحہ 166

44۔ ایضاً صفحات 525 تا 526

45۔ ایضاً صفحہ 467

46۔ ایضاً

47۔ صرف دو مثالیں دی جا رہی ہیں:

(1) برنی جلال الدین خلجی کا بڑا مداح ہے اور اس کی بڑی عزت کرتا ہے وہ اسے سلطانِ حلیم کہتا ہے اور اُن سب کو بُرا بھلا کہتا ہے جو اس کی المناک موت کا سبب بنے۔ لیکن یہ بات اُسے تفصیلات بتانے سے نہیں روک پاتی۔ تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ جلال پوری تیاری کے جانے اور احتیاط برتنے کے سارے مشوروں کو نظر انداز کر کے خود ہی موت کے کھلے جبڑوں میں گھس پڑا۔

(ب) برنی سیدی مولانا کے واقعے کا حوالہ دیتا ہے اور اپنی خوش اعتقادی میں اس واقعہ کو آندھی اور فوراً بعد میں ہونے والی خوراک کی کمی سے جوڑ دیتا ہے لیکن اس کے بیان سے یہ شبہ کسی کو نہیں رہتا کہ اس کی خانقاہ بے اطمینان عناصر کی پناہ گاہ بن گئی تھی۔ اور بھی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

48۔ تاریخ فیروز شاہی، صفحات 516 تا 17

49۔ ایضاً صفحہ 222

50- Hardy, Historians of Medieval India, p 39

51۔ تاریخ فیروز شاہی صفحہ 77 (et seq)

52۔ ایضاً صفحہ 132 (et seq)

53۔ ایضاً صفحات 184، 224 وغیرہ

54۔ ایضاً صفحہ 229 (et seq)

55۔ ایضاً صفحہ 375 (et seq)

56- Mohammed Habib The Political theory of the Delhi Saltanate, p 125

57۔ تاریخ فیروز شاہی، صفحہ 41۔

58۔ اسے جن لوگوں سے معلومات حاصل ہوئی اُن میں خواجہ ذکی، ملک قارا بیگ، امیر خسرو اور امیر حسن کا نام لیتا ہے۔ تاریخ فیروز شاہی، صفحات 67، 114، 229، 118، 370۔

59۔ ایضاً صفحہ 113

60- The Political theory of Delhi Sultanate p 126.

61۔ تاریخ فیروز شاہی، صفحات 24، 126، 174 وغیرہ

62۔ ایضاً صفحہ 132

63۔ فتوحات فیروز شاہی، صفحات ۱۸ تا ۱۹

64۔ تاریخ فیروز شاہی، صفحہ 49

65۔ ایضاً صفحہ 578

66۔ ایضاً صفحات 578 تا 579

67۔ ایضاً صفحہ 176

68۔ ایضاً صفحہ 287

69۔ ایضاً صفحہ 473

دورِ وسطیٰ کے کشمیر میں تاریخ نگاری

محبّ الحسن

اس مقالے میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ سلطنت کے دور میں کشمیر کی صرف فارسی تاریخ نگاری کا ذکر کیا جائے۔ اب یہ بات عام طور پر مان لی گئی ہے کہ صرف کشمیر ہی ہندوستان کا وہ واحد علاقہ تھا جہاں مسلمانوں کی آمد سے پہلے تاریخ نگاری کا دَور دورہ تھا۔ اور حالانکہ بہت سے روزنامچے لکھے گئے، لیکن صرف کلہن کی راج ترنگنی ہی تلف ہونے سے بچ سکی۔ یہ 9-1148ء میں مکمل ہوئی[1]۔ دو سو سال بعد جوناراج نے اس زمانے سے لے کر سلطان زین العابدین تک کے زمانے کے حال قلم بند کیا اور کلہن کی طرح اِس کا بھی نام راج ترنگنی رکھا۔ 1459ء میں جوناراج کے انتقال کے بعد اس کے شاگرد شری وَر نے، اس وقت کی تاریخ سے لے کر جہاں تک جوناراج نے لکھی تھی، 1486ء تک کا حال لکھا۔ شری ور کے انتقال پر پراجیہ بھٹ نے اپنی راجیہ وُلیتک تالیف کی جس نے 1517ء سے 1596ء تک کے دَور کا احاطہ کر لیا[2]۔ کشمیر میں لکھا جانے والا یہ سنسکرت کا آخری روزنامچہ تھا۔

چنانچہ کشمیر میں تاریخ نگاری کی ایک ٹھوس روایت موجود تھی، اور مزید یہ ہوا کہ سلطنت کے قیام کے بعد ایران اور ترکستان سے جو عالم فاضل لوگ آئے وہ اپنے ساتھ ایرانی اور وسط ایشیائی روایتیں لائے۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ ابتدائی اُسی برسوں میں فارسی کی کوئی تاریخی کتاب نہیں لکھی گئی۔ اس کا صرف ایک ہی سبب معلوم ہوتا ہے کہ اس دَور میں درباری زبان سنسکرت تھی۔ سلطان زین العابدین (70-1420ء) کے زمانے سے فارسی ادب اور دربار

کی زبان کی حیثیت سے سنسکرت کی جگہ لے لی۔ اور فارسی تاریخیں لکھی جانے لگیں۔ ان میں سے دو تاریخیں سلطان کے درباری شاعروں، ملا احمد اور ملا نادری، کی تھیں لیکن افسوس کہ ان میں سے کوئی بھی موجود نہیں ہے۔ ان تاریخوں کا بھی کوئی سراغ نہیں ملتا جو سلطان فتح شاہ کے دوسرے دورِ حکومت (1493 - 1505ء) میں قاضی ابراہیم نے چک عہد اور علی کے زمانے (88 - 1566ء) میں ملا حسن قادری نے لکھیں[3]۔ مغلوں سے پہلے کے دور میں تالیف ہونے والی صرف ایک ہی کتاب اب تک محفوظ ہے۔ یہ سید علی کی تاریخِ کشمیر ہے۔ جو یوسف شاہ کے دورِ حکومت میں لکھی گئی۔ باقی ساری کتابیں جو اب تک موجود ہیں مغلوں کے دورِ حکومت میں لکھی گئی تھیں۔ اس کے باوجود انھیں دورِ سلطنت کی کتابیں سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ ان کے مصنف کشمیر میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے اور انھوں نے بعد کے شاہ میر اور چک ادوار میں زندگی گزاردی۔ چنانچہ دورِ سلطنت کی تاریخوں میں سید علی کی تاریخِ کشمیر ہے جو 1579ء میں مکمل[4] ہوئی، ایک گمنام مورخ (اومر 287) کی تاریخِ کشمیر ہے جو 1590ء میں لکھی گئی[5]، ایک اور گمنام مورخ کی کتاب بہارستانِ شاہی ہے جو جہانگیر کے زمانے میں لکھی گئی[6]، حسن بن علی کاشمیری کی تاریخِ کشمیر ہے جو جہانگیر ہی کے زمانے میں لکھی گئی [7]، حیدر ملک کی تاریخِ کشمیر ہے جو 21-1620ء میں مکمل ہوئی[8]۔ کشمیر کی اور دوسری تاریخیں اس سے قطع نظر کہ وہ مندرجہ بالا کتابوں کی اختصار شدہ شکلیں ہیں، اٹھارھویں صدی اور انیسویں صدی میں لکھی گئی ہیں۔ اور اسی بنا پر اس موضوع کے لیے خارج از بحث ہیں۔

مندرجہ بالا کتابوں میں بہارستانِ شاہی اور حیدر ملک کی تاریخ سب سے زیادہ اہم ہے۔ دوسری کتابیں گو بعض پہلوؤں کے اعتبار سے مفید ہیں، لیکن تاریخوں کے تسلسل کے لحاظ سے ناقص ہیں۔ ان میں عام طور سے واقعات کے خلاصے ہیں اور بعض اہم تاریخی واقعات کا ذکر نہیں ہے، مثال کے طور پر سید علی کی تاریخ محض ان وجوہات کی بنا پر اہم کتاب سمجھی جاتی ہے کہ اس میں مرزا حیدر دغلت کی کشمیری ترقیوں کا ذکر ہے، جن پر اس نے اپنے

ذاتی مشاہدے کی مدد سے لکھا ہے اور دَورِ سلطنت کی مذہبی تاریخ کا ذکر ہے جس نے کتاب کے ایک تہائی حصّے کا احاطہ کر رکھا ہے، لیکن اس میں بہت اہم تاریخیں دی ہوئی ہیں اور دَورِ سلطنت کی سیاسی تاریخ کو زیادہ تر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ گُمنام مصنّف (اومر 267) کی تاریخِ کشمیر سلطان شمس الدّین (1540ء) کے دَورِ حکومت کی کشمیری تاریخ ہے۔ اس میں بھی چند ہی تاریخیں دی ہوئی ہیں اور بہت سے اہم واقعیات کا ذکر نہیں ہے جیسے ولیٔ کشمیر میں سیّد علی ہمدانی کی آمد۔ اس کے علاوہ بعض مقامات پر تحریر بہت اُلجھی ہوئی اور ناقابلِ اعتبار ہے۔ حسن بن علی کی تاریخِ کشمیر کی ایک مختصر تاریخ ہے، جو ایک کشمیری امیر جلال الدّین مُلک کی درخواست پر لکھی گئی۔ وہ اپنے آباؤ اجداد کے کارنامے محفوظ کرانا چاہتا تھا۔ کتاب کا دعوا ہے کہ اس نے قدیم زمانے سے 1616ء تک کے دَور کا احاطہ کر لیا ہے لیکن دراصل یہ سلطان حسن شاہ کے دَورِ حکومت (84-1472ء) تک محدود ہے۔ بعد کا بس ایک معمولی سا حوالہ یہ ہے کہ یعقوب شاہ نے اکبر کی اطاعت قبول کر لی تھی۔

اس کے برخلاف بہارستانِ شاہی اور حیدر مُلک کی تاریخ، تاریخوں کے تسلسل اور جغرافیائی خصوصیات دونوں اعتبار سے بہت کارآمد کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں اس دور کی تفصیلات جس دَور کا یہ احاطہ کرتی ہیں دوسرے روزنامچوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ دی ہوئی ہیں۔ بہارستان کے مصنّف کے بارے میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں معلوم کہ وہ غالباً بیہاقی سیّدوں[9] کا ملازم تھا اور ان ہی کے ایما پر اس نے یہ کتاب لکھی کیونکہ اس نے اس کتاب میں ان کی ترقّی اور کاموں کو خاص مقام دیا ہے اور ان کی بہت مدح سرائی کی ہے۔ اس کے ماخذوں میں کلہن کی راج ترنگنی، جوناراج اور شری ور کے روزنامچے، ملّا احمد، ملّا قادری، قاضی ابراہیم اور ملّا حسن قادری کی فارسی تاریخیں تھیں، جو سب اس کے زمانے میں موجود تھیں جہاں تک بعد کے شاہ میر اور چک فرمانرواؤں کا تعلق ہے اس نے اس کے بارے میں اپنے ہمعصروں یا ذرا بعد کے ہمعصروں سے معلومات حاصل کر کے یا اپنے ذاتی تجربے

کی بنا پر لکھا ہے۔ حیدر ملک نے اپنی تاریخ کشمیر کے بادشاہوں اور اپنے ان آباؤ اجداد کے عظیم کارناموں کو محفوظ رکھنے کے خیال سے لکھیں، جن آباؤ اجداد نے اپنے ملک کی تاریخ بنانے میں بڑا اہم رول ادا کیا تھا۔[10] حیدر ملک رام چندر کے خاندان سے تھے۔ جو کشمیر کے آخری ہندو راجہ سُنا دیو کا سپہ سالار تھا۔ ایک اچھا سپاہی مدبر سیاست داں، مورخ اور انجینئر ہونے کی وجہ سے وہ خود بھی ایک صاحب کمال شخص تھا۔ اس نے بیس برس تک یوسف خاں چک کی خدمت کی اور جب مغلوں نے کشمیر فتح کیا تو جلاوطنی کے ایام میں وہ اس کے ساتھ ہندوستان میں بھی رہا۔ یوسف خاں کے انتقال کے بعد وہ جہانگیر کا ملازم ہو گیا جس نے اسے چغتائی اور رئیس الملک کا لقب دیا۔[11] حیدر ملک نے بھی ان ہی مآخذوں سے استفادہ کیا جن سے بہارستان شاہی کے مصنف نے کیا تھا۔ جہاں تک چک دور کا تعلق ہے اس نے خود ہی بہت سے واقعات دیکھے تھے کیونکہ وہ زمانہ اس کی نوجوانی کا زمانہ تھا۔ اس کے علاوہ اسے بہت کچھ معلومات اپنے والد اور دادا سے ملی۔ جو سلطنت کے دور میں اعلا سرکاری عہدوں پر فائز تھے۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ کشمیر کی تاریخیں، کشمیر کی تاریخ نگاری کی اس روایت سے کس حد تک متاثر ہوئیں جس روایات کی نمائندگی کلہن، جوناراج یا شری ور کرتے تھے۔ ان کے مطالعے سے بہرحال یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مصنف نے ہندوستان اور ایران کی تاریخ نگاری کی روایتوں کی نقل کی ہے۔ ان دونوں ملکوں سے ان کا تہذیبی تعلق رہا۔ کشمیر کی فارسی تاریخوں میں واقعات بیان کرتے وقت تاریخوں کے تسلسل کا سختی سے خیال رکھا گیا ہے گو ان میں تاریخیں کم دی گئی ہیں لیکن انھیں حکومتوں کے دور، بغاوتوں، جنگوں اور فتوحات اور شاہی سلسلوں کے عروج اور زوال کے مطابق ترتیب دیا گیا ہے۔ واقعات کے بیچ بیچ میں شعر دیے گئے ہیں جن سے کوئی نہ کوئی سبق ملتا ہے یا صوفیوں کی کرامات کی حکایتیں اور کہانیاں یا ایسے دوسرے مافوق الفطرت حالات دیے ہوئے ہیں جو کشمیر کے پہاڑوں، جھیلوں، چشموں اور دریاؤں میں رونما ہوئے۔[12] ان میں وادی کی اندر اشاعت اسلام کے بارے میں خاصا کچھ دیا گیا ہے،

لیکن لوگوں کی سماجی اور اقتصادی حالات پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ حالانکہ ان میں زیادہ تر واقعیات کا محض بیان ہے لیکن بعض اوقات تشریح کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ کوئی واقعہ کیوں رُونما ہوا۔ چنانچہ مرزا حیدر دغلت کی طاقت توڑنے کا حال بیان کرتے وقت حیدر ملک تشریح کرتا ہے کہ اس کا سبب اس کے وہ ظالمانہ اقدامات تھے جن کی بنا پر کشمیر کے لوگ مخالف ہو گئے اور بغاوت پر آمادہ ہو گئے[13]۔ بہارستان کا مصنف اس ظلم کے بارے میں زیادہ واضح ہے اور یہ کہتا ہے کہ مرزا حیدر کی طاقت اس بنا پر توڑی گئی کہ وہ شعیوں، شافعیوں اور صوفیوں پر جبر کرتا تھا[14]۔ اسی طرح یہ کتابیں مغلوں کی فتح کشمیر کا سبب یہ بتاتی ہیں کہ یوسف شاہ عیش طرب میں وقت گزارتا تھا اور ریاست کے معاملات میں بے پرواہی برتتا تھا۔ اس کا مزید سبب یہ بتاتی ہے کہ یعقوب شاہ نے وادی کے دفاع کا خیال نہ رکھا اور سُنیوں پر جبر کیا[15]۔

کشمیر کی فارسی تاریخوں کے بعض دلچسپ پہلوؤں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ جذبہ حب الوطنی کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ کشمیر کے مورخین کو کشمیر کی سرسبز وادیوں، برف سے لدی پہاڑیوں، چکر دار راستوں سے بہتے ہوئے دریائے جہلم، حیات آفریں اور مقدس چشموں اور دلکش مناظر سے محبت ہے۔ وہ بڑے فخر کے ساتھ سلطان شہاب الدین کی فتوحات اور سلطان زین العابدین کی تہذیبی عظمتوں کا ذکر کرتے ہیں، اور 1527ء کے بعد تک کشمیریوں نے مغلوں کے حملوں کو جس کامیابی سے روکا اس کی بڑی مدح سرائی کرتے ہیں۔ وہ یوسف شاہ پر بڑی تنقید کرتے ہیں کہ اس نے مغلوں کے خلاف جدوجہد ختم کر دی اور ان کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اور اس کے بیٹے یعقوب کی بڑی تعریف و توصیف کرتے ہیں کہ اس نے بڑے ناموافق حالات میں جنگ جاری رکھی اور بالآخر جب کشمیر کی آزادی سلب ہو جانے پر ان کا رنج و الم بظاہر پوشیدہ رہتا ہے لیکن روزنامچوں کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو نظر آنے لگتا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ روزنامچے مغلوں کے دور میں لکھے گئے تھے اور ان کے مصنف کھلا کر کوئی

ایسی بات نہیں لکھ سکتے تھے جو اُن کے نئے آقاؤں کو ناراض کر دے۔

پورے ہندوستان کی بیشتر اہم تاریخوں نیز صوبائی حکومتوں کی تاریخوں میں ہندوستانی تاریخ کے قبل از اسلام دَور کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس کشمیر کی فارسی تاریخیں اس جزیرے کی افسانوی ابتدا سے شروع ہو جاتی ہیں اور ان میں قدیم راجاؤں کی تاریخ دی جاتی ہے اس کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ دَورِ وسطیٰ کے مورّخین کے پاس گو قدیم ہندوستان کی کوئی ایسی تاریخ موجود نہ تھی جس سے مواد حاصل کیا جا سکے، لیکن کشمیر کی تاریخ پر کلہن کی راج ترنگنی بڑی آسانی سے دستیاب ہو جاتی تھی، جس کا فارسی ترجمہ بھی سلطان زین العابدین کے زمانے میں کیا جا چکا تھا۔

بہارستانِ شاہی کا اندازِ بیاں بڑا پُر تکلّف اور طوفانی ہے، جبکہ حیدر ملِک کی تاریخ شاہ اور صاف ستھری زبان میں لکھی گئی، دونوں ہی اعتدال کے ساتھ لکھتے ہیں اور سخت زبان سے گریز کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر دونوں غیر مسلموں کو عادتاً جہنم رسید نہیں کرتے وہ کُفر اور کافر جیسے الفاظ کا استعمال تو کرتے ہیں، لیکن اُن میں تحقیر کا پہلو نہیں ہوتا، اور حالانکہ وادی میں اشاعتِ اسلام کے سلسلے میں وہ سیّد علی ہمدانی اور ان کے بیٹے محمد ہمدانی کی سرگرمیوں کا ذکر بڑی تفصیل سے کرتے ہیں، لیکن ان کی تحریر سے برتی یا بدایونی کا کٹرپن ظاہر نہیں ہوتا۔ کشمیر کے مورّخین اپنی شخصیوں کے معاملے میں زیادہ تحمّل اور معروضیت سے کام لیتے ہیں چنانچہ بہارستان کا مصنّف شیعہ ہونے کے باوجود یعقوب شاہ کی اس تعصّبانہ حکمتِ عملی کو ناپسند کرتا ہے جو اس نے سُنّیوں کے خلاف روا رکھی، اور قاضی موسا کے قتل پر بھی تنقید کرتا ہے کیونکہ یہ حکم قتل اس بنا پر دیا گیا تھا کہ انھوں نے اذان میں حضرت علی کا نام لینے سے انکار کر دیا تھا[64]۔

اسی طرح، گو بہارستان کا مصنّف اور حیدر ملِک دونوں ہی سلطان سکندر کی ان سرگرمیوں کا حال بیان کرتے ہیں جو بُت شکنی سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن سلطان زین العابدین اور اس کے جانشینوں نے کشمیر میں ہندو مذہب کی حیثیت بحال کرنے اور ہندوؤں کے ساتھ رواداری

کے ساتھ پیش آنے کے سلسلے میں جو اقدامات کیے ان کو وہ ناپسند نہیں کرتے۔ بہارستان کا مصنف لکھتا ہے:

"سلطان سکندر کے زمانے میں جو مندر توڑے گئے تھے انھیں دوبارہ بنوایا گیا جو ہندو جوگی اور کشتاور بھاگ گئے تھے انھیں واپس بلایا گیا۔ ہندوؤں کے علم و ادب کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ ہندوؤں کو پوجا پاٹ کرنے اور رسم و رواج ادا کرنے کی پوری آزادی دی گئی۔ چنانچہ انھوں نے سال کے مخصوص دنوں میں اپنے تہوار منانے شروع کر دیے۔ سلطان زین العابدین خود ان تہواروں میں شرکت کرتا تھا۔ وہ گویوں اور رقاصوں کو تحائف دیتا اور اسی وجہ سے بڑا مقبول ہو گیا تھا۔ زین العابدین کی سرپرستی میں ہندو مذہب کے احیا کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے بھی ہندوؤں کی رسمیں اپنا لیں۔ حتیٰ کہ یہ رسمیں صاحب علم لوگوں اور علما میں رائج ہو گئیں۔ یہ صورت حال شمس الدین عراقی کے زمانے تک برقرار رہی جس نے بت پرستی کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے۔"

ان مورخین نے کشمیری قدیم تاریخ کے لیے جس ماخذ سے استفادہ کیا وہ کلہن کی راج ترنگنی تھی لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے کلہن کی تکنیک نہ اپنائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے کتبوں اور دستاویزوں سے رجوع نہ کیا۔ اس بات کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ انھوں نے ان سرکاری محافظ خانوں سے فائدہ اٹھایا جو سلطانوں نے قائم کیے تھے اور نہ انھوں نے سلطنتِ دہلی کی تاریخوں کا مطالعہ کیا۔ ان کے ماخذ محض ابتدائی کشمیری کتابیں تھیں جن کے بیانات بلا تنقید تسلیم کر لیے گئے۔ کشمیر کے علاوہ کسی اور تاریخی کتاب سے استفادہ نہ کرنے کی بنا پر ان کے بیانات میں بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا بیان چونکہ زیادہ تر اپنے ہی سلاطین کے بیانات پر مشتمل ہے۔ اس لیے وہ لکھتے ہیں کہ شہاب الدین نے پہلے بدخشاں

کابل، غزنی اور قندھار فتح کیے اور پھر دہلی فتح کرنے کے ارادے سے آگے بڑھا۔ وہ ستلج کے کنارے خیمہ زن ہوا جہاں فیروز شاہ تغلق مقابلے پر آیا۔ یہاں ایک جنگ ہوئی۔ لیکن شکست و فتح کا فیصلہ نہ ہو سکا آخر کار معاہدۂ امن ہوگیا۔ طے یہ پایا کہ سرہند سے کشمیر تک کا سارا علاقہ فیروز شاہ کا ہوگیا۔ دہلی اور سری نگر کے حکمرانوں میں علاقائی معاہدے کے ساتھ شادی کا رشتہ بھی ہوا۔[18]

اگر عصری تاریخوں کا مطالعہ کیا جاتا تو یہ بیان جھوٹا ثابت ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کشمیر کے مورخوں نے دہلی سلطنت اور ترکستان کی تاریخیں دیکھنے کی زحمت گوارہ کی ہوتی تو اُن سے غلطیاں سرزد نہ ہوتیں۔ ان میں یہ رُجحان عام تھا کہ واقعات کو بلا تنقید مان لیتے تھے۔ اس رُجحان میں ایک غلط قسم کا مدبہ حب الوطنی بھی شامل ہوگیا جس کی بنا پر انھیں برابر یہ فکر رہتی کہ کشمیر کے سلطانوں کے کارنامے بڑھا چڑھا کر بیاں کیے جائیں۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ حقیقی واقعات اور من گھڑت قصوں میں تمیز نہ کر سکے۔

جس بات کی طرف میں پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں وہ یہ ہے کہ کشمیر کے مورخوں نے مشترک ماخذوں کی بنیاد پر لکھا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان بیانات میں یکسانیت اور عدم تنوع ہے۔ چنانچہ روزنامچوں میں، خواہ شاہ میر حکومت کے قیام کا بیان ہو یا سلطان شہاب الدین کی فتوحات کا، یا خواہ سید علی ہمدانی اور اُن کے بیٹے محمد ہمدانی کی سرگرمیوں کا بیان ہو یا سلطان زین العابدین کے کارناموں کا، سب ہی بیاں ایک جیسے لگتے ہیں۔ ہاں جب ہم بعد کے شاہ میر اور چک ادوار پر پہنچتے ہیں تو بیانات میں تنوع اور اختلافات نظر آتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں ایسے مشترک ماخذ نہیں ملتے جن سے مواد حاصل کیا جا سکے۔

حوالہ جات

1- Kalhana, Rajatarangini, English trans M.A. Stein, 2 vols, London, 1900.

2- جناراج، سری ور، پراجیہ بھٹ اور شکا کی کتابوں کی ترتیب و تدوین 1896ء میں Paterson نے کی، سنسکرتی۔ انگریزی ترجمہ J.C Dutt نے کیا انگریزی ترجمہ کا نام اور حوالہ یہ ہے:

Kings of Kashmir, 3 vols Calcutta 1879-98

3- Mohibbul Hasan, Kashmir under the Sultans, P1.

4- شعبۂ تحقیق و طباعت، سری نگر

5- Tarikh-i-Kashmir-K Hof Stats biblio thek Munich

6- بہارستانِ شاہی 509 'Indian office'

7- حسن بن علی کاشمیری، تاریخِ کشمیر 315 'Bodlean'

8- حیدر ملک، تاریخِ کشمیر 509 'Indian office'

9- بیہاقی سید سلطان سکندر کے زمانے میں کشمیر آئے۔ انھوں نے شاہی خاندان میں شادیاں کیں، اور وادی کے سیاسی معاملات میں اہم رول ادا کیا۔ بیہاقی سیدوں میں سے ایک تھوڑی مدت کے لیے بادشاہ بھی رہا۔

10- حیدر ملک، تاریخِ کشمیر (الف) 3 اے

11- حیدر ملک کو ان خطابات سے سرفراز کیے جانے کا خاص سبب یہ تھا کہ شیر افگن کے قتل کے بعد اس نے اور اس کے بھائی علی ملک نے مہرالنساء کی جان اور عزت بچائی تھی۔ اس ضمن میں میرا مندرجہ ذیل مضمون دیکھیے:-

A Note on the Assassination of Afgan, Dr. Yazdani, Commemoration Volum, ed. H K Sherwani 1966

12- حیدر ملک نے اپنی تاریخ کا پورا ایک حصہ کشمیر کی جھیلوں، چشموں وغیرہ میں رونما ہونے والے مافوق الفطرت واقعات کے لیے وقف کر دیا ہے۔

13- ایضاً 146a

14- بہارستانِ شاہی 120a-b, ff 111b - 112b

15- حیدر ملک، تاریخ کشمیر 192a-b، بہارستانِ شاہی ff 181a—b,

16- ایضاً

17- ایضاً ff 48b

18- ایضاً f 206؛ حیدر ملک تاریخ کشمیر ff 108b — 109b.

شیخ سکندر کی مراتِ سکندری اور اس سے پہلے کی کتابیں

ایس سی مسرا

سکندر بن منجھو کی مراتِ سکندری کو اس بنا پر غالباً ناقابلِ رشک یا شاید لائقِ رشک امتیاز حاصل ہو چکا ہے کہ اس نے پہلے اور بعد کی ساری کتابوں کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ اب یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ خصوصاً تاریخ کشمیر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے یہ ایک سہل کتاب ہے۔ اٹھارھویں صدی کے ایک مغل مورخ نے جو مغل گجرات پر اتنا ہی یا پھر اس سے زیادہ ممتاز مصنف سمجھا جاتا ہے، محض اتنا ہی کیا ہے کہ دورِ سلطنت پر جو چند صفحات لکھے ہیں ان میں مرات کے ابتدائی حصے کا خلاصہ چند ایک اضافوں کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ بعد کے مصنفین حتیٰ کہ برطانوی مصنفین نے بھی اس دور کا سرسری جائزہ لیتے وہ شاید ہی اس سے زیادہ کچھ لکھا ہے۔ سر ڈینسی روس نے اتفاقاً ظفر الوالہ دریافت کی جو اتنی ہی قابلِ قدر اور جامع ہے جتنی مرات ہے اور جہاں تک مجھے علم ہے یہ اس ملک میں لکھی جانے والی عربی تاریخوں میں غیر مذہبی اعلانکی واحد تاریخ انداز کی واحد تاریخ ہے۔ اسی اتفاقی دریافت کے بعد ہی یہ تسلیم کیا گیا کہ مرات کی ہم پلہ اور اتنی ہی قابلِ قدر کتابیں موجود ہیں" اور اس کو جو اعلیٰ مقام دیا گیا تھا وہ مقام نہ خود اس کے لیے حق بجانب تھا اور نہ ان تاریخوں کے لیے حق بجانب تھا اور نہ ان تاریخوں کے پیش رو کی جگہ اس نے لے لی تھی کیونکہ یہ دوسری تاریخیں گمنامی کی حالت میں پڑی رہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر لوگ مرات کی جلدیں ہندوستانی اور غیر ملکی کتب خانوں میں بکثرت ملتی ہیں اور

اُدھر دوسری کتابیں کمیاب ہوتے ہوتے تقریباً نایاب ہوگئیں، اور ایک قابل قدر کتاب تو بالکل ہی غائب ہوگئی۔

تاہم گجرات کے مورخوں نے گجرات کی بڑی خدمت کی۔ پہلے ہی سلطانوں کے زمانے سے تاریخیں، روزنامچے اور غلط نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ نصرت انگیز حد تک خوشامدانہ قصیدے لکھے جانے لگے تھے۔ میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ یہاں اُن کی فہرست دوں یا تاریخی اعتبار سے اُن کی قدر و قیمت بتاؤں۔ یہ کام میں ایک اور مقالے میں کرچکا ہوں اور یہی کام دوسرے مصنفین بھی کرچکے ہیں۔ میں صرف یہ بتانا چاہوں گا کہ سرکاری تاریخ نگاری کو شروع ہی سے سلطانوں کی سرپرستی حاصل رہی اور سکندر کو خواہ درباری نہ کہا جاسکے لیکن نہایت اسنبار ضرور کہا جائے گا کیونکہ اس نے بُرز ور طریقے سے یہ کہا ہے کہ جن مورخین نے بادشاہوں کے اعمال ان کے زمانے میں درج کیے، اُن مورخین نے اپنے بیان میں نقصان دہ مدات شامل کرکے حق پر مصلحت کو ترجیح دی۔[2]

افسوس کہ سکندر نے جو تاریخیں استعمال کیں ان میں دو یا تین کے علاوہ نقہ یا تو مل نہ سکی ہیں یا پھر ابھی تک دریافت نہ ہوسکی ہیں، اسی لیے ہم اس کے فیصلوں پر کوئی رائے قائم نہیں کرسکتے۔ اس کے باوجود انھیں ایک حد تک جانچا جاسکتا ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سب نہیں تو بھی لیکن بہت سے مورخین میں وہ ساری خوبیاں اور خامیاں موجود تھیں جو درباری مورخین میں ہوتی تھیں۔ حلوی شیرازی نے اپنی معلوم تاریخ احمد شاہی میں صنعت ادب کی خاطر مضمون کو قربان کردیا ہے، کم از کم طمطراق والے ان اشعار میں تو ضرور قربان کیا ہے جو مرات میں نقل کیے گئے۔ اسی لیے انگریزی ترجموں میں ان شدید اعتراضات کو شامل نہ کرنے کی وجہ سے کوئی کمی واقع نہیں ہوتی ہے۔ شاید اپنے غیر شاعرانہ لمحات میں جنھیں سکندر نے نقل کرنا مناسب نہ سمجھا، حلوی نے ضرور کچھ نہ کچھ نئی معلومات دی ہوگی۔ لیکن اگر داخلی ثبوت سے کچھ روشنی مل سکتی ہے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کا امکان نہیں معلوم ہوتا۔ وہ تاریخیں زیادہ قابلِ قدر اور

زیادہ حوصلے کے ساتھ لکھی گئی ہیں جو عالمگیر ہیں اور سال وار ترتیب دی گئی ہیں۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ یہ موجود ہیں۔ یہ سب سلطان محمد شاہ جو گجرات میں 'ملکاڑ' کے نام سے مشہور تھا' کے دورِ حکومت میں لکھی گئی ہیں۔ سب سے پہلی کتاب تاریخِ محمود شاہی ہے جس کے مصنف کے بارے میں شبہ ہے اور جس کا بیان ضمیمۂ محمود شاہی تک چلتا ہے۔ تیسری بھی ایک عالمگیر تاریخ 'تاریخِ صدر جہاں' ہے' جو مشکل ہی سے ہندوستان کی تاریخ کہی جاسکتی ہے۔ یہ کتاب ملا شہ وسیع العلمی کی ایک یادگار ہے' اور موجودہ سیاق میں اس بنا پر بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ اس کی مدد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ احمدآباد کے دربار میں یا پٹن کی خانقاہوں میں کس انداز کا علم و فضل پروان چڑھ رہا تھا کیونکہ جیسا مجھے معلوم ہوا ہے کہ پٹن کی خانقاہوں میں حدیث اور فقہ جیسے اعلا علما کی قدر تھی اور تاریخ کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

مجھے ابھی تک طبقات محمود شاہی کا مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملا' لیکن ایک مستند حوالے سے معلوم ہوا ہے کہ وہ اتنی بیش قیمت نہیں ہے جتنی توقع کی جاتی تھی[3]۔ غالباً اس کے بعض بیانات غیر واضح ہیں۔ مصنف نے واقعات کو سال وار ترتیب کے ساتھ درج کیا ہے' اور اسی بنا پر اپنے اُوپر اور زیادہ پابندی عائد کرلی ہے۔ ایسی ترتیب تاریخوں کے تسلسل کے اعتبار سے لاکھ اچھی سہی لیکن غور و فکر کے لیے کم موقع دیتی ہے' حالانکہ یہی غور و فکر تاریخ نگاری کی رُوح ہوتا ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ یہ کتاب غالباً کبھی مکمل نہ ہوسکی' اور اس کے دونوں نسخے' ایک ناتمام متن کے نہایت نامکمل مسودے ہیں[4]۔ گجرات پر کام کرنے والے مورخ کو تاریخِ محمود شاہی سے زیادہ مدد ملتی ہے۔ لیکن سکندر نے اسی کتاب پر نستن زنی کی ہے۔ اس کی رائے میں اس کے مصنف نے اپنے سارے جوہر حق کی پردہ پوشی میں صرف کردیے ہیں۔

درباری تاریخیں یا ایسی تاریخیں جو کسی کے حکم پر کسی کی خوشی کی خاطر لکھی جاتی ہیں جیسا کہ یہ دونوں ہیں' عام طور سے بڑی مفصل' جزویات پر حد سے زیادہ زور دینے والی' رنگینی زبان سے مرتین اور طویل نویسی کا نمونہ تو ہوتی ہیں' لیکن شاذ و نادر ہی حق اور حق کے سوا کچھ نہیں؛

کے اصول پر عمل کرتی ہیں۔ کمزوری کی سطح پر روغن لگانے کا یہ میلان مالوہ کی عصری تاریخ مآثر محمود شاہی میں بہت نمایاں ہے جو الکرمانی نے لکھی ہے۔ اس کی مدح اور دل دار شعر تقریباً آٹھ سو ایسے صفحات میں پھیلی رہتی ہے، جو مبالغہ آمیز القابات سے پُر ہیں۔ سکندر نے الفاظ کی اسی بھرمار اور گھلی ہوئی ملاوٹ میں حق کو فضولیات سے علاحدہ کرنے کے لیے قدم اٹھایا۔ اس نے اپنے پیشرو مصنفوں پر جو سخت اعتراضات کیے ہیں وہ اعتراضات اور خود اس کی معذرت اس لائق ہیں کہ نقل کیے جائیں۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان مصنفین میں سے جس نے بھی حکمراں سے انعام لیا یا سرپرستی کی توقع رکھی اس نے اس سبب کی بنا پر اپنی تاریخ میں مکمل اور دُرست واقعات بیان کرنے سے گریز کیا۔ اِسی لیے ان صفحات میں وہ بیانات شامل نہیں کیے ہیں جو اُن سرپرستوں کی تعریف سے تعلق رکھتے ہوں، ویسے کوئی انسان خوبیوں اور خامیوں سے بالاتر نہیں ہوتا۔۔۔

اور گجرات کے ان سلطانوں کا ذکر کرتے وقت جو منصفانہ برتاؤ کرتے تھے میں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ ان کے محض اچھے افعال کا ذکر کروں اور بقایا افعال کو مبہم رہنے دوں کیونکہ تو لازمی پر یہ پتہ لگا کہ اچھے افعال بُرے افعال پر بھاری ہیں۔ اور بعض صورتوں میں بُرے افعال سرے سے ہیں ہی نہیں۔ بہر صورت، لائق اعتماد اشخاص سے اچھا یا بُرا جو کچھ بھی سُنا ہے یا تاریخوں کی چھان بین سے جو کچھ بھی جمع کیا ہے اسے قلم بند کر لیا ہے تاکہ قاریوں کو یہ علم ہو جائے کہ ان حکمرانوں کی اچھائی کس حد تک ظاہر ہوا اور انہوں نے بُرائی سے کہاں تک پرہیز کیا۔ اور انہوں نے فتح (جہانگیری) اور حکمرانی (جہاں بانی) کے لیے کیا طریقے اختیار کیے، لہذا اس مختصر کتاب کا نام آئینۂ سکندر رکھا ہے تاکہ ہر واقعہ بغیر کسی کمی بیشی کے مکمل طور سے اس میں نظر آ سکے۔۔۔۔

ایک ایسے بازار میں جو پہلے ہی سے بھرا پڑا تھا، نئی شے لانے پر سکندر نے بڑی نیک نیتی کے ساتھ معذرت چاہی ہے۔ اس کی رائے میں جب سچ کا پورا علم ہو جائے گا، اُس وقت [illegible]

محنت سے حاصل ہوئی اس کی یہ تصویریں ماند نہ پڑیں گی۔ بلکہ ان کے حسن میں اضافہ ہو جائے گا کیونکہ ان کے بارے میں تجسس سے کھلا کہا جا چکا ہوگا اور ابہام دور ہو چکا ہوگا۔

اس پر شبہ کیا جا سکتا ہے کہ متعدد دشواریوں کے باوجود محض اسی سبب کی بنا پر سکندر نے کاغذ اور قلم سنبھال لیا، ظاہر ہے کہ سلطانوں کا زمانہ پہلے ہی گوشۂ گمنامی میں جا چکا تھا۔ اسے اپنی محنت کے صلے میں کسی انعام یا سرپرستی کی توقع نہ تھی۔ بس شاید محنت سے حاصل کی ہوئی ایک جائز شہرت کی توقع ہو۔ اور بھی کئی اہم باتیں دریافت کی جا سکتی ہیں جنھوں نے سکندر کو مجبور کر دیا ہوگا کہ وہ اپنی زندگی کی شام میں ایک اتنی مشکل مہم سر کرنے کا فیصلہ کرے جس کی انجام دہی پر کسی بڑے انعام کی توقع بھی نہ ہو۔

یہ بات بہرحال کسی صورت میں نظرانداز نہ کرنی چاہیے کہ سکندر کو اپنے علاقے سے لگاؤ اور اس کے ماضی کے بارے میں تشویش تھی۔ اس کی نظر میں مغلوں کا گجرات سلطانوں کے گجرات کے آگے ماند تھا۔ وہ چمپانیر کی عظمتِ رفتہ کا ماتم کرتے ہوئے کہتا ہے "یا غفور الرحیم کیا چمپانیر ایسا ہی تھا؟ اب تو یہ شیروں اور چیتوں کا مسکن ہے۔ اس کی عمارتیں تباہ ہو چکیں، ان کے شہروں کی جائداد اور املاک بربادی کی ہواؤں کی نظر ہو گئی، حتیٰ کہ اس کا پانی بھی زہر آلود ہو گیا.... یہاں تو قرآن کی اس پیشین گوئی کا اطلاق ہو چکا ہے کہ صفحۂ ہستی سے ہر چیز مٹ جائے گی، سوائے ذوالجلال و الاکرام کی ذات کے جو ہمیشہ رہنے والی ہے[5]"

مثال کے طور پر کہیں اور جب سکندر پرتگالیوں کے خلاف سلطانوں کی شجاعت، اور مغلوں کی نسبتاً کمزوری کا مقابلہ کرتا ہے تو فیصلہ ہمیشہ گزرے ہوئے زمانے کے حق میں کرتا ہے۔ سورت کا ملک جس میں مالوہ، خاندیش اور گجرات کی ساری خوبیاں موجود تھیں اور جس کے بندرگاہ گجرات کو مال تجارت فراہم کرتے تھے، وہی ملک صوبیداروں کے مستقل تبادلوں کی وجہ سے تحفظ کرنے والے بحری بیڑوں کے فقدان، فریبی تاجروں، جھوٹے مرشدوں، زبردستی قبضہ کرنے والے زمینداروں اور شکستہ حال فوجیوں کی آماجگاہ بن گیا ہے[6]۔

ظاہر ہے کہ یہ کُل بیان دُرست نہیں ہے۔ یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ اکبر اور جہانگیر کے زمانے کا گجرات کیا واقعی محمود شاہ بگاڑا اور مظفر شاہ کے زمانے کے گجرات سے کم مالدار تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ ان بوڑھے آدمیوں کی سی آہ زاری ہے، جو ہمیشہ اپنے اور اپنے سے پہلے کے زمانے کے گرد حلقہ اور دیکھا کرتے ہیں۔ لیکن کہیں اس سے زیادہ کوئی اور بات تو نہیں ہے؟

یاد رہے کہ سکندر کی دو ہی نسلیں گجرات میں رہی تھیں۔ اس کے والد ہمایوں کے ساتھ گجرات آئے اور غالباً سوائے انتہائی قابلِ تعظیم اور شاہانہ سیّدوں کی ملازمت اختیار کرکے وہیں رہنے لگے۔ اِسی ملازمت کے دوران سکندر کے والد وہاں منجھو کو خاصہ اعزاز حاصل ہوا، اور سکندر کو ان کے پوتے سیّد حامد، اُن کے بیٹے سیّد مراد اور خود ان کی معیت میں سلوک کے نئے تجربات ہوتے۔ اکبر کے پورے دَورِ حکومت اور جہانگیر کے دَور کے پہلے پانچ برسوں تک وہ ان ہی سیّدوں کے ساتھ رہا اور اس کے بعد مغلوں کی ملازمت اختیار کرلی۔

لہٰذا سکندر کی دو حیثیتیں تھیں۔ ایک حیثیت چندہ قسم کے غیر ملکی کی تھی کیونکہ گجرات میں وہ ایک ایسی برادری کا فرد تھا جو واقعی غیر ملکی تھے اور جس نے اپنا تہذیبی ورثہ شمال سے حاصل کیا تھا، اور دوسری حیثیت اپنی برادری کے ان اہم رُتبہ افراد کے درمیان تھی جو دوسرے علاقوں میں رہ رہے تھے اور خود کو ان علاقوں کے ماحول میں ڈھال چکے تھے اور وہیں کے باشندے کہلانے لگے تھے۔ سکندر دراصل امرائے اسی غیر ملکی حکمران طبقے کے واسطے سمت کا تعین کررہا تھا اور اسے یہ فکر تھی کہ ان پر ان کے اور اپنے دیس اور دیس کے تہذیبی ورثے کی عظمت ثابت کرے۔ اِسے ایسے دَورِ ماضی سے کوئی سروکار نہ تھا جو تاریک ہو۔ سلاطین دہلی کے گجرات سے بھی اسے دلچسپی نہ تھی کیونکہ اس دَور نے گجرات کی عظمت میں شاید ہی کچھ اضافہ کیا ہو، لیکن گجرات کے سلطانوں کا معاملہ کچھ اور تھا۔ سکندر شاید اس بیان کی مخالفت نہ کرتا کہ مغلوں کے سارے صوبوں میں گجرات کا ماضی سب سے زیادہ پُرعظمت تھا۔

اس جگہ میں اپنی یہ رائے پیش کردوں کہ جس جذبے نے ایسے غیر ملکی اعمال کی تربیت کی

حصوں نے اس ملک کو اپنا لیا تھا، اور اپنے ان کارناموں پر فخر کرتے تھے جو انھوں نے اس ملک میں انجام دیے تھے، وہ جذبۂ قوم پروری کے اس نوزائیدہ جذبے سے ملتا جلتا تھا جس نے صنعتی سماج سے پہلے جنم لیا تھا۔ یہ جذبہ لوگوں کے اندر جڑ نہ پکڑ سکا۔ کیونکہ جوابی عمل مختلف محرکات کی بنا پر ہو رہے تھے اور سکندر جن اعلا خیالات کا اظہار کرتا تھا وہ ذہنوں میں سرایت نہ کر سکے تھے لہٰذا یہ جذبہ مشکل ہی سے نفوذ کے لائق تھا۔ یہ کاغذ کی طرح باریک تھا اور صرف سطح تک ہی محدود تھا لیکن اس نے ایک ایسا ذہنی ماحول ضرور تیار کر دیا تھا جس کی مدد سے حکمراں طبقے کے افراد میں اتفاق ہو سکے اور وہ اپنے پرائے میں تمیز کر سکیں۔

لہٰذا سکندر کے لیے دَورِ حال جو سب کا ملا جلا ورثہ تھا اتنا روشن دَور نہیں تھا جتنا ماضی کیونکہ اس زمانے کے گجرات اور گجراتیوں کو مغل امرا میں ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ اسی لیے سکندر کو عوام انعام و اکرام کی زیادہ توقع نہ ہو لیکن ان مغل امرا کے قدر و منزلت کی توقع ضرور تھی جو گجرات کے باشندے تھے۔ اور تبواے سیدوں سے تو کوئی بھی توقع نہ تھی۔ اور یہ کتاب گجرات اور اس کے عوام کے ورثے کی اہمیت ان امرا کے ذہنوں میں بھی بٹھا سکتی تھی جن میں سے بعض امرا بھی اعلا حیثیت کے مالک تھے۔ سکندر نے اپنی کتاب کی ایک جلد خود اعتماد الدولہ کو پیش کی تھی، اور غالباً اسی مقصد سے آگرہ کا سفر کیا تھا۔ اس سے محض مادّی مقاصد کے حصول کی خواہش ہی کا نہیں بلکہ مصنّف کے بجا فخر کا بھی پتہ لگتا ہے جو اسے اپنی کتاب اور اس کے موضوع پر ہوتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ خصوصیت ہر علاقے کے طبقۂ امرا میں تھی لیکن گجرات کے بارے میں ہمیں زیادہ علم ہے کیونکہ یہاں ادب اور تاریخ نگاری کی روایت زیادہ گہری ہے، اور غالباً ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دریائے گنگا کے وسطی میدان اور بنگال کو چھوڑ کر مادّی اعتبار سے یہ صوبہ مغل صوبوں میں سب سے زیادہ مالدار تھا۔ اس کے سمندری ساحل کی وجہ سے عربی اور فارسی روایت سے اور زیادہ رابطہ قائم کرنے کا موقع ملا، جس کی بنا پر ایک دیسی مسلم روایت نے

جنم لیا۔ اس روایت کی نشوونما مقامی مسلم برادریوں نے کی۔ سرکاری طبقے میں سے بعض برادریاں
کو بدعتی سمجھتے تھے۔ یہ کہنا یقیناً بڑا مشکل ہے کہ گجرات کا ٹھپّہ کتنا گہرا تھا اور دوسرے علاقوں
کے ٹھپّوں سے کس طرح مختلف تھا لیکن یہ بات خاصی واضح ہے کہ ایک تو یہ ٹھپّہ تھا ضرور، دوسرے
حکمراں طبقے کے افراد میں تمیز کرنے اور اس طبقے کو غالباً مختلف سطحوں پر تقسیم کرنے میں مدد دیتا
تھا۔ تیسرے یہ کہ علاقوں سے تعلق اور اسی بنا پر تحرّک کا ایک احساس بھی پیدا کر دیتا ہے۔

میں نے پہلے اس بات کا حوالہ دیا ہے کہ سکندر کے والد نے بخارا کے سیّدوں کے تحت ترقّی کی،
خود اس نے ان کی ملازمت کی، اور تمام عمر اُن سے تعلق رہا۔ یہ بات تو واضح ہو چکی ہے کہ سکندر گجرات
کے سلطانوں کا بڑا مدّاح تھا لیکن وہ غالباً اُن سے بھی زیادہ اپنے سرپرست کے خاندان اور
اس کے آباؤاجداد کی عزت اور تعظیم کرتا تھا۔ ظفر خاں کے لیے گجرات کی سلطنت حضرت مخدوم کا عطیہ
تھی۔ گجرات میں اُن کے جانشین سیّد برہان الدین نے ظفر خاں کے جانشین قطب الدین شاہ
کو وہ ذرائع فراہم کیے تھے جن کی مدد سے وہ مالوہ کے سلطان محمود شاہ کے مقابلے میں خود کو بچا
سکا تھا۔ جب قطب الدین شاہ نے ان کی اطاعت چھوڑ دی تو نیست و نابود ہو گیا۔ اس کے
جانشین اور گجرات کے عظیم ترین سلطان کی پرورش شاہ عالم کے گھر ہوئی۔ شاہ عالم ان سیّدوں
میں سب سے افضل تھے اور گجرات میں آج بھی ان کی بہت تعظیم کی جاتی ہے۔[9]

اس طرح کی نہ جانے کتنی مثالیں دی جا سکتی ہیں کیونکہ سکندر کی تاریخ ایسی ہی مثالوں
سے بھری پڑی ہے۔ سکندر کا تعصب یا اس کی جانب داری حقیقتاً اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب
اس کی تاریخ طبقاتِ اکبری یا گلشنِ ابراہیمی کے ساتھ ملا کر پڑھی جائے۔ ان میں سے کوئی بھی
مصنّف سیّدوں کو وہ اصلیت نہیں دیتا جتنی سکندر کے صفحات میں نظر آتی ہے۔ اس کی
بابت بھی بظاہر معقول دلیلیں دی جا سکتی ہیں کہ سکندر نے اپنے سرپرستوں کو اونچا اٹھانے کے
لیے سلطانوں کا ذکر موزوں سمجھا۔

پھر بھی سکندر کے لیے یہ کہنا مشکل ہی سے جائز ہوگا۔ سکندر کو اس میں کوئی دورنگی نظر

نہیں آئی کیونکہ ایک مملکت کا دُنیاوی ستون تھا اور دوسرا مذہبی، اور ہر چند کہ دُنیاوی حکمراں اپنے میدان میں افضل تر ضرور تھے لیکن ان پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ اپنے سے برتر اس اقتدار کے آگے جھکیں جو راسخ العقیدگی، روحانی ورثے اور میدانِ مذہب میں ذاتی برتری کی بنا پر حاصل ہوتا تھا۔ اسی کے ساتھ حکومت کے مذہبی ستونوں کا بھی یہ فرض تھا کہ حکمران مشکل میں پھنسا ہو تو اسے بچائیں اور جب یہ توازن برقرار رہتا ہے تو ملک پھولتا پھلتا ہے۔ سکندر کو بڑا افسوس تھا کہ اس بے لکھے معاہدے پر ہمیشہ عمل نہیں کیا جاتا، اور وہ اس کا ذِمّہ دار سیّدوں کو نہیں سلطانوں کو ٹھہراتا ہے۔

اس خیال کی تہہ میں دَورِ وسطیٰ کا محلت واثر والا مفروضہ ہے۔ اس زمانے میں یہ بات عام طور سے مانی جاتی تھی کہ حالات کو معمول سے بدلنے کے لیے ایک مافوق الفطرت ہستی دخل انداز ہوتی ہے۔ اس زمانے کے تقریباً سارے لوگوں کی طرح سکندر کو یقین تھا کہ رُوحانی تربیت، اخلاقی سختی اور شاید اختیاری خود ذِلّتی سے جرأت حاصل ہوتی ہے[10]۔ اس لیے نیکی محض شخصیت کی روحانی ترقی ہی نہیں بلکہ ایک ایسا ذریعہ بھی ہے جس کو اختیار کرکے ماحول کو تبدیل یا کم سے کم متاثر کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے جنھیں یہ خوبی عطا ہوئی ہے انھیں اس کی تربیت کرنی چاہیے، اور دوسرے لوگوں کو ان کی عزت کرنی چاہیے۔

ظاہر ہے کہ سکندر نے ان قدروں کو اپنے زمانے کے روایتی اور راسخ العقیدہ خیالات کے سیاق میں دیکھا۔ اس نے یہ سمجھا کہ حکمران اور صوفی دونوں کی پہلی ذِمّہ داری یہ ہے کہ ایمان کا بول بالا کریں، بدعتوں کی بیخ کنی کریں، اور مملکت میں نظم وضبط بھی قائم رکھیں تاکہ مصدقہ نیکیاں پروان چڑھیں۔ مسلمان حکمراں جہاں تک ممکن ہو سکے آپس کے ٹکراؤ سے گریز کریں۔ لیکن ہمیشہ ایسا کرنا ممکن نہیں، کیونکہ حکمراں بھی اکثر اوقات خطا کر بیٹھتے ہیں۔ لہٰذا یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ سکندر مالوہ سے نزاع قائم رکھنے کی ذِمّہ داری گجرات کے فرماں رواؤں پر نہیں ڈالتا۔ وہ اس کی ذِمّہ داری اپنی حب الوطنی کی وجہ سے مالوہ کے سلطانوں کے سر ڈالتا ہے۔

گو تاریخی اعتبار سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بات ہمیشہ ہی درست رہی۔

یہ بات نظر میں ہو تو اس بات پر تعجب نہیں ہوتا کہ سکندر جو شواے سیدوں اور شاہ عالم اور ان کے جانشینوں کی روحانی استعداد اور بلند رتبے کا قائل تھا' احمد آباد اور شواے درمیان ناگزیر قسم کے تناؤ کو اس نظر سے دیکھتا تھا جیسے یہ سب کچھ سلطانوں کی حماقت کی وجہ سے ہو۔ یہ حماقت لائق مذمت تھی۔ تاریخ اس کی نظر میں' جیسا کہ اس نے اپنی کتاب کی تمہید میں لکھا ہے "تدریس بالمثال تھی۔ عظیم انسانوں کے اعمالِ ماضی" دورِ حال کے لیے سبق کی حیثیت رکھتے ہیں۔[1] اس اعتبار سے شواے سیدوں کی تاریخ اس کے لیے اتنی ہی کثیر الاسباق تھی جتنی سلطانوں کی تاریخ۔

مجھے یہ لگتا ہے کہ ہمیں جو جیر وصف و نسبالداراد معلوم ہو رہی ہے وہی جیر سکندر کے لیے صحیح ادراک کی حیثیت رکھتی تھی۔ مخدوم جہانیاں' سید برہان اور شاہ عالم کو عروج دے کر وہ اس جذبہ کی عکاسی کر رہا تھا جو گجرات بھر میں جاری و ساری تھا۔ ان ہی حضرات کے جذبے سے تعلق رکھنے والی ایک اور تاریخ ڈھولکا میں تھی جس کا اسے ذاتی تجربہ تھا۔ اس نے اپنی تاریخ کا ایک تہائی حصہ مغلوں کی فتح سے پہلے سلطنت کے آخری چالیس برسوں کے لیے وقف کر دیا ہے۔ اور یہ دور ایک ایسی سیاست کا دور تھا جس میں امرا نے بعض اوقات سیاسی جوڑ توڑ کے علاوہ کچھ اور طریقے بھی اختیار کیے اور چونکہ سید مبارک اور ان کے بیٹوں نے ان سرگرمیوں میں بڑا حصہ لیا اس لیے اس نے اس دور کا بیان تفصیل سے لکھا ہے۔

اس بات کی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ سید مبارک کی ملازمت کے دوران اس کے والد نے جو کردار ادا کیا اس کا ذکر کرتے وقت سکندر کے بیان سے جانبداری کیوں جھلکتی ہے۔ اس نے اس دور کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ اس دور کے بارے میں بیشتر معاملات اسے اپنے والد اور اپنے بڑے بھائی شیخ یوسف سے حاصل ہوئی۔[2] یہ اس لیے ہو سکتا ہے کہ محض فرزندانہ محبت ہی وہ اکیلا سبب نہ ہو جس کی بنا پر یہ پہلو قدرے غیر متناسب ہو گیا: ہمدردی کا جذبہ تو

موجود تھا ہی لیکن خود ماٗخذی مواد بھی اسی طرح کے بیان پر محور کر رہا تھا۔

بہرحال یہی وہ جگہ ہے جہاں سکندر اپنے رویے کے بعض کم خوش گوار پہلوؤں کا اظہار کرتا ہے۔ کردار کی یہی خصوصیات ان لوگوں میں عام طور سے پائی جاتی ہیں جو آقاؤں سے عنایت کے طالب ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے ایک ساتھی منشی، آرام کشمیری کی کتاب، جو سید مبارک کے لیے لکھی گئی تھی، کو نیچا دکھانے کے لیے بڑی کاوش کرتا ہے۔ آرام کشمیری بھی وہیں ملازم تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ آرام کشمیری اور سکندر ایک دوسرے کے حریف تھے اور ان کے تعلقات اچھے نہ تھے، یا شاید سکندر کے والد اور یہ مصنف ہم منصب لوگ تھے۔ بہرصورت آرام کی تاریخ اب موجود نہیں لیکن سکندر کی قدرے غیر منصفانہ رائے موجود ہے۔[13] اگر اس رائے کے ساتھ اس کے بعد والا پیراگراف بھی ذہن میں رکھا جائے جس میں سکندر اپنے والد اور بھائی کی سند پیش کرتا ہے تو یہ تاثر قائم نہیں ہوتا کہ یہ اضافہ قدرے بے موقع ہے اور اچھے مزاق کا ثبوت نہیں دے رہا ہے۔

اسی طرح سکندر، ان لوگوں کے بارے میں پورا انصاف نہیں کرتا جو اس سے پہلے گزر گئے۔ ان کے بارے میں اس کی مخالفانہ تنقید کا حوالہ پہلے ہی دیا جا چکا ہے اور جہاں تک ہمیں علم ہے وہ اس کے لائق بھی تھے۔ ہاں کم سے کم ایک کتاب ایسی ہے جو اس تنقید سے مستثنا ہونی چاہیے۔ یہ تاریخ بہادر شاہی ہے۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے سکندر نے زیادہ تر معلومات اسی کتاب سے حاصل کی ہے کیونکہ اس کے زمانے میں یہی کتاب بڑی مشہور رہی ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سکندر اس مصنف کے مطابق لکھتا ہے تو اس کی تاریخ نگاری اپنے کمال پر ہوتی ہے۔ بعد کے صفحات میں جب وہ لائق اعتماد اشخاص پر بھروسہ کرنے لگتا ہے تو مزے کی خاطر لمبی لمبی حکایتوں کی طرف مائل نظر آتا ہے اور چھان بین کرنے کے بجائے غیر متعلق معلومات دینے لگتا ہے لیکن تعجب ہے کہ گو یہ کتاب مستقل اس کے پاس رہی ہوگی اور اسے مصنف اور خود کتاب کے بارے میں خوب علم ہوگا لیکن وہ کہیں اس کا نام نہیں لیتا۔ ہمیں اس کے مصنف حسام خاں کا نام صراحت سے نہیں بلکہ ظفر الوالیہ

سے معلوم ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مصنّف کا نام صاف طور سے نہ لینا اتنی فاش غلطی ہے کہ سر ڈینیسن روس نے اسے "خاموش رہنے کی سازش کہا ہے"۔[14] سکندر پر یہ الزام رکھنا کچھ ٹھیک نہیں لگتا کہ اس نے جان بوجھ کر نام چھپایا۔ ایک مگر وہ موضوع بدل کر محمود شاہ بگاڑا کے ایک بڑے امیر کی نشاندہی اس طرح کرتا ہے کہ وہ امیر تاریخِ بہادر شاہی کے مصنّف کے امداد میں سے تھا۔[15] لیکن سکندر کا بھلا حوالہ یہ ہے کہ اس کا مصنّف ایک شخص تھا جبکہ اسے اس شخص کے نام، خطاب اور عہدے کا ضرور علم ہوگا۔ دوسرے سکندر کی پوری تاریخ میں کہیں بھی حسام خاں کا نام نہیں ملتا۔ اور آخری بات یہ ہے کہ سکندر نے جس کتاب سے اتنا زیادہ مواد حاصل کیا۔ اس کا ذکر تحقیر آمیز انداز سے کیا ہے ان سب باتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جو شخص ایک بھاری احسان کو بھی تسلیم نہ کرے وہ یقیناً جھگڑالو اور بخیل ہوگا۔[16]

سکندر کی کتاب دوسری تحلیقی کتابوں کی طرح، اس کی شخصیت کا نچوڑ اور اس کی ..... (Weltan chau ung) کا عکس ہے۔ وہ ایک ایسے طبقے سے تعلق رکھتا تھا جو ذریعۂ معاش کے لیے خاص طور سے جاگیرداروں کا دستِ نگر تھا، اور پیشۂ سپہ گری کی طرف کم شہری ملازمتوں کی طرف زیادہ مائل تھا۔ اس کے درجے کے لوگ غالباً دیوان، نائب دیوان اور ایسے ہی دوسرے بہت سے عہدیدار تھے جو مغل امرا کی طویل غیر حاضری کے دوران جاگیروں کا انتظام اور ان کے دوسرے مفادات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ اس کے ہم درجہ اور اہم لیاقت لوگ بہت سے شہری اور عدالتی عہدوں پر فائز تھے۔ مغل انتظامیہ نے قاضی، محتسب امین اور دوسرے بہت سے ایسے ہی عہدوں کے دروازے ان لوگوں کے لیے وا کر دیے تھے۔

لہٰذا جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس میں اس طبقے کے مخصوص رویے اور خصوصیات موجود ہیں تو تعجب نہیں ہوتا۔ اس کا علم حیرت انگیز تھا نہایت شستہ اور بڑی نفیس زبان میں لکھنے کی لیاقت تھی، اور ایک مخصوص انداز میں ثبوتوں اور شہادتوں کی جانچ پڑتال کرنے کی صلاحیت

تھی۔ اس کی اپنی حدود تھیں۔ وہ واقعات کو سطح سے نیچے نہیں دیکھ سکتا تھا، کیونکہ اس کے نزدیک تاریخ کا مطلب یہ تھا کہ اخلاقی نصیحتوں کے ساتھ واقعات بیان کر دیے جائیں۔ اس بنا پر چیر پھاڑ یا تجزیہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ان واقعات کے پیچھے کیا منطق کام کر رہی ہے جس کی بنیاد پر لازماً اس کی تاریخ کی اندرونی ساخت قائم ہوئی۔

سکندر دراصل مجھے ایک مخصوص قسم کا معل دانشور لگتا ہے ـــــ قدامت پسند، عالم، خود رائے لیکن راست گو، صاحبِ تخیل اور ایسے سماجی یر مذہبی رویّوں کا انتہائی موافق جو مصدقہ ہوں۔ اس کی تاریخ جن مخصوص خوبیوں کی حامل ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ کردار کی ان ہی خصوصیات کی عکاسی کرتی ہے ـــــ اور چنانچہ جس زمانے میں لکھی گئی ہے اس زمانے کا بہترین نمونہ بن چکی ہے۔

حوالہ جات

1. مرات کے مآحدوں اور اس کے زمانۂ تصنیف پر اس کتاب کے سرودا والے ایڈیشن کی تمہید میں پورے طور سے بحث کی جا چکی ہے۔ اور اسی لیے اس بحث کو یہاں دُہرایا نہیں گیا ہے۔ اس میں اس کتاب کے ادبی مآحدوں کی پوری فہرست بھی شامل ہے۔ سرودا ایڈیشن کا پورا حوالہ ذیل میں دیا جا رہا ہے۔

The Mirat-i-Sikandri of Shaikh Sikandar ibn Mohammed urf Manjhu ibn Akbar, edited by S C Misra and M L Rahman, Baroda, the M S University of Baroda, 1961 Introduction, pp 1-56. Bibliography pp 53-56

میں دو ایسے مضامین کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جو کتابوں کی فہرست تیار ہونے کے بعد شائع ہوئے۔ مضامین یہ ہیں:

Z.A Desai, Mirat-i-Sikandri as a source for the study of cultural and social condition of Gujrat <u>under the Sultanate (1403-1572)</u>

Journal of the Oriental Institute, Baroda, vol. X No 3 (March 1961); and Jean Abbex, the Secretary of Mahmud Ganan and his lost Chronicle, Journal of the Research Society of Pakistan, Vol 1 Part II (October 1964) pp-9-13

2۔ مراتِ سکندری، رودا والا ئنٹس (مسودہ) صفحہ 2

3۔ Auben جس کا حوالہ پہلے دیا گیا ہے صفحہ 11

4۔ ایضاً صفحہ 11

5۔ مسودہ، صفحہ 2

6۔ مسودہ صفحہ 137 : ترجمہ (فضل اللہ لطف اللہ، دھرم پور، بیا ایڈیشن) صفحہ 68

7۔ مسودہ، صفحات 16-115 : ترجمہ، صفحہ 52

8۔ مسودہ، تمہید صفحات 48-48

9۔ مرات کا پورہ والا ئنٹس؛ کتاب کے نام والے صفحے پر بالائے سطر؛ مسودہ، تمہید صفحات 1 اور 46

10۔ مسودہ، صفحات 10-11، 71-77، 80-81، 9091 اور اس کے بعد والے صفحات شاہ عالم کے لیے دیکھیے۔ صفحہ 132 اور اس کے بعد صفحات اور تیغ جیو کے لیے دیکھیے — 170-71، 228-30 اور اس کے بعد والے صفحات۔

11۔ مثال کے طور پر ملک محمد امتیار اور داور الملک کی کہانی۔ مسودہ، صفحہ 161 اور اس کے بعد والے صفحات۔

12۔ مسودہ، صفحہ 361 اور صفحہ 438

13۔ مسودہ، صفحہ 361

E Denisson Ross. editor An Arabic History -14
of Gujrat Zafar-ul- Wabhdi, Mazzuffar,
Wa-Alih of 'thallah Muhammed bin Oamaral-
Mekki, al Asafi Ulngh Khani also Known
as Hajji ad-Daber Indian Texts Series
(3 volumes London, John Murray for Gover-
ment of India, 1910, 1921 and 1928) Vol II
Introduction, p XXVIII.

15- سورہ النحل 126

16- سورہ الصافات 1-2

مرزا ناتھن ـــــ سترھویں صدی کا ایک توزک نگار★

قیام الدّین احمد

ڈاکٹر بورہ نے بہارستانِ غیبی کی ترتیب و تدوین کی ہے، اور اس کے پورے مسودے کا ترجمہ کیا ہے۔ انھوں نے اس کی دریافت پر ان الفاظ سے اس کا خیر مقدم کیا تھا کہ یہ کتاب شمالی مشرقی ہندوستان کی تاریخ کی ترتیب نو کے کام میں ایک نئے عہد کا آغاز کرے گی[2]۔ اس کی دریافت سے پہلے بنگال اور آسام کی تاریخ کے واسطے جن عصری مآخذوں سے معلومات حاصل کی جاتی تھی وہ کچھ زیادہ فائدے مند نہ تھے۔ ان میں اس علاقے کی سماجی اور سیاسی تاریخ کی بہت معمولی تفصیلات دی ہوئی تھیں۔ مرزا ناتھن نے اس علاقے کی تاریخ پر بہت بڑا احسان کیا ہے، اور جادو ناتھ سرکار جن کے سر اس کتاب کی دریافت کا سہرا ہے، اس احسان کو بہت مانتے ہیں۔ اس بارے میں ان کے الفاظ یہ ہیں: "دورِ جہانگیر (1627 — 1601) کے بنگال کے بارے میں ہمیں آج جتنی معلومات ہے قرونِ وسطیٰ کے بنگال کے کسی اور دور کے بارے میں اس کی نصف درست یا نصف مکمل معلومات بھی نہیں ہے[3]۔" اس کتاب کی دریافت کے بعد جن مصنفین نے بھی اسے دیکھا ہے اُن سب نے بڑے جائز طور سے اسی پہلو پر زور دیا ہے[4]۔ لیکن کتاب کے صرف ایک ہی پہلو پر غور کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے موضوعات کو اور اصل مزاج کو نظر انداز کر دیا گیا۔

بہارستان دراصل علاءالدین اصفہانی (عرف مرزا ناتھن)، جن کا لقب شتاب خاں

★ بہارستانِ غیبی کی نوعیت اور اس کے مضامین کی ایک اور جانچ۔

تھا، کی توزک ہے۔ اسے فارسی کے روایتی روزنامچوں کے انداز سے ترتیب دیا گیا ہے، یعنی اسے چار دفتروں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر دفتر کے اپنے عنوانات اور ضمنی عنوانات ہیں۔[5] لیکن اچھی توزکوں کی طرح، مصنف خود اس کتاب کا مرکزی کردار ہے۔ پوری کہانی اسی کی سرگرمیوں کے گرد بیان کی گئی ہے۔ کتاب کا خاص مقصد یہ ہے کہ توزک نگار کی دنیاوی ترقی کا ایک دور بیان کر دیا جائے۔ صوبائی تاریخ اور فوجی مہموں کی تفصیلات دوسرے درجے میں آتی ہیں، اور توزک نگار نیز اس کے والد کی دنیاوی ترقیوں کے ضمن میں بیان کی گئی ہیں۔

مصنف کتاب کی ابتدا اسی مروجہ انداز میں کرتا ہے جس انداز میں باقاعدہ روزنامچوں کی ابتدا کی جاتی ہے "اس حقیر ناچیز کے ذہن میں یہ خیال گزرا کہ اگر بنگال کے وہ تھوڑے سے واقعات قلم بند کیے جائیں جو جہانگیر بادشاہ کے دورِ مسعود میں واقع ہوئے تھے تو اس تحریر کا نقش صفحاتِ وقت پر باقی رہے گا۔ . . . . لہٰذا یہ بیان اس توقع کے ساتھ قلم بند کیا جا رہا ہے کہ اگر یہ اہلِ علم کی پرتجسس نظروں سے گزرے . . . تو وہ اسے قلم اصلاح سے سنوار دیں، اور اس کے مضامین جہانگیر کی تاریخ میں شامل کر لیں۔"

لیکن اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مضامین بھی بیاض کے اندراجات سے زیادہ ملتے ہوتے ہیں۔ واقعات اور حادثات پورے طور سے کسی ایک مقام پر نہیں بیان کیے گئے بلکہ مختلف صفحات پر بکھرے ہوئے ہیں۔ (شاید جس طرح واقع ہوئے یا مصنف کو جس طرح یاد آئے)۔

پوری کتاب چار دفتروں میں تقسیم کی گئی ہے، جن میں سے تین کا تعلق بنگال کے تین صوبیداروں اسلام خاں، قاسم خاں اور ابراہیم خاں سے ہے۔ چوتھے دفتر میں ان واقعات کا بیان ہے جو شاہ جہاں کی بغاوت کے دوران پیش آئے۔ دفاتر اول و سوئم پہلے اور تیسرے صوبیدار کے لیے وقف کر دیے گئے ہیں اور ان ہی کے نام سے ہیں۔ ان تینوں صوبیداروں کو جوڑنے والا کڑی خود مرزا ناتھن ہے۔ اس دور کا انتخاب کسی ذاتی وصف یا تاریخی اہمیت کی بنا پر نہیں کیا گیا

یہ بلکہ اس بنا پر کہا گیا ہے کہ یہی زمانہ خود توزک نگار کی سرگرم فوجی ترقی کا زمانہ بھی ہے۔ پہلے دفتر
کی ابتداء یوں ہوتی ہے کہ اسلام خاں بنگال کا صوبیدار مقرر ہوا، لیکن بات یہیں ختم ہو جاتی ہے۔
اس کے بعد خاص موضوع یہ ہے کہ مرزا ناتھن کے والد، اہتمام خاں کا میر بحر کی حیثیت سے تقرر ہوا اور
انھوں نے بنگال کا سفر طے کیا۔ حتیٰ کہ صوبائی سرداروں کو پہلے کی کہانی بھی مرزا ناتھن اور اس کے
والد کے کارناموں کی طرح بیان کی گئی ہے مرزا ناتھن اس کے والد اور اور صوبیدار کے درمیان جو
معمولی نوعیت کے اختلافات ہوئے ان کا ذکر بے جا طوالت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ (صفحات 33، 34،
115، 147، 156 وغیرہ)۔ ان معمولی جھگڑوں میں توزک نگار اور اس کے والد کی اہمیت بڑھا چڑھا
کر بیان کی گئی ہے۔ ہر چند کہ وہ صوبیدار کے ماتحت تھے لیکن پڑھنے والے کو یہ لگتا ہے جیسے برابر
درجے کے افسران ایسے اہم معاملات پر جھگڑ رہے ہیں، جن کا تعلق ریاست کی حکمتِ عملی سے ہے یہی بات
دوسرے دفتروں پر بھی صادق آتی ہے۔ اگر کوئی شخص اعداد و شمار اکٹھا کرنا اور ہر دفتر کی تاریخ پر تال
کر کے یہ معلوم کرنا چاہتا ہو کہ صوبیدار پر کتنی جگہ صرف کی گئی ہے اور توزک نگار پر اس کے والد پر کتنی
جگہ صرف ہوئی ہے، تو تناسب . یا شاید اس سے بھی زیادہ آئے۔

ڈاکٹر سرکار، جنھوں نے یہ مسودہ دریافت کیا ہے، وہ بھی اس طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہ
لکھتے ہیں "بہارستان یہ دعوا کرتی ہے کہ وہ تین خاص صوبیداروں کے تحت بنگال اور اڑیسہ
کی تاریخ ہے۔ . . . . لیکن شتاب خاں اور اس کے والد اہتمام خاں کے اعمال کا بیان بھی اتنا
زیادہ تفصیلی ہے جتنی صوبیداروں کی تاریخ ہے، اور تقریباً نصف کتاب کے بارے میں یہ کہنا زیادہ
موزوں ہوگا کہ یہ توزک شتاب خاں ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کی اصل
افادیت" ان ساری تفصیلات میں مضمر ہے جو یہ بنگال اور اڑیسہ کے زمینداروں کو مکمل طور سے
مغلوب کرنے کے بارے میں نیز مغل سلطنت اور مشرقی سلطنت کے منگول بادشاہت کے درمیان
ہونے والے طویل اور لامتناہی سلسلۂ جنگ کے بارے میں بہم پہنچاتی ہے۔[7]"

پروفیسر شرما نے خاصی تفصیل سے کتاب کا معائنہ کیا ہے انھوں نے مغل ہنا

فہرستِ مآخذ میں اسے سوانحی تاریخوں کے حصے میں جگہ دی ہے۔ حالانکہ اسی فہرست میں توزکوں کا حصہ بھی موجود ہے۔ وہ مصنف کی لاف زنی پر تنقید کرتے ہیں۔ "اس کا تمام نہایت تشبیہی بازتاریخ نگاروں میں ہے جس کا ایک مقصد برابر یہ رہا ہے کہ اپنی خدمات بڑھا چڑھا کر بیان کرے .... جب کبھی مغل فتح یاب ہوتے ہیں تو فتح کا سرچشمہ وہ خود ہوتا ہے، جب کبھی ان پر کوئی آفت آتی ہے تو اس کا سبب اعلا عہدیداروں کی رقابت ہوتی ہے[8]۔" مصنف کی انا ملکہ خودستائی بھی اچھی طرح نمایاں ہیں لیکن اہم نقطہ یہ ہے کہ یہ سب باتیں کتاب کی اصل نوعیت کے مطابق ہیں ـــــ یہ ایک توزک ہے۔ سارے توزک نگار چیزوں کو اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ واقعات کو شکل دینے میں ان کی ذات بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ اچھے توزک نگار اپنی تصویروں کا عکس ڈالتے وقت ایک معیار نظر میں رکھتے ہیں اور خود پر قابو رکھتے ہیں لیکن بختاور خاں بعض اوقات مضحکہ خیز بن جاتا ہے یہ خامی بہت سے توزک نگاروں میں پائی جاتی ہے لیکن اسی طرح کی خامی اس قسم کے کام کی نوعیت کے عین مطابق ہے۔

اس سلسلے میں بہت سی اور باتوں کی طرف بھی توجہ مبذول کرائی جاسکتی ہے، جیسے غیر رسمی اسلوبِ بیان اور بعض واقعات کو ذاتی معاملہ بیان کرکے پیش کرنا، نیز باغی شہزادے (صفحات 763، 769، 772، 775 تا 776) اور دوسرے اعلا عہدیداروں (صفحات 115 تا 116، 155 تا 156) کا سراپا بے تکلفی سے بیان کرنا۔ اس میں ایسے موثر بیانات ہیں جن کا نقش ذہن پر بن جاتا ہے جیسے یہ بیان کہ ایک ہارا ہوا، لٹا کھڑا اور بھوکا شاہ جہاں اپنے ترکش کو تکیہ بنائے ایک پیڑ کے نیچے سو رہا ہے اور سہسرام کے نزدیک ایک جنگل سے بکرا پکڑ کر اور اس کا گوشت بھون کر ناشتہ کر رہا ہے (صفحہ 763)۔ یہ بیان کہ شاہ جہاں مرزا ناتھن کے پاس چل کر جاتا ہے اور اس سے وہ خط چھین لیتا ہے جو وہ اپنے گھر لکھ رہا تھا (صفحہ 772)۔ یہ بیان کہ کمسنی شہزادہ اورنگ زیب بعد میں بھی ایک ایسا شہزادہ سا جو شریعت کی سختی سے پابندی کرتا تھا۔ چھپ کر مرتبان سے وہ کیلے نکال کر کھا رہا ہے جو شاہ جہاں نے مرزا ناتھن کے لیے بچا رکھے تھے (صفحہ 780)۔ یہ سارے

بیانات ان سرکاری روزنامچوں کے بیانات کے مقابلے میں بڑے تازگی بخش معلوم ہوتے ہیں۔ جن سرکاری بیانوں میں کردار نگاری بڑے روایتی انداز سے کی گئی ہے۔

ایک عظیم صوبیدار اسلام خاں کا یہ واقعہ بھی بڑی وضاحت اور بے باکی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ وہ اپنے بیٹے ہوشنگ سے کسی معمولی بات پر ناراض ہوکر تمام درباریوں کے سامنے اسے مارتا ہے "اس سے پہلے کہ کوڑا لایا جائے، اس نے اپنا سر گھٹنوں سے نیچے جھکا کر ایک لوٹا اٹھایا اور اسے پیٹنا شروع کردیا۔ . . . ." خواجہ دانش کو حکم دیا گیا کہ تماشیانے کے بانسوں سے اسے مارے۔ جب اس نے رو کر یہ کہا کہ "آپ خود مجھے مار سکتے ہیں، خدا را خواجہ کو روکیں کہ وہ مجھے ڈنڈوں سے نہ ماریں تو اس نے خدمت گاروں کو حکم دیا کہ وہ بھی اسے ماریں۔" دیوان اور دوسرے عہدیداروں نے اسے بچانا چاہا تو ان پر بھی بہت سخت ہاتھ پڑے۔ (صفحات 115 تا 156)۔ اس قسم کے اندراجات کسی صوبائی تاریخ کے لیے نہیں بلکہ کسی ذاتی بیاض کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔

اس کتاب کی ایک اور خصوصیت اس کا اسلوبِ بیان ہے جس سے قدرے طمطراق ظاہر ہوتا ہے۔ دوسری تورکوں کے برعکس، بہت سے مقامات پر بیان میں صیغہ حاضر استعمال نہیں کیا گیا ہے، جس کی وجہ سے بعض اوقات محض نمائشی اور مصنوعی لگتے ہیں۔ اکثر اوقات مصنف اپنے لیے محض لفظ ناتھن یا ایسے منکسرانہ القاب استعمال کرتا ہے جو رواجاً استعمال کیے جاتے تھے۔ آخری حصے میں وہ شتاب خاں کے لقب کا استعمال کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کی عرفیت یا القاب سے واقف نہ ہو تو یہ سمجھے گا کہ مصنف کسی اور کے بارے میں لکھ رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پوری کتاب میں اسلوبِ بیاں نمایاں طور پر دو قسمی انداز کا ہے یہ ایک عجیب مجموعہ ہے جس میں رسمی قسم کی تصنع آمیز عبارتوں کے ساتھ غیر رسمی اور بے تکلف بیانات شامل کردیے گئے ہیں۔

کتاب کا اختتام بھی قابلِ توجہ ہے۔ یہ اچانک ہوجاتا ہے اور ان کتابوں کے اختتام سے بالکل مختلف ہے جو منصوبے کے ساتھ لکھی جاتی ہیں۔ کہانی کہیں درمیان سے شروع ہوتی ہے

ں سے پہلے کہ کوئی منطقی نتیجہ نکلے، ختم ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ دفتر چہارم کا خاص موضوع یعنی شاہجہاں
غاوت کی کہانی بھی پورے طور سے بیان نہیں کی گئی ہے۔
ڈاکٹر بورہ کو یقین ہے کہ کتاب جس صورت میں ملی ہے وہی اس کی مکمل صورت ہے۔ بہرکیف
، شبہ کی گنجائش باقی ہے کہ کتاب کی جو جلد دستیاب ہوئی ہے کیا وہ مکمل کتاب ہے یا ابھی
ل شکل میں ہے۔ اس بات کا امکان زیادہ ہے کہ موجودہ جلد وہ ناتمام مسودہ[9] ہے جو شتاب
اں نے اپنے نوٹس کی بنیاد پر قلم بند کیا، اور بعد میں اس نے اس مسودہ کو باقاعدہ تاریخی شکل
ینی چاہی۔ اس نے چھانٹے ہوئے مواد کی ابتدائی درجہ بندی تو کی (جیسے دفتروں میں تقسیم کیا،
ہر دفتر کی تمہید لکھی اور انھیں صوبیداروں کے نام معنون کیا وغیرہ) لیکن کتاب مکمل نہ کر سکا۔
پروفیسر سرمانے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے[10] کہ موضوعات کی جو فہرست مسودے سے تیّ
کی گئی ہے اس میں ابواب کے خلاصے دیے گئے ہیں[11] لیکن خلاصے قابلِ اعتماد نہیں ہیں" مصنف
نے بہت سے مقامات پر واقعات کو اپنی خواہش کے مطابق موڑا ہے، چنانچہ ابواب کے خلاصوں
میں ایسی بہت سی باتوں کا ذکر کر دیا ہے، جنھیں غالباً بعد میں وہ خود ابواب میں شامل کرنا چاہتا
تھا لیکن بالآخر اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ایسا نہیں کرے گا۔" اس بات سے اس شبہ کو بھی تقویت ملتی
ہے کہ کتاب کی جو جلد دستیاب ہوئی ہے وہ اصل کتاب کا پہلا مسودہ ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا
ہے کہ کتاب کے ایک ہی پہلو پر ساری توجہ صرف کرنے کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوا کہ اس کی اصل
نوعیت نظر انداز کر دی گئی ہے بلکہ یہ بھی ہوا ہے کہ بہت سا مواد جو کتاب کے صفحات پر بکھرا ہوا ہے،
اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا ہے۔ اس علاقے میں مغل حکومت کی توسیع سے قطع نظر، جس پر
پہلے ہی بہت جانچ پڑتال کی جا چکی ہے، اس کتاب میں فوجی، انتظامی اور سماجی معاملات پر ایسی
بہت کچھ معلومات ملتی ہے جو ہماری توجہ کی محتاج ہے۔ ذیل میں جو مثالیں دی جا رہی ہیں وہ کوئی
مکمل اور جامع مثالیں نہیں ہیں۔ انھیں محض اس نکتے کی وضاحت کرنے کے لیے انتخاب
کیا گیا ہے۔

پروفیسر شرما بھی کتاب کے گوناگوں فوائد کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ لیکن یہاں جو مثالیں آپ کی نظر سے گزریں گی ان میں سے بہت سی مثالیں یا تو اس خلاصے میں شامل ہی نہیں کی گئی ہیں جو انھوں نے چھپوایا ہے یا پھر بنا کسی تنقید کے سرسری طور پر لکھوا دی گئی ہیں۔

انتظامی معاملات

پہلے دفتر کے آخر میں جہاں اسلام خاں کے انتقال کی بنا پر کی جانے والی سرکاری تبدیلیاں بیان کی گئی ہیں، مصنف ایک اہم انتظامی نکتے کا ذکر کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ شاہی ضابطوں میں یہ لکھا تھا کہ جب بنگال کا صوبیدار فوت ہو تو وہ "شاہی افسر اس کی جگہ لے جو مونگھیر میں مقیم ہو..... لیکن اگر مونگھیر میں کوئی اعلا افسر موجود نہ ہو تو بہار کا صوبیدار بنگال چلا جائے" تقدم کی یہ ترتیب کسی دستور العمل یا سرکاری تاریخ میں نہیں دی گئی ہے۔ اس کی بنا پر ذہن میں کئی سوال اٹھتے ہیں۔ اس اصول کے پیچھے کیا خیال کارفرما تھا؟ ظاہر ہے کہ بہار کا صوبیدار اس اعلا شاہی عہدیدار سے کہیں اونچے مرتبے کا شخص ہوتا تھا جو مونگھیر میں تعینات کیا جاتا تھا۔ اس لیے بنگال کے صوبیدار کی جانشینی کے معاملے میں موخرالذکر کا حق کیوں افضل سمجھا گیا؟ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ موخرالذکر ایسی جگہ ہوتا تھا جہاں سے نسبتاً تیزی کے ساتھ ڈھاکہ پہنچ کر ان خطروں کو دور کیا جاسکتا تھا جو درمیان کی لمبی مسافت کی وجہ سے صوبے کے استحکام کو نقصان پہنچا سکتے تھے۔ اگر یہ درست ہے تو کیا اس اصول کا اطلاق صرف بہار اور بنگال پر ہوتا تھا؟ کیا دوسرے صوبوں کے لیے بھی اسی قسم کے اصول وضع کیے گئے تھے؟ ہرچند کہ یہ کتاب ان سوالوں کے جواب فراہم نہیں کرتی لیکن اس بنا پر اہم ضرور ہے کہ ہمیں ایسے سوال کرنے کا موقع دیتی ہے۔

ناتھن مزید لکھتا ہے کہ بہار کا صوبیدار ظفر خاں بنگال کے صوبیدار کا جانشین بننے کے شوق میں اسی اصول کی خلاف ورزی کرکے اور اسلام خاں کے بھائی قاسم خاں کا حق مار کر جو اس

وقت مونگھیر میں تعینات تھا یہ عہدہ حاصل کرنے کے ارادے سے ڈھاکہ پہنچ گیا۔ لیکن صوبے کے دیوان بخشی اور خبر نگار نے شہنشاہ اطلاع بھیج دی کہ طمرحاں لگر دیش (آج کا چھوٹا ناگپور) کے راجہ کا محاصرہ کیے ہوتے ہے اور اگر وہ کچھ دن اور محاصرہ کیے رہا تو راجہ سے تیس مثقال ورن کے جواہرات پیش کش کے طور پر وصول کرے گا۔ شہنشاہ ناراض ہوگیا۔ اور طمرحاں کو حکم دیا کہ اپنی نامکمل مہم وہیں روک دے اور قاسم حاں (جو ضابطے کے مطابق اس جگہ کا حقدار تھا) کو بنگال کا صوبیدار مقرر کیا۔ اس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ضابطے پر عمل کیا گیا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اگر صوبیدار اصول و ضوابط کی خلاف ورزی کرتا تو ماتحت صوبائی افسران خصوصاً خبر نگار بعض اوقات اس کی بھی رپورٹ کر دیتے تھے۔ ان کا شعبہ ان کا خاصہ تحفظ کرتا ہوگا تاکہ وہ بے خوف و خطر کام کر سکیں۔

ہمیں ایک اور مثال ملتی ہے جس سے اس بات کی خوب وضاحت ہو جاتی ہے کہ صوبائی خبر نگار بڑے ہوش مند بیدار اور بے خوف ہوتے تھے۔ اس درمیانی مدت میں جب اسلام خاں کا بیٹا آگرہ روانہ ہو چکا تھا اور قاسم خاں ابھی ڈھاکہ پہنچا نہیں تھا صوبائی دیوان مرزا حسین بیگ کے آدمیوں نے ان ناراروں کو اپنی نگرانی میں لے لیا جو پہلے اسلام خاں کے کوتوال کی نگرانی میں تھے۔ چونکہ ناراروں کی نگرانی بڑا نفع بخش کام تھا اس لیے قاسم خاں نے آگے ہی ناراروں کے لیے اپنا کوتوال مقرر کر دیا، اور یہ کوشش کی کہ دیوان کے آدمی ہٹا کر خود ان پر قبضہ کر لے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیوان کے بیٹوں اور ان کے مسلح آدمیوں اور صوبیدار کے سپاہیوں کے درمیان بڑا جھگڑا ہوا۔ اوّل الذکر مغلوب ہو گئے، انھیں زدوکوب کیا گیا اور گرفتار کر لیا گیا اور ان کا مال و اسباب ضبط کر لیا گیا۔

خبر نگار خواجہ لغمہ بڑے مجمعے میں پھنس گیا کہ شہنشاہ کو کس طرح اس معاملے کی اطلاع دے۔ قاسم خاں نے سرحدوں پر اتنے سخت پہرے لگا رکھے تھے کہ "خان صاحبان کے خطوط اور روزنامچہ نگاروں کی رپورٹوں کا تو کہنا ہی کیا وہاں سے ایک چڑیا بھی اس کے علم اور حکم کے

بغیر بالائے ہند (ہندوستان) نہیں جاسکتی تھی۔ اسی کے ساتھ اسے یہ فکر بھی تھی کہ اگر واقعے کی اطلاع نہ دی گئی اور شہنشاہ کو کسی دوسرے ذریعے سے اطلاع مل گئی تو میں کیا جواب دوں گا؟" چنانچہ اس نے ایک بڑی اچھی ترکیب سوچی۔ اس نے اپنے دو قاصدوں کو جوگیوں کا روپ بھروایا اور جہانگیر کے قریبی مددگار انی رائے سنگھ دلان کے پاس بھیج دیا۔ انھیں رائے کے ہمراہ جاکر جھروکا درشن کے وقت شہنشاہ کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کرنی تھی۔ قاصد "بہت سے حیلے بہانے" تراشتے ہوئے ڈھاکے سے آگرہ پہنچے اور ہدایت کے مطابق اپنا کام کیا۔ شہنشاہ نے معاملے کی نزاکت کو سمجھ لیا اور ایک افسر سادات خاں کو اس کی تفتیش پر معمور کیا۔ قاسم خاں کو متنبہ کیا گیا کہ "چشتی خاندان کی خدمات اور ان پر اپنی عنایات کے پیشِ نظر ہم نہیں چاہتے کہ تمہاری ملازمت اور ترقیوں کا خاتمہ ہو جائے۔" اسے حکم دیا گیا کہ دیوان کا غصّہ فرد کرے، اطمینان کا ایک خط اس سے حاصل کرے، اور سادات خاں کے ذریعے بھجوا دے۔ قاسم خاں نے دیوان اور اس کے بیٹوں کو مختلف صورتوں سے نواز کر ان کا غصّہ فرد کیا۔ اس نے ایک لاکھ روپیہ اور اپنی ذاتی جاگیر میں سے پرگنہ، مادھوپور بھگوان، ان کی نذر کیا۔ اس کے علاوہ شاہی افسرِ تفتیش نے سب کے سامنے پورے واقعہ کا حلفیہ بیان لیا، اور اس پر امرا کی مہریں ثبت کرائیں۔ اس نے مظلوم دیوان کا بیان بھی تحریر کروایا اور سارے کاغذات شہنشاہ کے سامنے پیش کر دیے۔

چنانچہ ہمارے سامنے اس واقعہ کا پورا بیان موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خبر نگار کی رپورٹ محض داخل دفتر ہی نہیں کی جاتی تھی، بلکہ اس کی بنا پر چھان بین کی جاتی تھی اور متعلقہ شعبہ کی پوری مشین اس کی تصدیق کرکے کسی ٹھوس نتیجہ پر پہنچ جاتی تھی۔[12]

اس واقعہ کی طرف بھی توجہ دلائی جاسکتی ہے کہ ایک شاہی افسر، صوبیدار اور دوسرے صوبائی افسران کے فرائض کی بابت فرمان اور زبانی ہدایتیں لے کر روانہ کیا گیا تھا۔ یہ ہدایتیں جو قوسین میں دی گئی ہیں انتظامی دستاویزوں کی حیثیت سے بڑی قابلِ قدر ہیں۔[13]

آمدنی کا حد سے زیادہ تخمینہ

مغلوں کے انتظامِ اراضیات کی بہت بڑی خرابی یہ تھی کہ بہت سے پرگنوں اور دیہی علاقوں کی اصلی اور واجبی آمدنی (جمع) میں اختلافات تھے۔ اکبر کے دورِ حکومت میں جمع، جسے جمعِ رقمی کہا جاتا تھا، کے جو اعداد و شمار موجود تھے وہ سورِ حکومت سے ورثے میں ملے تھے، اور اصل سے بہت بڑھے ہوئے تھے۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ بہت سے افسران کو اپنی جاگیر سے جو آمدنی ہوتی وہ سرکاری تخمینے سے کہیں کم تھی، اور اس بنا پر جاگیرداروں اور منصب داروں میں بڑی بے اطمینانی پھیل گئی۔ اکبر نے اس مسئلے پر مستقل توجہ دی اور کئی بار اسے حل کرنے کی کوشش کی۔ آمدنی کا ایسا تخمینہ کروانے کے لیے جو زیادہ قابلِ اعتبار ہو پہلے اس نے قانون گو افسران کی مدد لی پھر براہِ راست نگرانی کے ساتھ پیمائش کروائی۔ اس سے کچھ فائدہ ضرور ہوا لیکن یہ آزار پوری طرح سے دُور نہ ہوا۔ دراصل سرکاری اور اصلی تخمینوں کا فرق ایک ایسی بُرائی کی شکل میں تسلیم کر لیا گیا جسے دُور کرنا ممکن نہ تھا۔ ڈاکٹر عرفان حبیب سترھویں صدی کی بہت سی دستاویزوں کی بنیاد پر یہ بتلاتے ہیں کہ شاہ جہاں کے دَور میں اس بُرائی پر قابو پانے کے لیے تناسب فی ماہ کا ایک نیا طریقہ تیار کر لیا گیا تھا۔ اس کے بموجب جاگیریں مختلف قسموں میں بانٹ دی گئی تھیں، اور جاگیر کی قسم کا دار و مدار اس بات پر تھا کہ اُن کی اصلی اور واجبی آمدنی میں کیا تناسب ہے۔ چنانچہ اول درجے کی جاگیر وہ تھی جس کی اصل آمدنی سرکاری تخمینے کے عین مطابق ہو۔ اس جاگیر کو دوازدہ ماہہ کہا جاتا تھا۔ وہ جاگیر جس کا تناسب ٪50 تھا ششماہہ کہلاتی تھی، اور بقیہ نام بھی تناسب کے لحاظ سے تھے۔ ڈاکٹر حبیب جہانگیر کے دَور میں بھی اس نظام کی ایک مثال دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ کہتے ہیں کہ یہ نظام شاہ جہاں کے زمانے میں عام ہو گیا تھا۔[4] مرزا ناتھن بھی ایک واقعہ بیان کرتا ہے جو اس نظام کی ایک اور مثال معلوم ہوتا ہے۔[5] یہ واقعہ معنی خیز ہے کیونکہ اس دور سے تعلق رکھتا ہے جب یہ نظام عام نہ ہوا تھا۔

اس زمانے میں جب شاہ جہاں بغاوت کر چکا تھا اس کے ایک اہم عہدیدار شیر خاں فتح جنگ کو تاج پور، پورنیا میں ایک جاگیر عطا کی گئی۔ شیر خاں فتح جنگ کو اس کی تخمینی آمدنی کے بارے میں کچھ شبہات تھے۔ مرزا ناتھن کو، جو اس وقت عملی طور پر اکبر نگر کا فوجدار تھا، یہ حکم دیا گیا کہ تخمینے کی درستی کی جانچ کرے۔ چنانچہ ایک افغان عہدیدار اور خاصہ ٹوڈرمل، جو شتاب خاں کا میر سامان تھا، دونوں کو معاملے کی پوری طرح چھان بین کرنے کے لیے کہا گیا تاکہ "نہ تو رعیت یا جاگیردار کو کوئی تکلیف پہنچے اور نہ شاہی آمدنی میں کمی آئے۔" ان کو قسم کیا گیا کہ بڑی دیانت داری سے کام کریں، کیونکہ ہو سکتا ہے شتاب خاں "اصل حالات معلوم کرنے کے لیے خفیہ طور پر دوسرے کارکنان سے تفتیش کرائے" یا وہ خود وہاں پہنچ جائے۔[16] انھیں آمدنی کا ایک صحیح رجسٹر تیار کرنا تھا . . . . جو رعیت کی رضامندی سے تیار ہو، اس پر قانون گو افسراں کے دستخط ہوں اور اس میں چودھریوں کا معاہدہ (قبولیات) شامل ہو، جس کی تصدیق شیر خاں (موہوب الیہ)[17] کے کارندے نے کی ہو۔ افسران نے جانچ کرنے کے بعد پرگنے کی آمدنی ایک لاکھ بیس ہزار روپے بتائی، اور "وہ پرگنہ شیر خاں کو، اس کی تنخواہ کے عوض جو دو لاکھ چالیس ہزار روپے تھی، چھ ماہ کے لیے ہبہ کر دیا گیا۔"[18]

دفتر دوم کا اختتامی حصہ بھی بڑا قابلِ قدر ہے۔ اس کا تعلق صوبائی انتظام کے ایک اہم نکتے سے ہے، یعنی ان مشکلات سے ہے جو بعض اوقات اس درمیانی عرصے میں پیش آتی تھیں جب ایک برطرف صوبیدار جا چکا ہو اور دوسرا ابھی آیا نہ ہو۔ جانے والے صوبیدار کے ذاتی افسران بڑے مخمصے میں پھنس جاتے تھے۔ ان کی وفاداری کا بڑا سخت امتحان ہوتا تھا، ایک طرف مملکت ہوتی، دوسری طرف ان کا پہلا آقا۔ قاسم خاں نے برطرفی کے بعد جو روش اختیار کی اس سے یہ مسئلہ پوری طرح سامنے آجاتا ہے۔[19]

مدوح کامروپ کے دیوان اور بخشی، میر صفی کے افعال بھی باعثِ دلچسپی ہیں۔ اس نے پرگنوں کی آمدنی کے تخمینوں میں تبدیلیاں کیں۔ اس نے یہ جدید طریقہ شروع کیا کہ کاشتکاروں

کی فرد مالگذاری سے تیر اندازوں کا بھتہ نکال لیتا تھا۔ اس نے پرگنوں کو دو درجوں میں تقسیم کر دیا' ایک حصہ کروریوں (جو براہ راست سرکاری انتظام کے تحت تھے؟) کے سپرد کیا اور دوسرا مستجیروں (آمدنی کا حساب لگانے والے) کے سپرد کیا جو "اپنے اخراجات اور فائدے" کے پیش نظر بڑھا کر تخمینہ لگاتے تھے۔ اس میں سب سے بڑی بے اطمینانی اور ابتری پھیلی اور دیوان کو ہٹا دیا گیا تاکہ "بغاوت کو پھیلنے سے روکا جا سکے جس کی ابتدا ٹیکسوں میں اس اضافے کی وجہ سے ہوئی تھی جو پیکیوں اور تیر اندازوں کے اخراجات پورے کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔"[20]

فوجی معاملات

یہ کتاب فوجی تفصیلات کے اعتبار سے بڑی کارآمد ہے۔ قلعوں کی تعمیر، محاصرے کا طریقہ، جنگی آلات، جنگی کشتیوں کی قسمیں، وغیرہ۔ مصنف ایک بحری افسر تھا' اور جن بحری معرکوں کا اس نے ذکر کیا ہے ان میں سے اکثر معرکوں میں خود شامل ہوا تھا۔ اسی وجہ سے مختلف بحری معرکوں کے بیانات نہ صرف واضح ہیں (جیسے ہارے ہوئے باغی اودیتیہ کا دریا کی راہ تعاقب اور پھر اس کا بھاری کشتی جہال گری سے ہلکی اور تیز رفتار کشتی کوسا میں کود کر بال بال بچ نکلا (جلد اول صفحہ 129) بلکہ بڑے معلوماتی بھی ہیں۔ بحری فوج مغلوں کی بہت بڑی کمزوری تھی' اور فارسی روزنامچوں میں اس موضوع پر بہت کم معلومات ملتی ہے۔

ایک مثال بڑی معنی خیز ہے جس سے انجینئرنگ میں مصنف کی مہارت اور اس علاقے میں بحری لڑائیوں کے بعض مسائل ظاہر ہوتے ہیں۔ اسلام خاں جب بھاٹی کی مہم پر گیا تو اتہمام خاں کو حکم دیا گیا کہ کشتیوں کا ایک بیڑا لے کر اس کے پیچھے جائے۔ اس بیڑے کو نہر گدیا کے ذریعے سیال گڑھ جانا تھا لیکن یہ معلوم ہوا کہ نہر بہت اتھلی ہے۔ چنانچہ فوری طور پر یہ فیصلہ کرنا ضروری ہو گیا کہ آیا نہر کے راستے جایا جائے یا نہیں' کیونکہ وقت کے ساتھ نہر اور اتھلی ہو جاتی اور بحری بیڑا اس میں پھنس کر رہ جاتا۔ نہر کی گہرائی کا معائنہ کرنے کے لیے مرزا ناتھن کو آگے بھیجا گیا۔ اس دوران میں پانی

روکنے کے لیے" مٹی اور گھاس کے بند بنائے گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ یہیں اور زور چلانا ممکن نہیں،
لیکن خوش قسمتی تھی کہ شہر سے کچھ فاصلے پر اسے دو جگہ پانی کے دو بڑے ذخیرے اور ایک دہانہ یا کھاڑی
دلدل نظر پڑی۔ اس نے یہ پانی شہر میں پہنچانے کے لیے دس ہزار کشتی بانوں کی مدد سے ایک قدم کا
ایک نالہ کھدوایا۔ اور مزید پچیس ہزار کشتی بانوں کی مدد سے دریا پر ایک پشتہ لگوایا تاکہ ہر کا
پانی دریائے کراتویا میں نہ داخل ہو پائے۔ اس طرح بیڑے کو لے جانے کے لیے نہر میں خاصہ پانی اکٹھا
کرلیا گیا۔[21]

کشتیوں کے بیڑے کا تفصیلی بیان اور زیادہ قابل قدر ہے۔ کشتیوں کی مختلف قسموں کے
نام دیے گئے ہیں ——— کناری، مئی کی، تھیلا، بیارا، کوسا، ملیا، بیال، مہاب (آبی توپ خانہ۔ توپ دار
کشتی)، مچھوا، پستہ، طلیا، وغیرہ۔ جنگی کشتیوں پر کس طرح توپیں نصب کی جاتی تھیں۔ اُن کو
گاڑیوں یا ٹھٹھاری کی قطار کے پیچھے کس طرح چھپایا جاتا تھا۔ توپ داغتے وقت کس طرح یہ
قطار پیچھے کرلی جاتی تھی؛ اس سب کا بیان یوں کیا ہے' بڑی کشتیاں جن پر بڑی توپیں یا
زربزنگ (میدانی توپیں) نصب تھیں قلعے کی فصیلوں کی طرح صفوں میں کھڑی کردی گئیں کشتیوں
کی ہر صف کے آگے اس نے گاڑیوں، جنھیں ٹھٹھاری کہتے ہیں، کی قطاریں لگادیں اور ان پر میناروں
کا ایک پورا سلسلہ کھڑا کردیا، اور ان میں سے ہر مینار پر ایک لال جھنڈا لہرا دیا۔ گاڑیوں پر چیتوں
اور شیروں کی کھالیں بچھادیں اور ہر بڑی توپ پر شیروں کی کھالیں ڈال دیں۔ ہر کشتی پر
سنہرے کام کا ایک شامیانہ لگا تھا . . . . . اگر توپ خانہ استعمال کرنا ہوتا تو یہ گاڑیاں جو
کشتیوں پر دریا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک قلعے کی دیوار کی طرح کھڑی تھیں، یک
لخت کشتیوں پر لٹائی جاسکتی تھیں، اور ہیبت ناک توپوں کے دغنے کے بعد دھواں ختم ہونے سے پہلے،
اپنی سابق حالت میں دوبارہ کھڑی کی جاسکتی تھیں"۔ اس کے بعد ایک آبی پل ہے "جیسا پل کسی سالار
نے کبھی نہ بنایا ہوگا"۔ کشتیوں کی ٹولیاں اس طرح باندھی گئی تھیں کہ پورا بیڑا خواہش کے مطابق ایک
صف میں سیدھا بھی چل سکتا تھا اور دائیں بائیں مڑ بھی سکتا تھا۔ ملاحوں کی وردیاں فولاد کی

بنی ہوئی تھیں[22]:

میدانی جنگ کی تفصیلات کی قدر و قیمت بھی کچھ کم نہیں ہے۔ بانس کے حصار اور مورچے دفاع اور فوجی استحکام کے عام طریقے تھے۔ ان دفاعی مورچوں کو توڑنے کے لیے ہاتھی (جو اس علاقے میں بہ کثرت پائے جاتے تھے) استعمال کیے جاتے تھے۔ بعض اوقات ہاتھیوں کے حملے سے پہلے دیواروں کی جڑیں کھودنے کے لیے توپوں کی حفاظتی مار میں پہلے بیل دار (انجینئر سپاہی) روانہ کیے جاتے تھے۔ وہ ایک بھاری حفاظتی پردے کے پیچھے چھپ کر جس کے نیچے پہیے لگے ہوئے تھے اور جسے ٹھوری یا گردوں کلاں کہا جاتا تھا، دشمن پر حملہ آور ہوتے تھے۔ یہ انوکھی مشین بڑی وزنی ہوتی ہوگی، کیونکہ ایک موقعہ پر اسے کھینچنے کے لیے مرزا ناتھن اور بہت سے سپاہیوں کو بڑا زور لگانا پڑا تھا۔[23] ہاتھیوں کے اکیلے مقابلے بھی بڑی وضاحت سے بیان کیے گئے ہیں[24]۔

محصور قلعوں کے سامنے اونچی اونچی مچانیں بنانے کا طریقہ بھی نرالا تھا۔ ان مچانوں کو اسا اونچا اٹھایا جاتا کہ دیوار پناہ کے پیچھے کی چیزیں نظر آنے لگیں، اور پھر اس اونچائی سے قلعے کی محافظ فوج پر گولا بارود کی جاتی تھی۔ دن کے وقت سپاہیوں اور عام مزدوروں کی مدد سے گھاس کاٹ کر اس کے ڈھیر لگا لیے جاتے تھے۔ رات کے وقت ان ڈھیروں پر مٹی لیس کر ان کی سطح سخت کر لی جاتی تھی۔ یہ ڈھیر یا تو ایک پر ایک کر کے رکھے جاتے تھے ورنہ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے محصور قلعے تک پھیلا دیے جاتے تھے۔ لیکن یہ ترکیب بعض اوقات محاصرہ کرنے والوں پر ہی اُلٹ جاتی تھی کیونکہ دشمن یک لخت حملہ کر دیتا تھا اور لمبے لمبے بانسوں کے سروں پر جلتے ہوئے لوٗے لپیٹے تیزی سے آگے آئے ..... اور گھاس کے ڈھیروں میں آگ لگا دی اور اس سے پہلے کہ گھبرائے ہوئے بہتی پانی لائے کے بارے میں سوچیں، آگ چاروں طرف پھیل گئی اور پلک جھپکتے ہی گھاس کے ڈھیر جل کر راکھ ہو گئے ... اور دشمن کامیاب ہو گیا۔"

سماجی معاملات

یہ پوری کہانی جنگوں کے گرد گھومتی ہے۔ اس کی وجہ سے سماجی دلچسپی کے معاملات پر

سوچنے کا موقعہ یا گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔ لیکن فوجوں کے کوچ، محاصروں اور مہموں کے درمیان سماجی دلچسپی کے معاملات کی جھلک ضرور نظر آتی ہے ـــــ خوشی اور غمی کی تقریبات عقائد کی کمزوری[25]، فال نکلوانا (صفحہ 487)[26]، جادو ٹونے کرنا[27] علامی کا رواج، مسلمانوں میں جوہر کی رسم ادا ہونا وغیرہ۔

اس شاندار ضیافت کا بیان بھی بہت خوب ہے جس کا اہتمام مرزا ناتھن نے اپنے باپ کی وفات کے چھ ماہ بعد، سوگ کی مدت گزرنے کے موقع پر کیا تھا۔ وہ جمعہ کا دن تھا، جب سب مل کر نماز پڑھتے ہیں۔ اسلام خاں خود نماز میں شریک ہونے والا تھا، اور یہ منادی کرادی گئی تھی کہ جو نماز میں شریک نہ ہوگا اس پر جُرمانہ کر دیا جائے گا۔ ضیافت میں شریک ہونے والے بہت سے لوگ نماز کے لیے جانا چاہتے تھے، لیکن مرزا ناتھن نے ان سے یہ کہہ کر رُکنے کی درخواست کی کہ "اگر جُرمانے کی فکر ہے تو اس کی ذمّہ داری میں لیتا ہوں"، سارے مہمان رُک گئے۔ جب محفل گرم ہوئی تو مہمانوں نے خوب مئے نوشی کی، اور اتنی زیادہ پی لی کہ جب اسلام خاں وہاں آیا تو "وہ احباب اسلام خان کے نزدیک نہ گئے۔ جنھوں نے بہت پی رکھی تھی اور مرزا ناتھن کے مکان کے مختلف راستوں سے اِدھر اُدھر نکل گئے۔ مرزا کے ملازموں نے اپنے کپڑوں پر عرقِ گلاب اور گُل نارنگی کی خوشبو لگا لی اور مُشک وغیرہ چھڑک کر کمرے کی فضا کو اس درجہ معطّر کر دیا کہ شراب کے تعفّن کی جگہ بُوئے فردوس آنے لگی"۔ ضیافت سات دن اور سات راتیں چلتی رہی، اور مرزا ناتھن اس کے بارے میں خود یہ کہتا ہے کہ "وہ ایک ایسا جشنِ احباب تھا جس کا بیان دُنیا کی تاریخوں میں ہونا چاہیے۔"

جوہر کی رسم ادا کرنے کا ایک واقعہ بڑا دلچسپ ہے۔ یہ رسم خود مرزا ناتھن کے خاندان کے افراد نے ادا کی تھی۔ بڑے تعجب کی بات یہ ہے کہ نہ صرف بورہ بلکہ اس کتاب کے بارے میں لکھنے والے سارے مصنف اس اہم واقعہ کو نظر انداز کر گئے ہیں۔ آسامیوں کے خلاف جنگ میں مرزا ناتھن کی فوج کو ہزیمت اُٹھانی پڑی اور یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ قلعے پر دُشمن کا قبضہ ہو جائے گا۔ مرزا ناتھن اپنے حرم کی خواتین کو ہاتھیوں پر سوار کر کے دُور بھیج دینا چاہتا تھا، لیکن چونکہ پورا شاہی توپ خانہ ہاتھیوں پر لدا ہوا تھا اس لیے صرف ایک ہاتھی مل سکا۔ خواتین کو ایک لائق اعتبار ملازم کے

ساتھ روانہ کیا گیا اور ملازم کو یہ ہدایت کی گئی کہ زنانہ تھن کی موت کی خبر سنتے ہی خواتین کو ختم کر دے۔ چونکہ حرم کے خدمت گاران ہاتھیوں کی کمی کی وجہ سے بھیجے نہ جا سکے، اس لیے انھیں جوہر کرنے کا حکم دے دیا گیا، اور زمرا کے محل کے بچاس سے زیادہ رانیوں نے جوہر کیا اور فوج کے اُن بہت سے اشخاص نے بھی جوہر کیا جنھیں اپنی عزّت و آبرو خطرے میں نظر آئی۔[29] گو اس دہشت ناک اور غیر اسلامی رسم کے عام ہونے کے بارے میں ڈاکٹر بورہ کا خیال ضروری طور سے درست ہو سکتا ہے لیکن یہ بات معنی خیز ہے کہ یہ دونوں نادر مثالیں دُور افتادہ مشرقی علاقے میں رونما ہوئیں۔ یہ ممکن ہے کہ راکھس کی بعض بیویاں بھی اسی علاقے کی رہنے والی ہوں جہاں وہ مدّتوں مقیم رہا تھا۔ اور زیادہ معنی خیز ہے کہ انھوں نے جوہر کی رسم ادا کی۔

متفرق معاملات

اس بارے میں حوالے موجود ہیں کہ بنگال کی آمدنی دارالخلافہ بھجوانے میں کتنے خطرات پیش آتے تھے۔ یہ حوالے اٹھارھویں صدی سے متعلق ہیں جب بنگال کی آمدنی شہنشاہ کے ذرائع آمدنی میں بہت اہمیت رکھتی تھی۔ بہارستان میں ایک اور واقعے کا ذکر ہے جس سے نہ صرف دُشواریاں پتہ لگتی ہیں بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان دُشواریوں پر کیسے قابو پایا جاتا تھا۔

شاہ جہاں نے متناب خاں کو اکبر نگر کا حاکم اعلا مقرر کیا۔ اس کے اہم فرائض میں سے ایک یہ تھا کہ آمدنی اور جنگی ساز و سامان باقاعدگی سے بھجواتا رہے (اس نے اس دوران میں ایسی کشتیوں کے ذریعے جن میں پانچ سو سے ایک ہزار من تک سامان بھیجا جا سکتا تھا، چار ہزار من بارود، آٹھ ہزار من جستہ، لوہا اور سنگِ گرم بھجوایا تھا)۔ اس نے ایک موقع پر سات لاکھ روپیہ بھجوایا تھا چونکہ موسمِ برسات اپنے شباب پر تھا، سڑکیں پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں اس لیے یہ روپیہ صرف دریا کے راستے ہی بھیجا جا سکتا تھا۔ اس راستے میں بھی سیلاب کا یا کشتیوں کے ڈوب جانے کا خطرہ تھا۔ اس لیے متناب خاں نے ذیل کا انوکھا راستہ ڈھونڈ نکالا۔ اس نے پہلے یہ حساب لگا کر پانی کسی بھی جگہ چھ سو فٹ

سے زیادہ ۔ ہوگا۔ چنانچہ اس نے سو رسیاں منگوائیں جن میں سے ہر ایک چھ سو فٹ لمبی اور درمیانی انگلی کے برابر موٹی تھی۔ اس نے پانچ سو موٹے چھوٹے اور کھوکھلے تونبے بھی منگوائے جو تیرنے کی مشق میں کام آتے ہیں۔ ایک لاکھ روپے کی پہلی قسط ہزار ہزار روپے کے سو تھیلوں میں تقسیم کر دی گئی۔ ہر رسی کے ایک سرے سے روپے والے ہر تھیلے کا منہ اور دوسرا سرے سے الگ تونبہ باندھ دیا گیا۔ یوں تو عام طور سے روپوں کے تھیلے بکسوں میں رکھ کر بھیجے جاتے تھے، لیکن بجائے اس کے انھیں لکڑی کے لٹھوں پر رکھ دیا گیا جو کشتیوں پر رکھے ہوئے تھے۔ مزید احتیاط کے خیال سے مچھیروں کی کشتیاں ساتھ کر دی گئیں جن پر ماہر غوطہ خور موجود تھے " جو پانی کے اندر دو سو فٹ گہرائی تک غوطہ مار سکتے تھے"۔ ان تیاریوں کے پیچھے یہ اسکیم تھی کہ اگر کوئی کشتی ڈوبی تو روپوں کے تھیلوں میں بندھے ہوئے بہت سے تونبے تیرتے نظر آئیں گے اور مچھیرے روپوں کے تھیلوں کو پانی کی بالٹیوں کی طرح، بڑی آسانی سے اوپر کھینچ لیں گے۔ اگر روپوں کا کوئی تھیلا اتفاق سے دریا کی تہہ میں کسی چیز میں اٹک گیا تو غوطہ خور غوطہ لگا کر اسے چھڑا لیں گے[31]۔

عظیم الشان شاہ جہاں، تاج اور بہت سی دوسری نفیس عمارتوں کا خالق، بڑا مشہور شخص ہے۔ بہارستان یہ ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اسے ابتدائی ایام سے ہی عمارت سازی کا شوق تھا۔ اس پریشانی کی حالت میں بھی جب شاہی دستے اس کا تعاقب کر رہے تھے، اکبر نگر پہنچ کر اس نے یہ معلوم کرنے کا موقع نکال لیا کہ جس شاہی ایوان کی تعمیر کا اس نے حکم دیا تھا وہ کس حد تک مکمل ہو چکا ہے۔ اسے مجوزہ نقشے کی معمولی تفصیلات بھی یاد تھیں۔ چنانچہ عمارت میں جو ذرا ذرا سی تبدیلیاں کی گئی تھیں ان کے بارے میں بھی اس نے جواب طلب کیے۔ وہ داروغۂ عمارت سے ناراض ہو گیا اور حکم دیا کہ اس کے ساٹھ کوڑے لگائے جائیں۔ اس نے نئی تبدیلیوں کے واسطے حکم دیا اور ایک خاص خواب گاہ کی تعمیر کے لیے فوری طور پر سامان مہیا کیا گیا۔ جھروکہ اور غسل خانے کی عمارتیں بنائی گئیں۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ لکڑی کا سامان تیار کرنے والے کل چھتیس کارخانے — کارخانہ جات رخوتی — جن میں کام ہو رہا تھا ان کا انتظام درست کیا گیا — اس کام کے لیے شتاب خاں نے اپنی جیب خاص

سے سترہ ہزار روپے دیے۔[32]

مغل دور کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس دَور میں عصری اور نیم عصری روزناموں کی بہتات ہے۔ ان میں سے بیشتر نہ صرف دربارِ شاہی سے متاثر نظر آتے ہیں بلکہ اہم شخصیات اور بڑے بڑے سیاسی واقعات کے ادکار سے پُر ہیں۔ اسی وجہ سے اس دَور کے بارے میں جو نظریہ قائم کیا گیا ہے اس میں توازن قدرے کم ہے۔ بابر اور جہانگیر دونوں کی شاہی توزکیں اپنی مثال آپ ہیں، اور دوسری کتابوں کے مقابلے میں بڑی تارگی بخش ہیں۔ لیکن یہ شہنشاہوں کی توزکیں ہیں اور فطرتاً ان کا نقطۂ نظر ایک مخصوص اعلا سطح تک محدود ہے۔ بہارستاں ایک صوبائی فوجی افسر کی توزک ہے۔ اس کے مشاہدات اور بیانات ایک ایسا نظریہ پیش کرتے ہیں جس کا تعلق ایک بالکل مختلف سطح سے ہے۔ لیکن اس دَور کے بارے میں ایک دُرست اور مکمل خیال بنانے کے لیے ایسی کتابیں نہایت ضروری ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بہارستاں کے بعض بیانات خوش اعتقادی پر مبنی ہیں بلکہ فضول ہیں، پھر بھی ان بیانات کی مدد سے بہت سے نکات کے بارے میں ہمارا ادراک دُرست ہو جاتا ہے، اور اسی بنا پر کتاب کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ ہمیں اگر ایسی بہت سی کتابیں مل جائیں تو خاصہ فائدہ ہو۔

حوالہ جات

1- اصل مسودے کا حوالہ یہ ہے ا

"Biblio theque National, Paris, Gentil 42 supplement 252

سب سے پہلے ڈاکٹر جادو ناتھ سرکار نے اسے عوام سے متعارف کرایا۔ اس کے بارے میں ان کے بعض مقالے بنگالی کے ماہواری رسالے پراباسی میں شائع ہوئے۔ بعد میں انھوں نے ایک مقالہ JBORS 1921 میں لکھا، جس میں اس کی دریافت کا پورا حال اور اس کی پوری فہرست مضامین دی۔

2- (Department of Historical & Antiquarian Studies)

آسام سرکار کے تحقیقِ تاریخ و سلف کے شعبے نے 1936 میں شائع کیا۔ میرا مضمون اسی حدود متن پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر بورہ نے اس مسودے کی وہ اوٹوگراف نقل استعمال کی ہے جو ڈھاکہ یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔ ڈاکٹر سرکار نے اپنے استعمال کے لیے خود دستی نقل اور اوٹوگراف نقل کروائی تھی، ملک میں اس کے علاوہ فارسی متن کی کوئی نقل موجود نہیں ہے۔ ڈاکٹر سرکار کی دستی نقل اب نیشنل لائبریری کلکتہ میں موجود ہے، لیکن میں اسے استعمال نہ کر سکا۔

3- History of Bengal, Vol II, Preface p X, ed J. N Sarkar, Dacca, 1948

4- S R Sharma's articals entitled Bengal under

Jahangir, J I H Vols XI, XIII – XIV and Prince Shahjahan in Bengal, IHQ Vol XI Also see S N Bhattacharya's article, entitled Rebellion of Shahjahan and his carrier in Bengal, IHQ Vol X and his book, A History of Mugal North-East Frontier Policy Introduction

5- طبع سدہ متن میں جو عنوان اور ضمنی عنوان دے گئے ہیں ان میں سے سارے عنوان اصل متن میں نہیں ہیں۔ ان میں سے کچھ عنوان مدیر نے دیے ہیں لیکن چاروں دفتر ان کے عنوان اور ان کے نام وہ معنوں کیے گئے ہیں یہ سب اصل متن کے مطابق ہیں۔

Baharistan-i-Ghaybi, tr M I Borah (Gauhati 1936) -6
Vol I pp 282–287, 294–295, Ibid, pp 741, 777 etc
Henceforth quoted as Baharistan

JBORS op cit, p3 -7

Sharma, Bibliography of Mughal India, pp 69–70 -8

9- چونکہ اور زیادہ درست معلومات موجود نہیں ہے۔ اس لیے اس نکتے پر بہت زیادہ زور نہیں دیا جا سکتا لیکن داخلی شواہد نکتے کے حق میں ہیں۔

Journal of Indian History, Vol XI p 334 -10

11- تعجب ہے کہ ڈاکٹر بورہ کہیں یہ حوالہ نہیں دیتے کہ مسودے میں یہ فہرست موجود ہے۔ پروفیسر شرما نے ڈاکٹر سرکاری کی روٹوگراف نقل سے استفادہ کیا ہے۔ انھوں نے بھی یہ فہرست ضرور دیکھی ہوگی۔ ڈاکٹر سرکار نے JBROS میں اپنا جو مقالہ چھپوایا تھا اس معاملے میں عنوانات کی یہ پوری فہرست دی تھی لیکن انھوں نے خاص طور سے یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ یہ فہرست اس فہرست کی بنیاد پر تیار کی گئی ہے جو اصل متن سے منسلک ہے۔

Baharistan, Vol I, pp 282 – 87, 294–95, 298 -12

Ibid; pp 309–10 See also p 213 -13

14- Irfan Habib, Agrarian System of Mughal India (1556 —1707), (Aligarh 1963), pp 264-65, footnote 30

15- Baharistan, Vol II pp 741-42, 777
جیسا کہ اس ادارتی فٹ نوٹ نمبر (ج) میں بتایا گیا ہے یہ مضمون طبع شدہ انگریزی متن رسمی سے اس عبارت کا ترجمہ پورے طور سے اس مفہوم کی حمایت نہیں کرتا ہے۔ لیکن اگر اس واقعے کو غور سے پڑھا جائے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ وہی ماہواری تناسب والی امداد کا معاملہ ہے جو حبیب صاحب نے بیان کیا ہے۔

16- مغل انتظامیہ کے مختلف شعبوں میں دوہری جانچ کا جو نظام رائج تھا، یہ معاملہ اس نظام ہی کا ایک نمونہ ہے۔ جہاں ایک طرف یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ اس رواج سے مغل افسران کی عام بددیانتی ظاہر ہوتی ہے، وہیں یہ دلیل بھی دی جا سکتی ہے کہ سرکار معاملات کی اصل نوعیت سمجھنے اور درست معلومات اکٹھا کرنے کے لیے کتنی سخت کوشش کرتی تھی۔

17- ان تفصیلات کی مدد سے وہ طریق کار ظاہر ہوتا ہے جس کے تحت یہ نظام کام کرتا تھا۔

18- ڈاکٹر بورہ نے اس کا یہی ترجمہ کیا ہے۔ لیکن میرے خیال سے جس عبارت کا ترجمہ چھ ماہ کی تنخواہ دیا گیا ہے اس کا اصل مفہوم ماہواری تناسب نظام ہے۔

19- بہارستان، جلد اول، صفحات 421، 440

20- ایضاً، صفحہ 289

21- ایضاً، صفحات 45، 47

22- ایضاً، صفحات 48، 49

23- ایضاً، صفحات 235، 237

24- ایضاً، صفحات 181 تا 182، 283

25- ایضاً، صفحہ 168

26- ایضاً، صفحہ 487

27- ایضاً، صفحہ 273، اور جلد دوم، صفحہ 626

28- ایضاً، اوّل، صفحات 215، 216

29- ایضاً، جلد دوم، صفحات 298، 299

30- The English Bengal, Vol II pp 24-26

31- بہارستان۔ جلد دوم، صفحات 739، 741

32- ایضاً، صفحات 765، 772

گولکنڈہ کے قطب شاہی دَور کی عصری تاریخیں

ایچ۔ کے۔ شیروانی

دکن جیسے وسیع علاقے کی تاریخ میں سرگرمی کے ساتھ دلچسپی لینے والے عالم اتنی کم تعداد میں ہیں کہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اس وسیع علاقے کے ایک حصّے گولکنڈہ، جسے میں تلنگ آندھرا کہتا ہوں، کے تاریخی مآخذوں کا لوگوں کو بہت کم علم ہوگا۔ عالموں کو یہ بات عجیب لگے گی کہ برگس نے اپنی کتاب Rise and Fall of the Mohammed Power of India کی تیسری جلد میں ایک "گمنام مصنف" کی جس کتاب کا تحلیص شدہ ترجمہ شامل کیا ہے، اس کتاب کو ایک ممتاز مورخ فرشتہ سے منسوب کیا ہے۔ مزید یہ کہ ہم ایلیٹ اور ڈاؤسن کے اتنے مرہونِ منت ہو چکے ہیں کہ عبدالرزّاق کی کتاب مطلع السعدین کے صرف اس بیان سے واقف ہیں جو اس نے شہر وجے نگر کے بارے میں لکھا ہے وہ شاہ ہرات کے سفیر معتبر کی حیثیت سے رائے کے دربار میں بھیجا گیا تھا۔

قطب شاہی دَور کے بارے میں اتنا بہت سا تاریخی مواد موجود ہے کہ "ایک چھوٹے سے مضمون میں اس کا تجزیہ کرنا ممکن نہیں۔ لہٰذا میں نے یہ سوچا کہ اپنا مضمون ان عصری کتابوں اور دستاویزوں تک محدود رکھوں جو دکن میں لکھی گئیں۔

وضاحت کے خیال سے یہ مضمون ذیل کے حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے:

حصّہ اوّل

دکن میں لکھی جانے والی وہ عصری ہند فارسی تاریخیں جو شائع ہیں، اس حصّے میں بعض

وہ خطوط بھی شامل کر دیے گئے ہیں جو عبداللہ قطب شاہ اور دوسرے اشخاص نے لکھے۔

حصّہ دوئم

دکن میں لکھی جانے والی وہ عصری ہند فارسی تاریخیں جو نظم میں ہیں۔

حصّہ سوئم

تلگو کی وہ نظمیں جن کا تعلق قطب شاہی دور کی تاریخ سے ہے۔

حصّہ اوّل

عصری ہند فارسی تاریخیں جو نثر میں ہیں۔

1۔ بُرہانِ معاصر

یہ بات لائق توجہ ہے کہ بُرہانِ معاصر وہ پہلا فارسی روزنامچہ ہے جس کا تعلق قطب شاہی دور کی تاریخ سے ہے اور نہ دکن میں تالیف کیا گیا ہے۔ اس کا مصنّف سیّد علی بن عزیز اللہ طباطبائی عراق سے ہندوستان آیا اور ابراہیم قطب شاہ (80 - 1550) کی ملازمت اختیار کی۔ وہ مالارگ کے معاصرے کے وقت موجود تھا۔ یہ معاصرہ ابراہیم کے دور میں ستمبر 1581 سے شروع ہوا اور اس کے جانشین محمد قلی کے دورِ حکومت کے ابتدائی مہینوں میں جنوری 1582 تک جاری رہا لیکن اس واقعے کو شاید زیادہ مدت نہیں گزری تھی جب اس نے قطب شاہی ملازمت ترک کر کے نظام شاہی ملازمت اختیار کر لی۔ بُرہان نظام شاہ دوئم (95 - 1591) نے اس روزنامچے کی تالیف کا کام اس کے سُپرد کیا جس روزنامچے کا نام اس کے اپنے نام پر رکھا گیا۔ کتاب کا عنوان بُرہان معاصر مادّۂ تاریخ ہے اور اس سے 1000ھ مطابق 1592 تاریخ نکلتی ہے۔ (اتفاق سے اسی سال حیدرآباد کا شہر بھی بسایا گیا) مصنّف کا کہنا ہے کہ اس نے یہ کتاب 14 ربیع الثانی 1003ھ مطابق 17 نومبر 1594 کو مکمل کر لی تھی لیکن اس کا بیان اس طویل مجلسِ امن تک جاری رہتا ہے جو شہزادہ مراد اور چاند بی بی سلطان کے درمیان ہوئی اور جو 27 رجب 1004ھ

مطابق 14 / مارچ 1596 کو ختم ہوئی۔ کیمرج کے جس مسودے سے طبع شدہ کتاب نقل کی گئی ہے اسی مسودے کے آخر میں ایک دلچسپ ترقیمہ ہے، جس میں لکھا ہے کہ یہ مسودہ مصنّف کے بیٹے ابوطالب نے 22 محرّم 1038ھ مطابق 11 / ستمبر 1628 کو نقل کیا۔

یہ رورنامچہ تین بڑے چھوٹے طبقات یا حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصّے میں گلبرگہ کے بہمنیوں کا ذکر ہے، دوسرے میں بدار کے بہمنیوں کا ذکر ہے، اور تیسرے حصّے کا خاص موضوع احمدنگر کے سلطان ہیں جن کا ذکر 14 / مارچ 1596 کے معاہدۂ امن تک جاری رہتا ہے۔ پہلا حصّہ سب سے زیادہ مختصر ہے اور مسکل سے چھپے ہوئے باون صفحات پر مشتمل ہے، دوسرے حصّے میں ایک سو پندرہ صفحات ہیں۔ لیکن آخری حصّے میں تقریباً چار سو ستر صفحات ہیں جن میں برہان دوئم تک کے بادشاہوں کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ دیا گیا ہے۔ چونکہ احمدنگر منتقل ہونے سے پہلے مصنّف قطب شاہی ملازم تھا۔ اس لیے اُس نے گولکنڈہ۔ حیدرآباد۔ کی تاریخ پر بڑی توجّہ دی ہے۔ اس نے سلطان قلی قطب الملک اور اس کے بیٹے کے مختصر دورِ حکومت کا ذکر تقریباً چھوڑ کر ابراہیم قطب شاہ اور قلی قطب شاہ کے دورِ حکومت کا ذکر کیا ہے۔ اُس نے آخری دو بادشاہوں کا ذکر قدرے دلچسپی کے ساتھ کیا ہے، حالانکہ اس دلچسپی کا سبب وہ واقعات ہیں جن کا تعلّق نظام شاہی حکومت سے تھا۔ قطب شاہی سلسلۂ حکومت کے بارے میں اس کی دی ہوئی تفصیلات بڑی مفید ہیں۔ حالانکہ اس نے برار کے حکمرانوں کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے کہ حکمراں کو محض عماد الملک لکھا ہے اور اسی سلسلے کے دوسرے حکمراں کو محض شیخ علاالدین عماد الملک لکھا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ عماد شاہی اور نظام شاہی حکمرانوں میں سخت دشمنی تھی۔

جیسا کہ ایک اور جگہ لکھا گیا ہے (شیروانی، دکن کے بہمنی۔ ایک معروضی تحقیق) جہاں تک بہمنیوں کا تعلّق ہے برہان فرشتہ کی اصلاح کرتا ہے۔ بہمنی کے بعد والے دَور میں طباطبائی نے بہت سے واقعات اپنی آنکھ سے دیکھتے تھے، اور اس سے پہلے کی تاریخ کے بارے میں اس نے جو معلومات فراہم کی ہے وہ بھی خاصی لائقِ اعتبار ہے۔ دو معاہدوں کے وقت

موجود تھا ایک فالارگ کا محاصرہ جب وہ محمد قلی قطب شاہ کا ملازم تھا اور دوسرا احمد نگر کا محاصرہ جب وہ چاند سلطانہ کے حاسیہ نشینوں میں تھا اور کسی بڑے عہدے پر فائز تھا۔ مزید یہ کہ اس نے اس مجلسِ امن، جس نے احمد نگر اور مغلوں کے تصادم کو وقتی طور سے ختم کر دیا، کا ذکر اتنے واضح انداز میں کیا ہے کہ لگتا ہے جیسے وہ خود مجلس کی کارروائی میں شریک رہا ہو۔

پہلے دو طبقوں کا ترجمہ اور تلخیص جے۔ایس۔کنگ نے کی اور اسے "The History of Bahmani Kingdom" کے نام سے 1900ء میں شایع کرایا۔ اسی طرح تیسرے طبقے کا ترجمہ اور تلخیص سبرو ولرے ہیگ نے کی اور اسے "The History of Nizam Shahi of Ahmadnagar" کے نام سے 1923ء میں شایع کرایا۔

2۔ گلشنِ ابراہیمی جسے عام طور سے تاریخ فرشتہ کہا جاتا ہے۔

محمد قاسم ہندو شاہ کا لقب فرشتہ تھا۔ 552ھ میں ایران کے مقام استرآباد میں پیدا ہوا اور 1623ء میں بیجاپور میں فوت ہوا۔ وہ احمد نگر لایا گیا تو بچہ ہی تھا۔ بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ دوئم کے دربار کی ملازمت اختیار کرنے سے پہلے 1591ء تک وہ احمد نگر میں ہی رہا۔

اس کی عظیم الشان کتاب، گلشنِ ابراہیمی یا نورس نامہ جسے لوگ عام طور پر تاریخ فرشتہ کے نام جانتے ہیں، 1606ء میں مکمل شکل میں بادشاہ کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔ لیکن بعد میں مصنف نے کتاب میں توسیع کی اور اس میں 1606ء تک کے واقعات شامل کر لیے۔ ہندوستانی تاریخ کے دورِ وسطیٰ کے بارے میں جتنے روز نامچے لکھے گئے ہیں بلاشک وشبہ یہ روز نامچے ان میں سے اہم ترین روز ناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ جو بھی روز نامچے اس کے بعد تالیف کیے گئے ہیں ان کے مصنفین کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انھوں نے یا تو فرشتہ کے موضوعات میں اضافہ کیے ہیں یا پھر محض اس کی ایسی نقل کی ہے جس میں کسی خاص موضوع پر زور دیا ہے۔

مصنف نے تمہید میں تئیس کتابوں کا ذکر کیا ہے جن سے اسے معلومات حاصل ہوئیں لیکن اس میں سے کوئی بھی کتاب قطب شاہی سلسلۂ حکومت کی تاریخ نہیں ہے۔ جلد دوئم کا انتہائی مختصر حصّہ چار (لکھنؤ ایڈیشن) جو تلنگ کے فرمانرواؤں کے بارے میں ہے۔ اس میں وہ ایک کتاب 'وقائع قطب شاہیہ' کا حوالہ دیتا ہے جس کے بارے میں خیال یہ ہے کہ ابراہیم قطب شاہ (1550-۱۵۶۲) کے زمانے میں عراق کے شاہ خُرشاہ نے لکھی تھی۔ لیکن ساتھ میں وہ یہ اعتراف بھی کرتا ہے کہ یہ کتاب (ایسے) دستیاب نہ ہو سکی حقیقت یہ ہے کہ شاہ خُرشاہ کی کوئی ایسی کتاب ہے ہی نہیں۔ تاریخ ایلچی نظام شاہ (مصنف خُرشاہ بن قباد الحسینی) کی ایک نصف جلد موجود ہے جو 1038ھ مطابق 29-1628ء میں عبداللہ قطب شاہ کے شاہی کُتب خانے کے لیے تیار کی گئی تھی۔ (سالار جنگ میوزیم، حیدر آباد، مسودہ نمبر 118 B) اس کتاب میں مصنف نے دکن کے بہمنیوں تک کی تاریخ عالم بیان کی ہے۔ جس میں قطب شاہیوں کے ترکمان آباد اجداد کا ذکر بھی شامل ہے۔ لیکن جب وہ محمد شاہ لشکری (82-1463) اور بہمنی سلطنت کے ٹکڑے ہونے پر آتا ہے تو یہ وعدہ کر کے رُک جاتا ہے کہ بعد میں بہمنی حکومت کی جانشین حکومتوں، یعنی ان ریاستوں کے بارے میں تفصیل سے لکھے گا جن پر نظام الملک، عادل خاں، قطب الملک، عماد الملک اور قاسم بَرید نے حکومت کی۔ اگر اس نے واقعی قطب شاہیوں کی کوئی تاریخ لکھی ہے تو ہم اس سے واقف نہیں۔ اور وہ کم سے کم فرشتہ کو نہیں ملی۔

فرشتہ کے لکھنؤ والے ایڈیشن میں قطب شاہیوں پر صرف پانچ صفحے صَرف کیے گئے ہیں جبکہ عادل شاہیوں نے بانوے صفحات اور نظام شاہیوں نے بہتّر صفحات لیے ہیں۔ ان پانچ صفحات میں بھی مصنف نے حقائق سے لاعلمی کی بنا پر بعض کھلی ہوئی غلطیاں کی ہیں۔ اس کی غلطیوں کی چند مثالیں حسبِ ذیل ہوں گی:-

(۱) وہ کہتا ہے کہ محمد قلی بارہ سال کی عمر میں 989ھ مطابق 1581ء میں تختِ سلطنت پر متمکن ہوا۔ حالانکہ وہ خود ہی یہ کہتا ہے کہ وہ یکم رمضان 97۔ھ کو پیدا ہوا۔

2- 1018 ھ مطابق 10-1609ء میں لکھتے وقت وہ کہتا ہے کہ سفیر فارس' اُغورلو سلطان دکن میں مقیم تھا اور منتظر تھا کہ سلطان کی بیٹی حیات بخشی بیگم سے ایران کے شاہ عباس دوئم کے بیٹے کی شادی کی تجویز منظور ہو جائے' حالانکہ اس بیٹی کی شادی سلطان کے اپنے بھتیجے سے جو بعد میں سلطان محمد قطب شاہ بنا دو سال پہلے ہی ہو چکی تھی۔

3- فرشتہ محمد قلی اور "زنِ فاحشہ" بھاگ متی کے فرضی عشق میں اتنی زیادہ دلچسپی لیتا ہے کہ نو تعمیر دارالسلطنت کو 1018 ھ مطابق 10-1609ء میں بھاگ نگر کہتا ہے' جبکہ ہمارے پاس "دارالسلطنت حیدرآباد" میں ڈھلے ہوئے 1012 ھ مطابق 1603ء کے سب سکے موجود ہیں۔ وہ خود ہی اس بات کو بھول کر صاف لفظوں میں لکھتا ہے کہ قطب شاہی فوج کو جو 1005 ھ مطابق 1597ء میں احمد نگر بھیجی گئی تھی' مغلوں نے شکستِ فاش دی اور وہ بھاگ کر "حیدرآباد" واپس آگئی۔

لہٰذا جہاں تک قطب شاہی سلسلۂ حکومت کا تعلق ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ فرشتہ کی گلشنِ ابراہیمی پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

3- تذکرۃ الممالک

میر رفیع الدین ابراہیم بن نورالدین توفیق شیرازی 947 ھ مطابق 11-1510ء کے آس پاس پیدا ہوا تھا۔ وہ محمود شاہ بہمنی کے زمانے میں اپنے باپ کے ساتھ بحیثیت تاجر بیجاپور آیا لیکن علی عادل شاہ (79/1557) کے زمانے میں گردشِ ایام نے اسے سرکاری ملازمت اختیار کرنے پر مجبور کر دیا' اور بظاہر یہ لگتا ہے کہ وہ شاہی خاندان کے سامان کا مہتمم یا خوان سالار مقرر ہوا۔ اس نے رفتہ رفتہ یہاں تک ترقی کی کہ ابراہیم عادل شاہ دوئم (1579-1626) نے 1005 ھ مطابق 7-1596ء میں ایک اہم سفارتی مہم پر اسے احمد نگر بھیجا۔ اس نے کچھ مدت تک بیجاپور کے صوبیدار کے فرائض بھی انجام دیے۔

رفیع الدین نے ۱۹ / رمضان 1017 ھ مطابق 17 / دسمبر 1608ء کو تذکرۃ الممالک لکھنا شروع کی اور 6 / جمادی الثانی 1024 ھ مطابق 23 / جون 1615ء کو نورس پور میں، جو بیجاپور کے نواح میں ہے، (بیجاپور کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ اس کا نام بدل کر بیجاپور رکھ دیا تھا) اسے مکمل کر لیا۔ یہ تذکرہ دراصل بیجاپور کے عادل شاہیوں کا روزنامچہ ہے، جس میں دیباچے کے طور پر ایک باب بہمنیوں کے بارے میں ہے اور آخر میں دو باب، امیر تیمور سے اکبر تک مغلوں کے بارے میں ہیں۔ باقی سات ابواب میں ابراہیم عادل شاہ دوئم تک عادل شاہیوں کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ لیکن بہمنی کی جانشیں ریاستوں کی سیاست کچھ اس درجہ ایک دوسرے سے وابستہ تھی کہ عادل شاہیوں کی کسی بھی مفصل تاریخ میں قطب شاہیوں کو بھی خاصی اہم حیثیت دینا ضروری ہو گیا تھا۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مصنف نے عادل شاہی دور کے پہلے چار حکمرانوں کو لفظ شاہ لگائے بغیر صرف ان کے نام سے پکارا ہے۔ جس سے ایسا لگتا ہے کہ ان حکمرانوں نے اپنی بادشاہت کا اعلان نہیں کیا۔ یہ بات بہرحال یاد رکھنی چاہیے کہ چوتھے حکمراں ابراہیم عادل کے بعض کتبے موجود ہیں جن پر تاریخ سال 945ھ مطابق 9-1538ء پڑی ہوئی ہے، اور جن میں اس کا نام ابراہیم عادل شاہ لکھا گیا ہے۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ اس نے یوسف عادل خاں کا شجرۂ نسب سلاطینِ ترکی، محمود اوّل یا دوئم کے بجائے وسطِ ایشیا کے مقام ساوا کے محمود بیگ سے ملایا ہے، حالانکہ بعض اوقات یوسف عادل خاں کا شجرۂ نسب ترکی کے ان ہی سلطانوں سے ملایا جاتا ہے۔

مصنف نے قطب شاہیوں پر خاصی توجہ اور وقت صرف کیا ہے۔ اس نے ابراہیم قطب شاہ کی بڑی تعریف و توصیف کی ہے اور نئے دارالسلطنت حیدرآباد کی تعمیر کے بارے میں بڑی معلومات فراہم کی ہے۔ اس نے نیا شہر بسائے جانے کا سبب، شہری زمین کی تقسیم، شاہی محل کے حصّوں کی تفصیلات اور ریاست میں عالموں اور دانشوروں کی حیثیت کا ذکر کیا ہے۔ مجموعی طور سے یہ کتاب قطب شاہی سلسلۂ حکومت کے ابتدائی دور

خاصی اچھی سند سمجھی جاتی ہے۔

4۔ تاریخ محمد قطب شاہ

5۔ معاصرِ قطب شاہی

تاریخ قطب شاہی سلسلۂ حکومت کی ایک جامع اور مفصل تاریخ ہے۔ یہ سلطان محمد قطب شاہ کے حکم سے 1025ھ مطابق 1616ء میں تالیف کی گئی۔ اس کا مصنف، خود کو گمنام رکھنا چاہتا ہے، اس نے تمہید میں یہ لکھا ہے کہ اس کے سامنے "اعلا حضرت کے ملازمین (چاکران) میں سے ایک کی"، لکھی ہوئی ایک بڑی تاریخ موجود تھی جس کو اس نے مختصر کیا ہے اور بعض ایسے حقائق بیں اضافے کیے ہیں جن کا تعلق اس دَور کی تاریخ سے ہے۔ چونکہ یہ سلسلۂ حکومت کی ایک ایسی تاریخ ہے جس پر سرکاری مہر لگی ہوئی ہے اس لیے اس کا بیان سلطان قلی اور اس کے چچا اللہ قلی کے ہندوستان آنے سے پہلے سلطان قلی کے خاندان کے قارا قوونلوبس منظر سے شروع ہوتا ہے، اور اس سلسلۂ حکومت کی تاریخ کے سارے پہلوؤں کا احاطہ کرکے جاری رہتا ہے۔ یہ کتاب ذیل کے چار "بیانات" اور ایک اختتامیہ بیان میں تقسیم کی گئی ہے۔

(1) سلطان قلی قطب الملک کا بیان

(2) "محمد قطب الملک" اور اس کا بیٹا "جو جمشید قلی کہلاتا ہے" ان دونوں کا بیان۔

(3) ابراہیم قطب شاہ کے حالاتِ زندگی اور دَورِ حکومت کا بیان۔

(4) سلطان محمد قلی قطب شاہ کے حالاتِ زندگی اور دَورِ حکومت کا بیان۔

(5) اختتامیہ بیان: سلطان محمد قطب شاہ کے دَورِ حکومت کے "بعض واقعات" کا بیان۔

اس کتاب میں نہ صرف دربار کے واقعات، مہمات اور فتوحات کا ذکر ہے بلکہ قطب شاہیوں کے رفاہِ عامّہ کے کاموں، ان کی ادبی سرپرستی اور ان کی تعمیرات کا بھی ذکر ہے۔

اس نے حیدرآباد کا شہر بسائے جانے کا سبب، شہری زمین کی تقسیم کا خاکہ، مختلف عمارتوں اور دارالسلطنت سے آنے جانے والی سڑکوں کا ذکر کیا ہے۔ اس نے حیدرآباد اور گولکنڈہ کی باہمی اہمیت اور ایسے بہت سے حقائق بیان کیے ہیں جو کہیں اور نہیں ملتے۔ وہ تاریخوں کا بہت پابند ہے اور اس نے تاریخوں کی جو ترتیب دی ہے وہ بڑی حد تک درست ہے۔ مصنّف نے یہ کتاب شعبان 1026ھ مطابق جولائی۔اگست 1617ء میں مکمّل کر لی تھی۔

ایک اور مصنّف محمود بن عبداللہ نیساپوری نے اس تاریخ کا بیان اپنی کتاب معاصرِ قطب شاہی میں 1038ھ تک مکمل کر دیا ہے۔ اس نے 995ھ مطابق 1587ء میں محمد قلی قطب شاہ کی ملازمت اختیار کی، اور یہ کتاب 1033ھ مطابق 1624ء اور 1038ھ مطابق 1629ء کے درمیان تالیف کی۔ ابتدا میں یہ کتاب تین جلدوں میں تھی لیکن اس میں "متعدّد بار تبدیلیاں اور اضافے کیے گئے۔" اس کا صرف ایک ہی حصّہ موجود ہے جو آج کل انڈیا آفس لائبریری میں ہے اور اس حصّے کے بھی آخر میں کچھ خامی ہے۔ اس میں مصنّف نے محمد قطب شاہ کے سالِ وفات 1035ھ مطابق 1626ء تک قطب شاہی دَور کی تاریخ کے علاوہ اپنے وطن ایران کی تاریخ بھی قدرے تفصیل سے بیان کی ہے اور یہ بیان 1038ھ مطابق 1629ء میں شاہ عبّاس دوئم کی وفات پر ختم ہوتا ہے۔

(6) حدیقۃ السلاطین عبداللہ قطب شاہ (1626-27) کے دَورِ حکومت کے پہلے اُنّیس برسوں (سولہ برس نہیں جیسا کہ اسٹوری کی کتاب میں دیا گیا ہے) کی بڑی صحیح تاریخ ہے۔ جسے سلطنت کے معروف پیشوا یا وزیرِ اعظم شیخ محمد بن خاتون کے ایما پر مرزا نظام الدین احمد نے لکھا ہے۔ یہ ایک طرح کا یومیہ روزنامچہ ہے جس میں عبداللہ کی تاریخِ پیدائش 21/ نومبر 1614ء سے اس کی تاریخِ وفات یکم جنوری 1644ء تک اس کی زندگی کے شب و روز کا بیان ہے۔ یہ دَور قطب شاہی سلسلے کے سدید سیاسی زوال کا دَور تھا۔ جنوری 1636ء کے منحوس "قولِ اطاعت" کے تحت قطب شاہی سلطنت فی الواقع مغل شہنشاہ کی تابع

ہوچکی تھی، اور جب کبھی کوئی مغل ایلچی دارالسلطنت آتا تو بادشاہ شاہی محل سے پانچ میل دُور حسین ساگر سندہ کے آخری کنارے پر پہنچ کر اس کا استقبال کرتا تھا۔ وہ مجبور تھا کہ سکوں پر شاہ جہاں کا نام بھی ڈھلوائے اور جمعہ کے خطبے کے ساتھ شہنشاہ کے واسطے درازی عمر اور خوش اقبالی کی اور اس کی فوجوں کے لیے کامیابی کی دُعائیں کروائے۔ سلطان کو ان لوگوں کا رہین منت ہونا پڑتا تھا جنھیں شہنشاہ کے دارالسلطنت میں قوت حاصل تھی اور دارشکوہ، اورنگ زیب اور شہنشاہ کے وزیروں نیز سفیروں کو پست انداز میں ایسے خطوط لکھنے پڑتے تھے جو کوئی بھی خود مختار بادشاہ لکھنا گوارہ نہیں کرسکتا۔ (مکاتیب سلطان عبداللہ قطب شاہ، اس کتاب کا ذکر بعد میں ہوگا)۔ اور پھر بھی حدیقت کا مصنف یہ ظاہر کرتا ہے جیسے وہ کوئی نہایت طاقتور بادشاہ ہو، اور یہ لکھتا ہے کہ بادشاہ کی پیدائش کے وقت منجموں نے پیش گوئی کی تھی کہ "وہ سلیمان اور سکندر کے مانند ہوگا اور دُنیا کے سارے بادشاہوں کو فرمان جاری کیا کرے گا۔ وہ اس کے بارے میں بڑی بڑی باتیں کرتا ہے اور مختلف تہواروں کے سلسلے میں مختلف تقریبات کا ذکر یوں کرتا ہے کہ "اس وقت پھولوں کی بھرمار تھی، عطر کے پیپے تقسیم کیے جارہے تھے، لاکھوں شمعیں جل رہی تھیں اور ہزارہا من بانٹے جارہے تھے۔" مشرقی ساحل پر بادشاہ کی آمد کا حال کچھ ایسے الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ میدانِ رزلعت بھی فرطِ شرم سے ماند پڑجاتا ہے۔ اور ٹھیک ان ہی دنوں میر جملہ اپنے مرکزی مقام گنڈی کوٹا میں منقسم تھا اور رائل سیما کو فتح کررہا تھا اور کوہِ سنیٹ تھامس کے جنوب کی بلندیوں پر قطب شاہی پرچم لہرا رہا تھا۔ اور اس دن کی تیاری کررہا تھا جب وہ مغل سرحدوں کو عبور کرکے دربارِ شاہی کو سرمدہ کرے گا۔

حدیقت السلاطین قطب شاہی دربار کی بیاض کے مانند ہے جس میں نہ صرف شان و شوکت اور مسرت و انبساط کا ذکر ہے بلکہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ملک کا انتظام کس صورت سے کیا جاتا تھا، بڑے جاگیرداروں کے کیا طور و طریق تھے، پیشوا اور دوسرے وزیروں

کے کیا کام اور فرائض تھے، مجلس دیوانداری یا پریوی کاؤنسل کس طرح قائم کی گئی، انصاف کس طرح کیا جاتا تھا اور یہاں تک کہ کن شہری اور فوجی عہدیداروں کا کس دن اور کس جگہ تقرر کیا گیا۔ اس میں لوگوں کی سماجی زندگی، اُن کے توہمات، ان کی رسموں اور تقریبوں، اور اہم بات یہ ہے کہ آبادی کے مختلف حصّوں کے درمیان خصوصاً مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان کتنے عُمدہ تعلّقات تھے، اس سب کی خاصی دُرست تصویر دی گئی ہے۔ سب سے آخری بات یہ ہے کہ ہم اس کی مدد سے یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ معاشرے کی بین الاقوامی ساخت کیا تھی اور غیر معمولی اور مستقل دونوں طرح کے غیر ملکی سفارت کاروں یا حاجیوں کی دارالسلطنت میں کیا حیثیت تھی۔ کتاب کی زبان ایسی ہے کہ اس خزینۂ حقائق کے باوجود جو کتاب میں بھر دیا گیا ہے، قاری پڑھتے وقت بیزار نہیں ہوتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تقریباً ہر صفحے کے بعد اس کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔

(7) حدائق السلاطین

کتاب کا پورا نام ہے حدائق السلاطین کلام الخواقین یا "سلاطین کے باغات اور شاہان کے لطیفہ مضامین"۔ اس کا مصنّف، علی ابن تیفور البسطامی، لکھتا ہے کہ وہ محمد ابن خاتون کا شاگرد تھا اور اس نے سلطان ابوالحسن قطب شاہ (1672 - 87ء) کے کہنے پر یہ کتاب 1092ھ مطابق 1681ء میں مکمّل کی تھی۔ حدائق دراصل تاریخ کی کتاب نہیں ہے بلکہ فارسی شاعری اور ہندوستان نیز ایران کے بادشاہوں، ان کے وزیروں اور قابل لوگوں کے کچھ خطوط کا خلاصہ ہے۔ حالانکہ کتاب مکمل ہوئے مشکل سے چھ سال گزرے ہوں گے جب اس سلسلۂ حکومت کا زوال ہوگیا، اور آخری قطب شاہی فرماں روا کو دولت آباد میں تمام عمر کے لیے قید کر دیا گیا، لیکن مصنّف اپنا بیان اس دُعا پر ختم کرتا ہے کہ بادشاہ کا اقتدار اور قوت ہمیشہ برقرار رہے۔

یہ کتاب تین حدیقوں یا باغوں میں تقسیم کی گئی ہے۔* اور ہر ایک حدیقے کو بہت

سے طبقوں یا حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(ا) پیشدادیوں سے لے کر 30 ھ مطابق 51-650ء تک کے قبلِ اسلام ایرانی بادشاہ۔

(اا) ایران، وسطِ ایشیا اور ہندوستان کے مسلم بادشاہ و شہنشاہ جن میں غوری، سلجوقی، خوارزم شاہی، ترکِ سلاطین، تیمور سے جہانگیر تک مغل، قراقوینلو، صفوی بہمنی جن میں صرف محمود شاہ (یعنی محمود اوّل) اور فیروز کا ذکر ہے، عادل شاہی، اور آخر میں قطب شاہی جن میں صرف سلطان قلی جس کا نام بڑا ملک ہے، جمشید محمد قلی قطب شاہ اور سلطان محمد قطب شاہ کے دَورِ حکومت کا خفیف سا ذکر کیا گیا ہے تعجب یہ ہے کہ عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن قطب شاہ کا بحیثیت شاعر یا شاعر نواز قطعاً ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

(ااا) بعض وزیروں، امیروں، مصنفوں اور قابل لوگوں کی سوانح، لطیفیں اور کچھ خطوط۔ اس میں تیس سے زیادہ اشخاص کے نام ملتے ہیں لیکن شمال ہندوستان کی نمائندگی صرف عبدالرّحیم خانخاناں، علی قلی خاں، فیضی اور ابوالفضل کرتے ہیں، جب کہ دکن کی نمائندگی محمود گاواں، مرزا امین اصفہانی، محمد قلی قطب شاہ کے میر جملہ اور رضا قلی بیگ بہ ملقب نیک نام خاں کرتے ہیں۔

اس کتاب کا سارا مواد جیسا کہ خود کتاب کے نام سے ظاہر ہے، خصوصاً شاعر اور شاعری سے متعلّق ہے، لیکن ہر ایک کی سوانحِ حیات سے کچھ تاریخی معلومات بھی حاصل ہوتی ہے۔ حالانکہ جیسا خود مصنّف بھی اعتراف کرتا ہے، یہ معلومات ہند فارسی اور دوسرے روزنامچوں سے حاصل کی گئی ہے۔ دو سو سے زیادہ نمبر شمار (فولیو) میں سے صرف تقریباً بیس نمبر شمار (فولیو) ایسے ہیں جن کا تعلق گولکنڈہ، حیدرآباد کی تاریخ سے ہے، لیکن ان میں بھی بعض ایسے نئے حقائق کا ذکر ہے جن کی بنا پر حدائق کو قطب شاہی تاریخ کی مآخذی کتابوں کی صف میں رکھا جاسکتا ہے۔ بہر حال یہ بات بتا دینا ضروری ہے کہ اس کتاب کا معیار ایسی تاریخوں کے مقابلے میں صریحاً کم ہے جیسے تاریخِ محمد قطب شاہ، لیکن اس علاقے میں سیاسی حالات جس تیزی

سے مائل بہ انحطاط تھے اس کے پیشِ نظر ایسا ہونا بڑا فطری تھا۔

(8) عبداللہ قطب شاہ کے خطوط

1۔ مکاتیب سلطان عبداللہ قطب شاہ بہ نام دارا شکوہ وغیرہ (مسودات، سالارجنگ لائبریری، ادب، نثر فارسی، نمبر 295)۔

2۔ عرائض و استحاد سماجات و فرامین عبداللہ قطب شاہ (مسودات، انجمن ترقی اُردو، کراچی، نمبر 7/27)۔

3۔ انشائے عبدالعلی خان تلیقانی (مسودات، سالارجنگ لائبریری، ادب، نثر فارسی، نمبر 15)۔

عبداللہ قطب شاہ اور اس کے دَور کے بعض اہم اشخاص کے خطوط اور فرمانوں کے ان تینوں مجموعوں سے ہمیں منحوس قولِ اطاعت کے بعد اس قلمرو کی سیاسی حالت کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہوتی ہے۔ بادشاہ نے اس منحوس قولِ اطاعت پر اس وقت دستخط کیے تھے جب محمد سعید میر جملہ اس سے غداری کر کے مغلوں سے جا ملا تھا۔ کراچی کے مجموعے میں جو مسودہ ہے وہ دراصل سالارِ جنگ لائبریری کے مسودہ نمبر 295 کی ہی ایک ایسی نقل ہے جس میں بعض غیر اہم قسم کے اخراج یا اضافے کر دیے گئے ہیں۔ اس مجموعے میں آخری تاریخ رجب 1072ھ مطابق فروری، مارچ 1662ء دی گئی ہے جو مرزا ابوالحسن اور بادشاہ کی تیسری بیٹی کی شادی کی تاریخ ہے۔ مرزا ابوالحسن کے مقدر میں لکھا تھا کہ وہ قطب شاہی سلسلۂ حکومت کا آخری بادشاہ کہلائے۔ تیسری کتاب (انشائے تلیقانی) دراصل بعض ایسے خیدہ خطوط کا مجموعہ ہے جس کا مقصد فارسی کے اُن الفاظ محاوروں کی وضاحت کرتا ہے جو سترھویں صدی کے دکن میں رائج تھے، اور اس مجموعے میں نہ صرف وہ چند خطوط شامل ہیں جو دوسرے دونوں مجموعوں میں ملتے ہیں بلکہ ایسے دیگر خطوط بھی شامل ہیں جن کا اس دَور کی تاریخ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

پہلے دونوں مجموعوں میں جو خطوط ہیں وہ اس دَور کا تقریباً احاطہ کر لیتے ہیں جو 1065ھ

مطابق 1654ء میں میر جملہ کی غداری سے 1078ھ مطابق 1662ء تک کا دور ہے۔ ان میں سے بیشتر خطوط پر کوئی تاریخ نہیں دی گئی ہے، بعض خطوط پر محض مہینہ اور سال دیا گیا ہے۔ اور چند ایک پر پوری تاریخ دی گئی ہے۔ یہ خطوط عبداللہ قطب شاہ نے ایران کے شاہ عباس دوئم، شاہجہاں، داراشکوہ، شہزادہ اورنگ زیب، شاہ جہاں کی بیٹی (غالباً جہاں آرا)، علی عادل شاہ، عبدالصمد و سیرالملک جو مغل دربار میں قطب شاہی سفیر تھا، حاجی نصیر جو بیجاپور میں قطب شاہی سفیر تھا، اور دوسرے بہت سے اشخاص کو لکھے ہیں۔

ان خطوط میں سے بعض خطوط نہایت اہم ہیں۔ ان کی وسعت اس امر کی ہے کہ محض اس حقیقت پر ہی بھرپور روشنی نہیں پڑتی کہ عبداللہ کا حیدرآباد پورے طور سے مغل قوت کا دست نگر تھا، بلکہ اس بادشاہ کی شدید مایوسی پر بھی روشنی پڑتی ہے جو شاہ ایران اور بیجاپور کے اپنے برادرِ لسبتی کے سامنے جھک کر اپنی کیفیت کا رونا روتا ہے۔ ان سارے مجموعوں میں پہلا خط شاہ عباس دوئم کے نام ہے جس میں عبداللہ تلخ انداز میں میر جملہ کی غداری اور "سلطان حرم کی بے ایمانی" کی شکایت کرتا ہے۔ دوسری طرف وہ نہ صرف شہنشاہ بلکہ داراشکوہ اور اورنگ زیب کو بھی پیش کی جانے والی "عرض داشتوں" میں نہایت حقیر الفاظ میں اپنے خیالات ادا کرتا ہے۔ چنانچہ جب بھی وہ شہنشاہ کا نام لکھتا ہے تو اس کے ساتھ بعض اوقات کئی کئی سطروں میں تعریف و ستائش کے بہت سے القاب لکھتا ہے، اور ان عرضداشتوں کو "التحائیں" کہتا ہے۔ وہ اورنگ زیب کو "خلافت عظمیٰ کا درآبدار" کہتا ہے۔ حتیٰ کہ دہلی میں اپنے سفیر کو بھی جب کبھی کوئی فرمان بھیجتا ہے تو شہنشاہ کو بھیجے جانے والے اپنے خطوط کو "عرضداشتیں" اور خود شہنشاہ کو "مسکنِ پناہِ خلافت" لکھتا ہے۔

یہ خطوط اسی لیے بڑے قابلِ قدر ہیں کیونکہ اُن کے ذریعے عبداللہ کے دورِ حکومت کے بعد والے زمانے کی خارجی، سفارتی اور کسی حد تک داخلی حکمتِ عملی کا درست اندازہ لگانے میں مدد ملتی ہے۔

حصّہ دوئم

دکن میں لکھی جانے والی وہ عصری ہند فارسی تاریخیں جو نظم میں ہیں۔

(1) نسبت نامۂ شہریاری

(2) نسبت نامۂ قطب شاہی

(3) تاریخِ قطب شاہی (لندن)

(4) تواریخ قطب شاہی (حیدرآباد)

نسبت نامۂ سہریاری حسین علی شاہ فرشی نے تالیف کیا تھا۔ اور 1016ھ مطابق 1607ء میں اسے مکمل کرلیا تھا نیز 1019ھ مطابق 1610ء میں لاہور میں اسے نقل کیا تھا۔ اسی کتاب کے شروع کی کسی سطر میں تواریخ قطب شاہی کا نام آتا ہے۔ اسے چار فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور "لگتا ہے کہ یہ کتاب نسبت نامہ سے اخذ کی گئی ہے"۔ فرشی کا تخلّص صفحہ پانچ پر ملتا ہے لیکن کتاب کو حیدر قلی خاں کے معتمد (منشی) ہیرالال خوشدل سے منسوب کیا جاتا ہے، اور یہ تخلّص "خوشدل" اس کتاب کی عبائی نظم میں نظر آتا ہے۔

نسبت نامۂ قطب شاہی کے نام سے بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی کے مجموعے میں دو جلدیں موجود ہیں (آئیوانو 690 اور 691) اور دونوں جلدیں محمد قلی قطب شاہ (1580ء - 1611ء) کے دَورِ حکومت کی ابتدا پر ختم ہوتی ہیں۔

یہ کتاب چار مقالوں یا موضوعات میں تقسیم کی گئی ہے جن کے نام یہ ہیں:-

(I) محمود شاہ بہمنی کی وفات (1518ء) تک اس سلسلۂ حکومت کا تعارف اور اس کی ابتدائی تاریخ۔

(II) بہمنیوں کا زوال اور بڑے مُلک کا عروج۔

(III) ابراہیم قطب شاہ کی وفات تک دکن کی سلطنتوں کے درمیان بین الریاستی

جنگیں معہ عنائی نظموں کے جو ابراہیم اور اس کے بیٹے محمد قلی قطب شاہ کے اعزاز میں ہیں۔

(۱۷) محمد میر شاہ میر کی بیٹی سے محمد قلی قطب شاہ کی شادی کی تقریب تک اس کے دورِ حکومت کا پہلا سال۔

اِس کتاب میں نفیس قسم کی تیس قلمی تصویریں ہیں۔ اس کا پہلا حصہ علی بن ابی محمد نے محمد قطب شاہ کے کتب خانہ سے نقل کیا تھا اور 22 شوال 1022ھ مطابق 25 نومبر 1613ء کو اسے مکمل کر لیا تھا۔ اور اس کے بقیہ حصّے سعید الدین اصفہانی نے نقل کیے تھے۔ آئیونوو کا کہنا ہے لفظ "لاہور" بعد میں شامل کیا گیا ہے کیونکہ لفظ بہت ہی نئے خط میں لکھا ہوا ہے۔

اس کتاب کا بیان محمد قلی قطب شاہ کے دورِ حکومت کے سال اوّل میں اس واقعے کے پہلے تک جاری رہتا ہے۔ جب بادشاہ کے خسر کو اس کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا تھا اور یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ ملک چھوڑ دے۔ لیکن لگتا ہے کہ اِسے سلطان محمد قطب شاہ کے دورِ حکومت کے سال اوّل یعنی 1021ھ مطابق 1613ء میں نقل کیا گیا' اس کے پیشرو محمد قلی کے زمانے میں نہیں، حالانکہ آئیونوو یہی سمجھتے ہیں کہ اسے محمد قلی کے زمانے میں نقل کیا گیا ہے۔

وہ دوسری کتاب بھی جس کو آئیونوو نسبت نامۂ قطب شاہی (نمبر 691) کہتے ہیں "اِسی مضمون پر ہے لیکن اس کی نصف" ایک اور نظم ہے حالانکہ اس کے مصنّف کا نام "فری" اِس میں کئی جگہ آتا ہے۔

تواریخ قطب شاہی (E the - - - - نمبر 1486)۔ مندرجہ بالا سطروں میں جن دو کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے یہ بھی ان ہی کی طرح کی ایک کتاب ہے اور ان ہی کی طرح اسے بھی سلطانِ وقت محمد قلی قطب شاہ کے نام معنون کیا گیا ہے۔ مصنّف جو "اپنا نام چھپاتا

ہے "دس سال اس کی تالیف کے کام میں مصروف رہا۔ یہ بھی چار حصّوں میں تقسیم کی گئی ہے جن کے نام یہ ہیں:۔

حِصّہ اوّل

"سلطان قلی قطب شاہ" کی پیدائش تک قطب شاہی خاندان کا شجرہ نسب۔

حِصّہ دوم

"ملک سلطان قلی قطب شاہ" اور جمشید کے دَورِ حکومت۔

حِصّہ سوم

ابراہیم قطب شاہ کا دَورِ حکومت۔

حِصّہ چہارم

محمد قلی قطب شاہ کا دَورِ حکومت۔

دوسری کتابوں کی طرح اس کتاب کے سرورق کے مقابل کا صفحہ بھی سنہرا اور تابناک ہے۔ اس میں 137 فولیو یعنی 274 صفحات ہیں جو نفیس نستعلیق میں لکھے ہوئے ہیں۔

تواریخ قطب شاہی (سالار جنگ لائبریری، ادب، نظم فارسی، نمبر 1101) یہ کتاب بھی مندرجہ بالا تینوں کتابوں کی طرح ابتدائی قطب شاہیوں کی منظومہ تاریخ ہے اور جیسا کہ مصنّف نے شروع میں اشارہ کیا ہے یہ محمد قلی قطب شاہ کے دَورِ حکومت میں تالیف کی گئی تھی۔ اسی میں مشتمل ۲۸۸ ورق ہیں جس کے ہر صفحے پر اکیس سطریں لکھی ہوئی ہیں۔ یہ ایک حسین سنہری چمک دار کتاب ہے جو بڑی نفیس نستعلیق میں لکھی ہوئی ہے۔ اور سرورق کے مقابل کا صفحہ سنہرے خطوط میں مزین کیا گیا ہے۔ اس میں اسی سلسلۂ حکومت کی تاریخ بالکل ابتدا سے دی ہوئی ہے اور بعض واقعات بڑی تفصیل سے دیے ہوتے ہیں۔ جن میں سے بعض واقعات مصنّف کے ذخیرۂ دماغ کی پیداوار بھی ہو سکتے ہیں۔ اوراق (۵) ۹،

(b) 30 اور (b) 35 پر قلمی تصویروں کے لیے خالی جگہ چھوڑ دی گئی ہے۔ یہ مسودہ نامکمل ہے کیونکہ محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں تحریر ہونے کے باوجود اس کا بیان 1580ء میں اس کی تخت نشینی پر ختم ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مسودے کے آخری چند اوراق تلف ہو چکے ہیں۔

حالانکہ یہ بات لکھی نہیں گئی ہے لیکن کتاب صریحاً چار حصّوں میں تقسیم کی گئی ہے جن میں سے ہر حصّہ حمد باری تعالیٰ سے شروع ہوتا ہے۔ اِسی طرح پر ہی ہر بیان ختم کیا گیا ہے۔ دوسرا بیان شروع کرنے سے پہلے "آغازِ داستان" یا کہانی کی شروعات لکھا گیا ہے۔ یہ چاروں حِصّے حسب ذیل ہیں:۔

(1) کوول کونڈا کی کامیاب مہم اور بیجاپور کے اسمٰعیل عادل شاہ کی وفات تک سلطان قلی قطب الملک کا دَورِ حکومت۔

(2) بیجاپور میں ملّو کی تخت نشینی سے سلطان قلی قطب المُلک کے قتل تک۔

(3) "جمشید خاں" کی تخت نشینی سے شولاپور سے اس کی واپسی تک۔

(4) جمشید کی حکومت کا بقیہ دَور، سبحان کا چھوٹا درمیانی دَور اور ابراہیم کا دَورِ حکومت۔

اس کتاب میں کچھ ایسی کارآمد معلومات دی ہوئی ہیں جو کسی دوسری کتاب میں نہیں مِلتی۔ چنانچہ یہ دِلچسپ واقعہ کہ جمشید اپنے شہید باپ کے مزار پر فاتحہ پڑھنے جاتا ہے، اپنے باپ کے قاتل کو تلاش کرواکر مُردہ دیتا ہے، اس مسئلے پر تھوڑی سی روشنی ڈالتا ہے کہ آیا جمشید خود اپنے باپ کے قتل کی سازش میں شریک تھا یا نہیں۔ اس جنگ کی بھی بعض دِلچسپ تفصیلات دی گئی ہیں۔ جو جنوری 1565ء میں "دریا کرشنا کے کناروں پر" لڑی گئی۔ مسودے میں یہ اور بعض دوسرے واقعات بیان کیے گئے ہیں جو نا صرف دِلچسپ ہیں بلکہ کارآمد بھی ہیں۔ جیسا کہ مندرجہ بالا سطروں میں ذکر کیا گیا ہے اس کتاب کا نام ان میں سے کسی فہرست میں شامل نہیں کیا گیا ہے جو اب تک شایع ہوئی ہیں۔

حصّہ سوئم

تلگو کی وہ نظمیں جن کا تعلق قطب شاہی دَور کی تاریخ سے ہے۔

۱۔ طویل نظم:

تلگو میں کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جو قطب شاہیوں کی محض تاریخ ہو۔ علاوہ کُتبات کے، جن سے اس مضموں کا کوئی تعلّق نہیں، چند طویل نظمیں ہیں جو قطب شاہیوں کی سیاسی اور سماجی تاریخ کے بعض پہلوؤں پر کچھ روشنی ڈالتی ہیں۔ چنانچہ اڈّانکی گنگادھر کوی کی توپاتی سمور ناموہیں سلطان قلی قطب الملک کی فتوحات کا ذکر ہے اور بحیثیت بادشاہ اس کے کردار کی تعریف کی گئی ہے۔ اس نے راجہ مندری اور سریکا حکم اور اس سے اور آگے اُڑلیسہ کی سرحدوں تک ابراہیم قطب شاہ کے حملوں کا حال بھی بیاں کیا ہے، اور ابراہیم کے دربار کی ایک مکمّل، تحریری تصویر بھی پیش کی ہے۔ اسی طرح طویل نظم چتوپادیامنی سن یاری کا گُمنام مصنّف قدرے تفصیل سے اس بات کا ذکر کرتا ہے کہ ابراہیم تلگو کی کتنی سرپرستی کرتا تھا۔ تلگو کی تیسری اہم کتاب جس کا سماجی ڈھانچے سے تعلّق نظر آتا ہے۔ بیاتی چریترامو پونا گنتی یگیلنّاریا ہے۔ یہ دیو مالائی نظم ہے جس میں بیاتی کی کہانی ہے جو چاند سے اُترا تھا اور سارے چندرولسی اسی کی اولادیں مانے جاتے ہیں۔ یہ اتسایا خالص تلگو کی نظم ہے جس میں تتسم یا سنسکرت کا کوئی لفظ شامل نہیں ہے، اور اسے پٹن چیروسے امین خاں کے نام معنون کیا گیا ہے۔ تاریخ کے نقطۂ نظر سے ہمیں اس کی کہانی کے مقابلے میں اس کے انتسابی تعارف سے زیادہ دلچسپی ہے۔ کیونکہ اس میں مصنّف نے امین خاں کے خاندان کے بارے میں قومی خدمت اور سفارت کے میدان میں اس خاندان کی حیثیت کے بارے میں نیز دیہی سماج کے عام ڈھانچے کے بارے میں خاصہ طویل بیان دیا ہے۔ حالانکہ جن تینوں کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے اُن کا تاریخ سے براہِ راست کوئی تعلّق نہیں ہے، لیکن ان کی مدد سے واقعات کے بارے میں اور خصوصاً ابتدائی

قطب شاہوں کے بارے میں تلگو نقطۂ نظر معلوم ہو جاتا ہے۔

2۔ تلگو نظموں کا ایک نہایت دلچسپ مجموعہ وہ مدحیہ غنائی نظمیں ہیں جو بادشاہوں اور جاگیرداروں کے درباروں میں عموماً جمع کے وقت گائی جاتی تھیں۔ یہ ایسے بھاٹوں کی نظمیں ہیں جن کا علم اور سمجھنے کی صلاحیت بڑی مختلف ہوتی تھی، اور اسی لیے ان میں بڑا تنوع ملتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور نظمیں ویلوگوتواری و مساولی اور چکا دیوار یا و مساولی ہیں جن میں متذکرہ خاندانوں کے افراد کی شجاعت کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک اور کتاب راماراجوی جے۔ ایم ہے جس میں وبے لگرے اراوِدو خاندان کی تعریف میں لکھی ہوئی غنائی نظمیں شامل ہیں۔ یہ سب محض خاندانی روزنامچے ہیں، اور جب لوگ قابلِ عزت ہستیوں کو دکھانے کے لیے تعریفوں کے راگ الاپیں، تو ہمیں یہ توقع رکھنی چاہیے کہ ان کے بیانات یک طرفہ اور بعض اوقات مبالغہ آمیز ہوں گے۔ مزید یہ کہ چونکہ ان میں تاریخیں نہیں دی گئی ہیں اس لیے تاریخوں کی ترتیب اور تسلسل کے لیے ہمیں دوسرے روزنامچوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

3۔ مجموعۂ میکینیری

ہمارے پاس دیہات کی کیمیات، جنھیں کیفیات ہی کہا جاتا ہے، بڑی کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ ان کی اساڈ ڈنڈا کوائل یا محض کوائل سے ہوئی جو گاؤں کے کرنام یا افسرِ مالگزاری (پٹواری) کے پاس رہتے تھے، اور جن میں گاؤں کی سیاسی، مذہبی، سماجی اور اقتصادی حالات کے بارے میں معلومات دی ہوتی تھی، نیز روزمرہ کے ان واقعات کا حال بھی دیا ہوتا تھا جن کا تعلق اس علاقے سے ہوتا تھا۔ ہر کرنام اپنی ملازمت کے دوران ان میں اندراجات کرتا اور پھر انھیں اپنے جانشین کو سونپ دیتا تھا۔ کرنل میکینزی نے ان سیکڑوں کوائل کی اہمیت محسوس کر کے انھیں جمع کرنے یا ان کی نقلیں کروانے کا کام شروع کیا۔ لیکن جن کرناموں اور اہلکاروں کو ان دستاویزوں کی نقل کا کام سپرد کیا گیا انھوں نے طویل بیانوں کو لفظ بہ لفظ نقل کرنا فضول سمجھا اور اپنے اپنے شوق کے مطابق ان کے خلاصے تیار کر دیے۔ یہ وہی خلاصے ہیں جن کو

"کیفیات" یا "بیانات" کہا جاتا ہے اور ان کو مجموعی طور پر "مسودات میکینزی" یا "مجموعۂ میکینزی" کہا جاتا ہے۔

یہ کیفیات "تاریخ اور دیو کہانی کا آمیزہ ہیں۔ ابتدائی دَور کے بیان میں دیو کہانی والا عنصر غالب ہے، لیکن بعد کے دَور پر اس عنصر کا غلبہ ختم ہوگیا ہے۔" اس لیے محققین کو چاہیے کہ انھیں بڑی ہوشیاری کے ساتھ استعمال کریں، خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ بعض اوقات کرنام معمولی حقائق سے بھی واقف نہیں ہوتے تھے۔ ان کیفیات میں ہمارے نقطۂ نظر سے سب سے زیادہ اہم جتی ولئ کڈپا، ہم کونڈا، کونڈاویڈو، سدیالا، سارا، سدھاوتم (سدھوت) اور تدپاتری کی کیفیات ہیں۔

مجموعۂ میکینزی میں رام راجا کھائر بھی شامل ہے جس کے بارے میں قیاس ہے کہ اس فیصلہ کن جنگ کا بیان فراہم کرتی ہے جس کو غلطی سے جنگِ تالی کوٹا کہا جاتا ہے۔ بکھائر میں اس جنگ کی بابت حیران کن اعداد و شمار ملتے ہیں دوسری باتوں کے ساتھ وہ کہتی ہے کہ "جہالنا پورا کا سمراٹھ" اکھا بارا جلادین مگل یادوساہا" بھی اس جنگ میں شریک ہوا" اور بلی مگلی وجوں میں اس کی جو فوج شامل ہوئی اس میں ڈھائی کروڑ پیدل سپاہی، ایک لاکھ ہاتھی، دولاکھ اُونٹ، پانچ لاکھ تیر انداز، تقریباً بارہ ہزار بندوقیں اور بارہ ہزار بے سوار گھوڑے تھے۔ یہ صرف "اکھابارا" کی فوج کا حصہ تھا۔ دوسری طرف راماراجہ کے وسائل میں 65,50,000 گھوڑے، تقریباً اُنتیس لاکھ اُونٹ، تقریباً بیس ہزار ہاتھی، 9,87,76, 4/3 من بارود اور 9,87,65, 43, 21, 00, 000 توپ کے گولے تھے۔ ایسے ہی اعداد و شمار کی بنیاد پر جدید مورخین میں سے ایک صفِ اوّل کے مورخ یہ سوچتے ہیں کہ "یہ روزنامچہ ہمیں اس جنگ عظیم کے بارے میں جدید نقطۂ نظر بتاتا ہے اور مجاز کرتا ہے کہ اس مسئلے کی ازسرِ نو جانچ کریں۔"

بابر

پُشپاسُوری

بابر نے 1527ء میں لکھا تھا کہ "گیارہ برس کی عمر سے آج تک میں نے دو عیدِ رمضان ایک جگہ نہیں گزاریں۔ پچھلے سال عید پر میں آگرہ میں تھا۔ اس دستور کو قائم رکھنے کے خیال سے میں تیس تاریخ اتوار کی شب، سیکری کے لیے روانہ ہو گیا تاکہ عید کی ضیافت وہاں ہو۔[1]" یہ وہ شخص تھا جس نے کبھی مورخ ہونے کا دعوا نہیں کیا، اور پھر بھی نہ صرف مورخ ماننے کے لیے اس کی توزک خاصہ بڑا ثبوت سمجھی گئی، جیسا کہ لیں پول کہتا ہے[2]، بلکہ بعد کے سارے مورخین خواہ وہ ہمعصر ہوں، برطانوی ہوں یا جدید ہوں، بابر نامہ سے اس طرح استفادہ کرتے رہے ہیں جیسے بحیثیت مآخذ وہ ناگزیر ہو۔ بابر کی توزک میں جو کمیاں نظر آتی ہیں ان پر مرزا حیدر دغلت کی تاریخ رشیدی اور گلبدن بیگم کے ہمایوں نامہ سے کچھ روشنی ضرور پڑتی ہے، لیکن خود اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ چند ایک مستثنیات[3] کے علاوہ سارے کا سارا وقت اور تنقید کی کسوٹی پر پورا اترا ہے۔ بیورج نے کہا ہے: "اس کی خود نوشت سوانح کا شمار ان انمول تحریروں میں ہوتا ہے جن کی ہر زمانے میں قدر ہوتی ہے، اور اگر اسے سنیٹ اگسٹائن اور ردسو کے اعترافات نیز گبن اور نیوٹن کی توزکوں کی صف میں جگہ دی جائے تو موزوں رہے گی۔ ایشیا میں اس کی مثال شاید نہ مل[illegible]" بابر خوب جانتا تھا کہ اس کا کیا رتبہ ہے۔ وہ جانتا تھا کہ آنے والی نسلیں اس کی تحریروں کی جانچ پڑتال کریں گی۔ وہ لکھتا ہے: "میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ کسی کی رسوائی ہو: میں نے جو کچھ کہا ہے

وہ محض سیدھی سچی حقیقت ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ باتیں جس طرح رُونما ہوئی ہیں میں نے جُوں کے تُوں بتا دی ہیں۔ میں نے آج اس لمحے تک جو کچھ تحریر کیا ہے اس میں نہایت محتاط رہا ہوں تاکہ ہر لفظ سے حق بیانی ہو۔ میں نے واقعات ٹھیک اس طرح بیاں کر دیے جس طرح وہ حقیقتاً رُونما ہوئے۔ لہٰذا میں نے ہر اچھا بُرا فعل، خواہ وہ فعل میرے والد کا ہو یا میرے بڑے بھائی کا، ٹھیک اس طرح بیان کر دیا ہے جس طرح وہ واقع ہوا ہے۔ اور ہر شخص کی خواہ وہ شناسا کی ہو یا اجنبی کی، اچھائی یا بُرائی مکمل غیر جانبداری کے ساتھ واضح کر دی ہے۔ اس لیے قاری مجھے معاف کر دیں اور سامعیں بہت زیادہ سختی سے فیصلہ نہ دیں۔"[5]

بابر کو اپنے شاہانہ ورثے پر فخر تھا۔ اس کی آرزو تھی کہ وہ تیمور کی طرح فوجی کارنامے انجام دے، اور ایک تورک تالیف کرے۔ اگر وہ ایک طرف یہ چاہتا تھا کہ واقعیً بادشاہ ہے تو دوسری طرف یہ بھی چاہتا تھا کہ ہر کام جو وہ انجام دے تحریری شکل میں آجائے۔ حقیقت یہ ہے کہ سارے تیموری شہزادوں سے عام طور پر یہ توقع رکھی جاتی تھی کہ وہ تلوار اور قلم دونوں کو یکساں مہارت کے ساتھ استعمال کریں گے۔ اور ان سب کو ایک ہی معیار سے ناپا بھی جاتا تھا۔ بابر اپنے ایک چچا سلطان حسین بیکارا کے بارے میں لکھتا ہے: "بیچے کے استعمال میں تیمور بیگ کی نسل کا کوئی دوسرا شخص سلطان حسین مرزا کا کبھی مقابلہ نہ کر سکا۔ اس کی طبیعت کا جھکاؤ شاعری کی طرف تھا اور اس نے ایک دیوان مرتب کیا تھا۔ وہ ترکی زبان میں لکھتا تھا۔ اس کا شاعرانہ نام حسینی تھا۔ اس نے بہت سے شعر خاصے اچھے ہیں، لیکن اس کا پورا دیوان ایک ہی بحر میں ہے۔"[6] مرزا حیدر نے بابر کی بابت لکھا ہے کہ "ترکی زبان کی شاعری میں امیر علی شیر کے بعد اسی کا مقام تھا۔" اس نے ترکی زبان میں شاعری کی اور ایک نئی صنفِ نظم ایجاد کی جس کو موبے یاں کہتے ہیں۔"

لگتا ہے کہ بابر کی عادت تھی کہ سارے واقعات قلم بند کر لیتا تھا، لیکن یہ نہیں معلوم کہ اس نے اپنی توزک کب لکھنا شروع کی۔ اس کے پہلے حصّے کو اس نے ایک نفیس ادبی اسلوب

اور لطیف نثر کا جامہ پہنایا جس میں جگہ جگہ ترکی اور فارسی کے شعر تھے، لیکن بعد کا حصّہ اپنی اصل صورت یعنی بیاض کی شکل میں ہی رہ گیا۔ ایسا شاید اس بنا پر ہوا کہ اسے اس حصّے کو دوبارہ لکھنے کا موقع نہ ملا۔ ہم نے یہ نتیجہ اس کے ایک اشارے کی بنا پر نکالا ہے، اور وہ اشارہ یہ ہے کہ 1529ء میں مشرقی صوبوں سے واپس ہوتے وقت سفر میں ایک شدید طوفان اس کے اندراجات اور کاغذات اُڑا لے گیا تھا۔ "اسی رات نمازِ تراویح کے بعد . . . . موسم برسات کے بادل ٹوٹ پڑے اور دفعتاً باد و باراں کا طوفان آگیا، اور ایسے زور کی ہوا چلی کہ بشتر خیمے اُکھڑ گئے۔ میں اپنے خیموں کے وسطی شرنشین میں بیٹھا لکھ رہا تھا۔ طوفان اس قدر سرعت سے آیا کہ اس سے پہلے کہ میں اپنے لکھے ہوئے اوراق اور کاغذات سمیٹ پاؤں خیمہ اور اس کے چاروں طرف لگی قنات میرے اُوپر گر پڑے . . . . کتابیں اور اوراق پانی میں شرابور ہو گئے، بڑی مشکل سے انہیں اکٹھا کیا گیا اور سُرخ رنگ کے اُونی بستر پوش میں لپیٹ کر تختِ شاہی پر رکھ دیا گیا، جس پر قالین پڑے ہوئے تھے۔ طوفان دو گھڑی میں اُتر گیا۔ ہم نے . . . . بڑی مشکل سے آگ جلائی اور صبح تک جاگتے رہے کیونکہ ساری رات اوراق اور کاغذات کو سُکھاتے رہے۔"[7]

بابر نے اپنی تورک میں جو تاریخی حقائق بیان کیے ہیں ان میں اس کی رائے، اس کے جذبات، اس کے فیصلے اور اس کا فلسفۂ حیات اس قدر شامل ہے کہ دونوں کا علاحدہ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس کے مشاہدات پر اس کے رُجحانات کا رنگ چڑھا ہوا ہے، اور جب ہم اس کی تورک پڑھتے ہیں تو لگتا ہے کہ ہم اس کے ساتھ رہ رہے ہیں، اس کے ساتھ سوچ رہے ہیں، اسی ہیجانی رفتار سے حرکت کر رہے ہیں جو اس کا خاصہ تھی اور اُسی کی طرح اِرد گرد کے حالات پر غور کرنے کے لیے ٹھہر بھی جاتے ہیں۔ بابر نے تاریخ میں جغرافیہ کا عمیق علم بھی شامل کر دیا ہے۔ اس علم کا تاریخی واقعات سے بڑا گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ اور اسی کی مدد اُسے مخصوص مقامات پر رہنے والے لوگوں کے وسائل، آب و ہوا اور عادات کا اندازہ لگانے میں مدد ملی۔ اس کے کہنے کے مطابق "فرغانہ آب و ہوا کے لحاظ سے پانچویں خطّے میں واقع ہے . . . . فرغانہ ایک ایسا

ملک ہے جس کا رقبہ بہت کم ہے، لیکن اناج اور پھل کثرت سے ہوتے ہیں[8]۔ یہی معاملہ سمرقند کا تھا۔ یہ خوشگوار مقام 37´ 39° عرض البلد اور 16´ 99° طول البلد پر پانچویں خطۂ آب و ہوا میں واقع تھا۔ لیکن بابر نے انہی معلومات پر ہی اکتفا نہیں کیا، کیونکہ اس کا ذہن ریاضی داں کا سا تھا اور وہ پیمائش کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ "میں نے ہدایت دی کہ شہر پناہ کے چاروں طرف چل کر دیوار کو قدموں سے ناپا جائے اور یہ معلوم ہوا کہ اس کا محیط دس ہزار چھ سو قدم تھا"[9] اس کے بعد وہاں کے لوگوں کے بارے میں لکھتا ہے "وہاں کے سارے باشندے راسخ العقیدہ سنی، پابند شریعت اور مذہبی ہیں۔" اور اس کے بعد وہ ماوراالنہر کے ممتاز علمائے دین کا حال بیان کرتا ہے۔ پھر وہ اس کی حدود دریاؤں، پھلوں، سرکاری عمارتوں، بازاروں، نانبائیوں اور خانساماؤں پر آتا ہے۔ اور آخر میں کہتا ہے کہ "سمرقند میں دنیا کا بہترین کاغذ تیار ہوتا ہے۔ . . . . سمرقند میں ایک اور چیز کرمیزی (قرمزی مخمل) تیار کی جاتی ہے۔ جو ہر جگہ برآمد کی جاتی ہے۔"[10] مرغزاروں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ اسے آرزو رہتی تھی کہ گھوڑے سے اتر کر کسی مرغزار میں بہتے ہوئے چشمے کے کنارے ذرا دیر آرام کرے۔ یوریت خاں ایسا ہی ایک مرغزار تھا۔ "یوریت خاں کے چاروں طرف دریا اس انداز سے گھومتا ہے کہ درمیان میں اتنی بڑی جگہ بچ جاتی ہے جس میں ایک پوری فوج خیمہ زن ہو سکتی ہے۔ . . . . ایسا عمدہ مقام نظر آیا تو محاصرے کے دوران کچھ عرصے کے لیے میں یہیں خیمہ زن ہو گیا۔"[11] وہ صوبوں اور تومانوں کی تفصیلات دے کر اپنے اس ناظری بیان کو مکمل کر دیتا ہے۔ کیا یہ جدید گزیٹیر سے ملتا جلتا بیان نہیں ہے؟ اُس کے صفحات سے ہر طرح کی معلومات اکٹھی کی جا سکتی ہے۔

جب وہ کابل جاتا ہے تو پھر خوش بیانی سے کام لیتا ہے، اور کہتا ہے "آپ کابل سے ایک دن میں ایسی جگہ جا سکتے ہیں جہاں کبھی برف باری نہیں ہوتی، اور دو فلکی ساعتوں (دو گھنٹوں) کے عرصے میں ایسے مقام پر پہنچ سکتے ہیں۔ جہاں ہمیشہ برف رہتی ہے . . . ."[12] اور پھر حسب معمول اس مقام کا، وہاں کے جانوروں، پھلوں اور پرندوں کا ذکر نیز مچھلی اور آبی

اور پرندے پکڑنے کے طریقوں کا بیان شروع ہو جاتا ہے۔

پھر وہ ہندوستان کی طرف بڑھا۔ اس کی حیثیت کا شخص کابل کی بادشاہت پر قناعت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بادشاہت اس لقب بادشاہ کو بھی حق بہ جانب ثابت نہ کر سکتی تھی، جس کے حصول کے لیے وہ اپنی زندگی، اپنا یقین اور اپنا عقیدہ داؤں پر لگا تا رہا تھا۔ اس کا نصب العین ایک طرف تو بادشاہوں کا بادشاہ بننا تھا اور دوسری طرف اپنے خاندانی ورثے کا محافظ بننا تھا۔ ازبکوں اور ایرانیوں نے اُسے اُسی کے لوگوں کی سرزمین میں دونوں باتوں سے محروم کر دیا تھا۔ بدخشاں اس کی فیاضی کی نظر ہو گیا تھا، جسے اس نے شاہ بیگم کے نواسے کے حوالے کر دیا تھا۔ تاریخ کے علم نے ضرور اس کی توجہ ہندوستان کے ان میدانی علاقوں کی طرف مبذول کرائی ہو گی، جن کو کبھی تیمور نے فتح کیا تھا اور شاہ نامہ کا یہ طالب علم اس ملک میں داخل ہونے کے لیے، جو اس کے اقتصادی اور سیاسی خوابوں کی تعبیر بن سکتا تھا، اب اُن افغانوں کی رُکاوٹیں پار کر چکا تھا جن کے بارے میں وہ یہ کہتا ہے کہ "اشتعال انگیز حد تک غیر مہذب اور احمق ہیں۔"[13] وہ اپنی توزک میں یوں غور کرتا نظر آتا ہے "سلطان محمود نے جب ہندوستان فتح کیا تو وہ خراسان کے تخت پر متمکن تھا، اور سلاطین خوارزم نیز اطراف و جوانب کے سردار (ماوراالنہر) مکمل طور پر اس کے زیر اثر اور اس کے قبضے میں تھے۔ سمرقند کا بادشاہ اس کا مطیع تھا۔"[14] جب بابر بادشاہ بنا تو وہ واقعی خوشی سے پھُول گیا۔ "میں نہیں کہتا کہ اس کامیابی کا سبب خود میری قوت ہے، اور نہ یہ خوش قسمتی میری کوششوں کا نتیجہ ہے اس کا سرچشمہ تو خدا ہے جو رحمان اور رحیم ہے۔"[15]

پانی پت فتح کرنے کے بعد اس نے ہندوستاں کی اندرونی کمزوریوں پر غور کیا۔ "اس دور میں پورا ہندوستان کسی ایک شہنشاہ کے تابع نہ تھا۔ اپنی چھوٹی سی عملداری میں ہر راجہ بزعم خود بادشاہ بن بیٹھا تھا۔"[16] وہ مُسلم اور غیر مُسلم، ہر طرح کی معمولی سلطنتوں پر غور و خوض کرنے کے بعد پھر اپنے مرغوب موضوع یعنی ملک کے جغرافیہ پر آ جاتا ہے۔ "ہندوستان آب و ہوا

کے لحاظ سے پہلے، دوسرے اور تیسرے خطّے میں واقع ہے۔ اس کا کوئی حصہ چوتھے خطّے میں نہیں ہے..... اس کے پہاڑ اور دریا، اس کے جنگلات اور میداں، اس کے حیوانات اور نباتات، اس کے باشندے اور زبانیں، اس کے باد و باراں، سب ہی مختلف انداز کے ہیں۔"[17]

ہندوستان کے میدانی علاقے بابر کے اس ذوقِ جمال کی تسکین نہ کر سکے جس کی جڑیں اس کی شخصیت میں گہری جا چکی تھیں۔ اس نے ہمیشہ قدرت کی وہ پاکیزہ مسرتیں حاصل کرنے کی کوشش کی، جنھوں نے ذہنی پریشانی کے عالم میں ہمیشہ اُسے سکون بخشا۔ دریائے گنگا کا وسیع میدانی خطہ اُسے ایسی کوئی مسرت نہ دے سکا۔ اس نے اس دائمی مسئلے کا ذکر کیا ہے کہ یہاں کے لوگ ٹیکس ادا کرنے کے لیے کبھی خود سے آمادہ نہ رہتے تھے، اور موقع ملنے پر بغاوت کر دیتے تھے۔[18] شہروں کی بابت اس کا یہ مشاہدہ کہ ایک یا ڈیڑھ دن میں سارا شہر خالی ہو جاتا تھا، لوگوں کے معیارِ زندگی کا پتہ دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عوام کے پاس باندھ کر چل دینے کے لیے کچھ زیادہ سامان نہیں ہوتا تھا۔ وہ جسم ڈھانکنے کے لیے زیادہ کپڑے استعمال نہیں کرتے تھے۔ وہ لکھتا ہے "یہاں کے کاشتکار اور نیچے طبقوں کے سارے لوگ ننگے رہتے ہیں۔ وہ ایک چیز لپیٹتے ہیں جسے لنگوٹی کہتے ہیں..... عورتیں بھی ایک لانگ لپیٹتی ہیں ـــــ اس کا ایک سرا وہ اپنی کمر کے گرد باندھ لیتی ہیں اور دوسرا سر پر ڈال لیتی ہیں۔"[19] امیر آدمیوں کی تعداد یقیناً بہت کم رہی ہوگی۔ امرا سپاہیوں کی مدد سے لڑائیاں لڑتے تھے اور زمیندار منحرف کسانوں کی فوج کے ساتھ اپنے مٹّی کے قلعوں میں رہتے تھے۔ اور اگر کوئی فرمارروا اتنا مضبوط ہوتا کہ ان لوگوں پر قابو پا سکے تو اسے ان کو ایک ایک کر کے زیر کرنا پڑتا تھا، ورنہ یہ لوگ فرمارروا کے لیے ایک کھلی ہوئی چنوتی ہوتے تھے۔ اور اُس کا اقتدار گھٹا کر اپنی طاقت بڑھاتے رہتے تھے۔" اس ملک کے سپاہی اور کاشتکار میرے آدمیوں سے ڈر کر بھاگ گئے۔ اس کے بعد صرف دہلی اور آگرہ کے علاوہ، ہر مقام پر باشندوں نے جگہ جگہ مورچے بنا لیے، اور شہروں میں صوبیدار دفاعی انداز میں قلعہ بند ہو گئے۔ اور اطاعت

اختیار کرنے یا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔"[29]

(ہندوستانی سماج ذات پات پر مبنی تھا۔ اور ذاتوں کے کسی قسم کے سماجی تعلقات قائم نہیں ہو سکتے تھے لیکن ذاتوں کے اس نظام کی پیچیدگی اس کی سمجھ سے باہر تھی) وہ شخص جو اپنے باپ کی مے نوشی کی صحبتیں دیکھنے کا عادی رہا ہو تقریبات کے موقعوں پر خانوں کو جمع ہوتے اور اظہارِ دوستی کرتے دیکھتا رہا ہو، اور جو خود بھی اس طرح کی دعوتیں کرتا رہا ہو، سوائے اس کے اور کیا کر سکتا تھا کہ بیٹھ جائے اور غور کرے کہ اس کا سبب کیا ہے، اور پھر اپنے نتیجے کو یوں بیان کرے کہ ہندوستان کے لوگ "جانتے ہی نہیں کہ دوستانہ ماحول، بے تکلفی کے ساتھ ایک دوسرے سے ملنا جلنا یا بے تکلف تعلقات کتنے دلفریب ہوتے ہیں"[21] (ذات پات کے اس نظام کے بارے میں یا اس نظام کو وہ جو کچھ بھی سمجھتا رہا ہو اس کے بارے میں اس نے محض ایک ہی اچھی بات کہی اور وہ یہ کہ کام کے آدمیوں کی بہتات تھی۔ "ہر پیشے کے بے شمار اور لاتعداد کاریگر اور دستکار موجود ہیں۔ کسی بھی کام یا روزگار کے لیے ایسے افراد کی ایک پوری جماعت مل جاتی ہے جو نسل بعد نسل مدتوں سے اسی پیشے یا کام میں مصروف ہیں۔"[22] اس نے یہ کہہ کر انتظامی پہلو کا بھی ذکر کیا ہے بھیرا سے بہار تک سارے ممالک باون کروڑ مالگذاری وصول ہوتی تھی، جیسا کہ اس مخصوص اور تفصیلی بیان سے ظاہر ہوگا جو اس سلسلے میں دیا گیا ہے۔"[23] اس نے ہر پرگنے کی مالگزاری بھی دی ہے، لیکن بابر اپنی ساری زندگی اتنا بہترین سپاہی رہا کہ اچھا منتظم مالگزاری نہ بن سکا۔ اور ہمیں کہیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس نے مالگزاری کا کوئی مستقل بندوبست بھی کیا تھا) وہ اس حقیقت سے خوب واقف تھا کہ ہندوستان کے بارے میں اس کا بیان صرف آخر نہیں ہو سکتا۔ اس نے وہ سب کچھ لکھ دیا جو اس کے علم میں آیا اور جس کی وہ تصدیق کر سکا۔ وہ مزید یہ لکھتا ہے کہ "آئندہ اگر مجھے کوئی ایسی چیز نظر آئی جو لائقِ بیان ہو تو ضرور لکھوں گا، اور اگر میں نے کوئی ایسی بات سنی جو دہرانے کے لائق ہو، تو اسے شامل بیان کروں گا۔"[24])

ہو سکتا ہے بابر نے اسلام کے بعض قوانین نظر انداز کیے ہوں یا ان کی خلاف ورزی کی ہو، ورنہ حقیقتاً وہ ایک نہایت مذہبی انسان تھا۔ اسے یہ رویّہ اپنے والد سے ورثے میں ملا تھا۔ "وہ پابندی سے پانچوں وقت نماز ادا کرتے تھے اور تمام عمر انھوں نے قضائے عمری (ایامِ طفلی میں یا کبھی بعد میں چھوڑی ہوئی نمازوں، روزوں کے عوض نماز پڑھنا اور روزے رکھنا) بھی ادا کی۔ وہ اپنا بہت کچھ وقت تلاوتِ قرآن پاک پر صرف کرتے تھے۔ انھیں اپنے مُرشد خواجہ عبید اللہ سے بڑی عقیدت تھی، اور اُن کی صحبت کے وہ بڑے متلاشی رہتے تھے۔"[25] اس کے کردار میں فکرِ اسلامی کے دو رُجحانات بڑے نمایاں تھے۔ وہ مقررہ اندار میں نمازیں ادا کرنے کا بڑی سختی سے پابند تھا، اور کوئی بہت بڑی بیماری ہی اُسے فرائضِ اسلام کی ادائیگی سے روک سکتی تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ "سردی بڑے زوروں پر تھی، اور چار درویش کی تند ہوا کا زور ابھی کم نہ ہوا تھا، بلکہ اور تیز۔ . . . طہارتِ مذہبی کی رو سے مجھ پر غسل واجب ہو گیا تھا، اور اسی مقصد سے میں ایک چشمے پر پہنچا جس کا پانی کناروں پر تو جم گیا تھا لیکن بہاؤ کی تیزی کی وجہ سے درمیان میں موجود تھا۔ میں نے پانی میں چھلانگ لگا دی اور سولہ دفعہ غوطے لگائے۔ پانی کی شدید ٹھنڈک اندر تک گھُس گئی۔"[26] ہندوستان آتے وقت جب وہ بدعتی قلندر شہباز کے مزار کے نزدیک پہنچا، جو کوہ مقام پر واقع تھا، تو اس نے دو پل بھی سوچے بغیر اُسے مسمار کرنے کا حکم دے دیا۔[27] دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی بیماری سے جلد شفایاب ہونے کی امید پر وہ خواجہ عبید اللہ احرار کے رسالۂ ولیدیہ کا ترجمہ کرتا ہے۔[28] لیکن وہ ناسمجھی کی حد تک ضعیف الاعتقاد نہ تھا اور اس بات میں یقین کرتا تھا کہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سخت کوشش کرنی چاہیے۔ اس نے اپنے خط میں ہمایوں کو یہ قطعہ لکھا تھا۔

جو صلے جمود کے مخالف ہوتے ہیں
یہ دنیا اس کی ہے جو سعت کوشش کرتا ہے
بادشاہ کے علاوہ ہر شخص دانا
ہر حالت سے مطمئن ہو جاتی ہے

عمل پیہم یقیں محکم اس کا فلسفۂ حیات تھا۔ وہ کسی مخصوص صورتِ حال کے پیش نظر اعلانِ جہاد کرکے انسانی کھوپڑیوں کے مینار بھی بنا سکتا تھا، یا ہندو مندروں کو چھوئے بغیر یونہی گزر سکتا تھا۔

بابر، وہ عظیم مغل، نہ ہندوستان کو کبھی اپنا وطن سمجھ سکتا تھا اور نہ ہندوستانیوں کو اپنے لوگ۔ سمرقند، اس کا گلستانِ محل، محل کے میناروں کا عکس نہر کے پانی پر پڑ رہا ہے یہ اس کا وہ خواب تھا جو ہندوستان میں سر بستہ تعبیر نہ ہو سکتا تھا۔ جب اُس نے آگرہ میں ایک محل اور ایک باغ بنانا چاہا تو اُسے لگا کہ یہ ساری جگہ "بدنما اور قابلِ نفرت ہے"[30] بہر حال، وہ جو کچھ بنانا چاہتا تھا اُسے پورا کر دیا، حالانکہ اسے جس طریقے سے بنایا گیا وہ اس کے معیار پر پورا نہ اُترا "اس صورت سے، ہندوانہ انداز میں، قرینے اور نفاست کا خیال رکھے بغیر، میں نے بہر صورت باغات اور عمارتیں تیار کروائیں جو خاصی سڈول تھیں ..... میں نے ہر باغ میں گلاب اور نرگس ترتیب سے لگوائے اور یہ پودے ایسی کیاریوں میں اُگوائے جو ایک دوسرے کے برابر تھیں"[31] وہ آخری دم تک واپسی کا خواہش مند رہا۔ اس نے ۱۱ فروری 1529ء کو خواجہ کلاں کو لکھا "جلد ہی یہ معاملات اس حالت پر پہنچے (یعنی، پورے طور سے طے ہوئے) تو انشاءاللہ ایک لمحہ وقت ضائع کیے بغیر تمہاری سمت روانہ ہو جاؤں گا۔ اس سرزمین کی مسرتیں کیا کبھی اس دل سے ہٹ سکتی ہیں؟ ..... ابھی چند دِن پہلے وہ میرے لیے ایک مشکیں خربوزہ لائے۔ اُسے کاٹتے وقت میرے اندر شدید تنہائی اور اپنے اصلی وطن سے جلاوطن ہونے کا احساس جاگ اُٹھا اور اسے کھاتے وقت

میں اپنے آنسو نہ روک سکا۔"[32] ہندوستان کا کوئی پھل مشکیں خربوزے کے معیار تک نہ پہنچ سکتا تھا۔ اس نے لکھا "بہت سے لوگ آم کی اتنی زیادہ تعریف کرتے ہیں گویا اسے مشکیں خربوزے کے علاوہ ہر قسم کے پھلوں پر فوقیت حاصل ہو۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ اتنی زیادہ تعریف بجا نہیں ہے۔"[33] لیکن بابر کے پڑپوتے جہانگیر نے جو ہمیشہ ہندوستان سے ہی وابستہ رہا تھا، کابل میں یہ مشاہدہ کیا تھا کہ "کابل کے پھل لاکھ خوش ذائقہ صحیح، لیکن مجھے ایک بھی پھل آم جیسا خوش ذائقہ نہ معلوم ہوا۔"[34] بابر کے جانشینوں نے جہانگیر کے دَور سے بہت پہلے ہی ہندوستان کو اپنا وطن سمجھ لیا تھا، اور انہیں اپنی آبائی سرزمین میں دوبارہ جا بسنے کا خیال بھی نہ آتا تھا، پھر بھی، ہر شہزادے اور ہر بادشاہ وقت کے لیے بابر ایک مثال بنا رہا اور ان کی شدید خواہش رہی کہ قولاً اور فعلاً اس کی تقلید کریں۔

حوالہ جات

1. Memoirs of Zahir-ed-Din Mohammed Babar tr Leyden and Erskine (London 1921) Vol II, pp 316 — 317 مندرجہ بالا کتاب کو اب جب کبھی حوالے کے طور پر پیش کیا گیا تو صرف Memoirs لکھا جائے گا۔

2. Stanley Lane-Poole, Rulers of India Babar, p 13

3. اس ضمن میں سب سے زیادہ اہم وہ رویّہ ہے جو اس نے شیبانی کے بارے میں اختیار کیا، اور اس حقیقت کی پردہ پوشی کی کہ اسے اپنی بہن کو اسی خوفناک حریف سے شیر دکرنا پڑا تھا صفحہ

4. H Beveridge, Calcutta Review, 1897

5. Memoirs Vol II, pp 32 — 33

6. ایضاً Vol I صفحہ 288

7. ایضاً Vol II صفحات 409 — 408

8. ایضاً Vol I صفحہ 1

9. ایضاً صفحہ 78

۱۰۔ ایضاً صفحہ 83

۱۱۔ ایضاً صفحہ 84

12۔ ایضاً صفحہ 220

13۔ ایضاً Vol II صفحہ 178

14۔ ایضاً صفحہ 193

15۔ ایضاً صفحہ 195

16۔ ایضاً صفحہ 194

17۔ ایضاً صفحہ 201

18۔ ایضاً صفحہ 208

19۔ ایضاً صفحہ 242

20۔ ایضاً صفحہ 247

21 ایضاً صفحہ 248

22۔ ایضاً صفحہ 241

23۔ ایضاً صفحہ 244

24۔ ایضاً II صفحہ 245

25۔ ایضاً I صفحہ 11

26۔ ایضاً I صفحہ 161

27۔ ایضاً Vol II صفحہ 90

28۔ ایضاً صفحہ 347

29۔ ایضاً صفحہ 352

30۔ ایضاً صفحہ 257

31۔ ایضاً صفحات 58 - 257

32۔ ایضاً صفحہ 372

33۔ ایضاً صفحہ 225

34۔ Memoirs of Jahangir, Vol. I, p 116

بدایونی

محمد مجیب

بدایونی اپنی کتاب کے مختصر تعارفی بیان میں کہتا ہے کہ "مجھے ان لوگوں سے کوئی سروکار نہیں جو شریعت کے پابند نہیں اور جو روی یا اصولی طور سے اس کے منکر ہیں، کیونکہ یہ لوگ اس کے مستحق نہیں کہ انھیں اس صورت سے مخاطب کیا جائے۔ وہ اس لائق نہیں کہ انھیں معتبر، صاحب نظر اور معاملہ فہم لوگوں میں شمار کیا جائے۔"[2] اس سے ذرا پہلے اس نے یہ لکھا ہے کہ "ہمیں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے . . . . کہ علم کی اس شاخ — یعنی تاریخ — کا مطالعہ و تحقیق، ان ضعیف العقیدہ لوگوں کے لیے جو شک و شبہ میں مبتلا رہتے ہیں، ممتاز شریعتِ محمدی کے سیدھے راستے سے گمراہ ہو جانے کا سبب بنتا رہا ہے۔ اسی علم کی وجہ سے اس طرح کے لوگ مختلف نظریات قائم کر لیتے ہیں اور بدعت و تشکک کے مبہم طریقے اپنا لیتے ہیں۔ اور اسی بنا پر یہ علم سرچشمۂ مایوسی بن گیا ہے۔ ایسے لوگ جو فطرتاً ایمان کی طرف مائل نہیں ہوتے وہ اور زیادہ شدت اختیار کر لیتے ہیں اور مستقل شبہ میں گرفتار رہنے لگے ہیں، (حتیٰ کہ) کلام الٰہی پڑھتے وقت بھی شک میں مبتلا رہتے ہیں . . . . ایسے لوگ کس طرح تاریخ کا صحیح علم حاصل کر سکتے ہیں؟"[3]

تو سوال یہ پیدا ہوتا کہ بدایونی نے لکھا ہی کیوں؟ تاریخ اتنی اہم چیز ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ "علم کی اس شاخ کی قدر و قیمت سے کوئی کس طرح قطعاً انکار کر سکتا ہے، جو ہفت سبع (مراد پورے قران سے) کا ساتواں حصہ ہے، اور جس کی بنیاد پر ایمان اور یقین کو

قوت ملتی ہے۔[3] "تاریخ بذات خود علم کی ایک شاخ اور ایک نفیس فن ہے کیونکہ ان لوگوں کے لیے جو واقف کار ہیں یہ سسہ کا ایک وسیلہ ہے اور ان لوگوں کے لیے جو ذہین اور صاحب نظر ہیں یہ تجربے کا ایک ذریعہ ہے۔"[4] اور بہرحال ہر شخص مائل بہ خطا نہیں ہوتا۔ اسی لیے بدایونی نے یہ کہا کہ "میں اُن لوگوں سے مخاطب ہوں جو صحیح المزاج اور رود فہم ہیں اور جو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنے کے عادی ہیں۔"[5] اور یہ کہہ کر وہ جو کچھ لکھنا چاہتا تھا اور جس طرح لکھنا چاہتا تھا اس کی ابتدا کر دی۔

وہ اپنے زمانے کے اعتبار سے واقعی بڑا خوش نصیب تھا۔ وہ 1540ء میں پیدا ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مہدی قائدوں کی قسمت کا فیصلہ کیا جا رہا تھا، اور کوئی طالب علم علما کے درمیان پیدا ہو جانے والے اس گہرے شگاف سے واقف ہوئے بنا مشکل ہی سے تعلیم حاصل کر پاتا تھا، جو شگاف سید محمد جونپوری کی تعلیمات اور ان تعلیمات کی مخالفت کرنے والی ہستیوں اور عقیدوں سے متاثر ہونے والے مختلف گروہوں کے سبب پڑ گیا تھا۔ صوفیوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو دولت مند اور بااثر تھے اور ایسے لوگ بھی تھے جو دولت اور شہرت حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، اور دونوں طرح کے صوفیوں کے چاہنے اور ماننے والے موجود تھے۔ افغانوں اور مغلوں کے درمیان اقتدار کی کشمکش نے بہتوں کی وفاداری کا امتحان لیا، اور یقیناً بہت سے لوگوں نے خود وفاداری کی ماہیت اور افادیت پر غور کیا۔ اور آخر کار، عین ان دنوں جب بدایونی اپنی تعلیم مکمل کر چکا تھا اور اس قدر پختہ ذہن ہو گیا تھا کہ کوئی ادبی کام کر سکے، تو اکبر کا ذہنی تجسس بھی تسکین کے لیے بیتاب ہو چکا تھا اور وہ اشخاص، خیالات اور کتابیں جمع کر رہا تھا۔ جب بدایونی سرکاری عہدیداروں کے خاندانوں میں مطلوبہ آزمائشی مدت گزار چکا تو جلال خاں قورچی اور حکیم عین الملک نے اسے اکبر کے رُوبرو پیش کیا۔ تقریباً اسی زمانے میں ابوالفضل بھی دربار شاہی میں پہنچا تھا۔ شیخ عبدالنبی صدر تھا، اور اکبر ان سے اور دوسرے علما کے علم سے پریشان رہتا تھا۔ بدایونی کہتا ہے

"چونکہ علم ایک ایسی جنس تھی جس کی بڑی مانگ تھی اس لیے جونہی میں وہاں (بادشاہ کے رُوبرو) پہنچا (عالی جاہ سے) گفتگو کا شرف حاصل ہوگیا۔ مجھے ارکانِ مجلس میں شامل کرکے اس بحث میں حصہ لینے کے لیے کہا گیا جو علما کے درمیان ہو رہی تھی، اور جس بحث میں علما کسی کو خاطر میں لائے بغیر اپنے علم و فضل کی ڈینگیں مار رہے تھے . . . . . اللہ کے فضل سے اپنی ذہنی صلاحیت، تیز فہمی اور اس جرأت کی بنا پر جو نوجوانی کا خاصہ ہوتی ہے، میں اکثر ان پر سبقت لے گیا۔"[5] اس کے بعد سے بدایونی گھمسان کی جنگ میں شامل ہوگیا۔ وہی شریعت کی حمایت میں لڑ رہا تھا اور جو بھی رحمی ہوتا وہی اس کا دشمن تھا! اکبر، فیضی، ابوالفضل، سارے دالشور، سارے کافر، سارے مردُود شیعہ، سارے کٹر سُنی، سارے سہروردیے۔ کیا کوئی شخص اس بہتر شکارگاہ اور انواع و اقسام کے اتنے بہت سے شکاروں سے زیادہ کی خواہش کرسکتا تھا؟

لیکن ہمیں اس کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کی تعلیم ایسے اشخاص کے ہاتھوں ہوئی جیسے سنبھل کے میاں حاتم، جو خواہ ہمارے تصور کے آزاد خیال شخص سے میل رکھاتے ہوں، دوسروں کی بھلائی چاہتے تھے اور تعصب نیز عالموں کی خود پسندی سے آزاد تھے۔ یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ اس نے فیضی اور ابوالفضل کے والد اور مہدویوں کے حامی، شیخ مبارک ناگوری سے بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے والد صوفیوں اور درویشوں سے ملنے جاتے تو اسے ساتھ لے جاتے اور اس طرح اس کے اندر حرمت کے احترام کا رُجحان بنا دیا تھا۔ وہ علمِ دین اور فقہ کا اتنا عالم تھا کہ علما سے مقابلہ کرسکتا تھا اور ان ہی کی دلیلوں سے انھیں ہرا سکتا تھا۔ دراصل اکبر اس کی ادبی لیاقت اور دربار کے علما کے خلاف اس کی کامیاب دلیلوں کے سبب ہی اس پر مہربان ہوا۔ اس نے لڑائی میں شامل ہونے کا ارادہ کرلیا کیونکہ وہ ان علما کی خود پسندی، تعصب، ذہنی بھونڈے پن اور ناقص طور و طریق سے ناراض تھا۔ اس نے مولانا عبداللہ سلطان پوری اور شیخ عبدالنبی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اور اس سے کہیں زیادہ ہمدردی کے ساتھ مہدوی قائدین، میاں

اللہ بیازی اور شیخ علائی کے بارے میں جو کچھ بیاں کیا ہے' اس سے ہمیں یقین کلی ہو جانا چاہیے وہ راسخ العقیدہ تو تھا لیکن بے حس اور تنگ نظر نہ تھا۔ وہ ان مکاروں کے بارے میں بڑے نفرت اور حقارت کے ساتھ لکھتا ہے جو صوفیائے کرام کی نیک نامی سے فائدہ اٹھانے کی خاطر صوفی بن بیٹھتے تاکہ بادشاہ اور درباریوں کی عنایات حاصل ہو جائیں۔ وہ ان صوفیوں کو بالکل خاطر میں نہیں لاتا جنھوں نے مال و دولت اکٹھی کر لی تھی لیکن وہ ان صوفیوں کے بارے میں کوئی غلط بات نہیں کہتا جن کی زندگی اور برتاؤ کھلے طور پر ایک خاص مزاج کے غماز تھے اور اس مزاجِ ظاہری کی بنا پر انھیں بہ آسانی مدعی کہا جا سکتا تھا۔ وہ شیخ مبارک ناگوری کے بارے میں ہمیشہ تعظیم کے ساتھ لکھتا ہے' حالانکہ شیخ ہی نے پہلے پہل یہ خیال پیش کیا تھا کہ امام عادل علما سے برتر ہے اور انھوں نے خود ہی یہ فتوا تحریر کیا تھا' نہ صرف یہ' بلکہ شیخ ہی نے ایک موقعے پر شہنشاہ کی موجودگی میں سر بزم یہ ــــ جسے بدایونی سخت ناپسند کرتا تھا ــــ یہ کہتا تھا کہ ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں اضافے کیے گئے ہیں اور ہمارے مذہب کی (اسلام کی) نشوونما کے دوران بہت سی زائد چیزیں بھی شامل ہو گئی ہیں' اور کسی چیز پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔[7] اس نے شیخ کی تاریخِ وفات "شیخ کامل"[8] سے نکالی جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کے آخر دم تک ان کی تعظیم کرتا رہا۔

بدایونی کو اپنی ادبی لیاقت اور قوتِ مناظرہ پر خاصہ فخر ہے' لیکن اپنی پارسائی کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔ اس کا خود کو بار بار گنہگار کہنا یہ سمجھ کر رد کیا جا سکتا ہے کہ یہ سب محض رسمیات ہیں' لیکن وہ اپنی معصیت کی اہمیت کم کیے بغیر اس واقعے کا ذکر بھی کر دیتا ہے جب ایک غلط عورت سے غلط مقام پر پیار و محبت کرتے وقت فسادیوں نے اسے زخمی کر دیا تھا' اور ہو سکتا تھا کہ جاں سے مار دیتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کا احساسِ صداقت بگڑا ہوا ہے' تو اس بگاڑ کا اثر جتنا دوسروں پر پڑا ہے اتنا ہی خود اس پر پڑا ہے۔ لگتا ہے کہ وہ اس بات سے واقف تھا کہ جہاں دوسروں میں عیب ہیں وہاں وہ

دلیر اور دو ٹوک بات کہنے والا ہے اور اپنے ایذا رسانی کے جذبے کو قابو میں نہیں رکھ سکتا۔

پھر ایسا کیوں ہوا کہ اکبر اور بدایونی نے ایک دوسرے کے بارے میں اپنی رائے بدل دی، اور جہاں اکبر کو یہ شبہ پیدا ہو گیا کہ بدایونی دراصل اندر سے کٹر مذہبی ہے، وہاں بدایونی شدت اور بغض کے ساتھ اکبر، اس کے خیالات اور اس کی پالیسیوں پر تنقید کرنے لگا۔ بدایونی بیان کرتا ہے کہ اکبر نے ایک دفعہ اسے اپنے سامنے بلایا اور ابوالفضل سے کہا: "میں سوچتا تھا کہ یہ نوجوان صوفی مسلک پر پہنچ چکا ہے اور صوفیوں کے نقشِ قدم پر گامزن ہے، لیکن یہ تو ایسا کٹر عالم دین نکلا کہ اس کے کٹرپن کی شہ رگ کو تلوار بھی نہیں کاٹ سکتی۔"[9] اکبر ایک شعر کا مفہوم غلط سمجھا جو بدایونی نے مہابھارت کے ایک ترجمے میں شامل کر دیا تھا، اور بدایونی، ابوالفضل کی مدد سے اپنا نقطۂ نظر واضح کر سکا۔ لیکن اکبر کو جو شک پیدا ہو گیا تھا اس سے ایسا ظاہر ہوتا ہے، اور بدایونی برابر اس کی تصدیق کرتا ہے، کہ خود اس کا رویہ قدرے سخت ہو گیا تھا، اور خواہ عملاً نہ سہی لیکن اصولاً وہ اس کے لیے تیار نہ تھا کہ اپنے مسلمان درباریوں اور مصاحبوں کو عقیدے کے معاملے میں زیادہ آزادی دے۔ لہٰذا، اکبر کے مصاحبین اور اس کی مذہبی اصلاحات پر بدایونی نے جو سخت تنقید کی ہے اسے ہمیں یہ سمجھ کر رد نہیں کرنا چاہیے کہ اس کی وجہ بدایونی کا مذہبی کٹرپن، احسان فراموشی یا محض خودسری تھی۔

ہمیں معلوم ہے کہ بدایونی شیخ عبدالنبی، مولانا عبداللہ سلطان پوری اور عام طور پر ان سارے علما کے بارے میں کیا رائے رکھتا تھا جو اکبر یا اسلام شاہ کے دربار میں اکثر حاضر رہا کرتے تھے۔ لیکن کیا یہ سبب سارے علما کی مذمت کرنے اور علم دین کے مطالعے کی افادیت سے منکر ہو جانے کے لیے کافی تھا؟ کیا یہ سبب اس قدر معقول تھا کہ شریعت سے منہ موڑ لیا جائے؟ اگر کچھ مخصوص علما کے رویے اور برتاؤ کو سارے علما کے خلاف دلیل کے طور پر پیش

یا جا سکتا تھا، تو درباریوں کے بارے میں، اور خصوصاً ان درباریوں کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے جو اکبر کے نزدیک تھے۔ بدایونی یہ سوچ سکتا تھا کہ وہ نرم برتاؤ کے مستحق نہیں، اور اگر دونوں کے عیوب کا موازنہ کیا جائے، تو وہ سرکاری علماء سے چنداں بہتر نہ تھے۔ دونوں نے ہی اپنے اپنے انداز سے شریعت کی خلاف ورزی کی، اور بدایونی کے نزدیک شریعت ہی وہ معیار آخر تھی جس کی اساس پر فیصلہ کیا جا سکتا تھا۔

لیکن کیا شریعت کی کوئی ایسی واضح تعریف کی جا سکتی تھی جو معیار کا کام دے سکے؟ بدایونی کا یہی پہلو کمزور ہے۔ کوئی شخص کس طرح یہ طے کر سکتا ہے کہ ان بداعمال احمقوں کا ساتھ دے جو شریعت کی نمائندگی کرنے کا دعوا کرتے ہیں یا ان عیار دانشوروں کا ساتھ دے جنھوں نے اس کی تضحیک کو اپنا شیوہ بنا رکھا ہے۔ بدایونی اتنا پریشاں ہو جاتا ہے کہ اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے، اور فیضی اور ابوالفضل پر، جو درباری ترقی کے پورے دور میں اس کے مربی رہے تھے، تہمتیں لگاتے وقت تنگ ظرفی کی حد کر دیتا ہے۔ لیکن وہ حقیقتاً تنگ ظرف نہیں تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس نے اسی انداز سے سوچا جیسے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمان سوچنے لگے تھے کہ جہاں علما کی حمایت کرنا بے سود ہے وہاں ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے رہن سہن کے معاملے میں آزاد خیال ہونا اشد ضروری ہے، لیکن شریعت کا احترام ہر قیمت پر کرنا چاہیے۔ اور یہ بات محض ہندوستانی مسلمانوں ہی میں نہ تھی۔ مجھے یاد ہے کہ 1934ء میں مصر کے ڈاکٹر بہجت وہبی جامعہ ملیہ میں لیکچر دینے آئے تو انھوں نے یہ کہا تھا کہ اگر کسی شخص نے نماز نہ پڑھی تو بجائے اس کے کہ نماز نہ پڑھنے کو اصولاً درست ثابت کرے اسے یہ اعتراف کر لینا چاہیے کہ اس سے ایک غلطی سرزد ہو گئی۔ بدایونی نے اپنے زمانے میں یہ دیکھا کہ دیانت دار علما پر جبر کیا جا رہا ہے، اور عیار لوگ کرسی انصاف پر متمکن ہیں، اور پھر اسے ضرور یہ احساس ہوا ہوگا کہ ایسے غیر یقینی حالات میں اگر دربار کی مثال اور اس کی قوت اثر سے سرکاری علما اور ان کی نافذ کردہ شریعت سے

خلاف عوام کے جذبات اور زیادہ بھڑکتے تو خود شریعت، جس پر مسلم طرزِ زندگی کا دارومدار ہوتا ہے، تباہ ہو جائے گی۔ لہٰذا وہ اپنی جھلاہٹ کے اظہار میں اپنا سارا زورِ علم ان لوگوں کے خلاف صرف کرتا ہے، جن کا رویہ شریعت کے بارے میں بڑا گستاخانہ اور حقارت آمیز تھا، اور جو لوگ بالآخر شہنشاہ کے دل سے شریعت کا احترام ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

بدایونی کو نہ تحقیق و تفتیش کا ذوق تھا نہ تاریخ علم میں اضافہ کرنے کی خواہش۔ وہ بڑی سادگی سے یہ تحریر کرتا ہے کہ دہلی سلطنت کے قیام کے ابتدائی دور سے اس کے اپنے زمانے تک کا حال محض انتخابِ تواریخ ہے۔ جو اس نے تاریخِ مبارک شاہی اور نظام الدین احمد بخشی کی کتاب جسے وہ نظام التواریخ کہتا ہے اور طبقاتِ اکبری سے کیا ہے۔ لیکن اس نے کچھ اضافے اپنی طرف سے بھی کیے ہیں۔[19] جب ہم اپنے "اس کے کچھ" کی جانچ کرتے ہیں تو یہ پتہ لگتا ہے کہ بدایونی کو سیاسی تاریخ سے دلچسپی نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ دلچسپی کی یہ کمی اس دلچسپی سے کہیں کم ہے جس کا اظہار تعارفی بیان کے اس جملے سے ہوتا ہے کہ وہ ہر بادشاہ کے بارے میں مختصراً کچھ تحریر کرے گا۔ ہمیں اس کے بیان میں نہ صرف یہ کہ جگہ جگہ اشعار، قطعے، قصیدے اور مادۂ تاریخ ملتے ہیں، بلکہ ایسا لگتا ہے جیسے وہ یہ سمجھتا ہو کہ شاعری سیاسی واقعات کے مقابلے میں اگر زیادہ اہم نہیں تو برابر ضرور ہے۔ وہ رضیہ کی تخت نشینی اور اس کے دورِ حکومت کے بیان کے درمیان ایک شاعر پر بحث کرتا ہے اور اس کی شاعری کے نمونے پیش کرتا ہے، اور لگتا یہ ہے کہ ان دونوں میں شاعر کی شخصیت کہیں زیادہ افضل ہے۔ ناصر الدین کا دورِ حکومت چار صفحات پر مشتمل ہے جب کہ اس کے دور میں لکھے جانے والے قصیدوں پر اکتیس صفحات صرف کیے گئے ہیں بلبن کے ولی عہد سلطان محمد کی وفات سے اسے موقع مل گیا اور کئی طویل مرثیے شامل کر دیے۔ وہ سیاسی واقعات اور پالیسیوں کو کتنا وزن دیتا ہے یہ اس سے ظاہر ہے کہ بلبن کی اس نصیحت کے بارے میں جو اس نے اپنے بیٹے کو دی تھی یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے کہ یہ نصیحت دہلی کی تاریخوں میں دی ہوئی ہے اور بلبن کے مقابلے میں کیقباد پر زیادہ لکھتا ہے۔ اہم انتظامی

فیصلوں کو وہ محض اس مختصر حوالے کے لائق سمجھتا ہے کہ" اور اس سال عالی جاہ نے شہباز خاں کمبوہ کی زیرِ نگرانی داغ (گھوڑوں کو داغنا) اور حاضری (فوج وغیرہ کی) کے محکمے کے لیے حکم صادر فرمایا، اپنے زیرِ اختیار سارے علاقے میں کروریوں کے تقرر کا حکم جاری کیا اور ساری زمین کو بیک جنبشِ قلم پھر سے خالصہ کر دیا"[11]

بدایونی نے اپنے دونوں مآخذوں سے منتخب کیے ہوئے واقعات میں جو "کچھ اور زیادہ" اضافے کیے ہیں ان میں وہ حوالے بھی شامل ہیں جو صوفیوں اور شاعروں کے بارے میں متواتر دیے گئے ہیں۔ یہ حوالے کچھ زیادہ مددگار ثابت نہیں ہوتے۔ بجز اس کے کہ شاید ان سے بعض تاریخوں کے تعین میں مدد مل سکتی ہے، کیونکہ شاید ہی کوئی ایسی موت ہو جس کا ذکر قطعہ تاریخ کے بغیر کیا گیا ہو۔ بدایونی کو قصے سنانے کا شوق بھی تھا۔ لیکن اس کا تخیل کسی قصہ گو کی طرح آوارہ نہ تھا، اور وہ یہ سمجھتا ہوگا کہ قصہ گوئی دروغ الوقتی ہوتی ہے۔ وہ ماوق الفطرت ہستیوں کا ذرا بھی شائق نہ تھا۔ فیروز خلجی کے ہاتھوں سیدی مولا کے قتل کے بعد جو قدرتی شگون اور آفات سماوی دیکھنے میں آئیں ان کا حال بیان کرتے وقت وہ برنی کے مقابلے میں زیادہ ضبط سے کام لیتا ہے، اور خشک سالی کے بیان میں اپنی یہ رائے شامل کرتا ہے کہ ایسا قدرتی اسباب کی بنا پر بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن قصوں نے واقعتہً اس کے بیان کا لطف دوبالا کر دیا ہے۔ ایک کہانی التمش کی کسی کنیز کی ہے۔ جس کے متعلق بعد میں یہ پتہ لگتا ہے کہ اس کی بہن تھی۔ پھر سید موسیٰ اور سنار کی لڑکی موہنی کی داستانِ محبت ہے۔ یہ وہ واقعہ ہے جو خود اس کے زمانے میں گزرا۔ بدایونی اپنا بیان روک کر بڑی تفصیل سے یہ کہانی سناتا ہے۔ اس کہانی کے دوران یہ احساس ہوتا ہے کہ یہاں بالآخر اس نے اشخاص اور افعال کو شریعت کی عینک سے دیکھنا بند کر کے خود کو پورے طور پر ان لوگوں سے وابستہ کر لیا ہے جن کے مقدرات کا ذکر کر رہا ہے۔ یہ کہانی ادب کا ایک اعلا نمونہ ہے۔

لیکن بدایونی کی سب سے بڑی خصوصیت اس کے لطیفے اور طنزیہ جملے ہیں۔ محمد بن تغلق

کے دَورِ حکومت کے بارے میں بدایونی سے زیادہ دُرست، جامع اور چبھتا ہوا جملہ شاید ہی کہیں اور مل سکے: "سلطان کو لوگوں سے اور لوگوں کو سلطان سے نجات مل گئی"[12] ذیل میں اس کی شوخی کے چند مخصوص نمونے دیے جا رہے ہیں۔

"اور اس سال اس دَور کے علما، میر مرتضیٰ شریفی شیرازی اس سرائے فانی سے کوچ کر گئے۔ پہلے انھیں امیر خسرو (خدا ان پر رحم فرمائے) کے مزار کے نزدیک دفنایا گیا۔ پھر، چونکہ صدر اور قاضی الاسلام نے (عالی جاہ سے) عرض کیا کہ امیر خسرو ہندوستانی اور سُنّی تھے اور میر مرتضیٰ عراقی اور رافضی، اس لیے امیر خسرو کو بلاشبہ ان کی معیت سے اذیت پہنچے گی۔ . . . . عالی جاہ نے حکم صادر فرمایا کہ ان کی نعش وہاں سے نکال لی جائے اور کہیں اور دفنائی جائے۔"[13]

"اور اس برس شیخ ابراہیم چشتی فتح پور میں اپنی طبعی موت مرے۔ انھوں نے سوئے کے انبارو‌ں کو الوداع کہا اور خالقِ حیات کے سامنے اپنا حساب پیش کیا۔ ان کے مال و دولت سے پچیس کروڑ زرِ نقد، کے علاوہ ہاتھی، گھوڑے اور دوسری اشیا شاہی خزانے کی تحویل میں آئے، بقیہ ان کے دُشمنوں ـــــ بیٹوں اور وارثوں ـــــ کے ہاتھ لگا۔"[14]

"مخدوم الملک س ۹۹۵ ھ میں بمقام احمد آباد فوت ہو گئے۔ ان کی جائداد اور املاک فہرست تیار کرنے کے لیے قاضی علی فتح پور سے لاہور بھیجے گئے۔ انھوں نے اتنا زیادہ مال و زر اور دفینہ ڈھونڈ نکالا کہ جس کا قفل انسانی تخیّل کی کوئی کنجی نہ کھول سکتی تھی۔ اس خزانے کا ایک حصّہ مخدوم الملک کے خاندانی قبرستان میں طلائی اینٹوں سے بھرے بکسوں میں تھا، اور اس طرح دفن کیا گیا تھا جیسے لاشیں دفن ہوں۔ انسانوں کی نظر جو کچھ پڑا وہ اتنا زیادہ تھا کہ خالقِ باری تعالیٰ ہی اس کا حساب کر سکتا تھا۔ وہ ساری اینٹیں اور ان کے ساتھ وہ کتابیں جن کی قیمت معمولی اینٹوں سے زیادہ نہ تھی، ضبط کر کے شاہی خزانے میں داخل کر دی گئیں۔"[15]

بعض ایسے مادۂ تاریخ ہیں جو نہ صرف مرارت آمیز ہیں بلکہ فحش ہیں، جیسے شیخ ابراہیم چشتی کے لیے "شیخ بخیل"[16] اور شیخ گدائی کے لیے "جسم حریر"[17] لکھا ہے۔

اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ بدایونی کی منتخب التواریخ میں نمایاں اور شدید طور پر داخلیت ملتی ہے۔ اسے تاریخوں میں نہیں توزکوں کے خانے میں رکھنا چاہیے، اور واقعتاً اسے پڑھ کر اکثر سنیٹ سائمن کی توزک کا خیال آتا ہے۔ اور شاید بدایونی کی کتاب کی افادیت اسی میں مضمر بھی ہے۔ وہ کوئی بہروپ نہیں بھرتا، وہ جو محسوس کرتا ہے وہی لکھتا ہے۔ اسے نہ کسی فائدے کی فکر ہے، نہ کسی طبقے سے تعلق، وہ ایک آزاد رو مصنّف ہے۔ اسے نہ کسی کو خوش کرنے کا خیال ہے، اور نہ منصبِ مورّخ کا کوئی ایسا تصور جس کی بنا پر جھجک پیدا ہو جائے۔ اگر ہم یہ مانتے ہیں کہ شریعت سے محض اس کا یہ مطلب ہے کہ خدا، رسول اور الہام کے تئیں عزت و احترام کا رویہ ہونا چاہیے، تو ہم یہ مان لیں گے کہ اس نے اختلافِ رائے اور اپنی پسند کی زندگی گزارنے کی آزادی خود بھی لی ہے۔ اور دوسروں کو بھی دی ہے۔ اس کے باوجود ہم بعض اوقات جھلّا سکتے ہیں، لیکن ہمیں یہ احساس بھی ہوگا کہ یہ وہ شخص ہے جو زندگی کو ہر سمت سے دیکھنے کا لطف اٹھا رہا ہے، جو شوق سے لکھتا ہے اور خوب لکھتا ہے، جس نے ان حقائق کو تلاش کرنے کی کوشش کی جو پوشیدہ تھے اور دوسروں کی نظروں سے بچ گئے تھے، لیکن اس نے جو کچھ دیا ہے وہ زندہ اور متحرّک ہے، خود اس کا اور اس کے زمانے کا آئینہ دار ہے۔

حوالہ جات

1. Badauni, Muntakhab-ut-Tawarikh ed Lees (Calcutta 1865) Vol I p 3

2۔ ایضاً، صفحات 3، 4

3۔ ایضاً صفحہ 3

4۔ ایضاً، صفحات 2، 3

5۔ ایضاً، صفحہ 3

6۔ ایضاً، جلد دوئم، صفحہ 172

7۔ ایضاً، صفحہ 312

8۔ ایضاً، صفحہ 388

9۔ ایضاً، صفحہ 349

10۔ ایضاً، صفحہ 6

11۔ ایضاً، صفحہ 137

12۔ ایضاً، صفحہ 238

13۔ ایضاً، صفحہ 99

14۔ ایضاً، صفحہ 374

15۔ ایضاً، صفحہ 311

16۔ ایضاً، صفحہ 374

17۔ ایضاً، صفحہ 119

تاریخ الفی

ایس۔ اے۔ اے۔ رضوی

الف سعادت (ہزار سال کا زمانہ جس میں شیطان قید ہوگا اور اسلام کا بول بالا ہوگا) کی اہمیت صرف علماء دین اور صوفیوں ہی کا موضوعِ بحث نہیں بلکہ صدیوں تک عوام اس موضوع پر بڑے شوق سے قیاس آرائی کرتے رہے۔ یہ مقبولیت اتنی زیادہ تھی کہ شعرا اس مضمون پر بڑے چاؤ سے شعر کہتے تھے۔ ابوالفضل نے اکبر نامہ میں خاقانی (وفات 582ھ مطابق 1186ء) کا ذیل کا قطعہ نقل کیا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ دُنیا میں ہر ہزار سال کے بعد،
ایک سچا انسان پیدا ہوتا ہے،
وہ پہلے بھی آیا تھا، ہمارے وجود میں آنے سے پہلے،
وہ بعد میں بھی آئے گا، جب ہم بارِ غم اُٹھائے رخصت ہو چکے ہوں گے۔

اِسی شاعر نے ایک اور جگہ لکھا ہے:

اکثر اوقات جب یہ دُنیا آفت زدوں سے بھر جاتی ہے،
تو ایک رُوحِ درخشاں فلک سے اُتر آتی ہے،
خاقانی، اس زمانے میں اسے تلاش نہ کر،
رہ گزر پہ نہ بیٹھ کیونکہ کارواں دیر سے آئے گا!

ہندوستان میں اکبر کے دورِ حکومت میں مہدوی تحریک گو پہلے ہی زوال پذیر ہو چکی تھی، لیکن مسلمانوں میں ایک بڑھتا ہوا تناؤ اس بنا پر موجود تھا کہ حضرت محمدؐ کی وفات کے بعد ہزار سال مکمل ہونے کے دن نزدیک آتے جا رہے تھے۔ 74-1573ء میں مُلّا عبدالقادر بدایونی شیخ داؤد (وفات 982ھ مطابق 5-1574ء) سے ملے گئے اور شیخ کے ایک مقرب، میاں عبدالوہاب، کے ذریعے انھیں اطلاع دلوائی کہ ہندوستان کے مشائخ وارثِ سلطان علاالدین بن محمد شاہ بن مبارک شاہ بن خضر خاں، جو سیّدوں کے سلسلہ حکومت کا آخری سلطان تھا، کے زیرِ قیادت بغاوت کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ انھوں نے دعوا کیا کہ انھیں غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی سے ہدایات موصول ہوئی ہیں۔ سرحدوں کے بعض امیر بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ گو یہ مجوزہ بغاوت ظہور میں نہ آئی، لیکن سیاسی جاں باز اپنے فائدے کی خاطر لوگوں کے خوف اور امیدوں سے فائدہ اُٹھانے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ اکبر بظاہر ان تحریکوں سے پریشان نہ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے یہ کہا:

"حالانکہ میں اتنی بڑی سلطنت کا مالک ہوں، اور حکومت کے سارے وسائل میرے ہاتھ میں ہیں، پھر بھی چونکہ حقیقی عظمت رضائے الٰہی کے مطابق عمل کرنے میں مضمر ہوتی ہے، اس لیے فرقوں اور عقیدوں کی گوناگونی سے میرا دل بے چین ہے؛ اور حالات اس ظاہری شان و شوکت قطع نظر اپنی شکستہ دل کی وجہ سے مجھے وہ اطمینان کہاں نصیب ہے جس سے اپنی مملکت کو قابو میں رکھ سکوں۔ میں کسی ایسے محتاط با اصول انسان کی آمد کا منتظر ہوں جو میرے ضمیر کی گتھیاں حل کر دے گا۔"[3]

بہرحال اس نے اسلامی دور کے ہزار سال منانے کے واسطے یہ حکم دیا کہ سکّوں پر "دورِ ہزار سالہ" ثبت کیا جائے اور ایک تاریخ الفی لکھی جائے جو رسول کی وفات سے شروع کی جائے۔ ان احکامات کا مقصد اسلام کے خاتمے کا اعلان یا اس کے ضابطوں کی تحقیر ہرگز نہ تھا، جیسا کہ مُلّا عبدالقادر بدایونی کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے: "اور چونکہ عالی جاہ کی رائے

میں، یہ ایک طے شدہ حقیقت تھی کہ رسول اللہ (صلی علیہ وسلم) کی رسالت کے زمانے کے بعد ہزار سال کا وہ دَور پورا ہو چکا، جس دَور میں اسلامی عقیدے کا قیام ضروری تھا، اس لیے اب ان پوشیدہ ارادوں کی اشاعت میں کوئی رُکاوٹ باقی۔ تھی، جن کو وہ دل میں پال رہا تھا۔ اور اس لیے اس نے یہ سمجھا کہ شیوخ اور علما (جو جھکنے اور مصالحت کرنے کے لیے تیار رہتے تھے) کا مزید پاس اور لحاظ غیر ضروری ہے۔ اسے اختیار ہے کہ اسلام کے قوانین اور ضوابط کو مسترد کرے کے اپنے ارادے کو بے خوف و خطر پورا کرے، اور (ان کی جگہ) اپنے اس مہلک عقیدے کو قائم کرے جیسے وہ پال رہا تھا۔"[5] بہر حال بدایونی نے، اکبر کے دَور کے بعض ان ضابطوں کا حال مختصراً بیان کرے، جو اس کے مطابق ۹۹۰ ھ مطابق 83-1582ء میں جاری کیے گئے تھے، قدرے سنجیدہ انداز میں یہ تحریر کیا:

"سن ہجری، جو عام طور سے رائج ہے، اس کے ہزارویں برس کے تقریباً اختتام پر شہنشاہ نے حکم دیا کہ اسلام کے سارے بادشاہوں کی ایک تاریخ مرتب کی جائے، جو واقعیً ساری تاریخوں سے افضل ہو، اور یہ فرمایا کہ کتاب کا نام ایسا رکھا جائے کہ اس کا سالِ تالیف ظاہر ہو جائے۔ یہی سبب تھا کہ کتاب کا نام الفی رکھا گیا۔"[6]

یہ کتاب ان ہی وسیع البنیاد مقاصد کے حصول کے لیے لکھی جانی تھی جن کے حصول کے لیے ایک قسم کا دارالترجمہ قائم کیا گیا تھا۔ مُلّا احمد ٹھٹوی کی وفات کے بعد آصف خاں (جعفر بیگ)[7] نے تاریخ الفی مکمل کی، اس نے اپنے لکھے ہوئے حصّوں کے مختصر پیش لفظ میں پہلے اکبر کے اس اعلا احساسِ عدل کی تعریف و توصیف کی ہے جسے وہ عام کرنا چاہتا تھا، اور پھر یہ لکھا کہ شہنشاہ ہمیشہ اپنی ساری قوتیں جمع کرکے اس بات کی سخت کوشش کرتا رہا کہ "علمِ کامل" سے ہر شخص واقف ہو جائے اور مختلف مذاہب اور عقائد کے لوگ اس بنیادی سچائی کو سمجھیں جو ہر مذہب اور عقیدے میں پائی جاتی ہے، اور اندرونی تعصب کو چھوڑ دیں۔ اس نظریے کی بنا پر شہنشاہ نے حکم دیا کہ مختلف مذاہب کے وہ اصول جو دلیل پر مبنی ہوں مختلف زبانوں

ں ترجمہ کیے جائیں۔[9] اس نے یہ حکم بھی دیا کہ جہاں تک ممکن ہو سکے ہر مذہب کے روایتی علم کے گلستان اصول کو تعصب کے خاروں سے پاک کر دیا جائے، کیونکہ ہندوستان میں ہر مذہب کے اندر اختراعیں کی گئی ہیں اور ایسے ہزاروں ضابطے بنا لیے گئے ہیں جو ناپسندیدہ ہیں۔ اپنے اس دعوے کی حمایت میں اس نے اذان کا حوالہ دیا۔ اس نے یہ بتایا کہ حضرت محمدؐ کے زمانے سے ہر روز پانچ دفعہ اذان دی جارہی ہے، لیکن شعیہ اور سُنّی اپنے عقیدوں کی روایتوں کی بنا پر طریقۂ اذان کے بارے میں ایک دوسرے سے سخت اختلاف کرتے ہیں۔ اسی طرح بدارادہ لوگوں کو ان واقعات کے بیان کے وقت اپنے مخصوص احساسات اور جذبات کے اظہار کی بڑی گنجائش نکل آتی ہے، جو واقعات سابقہ فرمانرواؤں اور ان کی پالیسیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔[9]

ابتدا میں سات عالموں پر مشتمل ایک مجلس بنائی گئی جسے تاریخِ الفی تالیف کرنا تھی، اور جس کی تالیف کا آغاز 993ھ مطابق 1585ء میں کیا گیا۔ پہلے برس کا بیان نقیب خاں کے سپرد کیا گیا،[10] دوسرے کا شاہ فتح اللہ کے،[11] تیسرے کا حکیم ہمّام کے،[12] چوتھے کا حکیم علی کے،[13] پانچویں کا حاجی ابراہیم سرہندی کے،[14] چھٹے کا نظام الدین احمد کے[15] اور ساتویں کا مُلّا عبدالقادر بدایونی کے۔[16] یہ مجلس ہر نظریے کے علما پر مشتمل تھی۔ فی الحقیقت، اکبر نے یہ حُکم دیا تھا کہ تاریخِ الفی کی تالیف معروضیت اور تکمیل کے اعتبار سے نہایت اعلا درجے کی ہونی چاہیے۔ حضرت محمدؐ کی وفات کے بعد کے پہلے پینتیس برسوں کا بیان تالیف کے واسطے مندرجہ بالا ارکان مجلس میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ اکبر بذات خود اس کتاب کی تیاری پر نظر رکھتا تھا۔ مُلّا عبدالقادر بدایونی کہتا ہے:

"جس دوران میں ساتویں برس کے واقعات قلم بند کر رہا تھا، اور دوسرے سچے خلیفہ (خدا اُن پر راضی رہے) کی حیات تحریر کرنے میں مصروف تھا، ایک رات جب شہنشاہ نے کوہ کی تعمیر کا حال، قصر العمارات کی تعمیر اور تباہی کا حال جو اس کی تباہی کی

تفصیلات کے ساتھ بیان کیا گیا تھا، اور امیر المومنین علی (خدا ان پر راضی رہے) کی دختر، ام کلثوم کی شادی کا حال، اور اس کے ساتھ پنج وقتہ نماز کی ابتدا، شہر نصیبین کا زوال، اور مرغ کے برابر بچھوؤں کا حال سنا جو شہر کو تسخیر کرنے کے لیے استعمال کیے گئے تھے، تو اس نے بڑے اعتراضات اُٹھائے اور اسے سچ ماننے سے انکار کر دیا۔ آصف خاں ثالث، جو مرزا جعفر ہی کا دوسرا نام ہے، میری مدد پر آیا لیکن بڑے کمزور انداز میں، لیکن دوسری طرف سے ابوالفضل اور غازی خاں بدخشی نے میرے دعووں کی تائید کی۔ جب یہ پوچھا گیا کہ مجھے یہ معلومات کہاں سے حاصل ہوئی، تو میں نے جواب دیا کہ میں نے کتابوں میں دیکھا ہے، اور جیسا دیکھا ہے ویسا لکھ دیا ہے، یہ کوئی میری اپنی اختراع نہیں ہے۔ فوراً ہی روضۃ الاحباب اور دوسری کتابیں کتب خانے سے منگوائی گئیں، اور نقیب خاں کو دی گئیں کہ وہ اس بیان کی درستی کی تصدیق کرے، جو خدا کے فضل سے درست نکلا اور میں اختراع کے الزام سے بری ہو گیا۔"[17]

ایسا لگتا ہے کہ یہ مجلس اطمینان بخش طور سے کام نہ کر سکی، اور حکیم ابوالفتح کی سفارش پر مُلاّ بن نصراللہ دائی بولی ٹھٹوی کو حکم دیا گیا کہ چھتیسویں برس کے بیان کے بعد سے وہ کتاب کی تالیف کا کام کرے۔ اس سے کہا گیا کہ سادہ اور آسان زبان لکھے، اور حکم دیا گیا کہ کسی بانی سلطنت کا تعارف کراتے وقت یہ لکھنا ہرگز نہ بھولے کہ اس کے آباؤ اجداد کیا تھے نیز یہ کہ اسے کس طرح عروج حاصل ہوا۔[18] مُلاّ احمد نے تین سال کے عرصے میں 693ھ مطابق 1294ء (683 رحلت) تک کا حال مکمل کر دیا۔ اسے ۹۹۶ھ مطابق 1588ء میں مرزا فولاد بیگ برلاس نے قتل کر دیا اور آصف خاں جعفر بیگ کو حکم دیا گیا کہ کتاب مکمل کرے۔ اس نے غازان خاں (694ھ مطابق 1295ء تا 713ھ مطابق 1304ء) کے دورِ حکومت سے کتاب کا بیان شروع کیا اور کتاب میں ایک مختصر پیش لفظ کا اضافہ کیا جس میں اس نے کتاب کی تالیف سے اکبر کے مقاصد، مُلاّ احمد کے قتل، اس کے قاتل کی سزا، نیز مکمل کرنے کے واسطے کتاب اس کے سپرد کیے جانے کا مختصر حال لکھا۔[19] اس نے یقیناً 1000ھ مطابق ۹۲-۱۵۹۱ء

تک کا حال مکمل کر دیا ہوگا۔ لیکن جو نسخے موجود ہیں ان میں ۹۹۷ھ مطابق 89-1588ء کے بعد کا حال نہیں ملتا۔ بعد میں مُلّا عبدالقادر بدایونی کو حکم دیا گیا کہ مُصطفےٰ کاتب لاہوری کے ساتھ مل کر کتاب کا مختلف نسخوں سے مقابلہ کرے اور اس پر نظرِ ثانی کرے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس نے کتاب کی پہلی جلد پر بڑی عجلت سے نظرِ ثانی کی اور اس کی کاوشوں کو خوب سراہا گیا۔ اس کے بعد اسے حکم دیا گیا کہ دوسری جلد پر بھی نظرِ ثانی کرے کیونکہ، بقول اس کے، اس میں خاصہ مواد انتہائی تعصبانہ تھا۔ بدایونی کہتا ہے:

"ایک سال کے عرصے میں، میں نے کتابوں سے مقابلے کا کام خاصہ کر ڈالا، لیکن خود اپنے اندر تعصب کا اثر موجود ہونے کی وجہ سے، میں نے رسالوں کی ترتیب کے علاوہ کتاب میں کوئی دخل نہیں دیا، اور اصل متن میں کوئی تبدیلی نہیں کی، اور ایسا کرنے کا الزام اپنی تندرستی پر رکھا، ویسے خدا کو جو منظور ہو، مگر میری دُعا یہ ہے کہ میرے اس عمل سے کوئی مزید زخم نہ لگے۔ ان کتابوں کے سلسلے میں میری حالت اس شخص کی سی تھی جو کھجوروں میں پتھر ملا کر کھا رہا ہو، اور جب کوئی اس سے یہ پوچھے کہ، تم پتھر نکال کر پھینک کیوں نہیں دیتے تو وہ جواب دے کہ انھوں نے میرے لیے یہ مقدار مقرر کر دی ہے۔"[20]

ابتدا میں یہ کتاب تین جلدوں میں تقسیم تھی۔ پہلی دو جلدیں جو مُلّا احمد نے لکھی تھیں ان میں غازان خاں تک کا بیان تھا، اور تیسری جلد آصف خاں نے مکمل کی تھی۔[21] لگتا ہے کہ بدایونی نے غازان خاں کو چنگیز خاں سے گڈمڈ کر دیا۔ جو نسخے اب موجود ہیں وہ ابتدائی خاکے کے عین مُطابق نہیں ہیں، اور نقل نویسوں، جلد سازوں اور نسخوں کے مالکوں نے انھیں اپنی سہولتوں اور خیالوں کے مطابق جلدوں میں تقسیم کر دیا ہے۔[22] ابوالفضل، جو یہ دعوا کرتا ہے کہ کتاب کا پیشِ لفظ اس نے لکھا ہے، یہ کہتا ہے کہ "عالی جاہ جو نزہتہ تاریخ سے واقف ہو چکے ہیں، انھوں نے کئی صاحبِ علم مصنّفین کو ایک ایسی کتاب تیار کرنے کا حکم دیا جس میں وہ واقعات قلم بند کیے جائیں جو ہفت اقلیم میں پچھلے ایک ہزار برس میں وقوع پذیر

ہوئے ہیں۔ نقیب خاں اور کئی دوسروں نے اس تاریخ کا آغاز کیا۔ اس میں ایک بہت بڑا حصّہ بعد میں مُلّا احمد ٹھٹوی نے شامل کیا، اور پوری کتاب جعفر بیگ آصف خاں نے ختم کی۔ اس کی تمہید میں نے لکھی ہے۔ کتاب کا عنوان تاریخ الفی ہے، یعنی ہزار برسوں کی تاریخ۔[23] کتاب کے جو تھے نسخے موجود ہیں۔ ان میں سے کسی میں ابوالفضل کا لکھا ہوا پیش لفظ نہیں ہے۔ اگر کبھی وہ مِلا تو جہاں بھارت پر اس کے پیشِ لفظ کی طرح، اس پیشِ لفظ سے بھی کتاب کے خاکے پر خاصی نئی روشنی پڑے گی۔

لگتا ہے کہ مرزا جعفر بیگ آصف خاں نے کتاب مکمل کرلی تو فوراً بعد، اکبر ہی کے دورِ حکومت میں تاریخِ الفی کے وہ حصّے جن میں تیمور، مرزا خلیل، مرزا شاہ رخ، اُلغ بیگ، ابوالقاسم بابر، سلطان حسین مرزا، بابر، ہمایوں اور اکبر (984ھ مطابق 1577ء) کی تاریخ ہے، ایک الگ مسلسل جلد میں مرتب کرلیے گئے۔ شہنشاہ کے حکم سے ایک سو بارہ بڑی قلمی تصویریں شامل کی گئیں، جن میں سے بعض تصویریں دو مقابل صفحات پر بنی ہوئی ہیں۔ جو نسخہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، بانکی پور، پٹنہ میں محفوظ ہے اس کے شروع کے خالی ورق پر شاہ جہاں نے اپنی قلمی تحریر میں لکھا ہے کہ تیمور اور اس کے جانشینوں اور اکبر کے بائیسویں سال جلوس تک کا حال شاہ بابا (اکبر) کے زمانے میں لکھا گیا تھا۔[24] بعد میں کتاب کا نام تاریخ خاندانِ تیموریہ رکھ دیا گیا تھا۔

تاریخ الفی ان بہترین مآخذوں پر مبنی ہے، جو اس وقت موجود تھے۔ اس کی طرزِ فکر میں معروضیت اور اسلوبِ بیان میں سادگی پر خاص طور سے زور دیا گیا تھا۔ کتاب میں تاریخوں کی ترتیب کا سختی سے لحاظ رکھا گیا ہے۔ لاپرواہ نقل نویسوں نے اکثر اوقات رحلت کی تاریخ کو ہجری تاریخوں سے گڈمڈ کر دیا ہے۔ سر ایچ۔ ایم۔ ایلیٹ اور پروفیسر جون ڈاؤسن نے خاص طور سے اس طرف اشارہ کیا ہے: "لیکن تاریخِ الفی کی بابت جو ایک اور بڑا اعتراض کرنا ہے، وہ کتاب کے خاکے کے بارے میں ہے۔ اسے [?] ڈورس کی ہسٹوریکل لائبریری

کی طرح، سال وار واقعات کی شکل میں ترتیب دیا گیا ہے۔ لہٰذا، اگر ہمارا موضوعِ تحقیق کسی مخصوص ملک سے متعلق ہے تو وہاں کے واقعات کے مابین تعلق معلوم کرنے کے لیے ہمیں مجبوراً اس ضخیم تاریخ کے صفحے کے صفحے پلٹنے پڑتے ہیں۔ ایک نہایت عمدہ فہرستِ مضامین ہی اس عیب کو دُور کر سکتی تھی۔[25] ایلیٹ اور ڈاؤسن نے بجا طور پر یہ تحریر کیا ہے کہ تالیف کرنے والوں نے بظاہر ان تمام بہترین مآخذوں سے معلومات حاصل کی جو انھیں میسّر آسکے۔ انھوں نے نہایت قابلِ اعتبار دستاویزوں کا انتخاب کرتے وقت اور ان مَن گھڑت کہانیوں کو جن سے بہت سی دستاویزیں پُر تھیں رَد کرتے وقت بڑی مدبرانہ تنقید کی ہے۔[26] بدایونی نے اپنے مخصوص انداز میں تحریر کیا ہے کہ اکبر نے اس افسانوی مواد کو کتاب میں شامل کرنے کی اجازت نہ دی۔ کتاب کا ابتدائی حصّہ بحیثیتِ مجموعی زیادہ تر امیر جمال الدّین عطا اللہ بن فضل اللہ الحسینی الاشتکی الشیرازی (وفات 926ھ مطابق 1520ء) کی روضۃ الاحباب فی سیر النبی وال ولاصحاب پر مبنی ہے۔[27] یہ ایک ممتاز عالمِ دین تھا جو سلطان حسین (873 تا 911ھ مطابق 1469ء تا 1506ء) کے دَورِ حکومت میں ہرات میں کامیاب زندگی بسر کر رہا تھا۔ کتاب کی تیسری جلد ہندوستان کے علاؤ الدّین میں کسی صورت سے مقبول نہ ہوئی۔ بدایونی کہتا ہے کہ جب وہ شیخ ابو الفضل اور حاجی سلطان تھانیسوری کی معیت میں مخدوم الملک سے ملاقات کرنے گیا تو اس نے دیکھا کہ مخدوم الملک کے سامنے روضۃ الاحباب کی تیسری جلد تھی۔ انھوں نے ان لوگوں سے کہا، دیکھو، جن کی اس ملک میں لوگ اطاعت کرتے ہیں انھوں نے ایمان کو کتنا ضرر پہنچایا ہے، اور ذیل کا یہ شعر دکھایا جو حضرت علی کی شان میں لکھا گیا تھا:۔

خدا سے ان کی مشابہت کے لیے یہی ثبوت کافی ہے
کہ اُن پہ یہ شک کیا جاتا ہے کہ وہ خود خُدا ہیں۔[28]

انھوں نے کہا کہ مصنّف رفض[29] سے بڑھ گیا ہے، اور اس کی بے اعتقادی کا مسئلہ

حلول[30] کی حد میں داخل ہوگیا ہے۔ انھوں نے انھیں بتایا کہ وہ قطعی طور پر یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ کتاب کو کسی شیعہ کی موجودگی میں جلادیں۔ حالانکہ بدایونی پہلے کبھی مخدوم الملک سے نہیں ملا تھا، لیکن اس نے بڑی جرأت سے بتایا کہ یہ شعر ان اشعار کا ترجمہ ہے جو امام شافعی سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ مخدوم الملک اور بدایونی نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کی پُرجوش حمایت کی۔ مخدوم الملک نے مزید کہا کہ دوسرے جلد میں بھی ایسی عبارتیں موجود ہیں جن سے اس کتاب کے مصنف کا بدعتی اور بد اعتقاد ہونا ثابت ہوتا ہے۔[31]

نزاعی معاملات سے بچنا اور کٹر مذہبی لوگوں کے تعصب کا سامنا کرنا ممکن نہ تھا۔ مُلّا احمد[32]، جو ابتدائی حصّوں کا خاص مصنّف تھا، ایک پُرجوش شیعہ تھا۔ غالباً کٹر مذہبی لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے خیال سے ہی مُلّا عبدالقادر بدایونی سے کہا گیا تھا کہ مُلّا احمد کے لکھے ہوئے حصّوں پر نظرِ ثانی کرے۔

سلطان محمد بن تغلق، افغانوں، پندرھویں صدی کی صوبائی حکومتوں کے سلسلے اور سور سلسلہ حکومت کی تاریخیں ہر سال کے تحت تاریخ وار نہیں دی گئی ہیں، بلکہ انھیں مختلف مقامات پر تسلسل بیان کیا گیا ہے۔ دہلی کے سلطانوں کی تاریخ سے پورا انصاف نہیں کیا گیا ہے۔ بابر سے اکبر تک ہندوستان کے تیموری بادشاہوں کی تاریخ قدرے تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ بابر کا بیان خاص طور سے تزکِ بابری پر مبنی ہے، لیکن ہمایوں اور اکبر نیز ایران، وسطِ ایشیا اور ترکی کے بیانات اس معلومات پر مبنی ہیں جو شاہی محافظ خانے سے حاصل ہوئی تھی اور ممتاز امرا نیز دوسرے لوگوں کی زبانی شہادتوں کی بنا پر جمع کی گئی تھی مثلاً جوہر آفتابچی، بایزید بایات اور گل بدن بیگم کی تورکیں، جن میں ان اہلِ فضل کو بڑی مفید باتیں ملیں جو ہمایوں کے ادوار میں دلچسپی رکھتے تھے، غالباً تاریخ الفی تالیف کرنے والوں کو دستیاب نہ ہوسکیں۔ ایسا لگتا ہے کہ تالیف کرنے والوں کو محمد عارف قندھاری اور میر علاالدولہ کامی قازوینی کی کتابیں دستیاب ہوگئی تھیں، لیکن تاریخِ الفی کے آخری حصّوں میں اکبر کے

دَورِ حکومت کی پہلی سرکاری تاریخ دی گئی ہے، یہ حصّے خود شہنشاہ کی نگرانی میں تالیف کیے
گئے تھے۔ ہمایوں کے دَورِ حکومت پر نظام الدین احمد کا بیان زیادہ تر تاریخِ الفی پر مبنی
ہے، اور اکبر کے دَورِ حکومت پر بھی اس نے بہت کچھ مواد اسی سے اخذ کیا ہے۔ یہ کتاب اس
تناؤ کا نتیجہ ہے جس کا عکس مُلّا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ میں پوری طرح نظر آتا
ہے، لیکن اس میں ان معمولی جھگڑوں کو نظرانداز کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور لوگوں کو
زندگی کی ان نئی قدروں سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے تیار کیا گیا ہے جو اکبر کی "صلحِ کل" کی
پالیسی کی بنا پر برابر اہمیت حاصل کرتی جا رہی تھیں۔

بابر، ہمایوں اور اکبر سے تعلق رکھنے والے حصّوں میں ان بڑے بڑے واقعات کا
تفصیلی ذکر ہے جو ایران، وسط ایشیا اور ترکی میں رونما ہوئے، اور اس طرح یہ کتاب
ہمایوں اور اکبر کے درباروں کی سیاست اور پالیسیوں کو سمجھنے میں ایک نئے رُخ کا
اضافہ کرتی ہے۔ ہندوستان کی اہمیت پر غیر ضروری زور نہیں دیا گیا ہے، لیکن ایران اور
وسط ایشیا کی پالیسیوں میں اس ملک نے جو نمایاں رول ادا کرنا شروع کر دیا تھا وہ
تاریخ الفی کے بیانات سے خوب اچھی طرح جھلکتا ہے۔

حوالہ جات

1. Abul Fazl Akbar-nama, tr Beveridge, (Calcutta 1891-1921) Vol I, p 142
2. Badauni, Muntakhab-ut-Tawarikh, (Calcutta 1864 69) Vol III, p 35
3. Abul Fazl Ain-i-Akbari, trans Jarret, Vol III, p 380
4. Muntakhab-ut-Tawarikh, Vol III, p 380
5. Muntakhab-ut-Tawarikh, trans Lowe, Vol II, p-310
6. Ibid, p. 326

7۔ مرزا بدیع الزماں قاروینی والے مرزا قیام الدین جعفر بیگ 985ھ مطابق 1577ء میں ہندوستان آئے اور ان کے چچا مرزا غیاث الدین علی آصف خاں بخشی نے انھیں اکبر کے سامنے پیش کیا۔ وہ جامع ممتاز عالم اور آزاد خیال مفکر تھے۔ وہ 1012ھ مطابق 1612ء میں فوت ہوئے۔

8۔ ابوالفضل نے مہابھارت کے فارسی ترجمے کے پیش لفظ میں یہ لکھا کہ: "اکبر اپنی رعایا کے سارے طبقوں میں اصلاحات کرنے کا آرزومند تھا اور اس معاملے میں

دوست اور دشمن میں تمیز نہیں کرتا تھا۔ جب اس نے یہ دیکھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات بہت زیادہ بڑھے ہوئے ہیں، اور ان کے درمیان محبت اور مخالفت کی کوئی حد نہیں رہی ہے، تو اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ہر ایک مذہب کی مستند کتابوں کا اس کے حریفوں کی زبان میں ترجمہ کرائے، تاکہ دشمنی ختم کرکے وہ تلاشِ حق کی کوشش کریں۔ اور اس طرح اپنی اپنی کمزوریوں سے واقف ہوکر اپنی اصلاح کی کوشش کریں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہر مذہب میں ایسے بہت سے لاعلم لوگ رہے ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو بڑا عالم فاضل سمجھا ہے اور اعلا مصنّفین کی اصل کتابوں کو غلط طریقے سے پیش کیا ہے۔ عام لوگوں نے اس غلط بیانی کو مذہب کی اصل ترجمانی سمجھا اور اکثر گمراہ ہو گئے۔ اکبر نے ضروری سمجھا کہ لوگوں کو ایسے مذہبی محافظوں کے گندے منصوبوں کا شکار ہونے سے بچائے اور یہ فیصلہ کیا کہ اگر مختلف مذاہب کی کتابیں سادہ زبان میں ترجمہ کرلی جائیں تو لوگ خود ہی حق کو پہچان لیں گے۔" (ابوالفضل، مہابھارت کے فارسی ترجمے کا پیشِ لفظ، ذخیرہ لٹن، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)، ایف ۹، بی۔

9. Tarikh-i-Alfi (Bodlein 99/ousley 341), f. 333a

10. میر یحییٰ قاروینی (وفات 962ھ مطابق 1555ء) کا پوتا، میر غیاث الدین علی بن عبداللطیف قاروینی، لب التواریخ کا مصنّف، اس وقت اپنے والد کے ساتھ ہندوستان آیا جب اکبر تخت نشین ہو چکا تھا لیکن پنجاب سے رخصت نہیں ہوا تھا۔ (اکبر نامہ، جلد دوم، صفحہ 230) وہ جلد ہی شہنشاہ کا قریبی دوست بن گیا۔ وہی عموماً کتابیں پڑھ کر شہنشاہ کو سناتا تھا اور سنسکرت کی کتابوں کے فارسی ترجمے کے کام کی نگرانی کرتا تھا۔ وہ فن تاریخ نویسی کا ماہر تھا اور کہا جاتا ہے کہ اسے میر خواند کی روضۃ الصفا کی ساتوں جلدیں ازبر تھیں۔ جہانگیر بھی نقیب خاں کی خوبیوں کا بڑا

مداح تھا۔

11۔ میر فتح اللہ شیرازی نے ہندوستان آنے کے بعد، بیجاپور کے عادل شاہی سلسلے کے پانچویں بادشاہ، علی عادل شاہ اوّل (1557ء تا 1580ء) کی ملازمت اختیار کی۔ وہ ایک ممتاز ریاضی داں اور سائنسداں تھا۔ وہ ۹۹۱ھ مطابق 84-1583ء میں اکبر کی دعوت پر دربار شاہی میں پہنچا۔ اس کا نام بہت سی کلوں کی ایجاد سے منسوب کیا گیا ہے۔ وہ ۹۹۷ھ مطابق 89-1588ء میں کشمیر میں فوت ہوگیا۔

12۔ میر عبدالرزاق گیلانی کے بیٹے حکیم ہمام نے ۹۷۴ھ مطابق 67-1566ء میں ایران چھوڑا اور شہنشاہ کے دورِ حکومت کے بیسویں برس میں اپنے بھائی حکیم عبدالفتح کے ساتھ اکبر کے دربار میں پہنچا۔ اسے اکبر کا بڑا قرب حاصل تھا، اور شہنشاہ کے دورِ حکومت کے اکتسویں برس میں اسے بحیثیت سفیر صدر جہاں کے ساتھ توران بھیجا گیا تھا۔ وہ 6 ربیع الاوّل 1005ھ مطابق 9 نومبر 1595ء میں فوت ہوا۔

13۔ حکیم علی گیلانی اکبر کے دورِ حکومت میں ایران سے ہندوستان آیا۔ طب میں مہارت ہونے کی وجہ سے اسے جلد ہی اعلا مقام حاصل ہوگیا۔ شہنشاہ کے دور کے اُنتالیسویں برس میں اس نے ایک حیرت انگیز تالاب بنوایا، اس کا منصب بڑھا کر سات سو کر دیا گیا اور جالینوس الزماں کا خطاب عطا کیا گیا۔ آخری علالت میں اس نے اکبر کی تیمارداری کی۔ وہ 1018ھ مطابق 1609ء میں فوت ہوا۔

14۔ حاجی ابراہیم سرہندی اکبر کے دربار کے مشہور علمائے دین میں شمار ہوتا تھا۔ شہنشاہ کے ابتدائی دورِ حکومت میں اکبر پر اس کا بڑا اثر تھا۔ اور وہ مناظرے میں بڑا طاق تھا۔ بعد میں اسے ان علما کے ساتھ شریک رہنے کو کہا گیا جنھیں سنسکرت کتابوں کو فارسی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ وہ ۹۹۴ھ مطابق 1609ء میں رنتھمبور کے مقام پر فوت ہوا۔

15۔ محمد مقیم ہروائی کا بیٹا نظام الدین احمد اکبر کے دورِ حکومت کے سینتیسویں برس میں گجرات کا بخشی مقرر کیا گیا' اور 23 صفر 1003ھ مطابق 6 نومبر 1594ء کو فوت ہوگیا۔ وہ طبقاتِ اکبری کا مصنف تھا جو اس نے 1001ھ مطابق 93-1592ء میں مکمل کر لی تھی لیکن بعد میں اس نے 1002ھ مطابق 94-1593ء تک اکبر کے دورِ حکومت کا بیان اور قلم بند کر دیا۔

16۔ عبدالقادر' قادری" بن ملوک شاہ بن حامد بدایونی 'منتخب التواریخ کا مشہور مصنف' اکبر کے دارالترجمہ کا ایک سرگرم رکن تھا اور بہت سی کتابوں کی تالیف اور ترجمے میں شریک تھا۔

17۔ Muntakhab-ut-Tawarikh, trans Lowe, Vol II, p 328

18۔ Tarikh-i-Alfi, (British Museum) Riu 1186 – 119a Or 142f 498a

19۔ Tarikh-i-Alfi, (Bodleian 99) ff 332b – 33a, British Museum, Or 465, f 97a

20۔ Muntakhab-ut-Tawarikh, trans Lowe, Vol II, p 407

21۔ Ibid, pp 328 – 406

22۔ C A Storey / Persian Literature, A Bio-Bibliographical Survey (London, 1935) pp 120–121, A Halim / "Some Indian Collections of the Tarikh-i-Alfi, Indian Historical Records Commission Proceedings, Vol, 18 (1942),

pp. 108–113

مندرجہ بالا مقالے میں وہ دستاویزیں شامل نہیں کی گئی ہیں جو سر سالار جنگ لائبریری حیدرآباد میں موجود ہیں۔

23. H Blochmaun, English Translation of Ain-i-Akbari (Calcutta, 1927) Vol I, p 113

24. Manlvi Abd-ul-Maqtadir, Catalogue of the Arabic and Persian Maunscript in the Oriental Public Library at Bankipore (Patna, 1921) Vol VII, pp 40–48

25. Elliot and Dowson, the History of India as told by its own Historians, Vol V, p 156

26. Ibid, pp 156–157

27۔ یہ کتاب ۹۰۰ھ مطابق 95-1494ء میں مکمل ہو گئی تھی۔ یہ تین مقصدوں (جلدوں) میں تقسیم کی گئی ہے۔

(۱) حضرت محمدؐ

(2) پہلے تین خلیفہ

(3) علی اور بارہ امام

28۔ ہمی بس بود حق نمائے رو

کہ کردند شک در جدائے رو

29۔ شیعہ ہونے کے ناطے

30۔ تناسخ الارواح کا عقیدہ

Muntakhab-ut-Tawarikh, Vol III, pp 70-71, Eng- .31

-lish trans by Sir Wolseley Haig, pp 114-116.

32۔ ملا احمد بن نصر اللہ دائی ٹولی ٹھٹوی اپنی ابتدائی عمر میں شیعہ ہوگئے تھے۔ انھوں نے شہد

یرد اور شیراز میں تعلیم پائی۔ اکبر کے دربار میں (۹۸۹ ھ مطابق) آنے سے پہلے وہ گولکنڈہ

کے قطب شاہ کے دربار میں ملازم رہے۔ وہ ۹۹۶ ھ مطابق 1588ء میں بمقام ' لاہور

قتل کر دیے گئے۔

44
17
—
27

شیخ ابوالفضل

نعمان احمد صدّیقی

دورِ وسطیٰ کے ہندوستان میں جس تاریخ نگاری نے اربابِ علم وفضل کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی جن اربابِ علم وفضل نے اسے دوسروں سے الگ بذاتِ خود ایک مضمون سمجھ کر پسند کیا اور اس کی تربیت کی۔ ان میں سے بعض، جیسے ضیاالدّین برنی، نظام الدّین احمد، عبدالقادر بدایونی، محمد قاسم فرشتہ اور خفی خاں بڑے ممتاز مورّخ تھے اور انھوں نے دورِ وسطیٰ کے فنِ تاریخ نگاری کو بہت کچھ دیا۔ وہ تاریخ نگاری کی پرانی روایتوں سے متاثر تھے، لیکن اپنی ذاتی تعلیمی تربیت اور کمالات، نیز اپنی سماجی حیثیت اور مذہب نیز سیاست کے بارے میں اپنے مخصوص نظریات، کی بنا پر، انھوں نے فنِ تاریخ نگاری میں اپنی راہ خود اختیار کی۔ ان سب میں ابوالفضل، بہرحال، ایک ممتاز حیثیت کا مالک ہے اور اس نے دورِ وسطیٰ کی تاریخ نگاری کی روایتوں پر اپنا ایک نقش چھوڑ دیا ہے۔

اس کو خاص طور سے ممتاز مورّخ کا خطاب دینے کا اصل سبب یہ ہے کہ اس کی تحریروں پر عقلی عنصر غالب تھا، اس نے مذہبی اور تہذیبی روایتوں کی طرف نہیں، بلکہ بڑے نمایاں طور سے دلیلوں کی طرف توجہ مبذول کرائی، تاریخ کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر زیادہ وسیع تھا۔ اس نے اپنے زمانے کی تاریخ کی ترجمانی اس دور کی سیاسی اور انتظامی حقیقتوں کی روشنی میں کرنے کی کوشش کی۔ اس نے تاریخ نگاری کے ایک نئے طریقے کو اپنایا جس کا اطلاق اس

، اپنی تحریروں پر کیا، اور اس کی نثر کا ادبی اسلوب سب سے جدا اور بڑے اعلا درجہ کا تھا۔ آخری
ور بحیثیت مورّخ اس کا سب سے نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ وہ اکبر نامہ اور آئینِ اکبری کے صفحات
کے ذریعے اکبر کی عظمت کو ایک نمایاں اور ٹھوس شکل دینے میں کامیاب ہو گیا۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ برنی اور بدایونی اپنے زمانے کی اس رُوح، جس کو وہ ظاہر کرنا چاہتے
تھے، کی گرفت کرنے میں اس پر سبقت لے گئے۔ اس طرح نظام الدین احمد اور فرشتہ زیادہ
کامیاب مورّخ مانے جا سکتے ہیں، کیونکہ انھوں نے اپنے موضوعات کے بارے میں غیر جانبدارانہ
رویہ اختیار کیا، اور حقائق کو زیادہ معروضی طور سے وضاحت کے ساتھ تحریر کیا۔ یہ ماننے میں
بھی کسی کو جھجک نہیں ہونی چاہیے کہ حقی جان بجا طور پر اس کی تعریف کا مستحق ہے "کہ اس نے
ان حالات کو سمجھ لیا اور تحریر کر دیا جن کی بنا پر سماج میں یا انتظامی اداروں میں تبدیلی آئی،
اور اس نے ان تعلّقات کو بھی سمجھ لیا جو سماج اور انتظامی اداروں میں پائے جاتے تھے۔ ہو
سکتا ہے کہ ابوالفضل میں بحیثیت مورّخ یہ خوبیاں نہ ہوں۔ لیکن اس کے علاوہ دورِ وسطیٰ کا
کوئی مورّخ یہ دعوا نہیں کر سکتا کہ تاریخ کی بابت اس کا رویہ عقلی اور معروضی تھا، اور اس
نے حقائق جمع کر کے تنقید و تحقیق کی بنیاد پر انھیں ترتیب دینے کا نیا طریقہ اپنا لیا تھا۔ یہی
باتیں ابوالفضل کی تاریخی تحریروں پر مہرِ تصدیق کی طرح ثبت ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس نے کثیر تعداد میں ایسے حقائق تحریر کرکے، جن کا تعلق سیاسی،
سماجی، اقتصادی اور تہذیبی زندگی سے تھا، اور انتظامی ضابطوں، نیز کارروائیوں اور
مختلف صوبوں کے جغرافیائی حالات پر ابواب شامل کرکے، تاریخ کا دائرہ اور زیادہ وسیع
کر دیا۔ اس نے بڑی جان فشانی سے مواد جمع کیا، اور بڑی احتیاط کے ساتھ تحقیق و تفتیش
کرنے کے بعد وہ حقائق اکٹھے کیے جو اہم تھے، اور پھر انھیں واضح اور باضابطہ انداز میں پیش
کیا۔ اس نے ہر مآخذ کے صحیح ہونے پر شک کیا، اور اسی وقت اُسے تسلیم کیا جب وہ تاریخی
تفتیش کے ان اصولوں پر پورے اترے جو اصول خود اس نے وضع کیے تھے۔ دوسرے

لفظوں میں یہ کہنا چاہیے کہ اس نے تاریخ کے ادراک اور اس کی ترجمانی کے لیے ایک نئی بولی تحقیق کی اس کی وسعت اور رسائی میں اضافہ کیا، اور تاریخی تحقیق کے اصول مرتب کیے۔
اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابوالفضل کی تحریروں میں ہمیں ایک فلسفۂ تاریخ ملتا ہے، یعنی تاریخ کے مزاج اور مقصد کے بارے میں ایک ٹھوس تصور ملتا ہے، تاریخ کی ترجمانی کے اصول ملتے ہیں اور تاریخی حقائق جمع کرنے اور انتخاب کرنے کا تنقیدی ساز و سامان ملتا ہے۔

بحیثیت مؤرخ ابوالفضل کے جن کارناموں کا خلاصہ مندرجہ بالا سطور میں کیا گیا ہے وہ کسی بھی معیار سے مؤثر ہیں۔ بہرحال جب ہم بحیثیت مؤرخ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کر رہے ہوں تو ہمیں اس کی بعض محدودات کو نظر میں رکھنا چاہیے۔ اس کی محدودات کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ اکبر کا منہ لگا درباری اور لائقِ اعتبار معتمد تھا، اس کی تاریخ سرکاری نوعیت کی تھی۔ خواہ یہ دکھاوا ہو یا حقیقت لیکن وہ اکبر کو انسانِ کامل اور مثالی بادشاہ سمجھ کر اس کی تعظیم کرتا تھا۔ ایک ایسا درباری اور سرکاری مورّخ ہونے کے ناطے جو اکبر کے لیے جذباتِ تعظیم رکھتا ہو، ابوالفضل اس کے سوا اور کیا کر سکتا تھا کہ اس کی سرگرمیوں، پالیسیوں اور اقدامات کی حمایت اور تعریف کرے۔ اس جوش میں کہ اپنے ہیرو کو کامل اور مثالی بادشاہ ظاہر کرے وہ اکثر دلیل، اعتدال اور ضبط کے احکامات نہیں سن پاتا۔ اسی بنا بر اس کا بیان نہ صرف جانبدارانہ ہو گیا ہے بلکہ بعض اوقات گھٹ کر قصیدہ گوئی بن گیا ہے۔

ابوالفضل شیخ مبارک کا بیٹا، 14 /جنوری 1551ء کو بمقام آگرہ پیدا ہوا تھا۔ اسے غیر معمولی ذہانت عطا ہوئی تھی، اور اوائل عمری ہی میں قبل از وقت دماغی نشوونما کی علامتیں ظاہر ہو گئی تھیں۔ اس نے اپنے والد کی نگرانی میں تعلیم حاصل کی؛ جو اس زمانے کے نہایت باکمال علما میں ہوتے تھے۔ شیخ مبارک کے علم و فضل، ان کی وسیع النظری نیز آزاد خیالی اور صوفیانہ طریقۂ زندگی سے لگاؤ کے باعث ان کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ ابوالفضل پر شیخ مبارک کی شخصیت کی چھاپ بڑی گہری اور دائمی تھی۔ ابوالفضل نے پندرہ سال کی

چھوٹی عمر میں علم کی ان ساری شاخوں پر قدرت حاصل کر لی تھی جنھیں منقول کہا جاتا تھا بیس سال کی عمر میں اس نے خود درس دینا شروع کر دیا تھا۔

سب اہم واقعہ جس نے ابوالفضل کے مذہبی اور سیاسی نظریے پر بڑا گہرا نقش چھوڑا وہ طویل اذیت تھی، جو اُسے اور اس کے خاندان کو طاقتور علما کے ہاتھوں اُٹھانی پڑی۔ شیخ مبارک پر مہدوی بلکہ شیعہ ہونے کا شبہ کیا گیا۔ لیکن ابوالفضل اپنے والد کے خلاف ان الزامات کی تردید کرتا ہے! یہ اذیت تقریباً دو دھائیوں تک جاری رہی، اور اس کے خاندان کو مفروروں کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا، جن سے نہ کوئی دوستی کرتا تھا نہ پناہ دیتا تھا۔ بہرحال، 1570ء کی دھائی کے ابتدائی برسوں میں تکلیف کے دن ختم ہوئے۔ 1574ء میں اکبر نے اس خاندان کو بلایا اور اپنی حفاظت اور سرپرستی میں رکھا۔ خود ابوالفضل کو 1974ء میں فیضی کے بھائی کی حیثیت سے اکبر کے سامنے پیش کیا گیا، جس نے اسے عنایتِ خاص سے نوازا۔ کچھ عرصے کے بعد ابوالفضل نے ایک درباری کی حیثیت سے شہنشاہ کی ملازمت اختیار کر لی۔

ایسا لگتا ہے کہ شہنشاہ کی ملازمت اختیار کرنے کا فیصلہ کرنے سے پہلے ابوالفضل ایک شدید اور گہری ذہنی کشمکش میں گرفتار رہا۔ وہ اس بات پر غور کرتا رہا کہ درباری بننے میں کیا دانائی اور معقولیت ہے۔ اس زمانے میں صوفیوں اور دانشوروں کی روایتیں شاہی ملازمت کے سخت خلاف تھیں۔ ابوالفضل کے ذہنی میلانات اور غور و فکر نیز مراقبے کے ذریعے بنیادی سچائی کے حصول کی آرزو نے اس کے اس عزم کو مزید تقویت پہنچائی کہ ایک فلسفی اور تارک الدنیا کی طرح زندگی گزارے۔ ایک درباری کی زندگی ابوالفضل کی روحانی آرزوؤں سے تعلق رکھنے والی روایت کے بکسر خلاف تھی۔ بہرکیف، شیخ مبارک اور فیضی کے مستقل اصرار، اور ساتھ میں دنیاوی ترقی کی توقعات اور امکانات نے اس کشمکش کو ختم کر دیا۔ ابوالفضل کو آمادہ کر لیا گیا کہ وہ ایک درباری کی غلامانہ زندگی

قبول کرے۔[2] یہ اس کی زندگی اور ترقی میں نقطۂ انقلاب ثابت ہوا۔ اس کا شا[illegible]
کم رفتار سے طویل مدت میں بڑھا۔ اس نے اپنی ترقی بیس کے منصب [illegible]
1585ء میں یہ منصب بڑھ کر ایک ہزار ہو گیا۔ آخر کار اسے پانچ ہزار کا [illegible]
لیکن اسی سال اگست 1602ء میں وہ شہزادہ سلیم کی سہ پر قتل کر دیا گیا۔

ابوالفضل کی ترقی کی خاص بات وہ منصب نہیں جو اسے حاصل ہوا، بلکہ وہ بڑھا ہوا اثر ہے جو اس نے پالیساں بنانے اور انھیں نافذ کرنے کے سلسلے میں شہنشاہ پر قائم کر لیا تھا۔ ابوالفضل نے سب سے اہم رول یہ ادا کیا کہ مذہبی مباحثوں کو بڑے سلیقے سے کٹّر علما کے خلاف استعمال کیا اور ان مباحثوں سے فائدہ اُٹھایا۔ علما نے شیخ مبارک کے خاندان کو حس اذیت میں مبتلا رکھا تھا۔ اس کا نقش شیخ اور اس کے بیٹوں پر ایسا لگا تھا جو کبھی نہ مٹ سکتا تھا۔ اسی بنا پر وہ علما کے مخالف ہو گئے تھے۔ ابوالفضل اور فیضی نے بڑی مہارت کے ساتھ اس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھایا (اپنی اعلا دلیلوں اور وسیع علم کی مدد سے علما کو اکبر کی نظروں سے گرا دیا۔ اور بالآخر انھیں مقام اقتدار سے گرا دیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہی وہ مدرسہ آفات تھا جہاں ابوالفضل [illegible] نے وفاداری کا سبق سیکھا۔ جس کی وجہ سے اس کے سماجی اور مذہبی خیالات میں ایک گہری تبدیلی آ گئی۔ یہی اکبر سے دوستی کی بنیاد بنی، اور اُس نے ابوالفضل کو ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں ایک نیا تصور عطا کیا۔ مذہبی رواداری کا خیال اس کی تحریروں میں موجود ہے۔ مزید یہ کہ، اسی مدرسۂ آفات نے اسے تحریک دلائی کہ اپنی تخلیقات کے سلسلے میں غیر معمولی کاوشیں کرے، جو بعد میں اس کے لیے بڑی مفید ثابت ہوئیں، اور اپنی مخالفت کو کامیاب کرنے نیز کٹّر علما کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں مددگار ثابت ہوئیں۔

(1575ء اور 1585ء کی درمیانی دھائی اکبر کے دورِ حکومت کا نہایت ہنگامہ خیز، اور اسی کے ساتھ نہایت تشکیلی دور تھا۔ اکبر کے سامنے ایسے سیاسی، انتظامی اور مذہبی مسائل

ے جو نہایت اہم اور نتیجہ خیز تھے۔ مذہبی مسائل اور مُسلم برادری میں فرمانروا کی حیثیت پر بڑے پُرجوش مباحثے ہوئے۔ عبادت خانے کے مذہبی ساتھیوں نے تنقیدی تحقیق کی قوتوں کو آزاد کر دیا (ابوالفضل نے دلیل اور مذہبی رواداری کی حمایت کا بیڑا اُٹھایا۔ بالآخر اس مخالفت نے جس کی قیادت ابوالفضل اور حمایت اکبر کر رہا تھا، کٹر علما کو مکمل طور سے غیر مسلح کر دیا۔ وہ یہ ماننے پر مجبور ہو گئے کہ اکبر کی حیثیت مجتہد یا امامِ عادل کی ہے یعنی وہ مُسلم برادری کا ایسا قائد ہے جس سے کوئی خطا سرزد نہیں ہو سکتی، اور وہ مُسلم قانون اور مذہب کے نزاعی مسائل کی تشریح کے معاملے میں سند آخر ہے) کٹر علما کو بااثر عہدوں اور مقامات سے محروم کر دیا گیا۔ انھیں مذہبی معاملات کے انتظام میں جو کلیدی حیثیتیں حاصل تھیں وہ انھوں نے چھوڑ دیں۔ سخت اصلاحات کی وجہ سے صدر کی قوت اور وقار گھٹ گیا، اور مدد معاش پانے والے لوگ جو کٹر علما کے بڑے سرگرم حامی تھے ان کا سیاسی اور اقتصادی استحکام بالکل ختم ہو گیا۔ اس طرح ابوالفضل بالآخر اپنے نظریاتی اور ذاتی مخالفین پر فتح یاب ہو گیا۔

کٹر لوگوں کے زوال میں اس نے جو رول ادا کیا اس کے محرکات میں ذاتی اسباب کے ساتھ اس کا یہ یقین بھی شامل تھا کہ کٹر لوگ متعصب ہوتے ہیں، روایت کی اندھی تقلید کرتے ہیں اور ان لوگوں پر جبر کرتے ہیں جو ان سے اختلاف کرتے ہیں۔ جن اصولوں کی اس نے حمایت کی اور علما سے لڑا، وہ اس کی تحریروں میں مختلف موقعوں پر کبھی اتفاقاً اور کبھی خصوصاً اور تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ جو چیز موجودہ مباحثے کے واسطے اہم ہے وہ یہ ہے کہ مذہبی مناظروں میں اس کی شرکت نے مذہب اور سیاست کے بارے میں اس کے نظریات کی وضاحت کر دی، اور بعد میں یہی نظریات بار بار اس کی تحریروں میں نظر آئے۔ ایک اور چیز اس کی تاریخی تحریروں پر اثر ڈالا، اس کی فاضلانہ تربیت و مزاج اور فلسفیانہ غور و فکر کو ترجیح دینے کی عادت تھی۔ اس نے اسے ترغیب دی کہ ان چیزوں کے مقابلے میں جو حقیر اور معمولی لگتی ہوں۔

اں چیزوں کا انتخاب کرے جو اہم اور سنجیدہ ہوں۔ چنانچہ اس کی تحریریں تعلیمات اور فلسفیانہ خیالات سے بھری ہوئی ہیں، اور اس کے فنِ تاریخ نگاری کا ایک حصہ ہیں۔ اس کے ذہنی میلان نے بھی بڑی حد تک اس کا اسلوبِ بیان بنایا اور اس کی ادبی قدر و قیمت طے کی۔ اس نے جیسا کہ اکبر نامے میں بیان کیا ہے، معدودے چند لوگوں کے لیے لکھا۔ اسے اس سے غرض نہ تھی کہ اس کے زمانے کے عقلا کی اکثریت اس کی زبان اور اسلوب سمجھ سکے۔

ابوالفضل کے سیاسی اور مذہبی نظریات دو باتوں کی وجہ سے لائقِ توجہ ہیں۔ پہلی بات یہ کہ ان ہی کی بنا پر اس نے اہم تاریخی حقائق کا انتخاب کیا۔ دوسری بات یہ کہ انھوں نے مضامین کے اندازِ بیان پر اثر ڈالا۔ یہ سچ ہے کہ ابوالفضل نے ہر حقیقت کی بڑی احتیاط سے تصدیق کی لیکن حقائق کا انتخاب اور ان کی جانچ پڑتال پیش کرنے کا انداز، یہ دونوں ہی چیزیں اس نظریے کے رنگ میں رنگ گئیں جو نظریہ اس نے وقت کے سیاسی اور مذہبی مسائل کے بارے میں قائم کیا تھا۔

ابوالفضل یہ اصول مان کر چلتا ہے کہ بادشاہ بنیادی طور پر مقدس ہوتا ہے۔ یہ وہ روشنی ہوتی ہے جو خود خدا سے پھوٹتی ہے۔ بادشاہ کو ایسا مقام بغیر کسی شفاعت اور استحقاق کے خدا کے فضل و کرم سے نصیب ہوتا ہے۔ سماج کی مخالف قوتوں کو قابو میں رکھنے کے لیے یہ ادارہ ضروری بھی ہے اور پسندیدہ بھی۔ اس ادارے کی غیر موجودگی میں سماج کی وہ قوتیں جو ایک دوسرے کی مخالف ہیں خود کو برباد کرنے والی جدوجہد میں پڑ کر تباہ ہو جائیں گی۔ لیکن بادشاہت بادشاہ کے ہاتھوں میں کھلونا نہ بننا چاہیے۔ جس سے اُسے ذاتی تسکین، مادّی عیش اور ہوسِ قوت و وقار ملے۔ اس کے برخلاف بادشاہ کو چاہیے کہ خود کو اپنے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دے۔[3] اُسے چاہیے کہ ایسی دنیا میں جو مخالف قوتوں سے پُر ہے، نظم و ضبط قائم کرے۔ بادشاہ کو منصف مزاج، عقل مند اور بہادر ہونا چاہیے، اور اس میں بڑی جسمانی قوت ہونی چاہیے۔ رواداری، وسیع النظری اور قوی احساسِ عدل وہ

خوبیاں ہیں جو ایک مثالی بادشاہ میں ہونا ضروری ہیں۔ ابوالفضل کے لیے یہ بات بڑی باعث اطمینان تھی کہ اسے اکبر کی ذات میں ایسا مثالی بادشاہ مل گیا۔ اس سے زیادہ یہ کہ اکبر میں وہ خوبیاں بھی موجود تھیں جو لوگوں کی مذہبی اور دُنیاوی دونوں طرح کی حاجتیں پوری کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔

اکبر جو اتحاد، استحکام اور اچھی حکومت کی ان قوتوں کا نمونہ تھا جو قوتیں معاشی خوشحالی، امن و سلامتی، مذہبی آزادی اور سب کے رواداری کی ضامن تھیں۔ اس اکبر کی قیادت میں مغل سلطنت کی قدر و قیمت کا جو اندازہ ابوالفضل نے کیا وہ فطری طور پر اس کے بنیادی، سیاسی نظریات کا نتیجہ تھا۔ مندرجہ بالا سطور سے فطری طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لوگوں کی مذہبی، سیاسی اور معاشی ضرورتوں کے پیشِ نظر توسیعِ سلطنت کی پالیسی نہ صرف ضروری تھی بلکہ امن پسند بھی تھی۔ لہٰذا ابوالفضل کے وہ سیاسی نظریات جو بار بار اس کی تحریروں میں بیان کیے گئے ہیں، مغلوں کی توسیعِ سلطنت کی پالیسی کا اخلاقی یا عقلی جواز فراہم کرتے ہیں۔

ابوالفضل کے مذہبی نظریات اس کے ہمعصروں کی طرح مغل تاریخ کے طالب علموں کے لیے بھی ایک معمہ ہیں۔ ابوالفضل کے بارے میں اس کے ہمعصروں کے خیالات کا خلاصہ معاصر الامراء کے مصنف نے پیش کیا ہے۔[4] خانِ اعظم نے ایک مادۂ تاریخ میں اسے باغی رسول کہہ کر پکارا ہے۔ ابوالفضل کے بارے میں جہانگیر کی بھی یہی رائے تھی۔ عام خیال یہ تھا کہ ابوالفضل ملحد تھا۔ اس پر الزامات تھے کہ وہ ہندو تھا، آتش پرست تھا، لادین تھا اور دہریہ تھا۔ بہرحال معاصر الامراء کے مصنف کے مطابق یہ کہنا زیادہ دُرست تھا کہ وہ "صلح کل" میں یقین رکھتا تھا اور آزاد مفکر تھا جو ہر مذہب کو اچھا مانتا تھا۔ المارۂ عباسی کے مصنف نے اسے نقطوی کہا ہے۔[5] عرفی کے خیال میں یہ دونوں بھائی لوگوں کو ارتداد کی راہ پر ڈالنے کے ذمہ دار تھے۔ ابوالفضل خود یہ اعتراف کرتا ہے کہ اس نے "صلح کل" کی راہ اختیار کر لی تھی۔[6] آئین اکبری

میں ایک جگہ اس نے اپنے بارے میں موافق اور مخالف دونوں طرح کے ہمعصروں۔ رجب ویل
نظریات کا حوالہ دیا ہے۔ یہ حوالہ اس لائق ہے کہ درا تفصیل سے نقل کیا جائے۔

"حالانکہ مبارک کا بیٹا آج کل سببِ آزردگی ہے اور اسے نوعِ انسانی کے لیے خطرہ سمجھا جاتا ہے، اور اس کے بارے میں محبت اور نفرت کے جھگڑے کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، لیکن اللہ کے ماننے والے جو حق کے متلاشی ہیں اسے ابوالوحدت کا لقب دیتے ہیں اور رازقِ اعلیٰ کا خادم مثالی سمجھتے ہیں۔ میدانِ شجاعت کے سورما اسے ابوالہمت گردانتے ہیں اور دنیا وہ معاملات میں اس کی نفس کشی کو عجائبات میں شمار کرتے ہیں۔ دانائی اسے ابوالفطرت کہتی ہے اور اسے خانۂ برتر کا نادر نمونہ خیال کرتی ہے۔ باراری ریوڑ کی ان تحریروں میں جو جہلائے پرشور بازاری اڈوں کے مصداق ہیں، کچھ لوگ اس سے دنیا داری کو منسوب کرتے ہیں اور اسے ان لوگوں میں شمار کرتے ہیں جو اس گرداب میں پھنس چکے ہیں، جبکہ کچھ اور لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ تشکک اور اتداد کا شکار ہو چکا ہے، اور یہ سب لعنت ملامت کرتے وقت ایک ہو جاتے ہیں۔

"میرے بارے میں سیکڑوں افواہیں اُڑائی جاتی ہیں اور اگر میں جواب میں ایک لفظ بولتا ہوں تو ساری دنیا تکنے لگتی ہے۔ بحمداللہ زندگی کے عجیب نشیب و فراز پر نظر رکھنے کی وجہ سے میں ان لائقِ تعظیم رجحانات سے درا نہیں ہٹتا، نہ ان دونوں کے حق میں دعائے خیر سے منہ موڑتا ہوں جو الزام دیتے ہیں اور جو تعریف کرتے ہیں، اور اپنی زبان تعریف یا ملامت سے آلودہ نہیں کرتا۔"[7]

(اکبرنامہ اور آئینِ اکبری کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ عقلیت پسند اور آزاد مفکر تھا۔ وہ بالآخر دلیل کی طرف توجہ مبذول کراتا تھا۔ وہ ان کا مذاق اُڑاتا ہے جو روایتوں یا رواجوں کی طرف توجہ دلاتے تھے یا ان رایوں کی طرف توجہ دلاتے تھے جو مذہبی کتابوں میں

دی گئی ہیں۔ وہ انھیں تقلیدی کا لقب دیتا یعنی پُرانی روایتوں اور نصیحتوں کو ماننے والے لوگ۔ وہ انھیں بے وقوف اور جاہل سمجھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کٹّر علما، تقلیدی تھے، کیونکہ وہ پُرانی روایتوں اور مقدّس قانون نیز عملِ رسول کی طرف توجّہ مبذول کراتے تھے۔ وہ یہ نہیں سمجھ پائے کہ وقت کے ساتھ مذہب اور قانون کی کتابوں میں دی ہوئی سچّائی فرسودہ اور متروک ہو چکی۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ لگتا ہے کہ ابوالفضل خاصہ مذہبی آدمی رہا۔ یہ بیان کرنا مشکل ہے کہ خدا اور دوسرے مذہبی تصوّرات کے بارے میں اس کے قطعی نظریات کیا تھے۔ لیکن اس کی تحریروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک خدائے واحد میں یقین رکھتا تھا اور صوفیوں نیز ان کے رُوحانی جوہروں کی قدر کرتا تھا۔ مذہبِ ظاہری اور اس کے قانون نیز مذہب کی بنیاد پر بننے والے سماجی رواجوں کی قدر وہ بادلِ ناخواستہ کرتا تھا، اور ایک طرح سے اس کا مذاق اُڑاتا تھا۔ لہٰذا مسلمان عام طور پر اور کٹّر لوگ خاص طور پر یہ شبہ کرتے تھے کہ وہ اسلام پر ایمان نہیں رکھتا ہے۔ بہرکیف اس کے خلاف دہریہ ہونے کا الزام دلیلوں سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ وہ خدائے واحد میں یقین رکھتا تھا لیکن مذہبِ ظاہری کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا، اور مذہب کے روحانی عنصر پر زور دیتا تھا۔ مذہبی نظریات کی بنا پر کٹّر لوگوں سے اس کا سیدھا ٹکراؤ لامحالہ ہو گیا۔ اس مقابلے میں بالآخر ابوالفضل جیتا۔ لیکن اس صورت سے کہ علما اور مسلمانوں کی اکثریت اس کے خلاف ہو گئی۔ وہ اسلام، رسول، روایت اور مسلم قانون کا دُشمن مشہور ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ سماج میں اس کی حیثیت ایسی نہ تھی جس پر لوگ رشک کرتے، چنانچہ وہ مجبور ہو گیا کہ آئینِ اکبری اور اکبر نامہ میں اپنے نظریاتی موقف کی تشریح و توضیح کرے اور اسے حق بجانب ثابت کرے۔ چنانچہ اس کی کتابوں میں مذہبی آزاد خیالی پر، "صلحِ کل" کے اصول پر، اور روایت کے مقابلے میں دلیل کی برتری پر مباحثے ملتے ہیں۔

مذہب کے بارے میں اس کی آزاد خیالی آئینِ اکبری کی ایک عبارت میں دی ہوئی

ہے، جس کا عنوان ہندوستان کے لوگوں کی حالت ہے۔ اس عبارت کے خاص نکات کا مندرجہ ذیل خلاصہ کیا جا سکتا ہے:

(۱) ہندو اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی تلخی اور مخالفت کا اصل منبع یہ خیال تھا کہ ہندو شرک کرتے تھے، یعنی خدا کی صفات انسانوں اور ان کے بتوں سے منسوب کرتے تھے۔ ابوالفضل پُر زور لفظوں میں کہتا ہے کہ ہندوؤں کے خلاف یہ الزام بے بنیاد تھا۔ بڑی احتیاط سے تحقیق و تفتیش کرنے پر یہ ظاہر ہوا کہ ہندو ایک خدا کے تصور کے حامی تھے۔

(2) اس کے باوجود غلط فہمی کی جڑیں بہت گہری تھیں اور اس بنا پر بڑی شدید مخالفت رہی بلکہ قتل و خون بھی ہوا۔

(3) اس غلط فہمی کے بہت سے اسباب تھے۔

(ا) ایک دوسرے کی زبان اور طریقۂ فکر کے بارے میں قطعی لاعلمی۔

(ب) تحقیق و تفتیش کے ذریعے اندرونی سچائی کو پہنچانے کے بارے میں اکثریت کی بے دلی۔

(ج) مروجہ روایتوں کے بارے میں زیادہ تر لوگوں کا عقلی طرزِ فکر اختیار کرنے کے بجائے انھیں محض تسلیم کر لینا، کیونکہ عام خیال یہ ہے کہ پُر احتیاط تحقیق کے ذریعے حاصل کیا ہوا اِدراک کفر کے مترادف ہوتا ہے۔

(د) مختلف مذاہب کے عالموں اور داناؤں کو مل بیٹھنے کے موقعوں کی کمی، جہاں وہ ہمدردی اور معاملہ فہمی کے ماحول میں تبادلۂ خیالات کر سکیں اور نزاعی نظریات کے بارے میں ان کی خوبیوں اور بُرائیوں کے مطابق فیصلہ کر سکیں۔

(ر) وہ حالات پیدا کرنے کے لیے بادشاہ اوّل نے بھی کوئی پیش رفت نہ کی جو آزادانہ تبادلۂ خیالات کے واسطے لازمی تھے، جن حالات میں اہلِ علم حق

کو صاف لفظوں میں بتا سکتے تھے۔

(س) عقل اور نیک مزاجی کی کمی کے باعث لوگ خود کو کمینگی اور درندگی کی حد میں داخل ہونے سے نہ روک سکے انھوں نے دوسروں کے مذہب میں دخل دیا، انھیں قتل کیا اور انھیں بے عزت کیا۔ وہ یہ محسوس نہ کر سکے کہ مذہبی جبر خلافِ عقل اور فضول تھا۔ اگر مخالفین غلط راہ پر بھی تھے، تو ایسا لاعلمی کی بنا پر تھا، اور اس لیے وہ لحاظ اور ہمدردی کے مستحق تھے نہ کہ نفرت اور قتل و خون کے۔[8]

جن نظریات کا خلاصہ مندرجہ بالا سطور میں کیا گیا ہے ان سے پوری طرح وضاحت ہو جاتی ہے کہ ابوالفضل مکمل مذہبی رواداری میں یقین رکھتا تھا اور ہندوؤں کو ایک خدا پجاری سمجھتا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ، وہ اس وقت تک تسلیم شدہ نظریات اور روایتی عقیدوں کو ماننے کے تیار نہ تھا جب تک وہ دلیل کے تقاضے پورے نہ کر دیں۔ اندرونی سچائی دلیل کی بنا پر کی جانے والی تحقیق کے ذریعے ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ مذہبی اختلافات کے لیے حسد کرنا فضول اور خلافِ عقل تھا، کیونکہ وہ لوگ بھی شرک کے مجرم تھے لاعلمی کی بنا پر گناہ کے مرتکب ہوئے اور اس لیے لائق ہمدردی تھے۔ اس نے بادشاہ کے ایسے سیاسی اقدامات کی تائید کی جن کی مدد سے مختلف مذاہب کے عقلا اور فضلا کے درمیان آزادانہ تبادلۂ خیالات کے واسطے ضروری حالات پیدا ہو سکیں۔ اور تاکہ وہ غلط فہمیاں دُور ہوں جن کی بنا پر نفرت اور مخالفت پیدا ہوتی ہے۔

مذہب کے بارے میں ابوالفضل کے عقل اور بے تعصب نظریے نے اس کے تاریخی کاموں پر خاصہ اثر ڈالا۔

تاریخ کے بارے میں نظریات

ابوالفضل نے اکبر نامہ کی دوسری جلد میں تاریخ اور فنِ تاریخ نگاری کے بارے

- میں اپنے خیالات کا قلمے تفصیل سے اظہار کیا ہے۔ اس کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب اور فلسفہ طویل عرصے تک اس کی ذہنی کاوشوں کا مرکز رہے۔ تاریخ میں اس کے لیے کوئی جاذبیت نہ تھی، اور وہ اسے معمولی قدر کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ وہ اس کے نزدیک دیو مائی کہانیوں سے زیادہ بہتر نہ تھی۔ تاریخ کا مطالعہ لاحاصل تھا اور اس کے وقت ضائع ہوتا تھا۔ اس کے مطالعے سے حق تک پہنچنا ممکن نہ تھا۔ مزید برآں، ماضی میں جو تاریخیں لکھی گئیں تھیں ان میں بہت سے عیب تھے۔ وہ اُن خود غرض اور مطلبی لوگوں نے تصنیف کیں جنھوں نے ذاتی فائدوں کی خاطر غلط بیانات تحریر کیے اور جھوٹ کو سچ میں گڈ مڈ کر دیا۔ وہ مصنفین جو ایماندار اور دیانت دار تھے، نیک نیت لیکن سادہ لوح تھے اور اُن کو درست معلومات نہ تھی۔ لہٰذا اُن کے بیانات احمقانہ اور مضحکہ خیز تھے۔ مزید یہ کہ، وقت کے ساتھ اصل مآخذ غائب ہوتے گئے۔ تاریخ نگاری کے لیے خصوصاً اس صورت میں جب مورخین میں تنقیدی تحقیق کا جوہر بھی کم ہو، یہ ایک بڑی رکاوٹ تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ بعض مورخین نے کچھ اپنی طرف سے بھی جوڑ دیا۔ چنانچہ وہ باتیں جو غیر معتبر اور غلط تھیں انھیں تاریخ سمجھ لیا گیا۔ غلط بیانات پر مشتمل تاریخوں نے قاریوں کی ایک بڑی تعداد کو گمراہ کر دیا۔ تنقیدی نظر کی کمی کے باعث ماضی کی بابت ان میں ایک ایسا رویّہ بن گیا جو گمراہ کن تھا اور جس نے لوگوں کو بڑا نقصان پہنچایا۔

تاریخی کتابوں کے بارے میں عام انداز کی یہ تنقید صریحاً تاریخ اسلام اور ہندوستان کے مسلم فرمانرواؤں کے ضمن میں کی گئی ہے۔ اس تنقید کا یہ مفہوم ہو سکتا ہے کہ ابوالفضل اپنے سے پہلے کے ان مصنفین سے بالکل متفق نہ تھا۔ جنھوں نے مسلمانوں کی فتح ہندوستان کا حال لکھا اور مسلم فرمانرواؤں کی سرگرمیوں کا ذکر کیا۔ انھوں نے تاریخ ہندوستان کو اس تصادم کی حیثیت دی جو ہندوؤں اور اسلام کے حامیوں کے درمیان ہوا۔ تاریخ ہندوستان کی اسی تشریح کی بنا پر سابقہ مورخین نے لوگوں کو گمراہ کیا تھا، اور ہندوستانی سماج

کو بہت بڑا نقصان پہنچایا تھا۔ لگتا ہے کہ ابوالفضل کی تنقید اسلامی تاریخ اور اسلامی اداروں سے تعلّق رکھنے والے ان حقائق کے خلاف بھی تھی جو اس کی نظر میں خلافِ عقل تھے۔

یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ایک خاص زمانے میں ابوالفضل تاریخ کے بارے میں خود اپنے اپنے نظریات رستہ کرنے لگا تھا۔ اس نے پورے مسئلے پر اچھی طرح غور کیا اور پھر اس غور و فکر کے نتیجے میں اس کی جانب اپنا رویّہ بدل دیا۔ آہستہ آہستہ اسے یہ یقین ہونے لگا کہ انسان کے سابقہ تجربات اور کارنامے، جو تاریخ کی کتابوں میں دیے ہوئے ہیں، واقعی روشن خیالی اور دانائی کا منبع تھے۔ وہ یہ بتاتا ہے کہ تاریخوں میں عارفوں اور فلسفیوں کا علم اور دانائی تحریر کی گئی اور اس طرح انھیں آنے والی نسلوں کے سُپرد کر دیا گیا۔ لہٰذا تاریخ اپنی کُھلی ہوئی محدودات کے باوجود لائقِ ذوق ہے۔

مزید برآں، ابوالفضل کے مطابق، تاریخ دلیل کی غذا اور قوّت کا ذریعہ ہے۔ اسے معقول اور منقول کے درمیان ایک حقیقی رشتہ نظر آتا ہے۔ وہ یہ اصول مان کر چلتا ہے کہ عرفان یعنی حصولِ حق، انسان کی زندگی کا بنیادی مقصد ہے۔ یہ محض دلیل کی روشنی سے ممکن ہے۔ لیکن خود دلیل حسوں کے ذریعے روشنی حاصل کرتی ہے، خاص طور پر آنکھ اور کان کے ذریعے یعنی دیکھ کر اور سُن کر۔ اس لیے ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے حالات دیکھ اور سُن کر، جنھوں نے ماضی میں زندگی بسر کی، دلیل کو تقویت ملتی ہے۔

آخری بات یہ کہ، تاریخ کے مطالعے سے افراد کو احساسِ رنج و الم پر قابو پانے میں مدد ملتی ہے۔ ابوالفضل تاریخ کا مقابلہ شفاخانے سے کرتا ہے۔ جہاں کوئی بھی شخص اپنے دُکھ کی دوا اور غم کا مداوا حاصل کر سکتا ہے۔ اس دُنیا میں جہاں روابطِ باہمی عام طور سے درد و الم کا سبب بن جاتے ہیں، وہ بدنصیبوں اور دُکھ کے ماروں کو تسلّی دیتی ہے۔

تاریخ کے بارے میں ابوالفضل نے جو نظریات پہلے قائم کیے تھے اور جن کا خلاصہ دیا جا چکا ہے، ان کا جائزہ لیا جائے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تاریخ کے معاملے میں عقلی طرزِ فکر کو بڑی اہمیت دیتا تھا۔ اس کا ذہن اس بارے میں بھی صاف تھا کہ جو حقائق اور بیانات کسی تاریخی کتاب میں شامل کیے جائیں وہ اصل ماخذوں پر مبنی ہونے چاہئیں اور حقائق کو نہایت احتیاط کے ساتھ تحقیق و تفتیش کرنے کے بعد ہی تحریر کرنا چاہیے۔ اگر کوئی عقلی رُجحان اور تنقیدی صلاحیت کی کمی کی سا بر حقیقت اور افسانے میں تمیز نہ کر سکے، تو اس کی کتاب ناقص ہوگی اور کسی حالت میں کہانیوں کے اس مجموعے سے زیادہ اہمیت نہ ہوگی۔ جس میں فرضی باتوں کا ذکر کیا گیا ہو۔ جن تحریروں میں حقائق اور قصّوں کی آمیزش کر دی گئی ہے۔ انھیں تاریخ کہنا مشکل ہے۔

دوسرے درجے پر اہم ہونے کی وجہ سے یہ بات لائق توجہ ہے کہ وہ تاریخ کو تفسیر یا فقہ سے تعلق رکھنے والی ایک اور ساخ نہیں سمجھتا۔ درحقیقت وہ تاریخ اور فلسفے میں قریبی تعلق قائم کرنے کی جانب مائل ہے۔ اس کے نزدیک یہ دونوں نہ صرف متعلقہ مضامین ہیں، بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل اور ایک میں اضافہ کرتے ہیں۔ تاریخ کی ماہیئت کے بارے میں یہ خیال برنی اور بدایونی کے خیال سے نمایاں طور پر مختلف ہے۔ مزید برآں، ابوالفضل اس نظریے کی طرف ذرا بھی اشارہ نہیں کرتا جو مسلم مورّخین عام طور پر تسلیم کرتے تھے کہ تاریخ سے محض 'ایمان والوں کو' روشنی ملتی ہے اور ان ہی کو یہ تسلیہ کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ تاریخ کے بارے میں اس کا تصور دینوی نہیں بلکہ دُنیاوی ہے۔

ابوالفضل کے مطابق تاریخ میں جشن اور تقریبات نیز جنگیں اور مہمیں درج کی جاتی ہیں۔ وہ سنجیدہ اور غیر سنجیدہ دونوں طرح کی باتیں قبول کر لیتی ہے (لیکن ابوالفضل نے غیر سنجیدہ باتوں کا ذکر نہیں کیا) اس میں رحم اور ظلم، فیاضی اور بخل،

شجاعت اور بزدلی، ہر طرح کے افعال کا ذکر کیا جاتا ہے۔ وہ لوگوں کی حالت اور حکومت کی حکمتِ عملی بیان کرتی ہے، اور اس میں داناؤں کی دانائی اور عالموں کا علم شامل ہوتا ہے ابوالفضل کے مطابق، تاریخ ان ساری تبدیلیوں کا احاطہ کر لیتی ہے جو دُنیا بھر میں کہیں واقع ہوتی ہیں۔

اکبر نامہ اور آئینِ اکبری ایک ہی کتاب کے دو حصّے ہیں۔ اکبر نامہ کے پہلے حصّے میں اکبر کے آباؤ اجداد کا ذکر ہے اور اس کے والد ہمایوں کا ذکر بھی شامل ہے۔ دوسرے حصّے میں اکبر کے دور کے چھیالیسویں سال تک کا نہایت مکمل بیان سال وار ترتیب میں دیا ہوا ہے۔ یہ کتاب 1595ء میں لکھا شروع کی گئی، اور پانچ مرتبہ نظرِ ثانی کرنے کے بعد 1602ء میں مکمل کر دی گئی۔ آئینِ اکبری کتاب کا تیسرا حصّہ ہے۔ یہ ایک بے مثل تالیف ہے جس میں ایک عظیم سلطنت کے مختلف شعبوں کے انتظام اور جانچ پڑتال کے نظام کے بارے میں معمولی ترین تفصیلات بڑی دیانت داری اور باریک بینی کے ساتھ دی گئی ہیں۔ اور اس میں سلطنت کی حدود، وسائل، حالت، آبادی، صنعت اور دولت کی وضاحت کے لیے اتنے بہت سے حقائق پیش کیے گئے ہیں کہ اتنے حقائق سرکاری ذرائع سے ہی حاصل کیے جا سکتے تھے۔[5] اس میں ہندوؤں کے دھرم اور فلسفے کے نظاموں کا بیان بھی شامل ہے، جو اِن کی قدیم کتابوں میں بیان کیا گیا ہے اور ان کے سماج رسموں اور رواجوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس طرح، ابوالفضل نے تاریخ کی وسعت اور رسائی میں اتنا اضافہ کر دیا۔ جتنا اس سے پہلے دَورِ وسطیٰ کے کسی اور مورّخ نے نہ کیا تھا۔

ابوالفضل دَورِ وسطیٰ کا پہلا مورّخ ہے۔ جس نے اصل مآخذوں کی اہمیت کو جانا اور مانا اور بڑی غور و فکر کے ساتھ ان کا مطالعہ کیا۔ کسی ایک حقیقت کی تصدیق کے لیے اس نے صرف ایک مآخذ یا صرف ایک بیان پر بھروسہ نہیں بلکہ جتنی ہو سکتی تھیں۔ وہ ساری روایتیں جمع کیں۔ انھیں تسلیم کرنے سے پہلے تنقیدی طور پر جانچا پرکھا۔ وہ

لہتا ہے کہ اس نے بہت سے سوال سنا لیے تھے جنھیں وہ کسی واقعے یا حقیقت کی رواداری
سے پوچھتا تھا۔ وہ بتاتا ہے کہ طریقہ کار حق کی تصدیق میں مورخ کی بڑی مدد کرتا ہے"[11]
اس کا ماخذی مواد ان لوگوں کے بیانات پر مبنی ہے جنھوں نے واقعات اپنی آنکھوں
سے دیکھے۔ افسران کی تیار کی ہوئی رپورٹوں، عرضداشتوں، رودادوں، شاہی فرمانوں اور
دوسری دستاویزوں سے بڑی احتیاط کے ساتھ استفادہ کیا گیا۔ واقعہ نویس دربار
کی کارروائی روزانہ تحریر کرتے تھے، اکبر کے دور کے انیسویں برس سے اس نے ان تحریروں
سے بڑا مواد حاصل کیا۔[12]

اسے جنگی مہموں، انتظامی اقدامات اور دوسرے واقعات کے بارے میں مختلف
ذریعوں سے معلومات، تحریری بیانات اور رپورٹیں ملیں۔[13] اس نے اہم عہدیداروں، بلند
مرتبہ لوگوں، صاحبِ علم معمّرین اور شاہی خاندان کے بوڑھے افراد سے معلومات حاصل
کی۔ زبانی بیانات چونکہ متضاد تھے اس لیے اس نے ان سے درخواست کی کہ بیانات تحریر
کر دیں۔ چنانچہ اس نے ایسے اشخاص سے تحریری بیانات حاصل کر لیے جو اپنی سنجیدگی،
استدلال اور دیانت داری کے لیے مشہور تھے۔ اس نے ان بیانات کو بڑی احتیاط کے
ساتھ جانچا اور انھیں دلیل کی کسوٹی پر کسا۔ جن اشخاص نے جو متضاد بیانات دیے تھے
وہ شہنشاہ کو سنائے گئے جس نے بعض مخصوص بیانات کی تصدیق کی اور بعض میں ضروری
اصلاح کے مشورے دیے۔ اسی طرح وہ بیانات بھی بادشاہ کے سامنے رکھے گئے جو خود
مصنّف کے ذاتی علم اور تجربے کی تردید کرتے تھے۔ تاریخی تفتیش کے اسی عمل کے ذریعے
حق کی تصدیق کی گئی اور اسے تحریر کیا گیا۔[14]

مورخ کی حیثیت سے ابوالفضل کی کامیابی اور ناکامی کا معیار بڑی حد تک ان
حالات کی مدد سے طے کیا گیا ہے جن حالات میں اس نے اپنا کام کیا۔ اس کی محدودات
اور کارناموں دونوں کی جڑیں اس کی سماجی حیثیت، اس کی تعلیمی تربیت اور کمالات،

نوعمری میں اس کے تجربات اور اس کے مذہبی نیز سیاسی نظریات میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ اس نے اپنے دَور کے سیاسی اور مذہبی مسائل میں سرگرمی کے ساتھ دلچسپی لی اور اُن مسائل کے بارے میں اس نے جو نظریہ قائم کیا تھا اس کی بنا پر اس نے اپنی عظیم کتاب کے مواد کو ایک خاص شکل میں پیش کیا ہے۔

پہلی بات جس کی طرف پہلے توجہ دلائی جا چکی ہے، یہ ہے کہ وہ اکبر کا نہایت منظورِ نظر درباری اور دوست تھا، اور ان قوتوں کے خلاف اکبر کا حامی تھا جنھوں نے مغل سلطنت کے نئے تصوّر کو جنم دی تھی۔ وہ اکبر کا لائقِ اعتبار معتمد اور راز دار تھا۔ اسی کے ساتھ، جیسا کہ زوردار لفظوں میں اس کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے، اس کے دل میں واقعی اکبر کے کردار اور شخصیت کے بارے میں تعظیم اور تکریم کا جذبہ موجود تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ یہ رویّہ جزوی طور پر ذاتی ترقّی کے خیال سے رہا ہو، لیکن لائقِ توجہ اہم بات یہ ہے کہ سیاست اور مذہب کے بارے میں اس کے نظریات اکبر کے نظریات سے ملتے جلتے تھے۔ مذہبی رواداری میں اس کے یقینِ کامل کی ابتدا عمر کے ان تشکیلی برسوں ہی میں ہو گئی تھی، جب وہ اور اس کا خاندان کٹّر علما کے ہاتھوں بدترین قسم کے جبر کا شکار تھے۔ یہی یقین اکبر کے ساتھ دائمی دوستی کی بُنیاد ثابت ہوا۔ مزید برآں، چند ہی لوگوں کو یہ شک ہو گا کہ اکبر دل و دماغ کی اعلاترین اور نفیس ترین خوبیوں سے مزین رہا تھا۔ کوئی تعجّب نہیں کہ ابوالفضل کو اکبر کی ذات میں ایک بادشاہ، ایک فلسفی اور ایک ہیرو کی خوبیاں ایک ساتھ مل گئیں۔ اکبر کے لیے ابوالفضل کی تعظیم کے اسباب کچھ بھی رہے ہوں، حقیقت یہ ہے کہ اکبر نے حکومت کی جو پالیسیاں اور اصول بنائے ان سے اس نے اپنے آپ کو پورے طور سے وابستہ کر لیا۔ مذہب کے بارے میں بھی اس نے اکبر کے نظریات کی تائید کی۔ اگر عصری مآخذوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو لگتا ہے کہ اکبر کی مذہبی اور انتظامی پالیسیاں بنانے کی اصل ذمّہ داری شاید ابوالفضل پر نہ تھی۔ ہاں یہ دُرست ہے کہ اسی نے اخلاقی اور عقلی طور سے شہنشاہ کی حمایت کی تاکہ

وہ سختی کے ساتھ ان پالیسیوں پر کاربند رہے جو تعصب سے خاصی پاک تھیں۔ اس کے سرکاری رُتبے، تیز مذہب اور سیاست پر اس کے ایسے نظریات کا تقاضہ یہی تھا کہ وہ اکبر اور اس کی سرگرمیوں کی حمایت کرے، انھیں حق بہ جانب ثابت کرے اور ان کی تعریف و توصیف کرے۔ اس مثالی بادشاہ کی سرگرمیوں اور کارناموں کو تحریر کرنا اس کے لیے عبادت کا درجہ رکھتے تھے۔[15] اس لیے یہ بیان کہ ہر چند تفصیلات کے لحاظ سے دُرست ہے، پھر بھی جانب داری کے انداز میں لکھا گیا ہے، اور اس کا مقصد اکبر کے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا اور اس کی خامیوں اور ناکامیوں کی لیپ پوت کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنی بے پناہ ذہانت، قوتِ استدلال، علم اور زبان پر اپنی قدرت کو بروئے کار لایا ہے۔ موضوعِ سخن کی وسعت، وہ بڑے مسائل جن کی وجہ سے اس زمانے کے لوگ بے چین تھے، اور اکبر کی غیر معمولی شخصیت، اُن سب نے اسے ایک ایسا موضوع اور ایسا مضمون فراہم کر دیا جو کسی طویل رزمیہ داستاں کے لیے خوب موروں تھا۔ ابوالفضل نے، زبان پر غیر معمولی قدرت کی مدد سے تاریخ اور رزمیہ داستان کو ایک ہی ادبی تخلیق میں یک جاں کرنے کی کوشش کی۔ چند ہی لوگوں کو سہ کہ وہ اپنی اس کوشس مں کامیاب۔ ہوسکا مورخ کی کامیابی اور ناکامی کو ناپنے کے واسطے یہی اس کا معیار تھا۔

اس ادبی کاوش کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں اکبر کے دَور کا ایک نہایت مکمل اور تفصیلی بیاں مل گیا ہے۔ بحیثیت مورّخ ابوالفضل کا یہ ایک نہایت غیر معمولی کارنامہ ہے کہ اس نے تاریخ کی ایک ایسی کتاب لکھی ہے جو رزمیہ داستان لگتی ہے۔ وہ ایک عجیب معمارانہ عظمت کی حامل ہے، اور اس بڑی عمارت کے اُوپر اکبر کی شخصیت چھجے کے پتھر کی طرح جمی ہوئی ہے۔ اکبر نامہ اور آئینِ اکبری کے صفحات میں اکبر کی عظمت کو ایک ٹھوس شکل دے دی گئی ہے۔ اس میں اکبر کی غیر معمولی اخلاقی جرأت اس کی رُوحانی آرزوؤں، اس کی عظیم بصیرت، اور گہری ذکاوت کا عکس نظر آتا ہے۔ قاری اکبر کی جسمانی قوت اور دلیری، اس کے رحم

اور سخت احساسِ عدل نیز بلند اقبال کی بنا پر اس کی شان و شوکت سے مرعوب ہو کر رہ جاتا ہے۔

سلطنت کے بارے میں اکبر کا ایک نیا تصور، سخت اور موزوں انتظامی اقدامات کے ذریعے لوگوں کی حالت سدھارنے کے واسطے اس کا بے انتہا شوق، اور مکمل مذہبی رواداری کے بارے میں اس کا اعلا تصور اور اس تصور پہ عمل، یہ ساری چیزیں اتنے جوش کے ساتھ ایسی زبان میں تحریر کی گئی ہیں کہ اکبر زندہ جاوید ہو گیا ہے۔ اسے ہندوستانی لوگ ان روایتی بادشاہوں میں شمار کرتے ہیں جو نہایت کریم النفس اور کامیاب تھے اور جنھوں نے خود کو رعایا کی بہبودی کے لیے وقف کر دیا تھا۔ یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ چند ہی مورخین اس خوش نصیبی کا دعوا کر سکتے ہیں۔ ابوالفضل نمایاں طور پر اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوا ہے، جو اس نے اکبر پر اپنی عظیم کتاب کے دیباچے میں تحریر کیا ہے۔

میری نظر میں یہی ابوالفضل کا سب سے نمایاں کارنامہ ہے جو اس نے اکبر کے مورخ کی حیثیت سے انجام دیا۔ اتنا ہی اہم اس کا وہ طریقِ عمل ہے جو اس نے عصری تاریخ لکھنے کے لیے اختیار کیا۔ اس نے حالی اور رائج ہوئی تاریخی روایتوں میں کئی اعتبار سے جدت کی وہ اس کا قائل نہ تھا کہ ہندوستانی تاریخ میں صرف ہندوستان کے مسلم فرمانرواؤں کے کارناموں کا ذکر ہو۔ نہ اس نے اسلام کے ماضی سے تعلق قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس نے سابقہ مورخوں کے برعکس اس نظریے سے اتفاق نہ کیا کہ ہندوستانی تاریخ بنیادی طور پر ایک ایسی کشمکش کا احوال ہے جو اسلام اور ہندو دھرم کی قوتوں کے درمیان ہوئی۔ ابوالفضل کے نزدیک یہ تصادم مغل سلطنت اور ہندوستانی حکمرانوں کے درمیان ہوا۔ جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔ دراصل اس تصادم میں ایک طرف قیام، استحکام اور اچھی سرکار کی قوتیں ایک ایسے مثالی فرمانروا کے تحت

بروئے کار تھیں جو دینوی اور دُنیاوی معاملات میں لوگوں کی قیادت کرنے کا اہل تھا اور دوسری طرف بری سرکار اور انتشار کی قوتیں تھیں جن کی قیادت "زمیندار" کر رہے تھے۔ اکبر اور ابوالفضل کے نزدیک مُغل سلطنت صحیح معنوں میں ہندوستانی سلطنت تھی، کیونکہ اب اس کا تعلق محض کسی ایک نسلی گروہ، یا کئی نسلی گروہوں کے مجموعے سے نہ تھا اور نہ محض ان سے تھا جو اہلِ ایمان کہلاتے تھے۔ ہندو اور راجپوت جاگیرداروں کے مذہبی، سیاسی اور اقتصادی دعوؤں کو پوری طرح مان کیا گیا تھا۔ ان بدلے ہوئے حالات کے پیشِ نظر ہندوستانی فرمارواؤں کے لیے اب جائز نہ تھا کہ وہ اس شاہی ریاستی اتحاد میں شامل نہ ہوں جو ملک میں اتحاد، استحکام اور معاشی خوش حالی لائے گا۔ ابوالفضل نے راجپوتوں کے خلاف چلائی جانے والی اہم فوجی مہموں کا جس انداز سے ذکر کیا ہے اس سے وہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے جو مندرجہ بالا سطور میں بیان کیا گیا ہے۔

ہندوستانی تاریخ کے بارے میں جو نیا تصوّر قائم کیا گیا اس کا سب سے عمدہ اظہار ان بدلی ہوئی اصطلاحات سے ہوتا ہے جو شاہی سورماؤں کے لیے استعمال کی گئی ہیں۔ ابوالفضل انھیں مجاہدینِ اقبال اور سماریانِ دولت کہتا ہے۔ انھیں مجاہدینِ اسلام اور سماریانِ اسلام یعنی فاتح سپاہی، جو اسلام کی راہ میں اپنی جانیں لڑا رہے ہوں، ــــ نہیں کہا گیا۔ عصری تاریخ کو ان اصطلاحات کے ساتھ پیش کرنے کی وجہ سے دَورِ وسطیٰ کے فنِ تاریخ نگاری میں ایک نیا عنصر اُبھرا۔ یہ چیز تصوّرِ تاریخ کے لیے واقعی ایک نئی دین تھی۔ یہ بلاشبہ دُرست ہے کہ تاریخ کے بارے میں ابوالفضل کے لیے تصوّر سے زیادہ تر لوگوں کے ذہن کچھ عرصے تک نہیں بدلے۔ اس کے باوجود ہندوستانی تاریخ کے بارے میں اس کے نئے نظریے کی اہمیت دائمی ثابت ہوئی۔ اس نے مغل حکومت کی غیر مذہبی نوعیت کو مقبولِ عام کرنے میں بڑی مدد دی، اور سرکاری عہدیداروں نیز ہندو جاگیرداروں کے رویّے اور نظریے کو بھی خاص حد تک متاثر کیا۔ ہندوستانی تاریخ کے بارے میں

ابوالفضل کی ترجمانی مستقبل میں پسند کی جانے لگی، اور بعد کے مغلوں کے مورخین، خواہ وہ ہندو رہوں یا مسلمانوں، ملک کے سیاسی حالات کو اسی نظر سے دیکھنے لگے کہ یہ تصادم مغل سلطنت اور اُن لوگوں کے درمیاں تھا جو اس سلطنت کے مخالف تھے۔ ل

ہندوؤں کے قدیم فلسفے اور دھرم نیز ان کے سماجی ریت رواجوں سے ابوالفضل کو جو گہری دلچسپی تھی وہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ اس نے ہندو سماج کے ان پہلوؤں کا بڑے غور اور ہمدردی کے ساتھ مطالعہ کیا۔ اس کے یہ مطالعے اس کی تحریروں میں غیر جانبداری اور تاریخی معروضیت کی بہترین مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ہندو دھرم اور سماج کو صحیح تاریخی پس منظر کے ساتھ باقاعدہ طور سے سمجھنے کی کوشش البیرونی کے بعد ابوالفضل نے ہی کی۔ مزید برآں، اس نے اس زمانے کے ہندو سماج کو ہندوؤں کے خیالات کی تاریخ کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی۔ یہ طریقِ کار بالکل نیا تھا اور اس طریقۂ تحقیق سے ملتا جلتا ہے جو آج کل عمرانیات میں اپنایا جاتا ہے۔

ان کارناموں کی بنا پر ابوالفضل کو ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے بہترین مصنفوں میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ بہرحال جب مورخ کی حیثیت سے ابوالفضل کی صحیح قدر کا اندازہ کرنا ہو، تو جائز یہ ہوگا کہ اس کی کچھ محدودات بھی نظر میں رکھی جائیں۔ یہ درست ہے کہ جہاں تک منفرد واقعات کی تفصیلات کا تعلق ہے وہ قابلِ اعتبار ہے کیونکہ ان کی اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ تفتیش اور تصدیق کی۔ لیکن مضامین کو پیش کرنے کا انداز اتنا معروضی نہیں، بلکہ داخلی ہے۔ اس کے محاوروں اور اصافِ صفت، نیز جملوں کی ساخت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہر مخصوص واقعے یا صورتِ حال کا اس نے اپنے طور پر جائزہ لیا اور اندازہ لگایا۔ کہ کسی فرد یا کسی واقعے یا کسی صورتِ حال کے بیں اس کا بیان اس کے اپنے فیصلے پر مبنی ہے۔ وہ ہمیشہ ان مقاصد کی تشریح کرتا ہے جن کے تحت اکبر نے کسی راجپوت فرمانروا [illegible]

اس طرح بیان کیے گئے ہیں جیسے وہ جائز اور قابلِ تعریف ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ اندازِ فکر تاریخی معروضیت کی شرائط کو پورا نہیں کرتا۔

اسی طرح، اگر ابوالفضل دلیل کو اپنا واحد رہنما اور اصول مانتا ہے، اور ان لوگوں کا مذاق اُڑاتا ہے جو دلیل کے مقابلے میں روایت کی راہ اختیار کرتے ہیں، لیکن وہ اس اصول کا اطلاق اکبر پر نہیں کرتا۔ اکبر غیر معمولی رُوحانی خوبیوں کا ذکر کرتے وقت، یا پیش بینی سے تعلق رکھنے والی اس کی اس خوبیوں کا حوالہ دیتے وقت جو الہام کے اور مافوق الفطرت قوتوں کے مترادف تھیں، یا "اقبال مندی" کی بنا پر اکبر کے کارنامے تحریر کرتے وقت، ابوالفضل کے کان دلیل کی صدا کے لیے بند ہو جاتے ہیں۔ ان کمزور لمحوں میں ابوالفضل کا ساتھ دینا واقعی تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ یہ لگنے لگتا ہے کہ پیغمبرِ دلیل خوش اعتقادی اور اوہام پرستی کا شکار ہو گیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے، کہ ایسے ثبوت بھی موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بعض ایسے حقائق اور واقعات کی لیپا پوتی کرتا ہے جو اکبر کی لیاقت اور اس کی دانائی پر داغ لگا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اکبر نامہ اس منصوبے کی سخت ناکامی کے بارے میں چپ ہے جس کے تحت زمین جاگیریں خالصہ میں بدل دی گئیں اور کروریوں کا انتظام حکومت کے سپرد کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قابلِ زراعت زمینوں کے علاقے کے علاقے تباہ ہو گئے اور ان کے ساتھ کسان بھی تباہ ہو گئے، اور آخر کار اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کروریوں کی کوشش کے بارے میں چند جملے بھی نہیں لکھتا ہے نہ وہ یہ لکھتا ہے کہ شہنشاہ کے دَور کے چوبیسویں برس سے زمین جاگیریں پھر سے دی جانے لگیں کیونکہ یہ تجربہ ناکام ہو گیا تھا۔ بہرحال یہ حقائق بدایونی نے تحریر کیے ہیں اور نظام الدین احمد نے ان میں سے خاص خاص باتوں کی تصدیق کی ہے۔ ٹوڈرمل اور شاہ فتح اللہ شیرازی کی رپورٹ سے جو اندرونی ثبوت ملتا ہے، اور جو رپورٹ اکبر نامہ میں جُوں کے تُوں شامل کر دی گئی ہے، وہ اندرونی ثبوت بدایونی اور

نظام الدین کے بیانات کی بالواسطہ تصدیق و توثیق کرتا ہے۔

اسی طرح وہ اصلاحات جو دیوان صدر میں کی گئیں اور لمبی مدت تک نافذ رہیں، ان کا اکبر نامہ میں شاہی فرمان کے اس خلاصے کے سوا کوئی اور ذکر نہیں ہے جو فرماں مدد معاش والی زمینوں کو جاگیر اور خالصہ کی زمینوں سے جدا کرنے کے لیے جاری کیا گیا تھا۔ یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ابوالفضل نے کیا سوچ کر آئین اکبری میں ان اصلاحات کا ایک مختصر بیان شامل کر دیا۔ اس بیان میں بھی اس نے بڑے عام انداز سے ان بدعنوانیوں کا ذکر کیا ہے جو دیوانِ صدر میں پائی جاتی تھیں، اور ان بڑے بڑے مسائل کا ذکر نہیں کیا ہے جن کی وجہ سے یہ سخت اصلاحات کی گئیں، جن کا مقصد یہ تھا کہ صدر کی طاقت کم کر دی جائے۔ اس بارے میں کہ ان اقدامات سے مسلمانوں کے ایک حصّے کے اقتصادی اور سماجی حالات پر بڑے اثرات پڑے ابوالفضل جان بوجھ کر چُپ رہا ہے۔ ان اقدامات کی وجہ سے مدد معاش والے طبقے کی اقتصادی حالت پر جو بُرے اثرات پڑے، اور جو سخت ردِّ عمل ظاہر ہوا، اس کا ذکر بدایونی نے اس طبقے کے ترجمان کی حیثیت سے بڑے مدلل اور جامع انداز میں کیا ہے۔

مزید یہ کہ، عبادت خانے میں ہونے والے مذہبی مباحثے علمائے اکبر کے متنفر کی ابتدا، ان سے قطع تعلق اور پھر اکبر کے مجتہد یا امامِ عادل ہونے کا اعلان، ان سارے بیانات کو دُرست اور مکمل سمجھنا مشکل ہے۔ ان سارے مذہبی مباحثوں میں ابوالفضل خود ایک جانب سے شریک رہا، اور دلیلوں کی اس جنگ میں علما کو بدنام کرنے اور انھیں لاجواب کرنے اور بالآخر ان کی قوت اور اثر زائل کرنے میں اسی نے خاص کردار ادا کیا۔ اس لیے اس نے شاید مذہبی تنازعوں کی بابت جو بیان دیا ہے وہ یقیناً غیر جانبدارانہ اور معروضی نہیں مانا جا سکتا۔ مزید برآں اس موضوع سے تعلق رکھنے والی عبارتیں علمائے تئیں حقارت اور تضحیک سے پُر ہیں۔ حالانکہ یہ ساری باتیں بڑی پُر تصنع اور پُر وقار زبان میں کہی گئی ہیں۔ اس کے باوجود، علما اور ان کے اصول نیز قدروں کے بارے میں

گہری نصرت کا اظہار بڑے زور شور سے طفلانہ انداز میں کیا گیا ہے۔ گو یہ درست ہے کہ ابوالفضل اشخاص اور افراد پر ذاتی حملے کرنے سے اجتناباً پرہیز کرتا ہے، لیکن طبقۂ علما کے خلاف اپنی پرانی رنجش کا بدلہ وہ اپنے زورِ قلم کی مدد سے خوب لیتا ہے۔ یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ اس نئے سیاسی مقابلے میں وہ اصول، جو علما کو عزیز تھے، اپنی قوت کھو چکے تھے اور جائز نہ رہ گئے تھے، بلکہ ان کے بعض عقائد روشن خیالی اور دلیل کے عین منافی بھی لگتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا تھا، تو ابوالفضل ہی کی زبان میں، وہ لاعلمی کا شکار تھے اور اس لیے صفحاتِ تاریخ میں جبر اور دائمی تضحیک کے مستحق نہیں بلکہ لحاظ اور ہمدردی کے مستحق تھے۔ ایسی عبارتوں میں ابوالفضل رواداری اور وسیع النظری کے ان ہی اصولوں کی اعلانیہ خلاف ورزی کرتا ہے جن اصولوں کو وہ کسی اور بیر مختلف سیاق میں بڑی کاوش سے منواتا ہے اور مشتہری کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علما کے درمیان یہ تصادم جتنا نظریاتی تھا اتنا ہی حصول طاقت کے لیے بھی تھا، جس میں ایک طرف وہ علما تھے جو صاحبِ قوت واثر تھے اور دوسری طرف وہ سابقہ گداگر تھے جو دُنیا ترک کرکے عُسرت کی حالت میں گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ جب آخر الذکر نے طاقت پکڑی تو انھوں نے اوّل الذکر علما کے خلاف قلم اور تلوار کو اسی بے دردی سے استعمال کیا جس بے دردی سے کبھی اوّل الذکر، آخر الذکر کے خلاف استعمال کرتے تھے۔ انھوں نے فیصلہ کر دیا تھا کہ علما کی طاقت مکمل طور سے ختم کر دیں اور تاریخ میں ان کو جاہل، خود غرض، تنگ ظرف اور مطلبی کے ناموں سے پکارا جائے۔

بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابوالفضل نے بحیثیت مورخ اپنے منصب سے انصاف نہیں کیا۔ شیر شاہ کا بیان اس نکتے کی حمایت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس کے کارناموں کو چھوٹا کرکے دِکھایا گیا ہے اور اس کی کامیابی کو دغا، فریب اور جھوٹ سے منسوب کیا گیا ہے۔ شیر شاہ کے بارے میں اس رائے سے کوئی جدید مورخ

متفق نہ ہوگا۔ اس کی بعض اصلاحات کا ذکر کیا گیا ہے، لیکن ان کی اہمیت کم کرنے کے خیال سے، ابوالفضل فوراً ہی یہ کہہ دیتا ہے کہ یہ اصلاحات علاالدین خلجی یا بنگال کے فرمانرواؤں کی نقل میں کی گئی تھیں۔

ابوالفضل اکبر اور اس کی سرگرمیوں میں اتنا محو رہتا ہے کہ بہت سے ایسے حقائق لکھنا بھول جاتا ہے جن کی مدد سے سکے کا دوسرا رخ بھی سامنے آتا ہے اور اس سے بیان کا درست پس منظر ہم تک پہنچ سکتا تھا۔ ہمیں اس کا تقریباً کوئی علم نہیں کہ افغانوں یا راجپوتوں نے اپنی کہانی کس انداز سے پیش کی، ان لوگوں نے کیا موقف اختیار کیا، اور اس سہ رخی تصادم کی کیا نوعیت تھی جس میں گو اکبر فتح یاب ضرور ہوا، لیکن اسے لازمی فوجی اقدامات کے ساتھ بڑی سخت سفارتی کوشش بھی کرنا پڑی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اکبر نامہ میں پیش کیا جانے والا سیاسی بیان اس شدید جدوجہد کو رنگین اور جاندار بنانے میں ناکام رہا ہے جو ہندوستان کی سلطنت حاصل کرنے کے لیے کی گئی۔ وہ اپنے بیان سے ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ اکبر کے بلند اقبال اور اس کی عظیم الشان فوجی طاقت نے ان مخالف فوجوں کو روند ڈالا جنھوں نے تقریباً کوئی مزاحمت نہیں کی، اور مغل فوجوں کی کامیاب فوجی نقل و حرکت میں محض پس منظر کا کردار ادا کیا۔ ایسا تاثر جو اکبر نامہ کے بیان سے مستقل بنتا رہتا ہے، اسی سیاسی صورتِ حال کی حقیقتوں کو سمجھنے میں مدد نہیں دیتا جن کا سامنا اکبر کو کرنا پڑا، کیونکہ دراصل وہ اپنی دُور اندیشی، سفارت کاری کی مہارت اور فوجی مہموں کو کامیابی کے ساتھ چلانے کی صلاحیت ہی کی بنا پر کامیاب ہوا، نہ کہ محض اپنے بلند اقبال کی وجہ سے، جو ابوالفضل کا خیال ہے اور جیسے وہ ہمیں باور کرانا چاہتا ہے۔

یہ بات بھی اہم ہونے کی وجہ سے قابلِ توجہ ہے کہ ابوالفضل ان سیاسی اور سماجی قوتوں کا ذکر پوری دیانت داری سے نہیں کرتا جو علاقائی وفاداریوں، علاقائی حب الوطنی اور خود مختاری نیز نسلی جھگڑوں کی نمائندگی کرتی تھیں اور جن قوتوں نے اکبر کے اس

دعوے کو چیلنج کیا تھا کہ وہ ہندوستان کا جائز شہنشاہ ہے۔ لہٰذا اس کی تحریروں میں اس دَور کے مختلف اقسام کے تصادموں کی گہرائی پھیلاؤ اور شدّت کی جھلک نظر نہیں آتی۔

مزید برآں، شہنشاہوں، امیروں، عالموں اور عارفوں کی سرگرمیوں میں غرق رہنے کی وجہ سے زندگی کے بارے میں اس کا نظریہ قدرے محدود ہو گیا تھا۔ اس نے شاید ہی کبھی ایسے واقعات یا حقائق کی طرف توجہ دی ہو جو ابوالفضل کے اندر چھپے ہوئے عقلی انسان کو غیر اہم اور حقیر معلوم ہوتے ہوں۔ وہ اگر یہ حقائق تحریر کرتا تو عام آدمیوں کی زندگی کے بارے میں غیر معمولی بصیرت حاصل ہوتی اور وقت کی رُوح کو مقید کرنے میں مدد ملتی۔ عقلی میلان اور عالمانہ تربیت نے اسے زندگی کی ہر غیر سنجیدہ، معمولی اور ادنا بات سے لاتعلّق اور متنفر کر دیا۔ لہٰذا وہ عام طور سے محض ان حقائق میں دلچسپی لیے لگا جو کسی بادشاہ، کسی امیر اور فلسفیانہ انداز میں غور و فکر کرنے والے کسی صاحبِ کمال عالم کے نقطۂ نظر سے سنجیدہ اور نتیجہ خیز لگتے تھے اور جب ان حقائق کا انتخاب کر لیا تو پھر اتنی ہی سنجیدہ، پُرشوکت، مختصر اور جامع زبان میں انھیں پیش کیا اور وہ انداز اختیار کیا جو ایک ایسے فلسفی کو زیب دیتا ہے جس نے طے کر لیا ہو کہ زندگی کی اعلا اور عمیق حقیقتوں کو ہی تحریر کرے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دَور کی پوری زندگی، جس میں سنجیدہ اور غیر سنجیدہ، اعلا اور ادنا، تلخ اور بدمذاق، سادہ اور رنگین، ہر طرح کی چیزیں ہوں، اکبر نامہ اور آئینِ اکبری کے صفحات میں متحرک نظر نہیں آتی۔ یہ دُرست ہے کہ آئینِ اکبری میں ایسے اعداد و شمار کی بھرمار ہے جو اقتصادی صورتِ حال سے تعلّق رکھتے تھے، لیکن یہ تفصیلات ریلوے کے نظام الاوقات یا کسی محکمے کی رپورٹ جیسی لگتی ہیں، اور ہر اس بات سے مبرا ہیں جن سے ہمیں لوگوں کے اصل حالات کے بارے میں کچھ علم ہو سکے اور ان کی زندگی کے معنی، مقصد اور موضوعات کے بارے میں بصیرت حاصل ہو سکے۔ ابوالفضل افراد اور جماعتوں کی انسانی ضرورتوں کو نظر میں رکھ کر اُجرتوں، قیمتوں اور سلطنت کے مالی مطالبوں کے بارے میں کبھی کچھ نہیں کہتا۔ آئینِ اکبری ہمیں بعض ایسے اعداد و شمار فراہم کر دیتی ہے جن کا تعلّق

مشکل ہی سے لوگوں کے حالاتِ زندگی سے قائم کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح، وہ اس کو ایک دانشور کی سطح سے گرا ہوا کام سمجھتا ہے کہ عام آدمیوں اور عورتوں کے عادات و خصائل، رِیت رواج، عقیدوں، سماجی معلوں اور توہمات کے بارے میں تحریر کرے۔ وہ حد جو اس کی شخصیت، مزاج اور عقلی میلان نے قائم کر دی تھی، اسی حد کی وجہ سے اس کا فسانہ دَوران یک طرفہ اور نامکمل رہ گیا۔ اکبر نامہ اکبر اور ابوالفضل کے دور اور سماج کی کہانی سے زیادہ اکبر کی کہانی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ابوالفضل اپنے دَور کی رُوح کو مقید کرنے میں اور اپنی کتاب میں اس دَور کے سماج کو ایک مسلم اتحاد کی کہانی کے طور پر پیش کرنے میں ناکام ہو گیا ہے۔

حوالہ جات

1 Abul Fazal, Ain-e-Akbari, (Lucknow 1893) Vol III, pp 207-216.

2 Abul Fazl, Akbar-nama, (Bib Ind), Vol II, pp 387-382.
Ain-i-Akbari, Vol III, p 217.

3 Ibid, Vol I, pp 2-3, Ibid, Vol I, pp 201-202

4 Maasir-ul-Umara, Beveridge, Vol I, pp 117-125.

5. نقطوی:
یہ سمجھتے تھے کہ دُنیا کبھی فنا نہ ہوگی۔ یہ آخرت اور حشر کے دن سے اور جزا و سزا سے منکر تھے، اور کہتے تھے کہ جنت اور دوزخ دُنیا ہی میں راحت اور تکلیف کی شکل میں مل جاتی ہیں۔

6. آئینِ اکبری، جلد سوئم، صفحہ 218۔

7. ایضاً صفحات 4-2۔ اکبر نامہ، جلد سوئم، صفحات 660-659

8. ایضاً صفحات 524-523۔

9. ایضاً جلد دوئم، صفحات 392-376

10. Ain-i-Akbari Jarrett, Introduction

11. اکبر نامہ، جلد دوئم، صفحات 392—367

12. ایضاً جلد اوّل، صفحات 10—9

13۔ آئینِ اکبری، جلد سوئم، صفحات 200—199 ، اکبر نامہ، جلد اوّل، صفحات ۱۵-۹۔

14۔ آئینِ اکبری، جلد سوئم، صفحات 200 - 199

15۔ اکبر نامہ، تعارف۔

اٹھارھویں صدی کے دوران ہندوستان میں
فارسی فنِ تاریخ نگاری

ظہیر الدّین مَلِک

اٹھارھویں صدی کے دوران تاریخی مضامین عام علمی تربیت کا ایک لازمی جزو تھے۔ گو تاریخ کو اعلا تعلیم کے نظام میں باقاعدہ شامل نہیں کیا گیا تھا، لیکن فطرتِ انسانی سے تعلق رکھنے والے مضامین پر اس کا بڑا اثر تھا کیونکہ اس کا مطالعہ ذہن کے لیے بڑا محرک ثابت ہوتا تھا![1] چنانچہ اس دَور میں مورّخین نے بہت کچھ لکھا۔ باقاعدہ سیاسی تاریخوں کے علاوہ بہت سے انتظامی رسالے بیر کاروبار اور تجارت پر کتابیں تالیف کی گئیں۔[2] دستاویزوں میں دلچسپی کے باعث بہت سے مکتوبات اور تاریخی اہمیت کے دیگر مجموعے تالیف کیے گئے۔[3] یہاں تک کہ مورّخین نے صنفِ نظم کو بھی نہ چھوڑا اور منظوم تاریخیں بڑی تعداد میں لکھی گئیں۔[4] اس ادب کے علاوہ امیروں اور صوفیوں کی سوانحیں اس دَور کی عظیم الشان اور فاضلانہ دین ہیں۔[5] اہم ترین چیز، جس کی وجہ سے اٹھارھویں صدی خاص طور سے باعثِ دلچسپی بن گئی، وہ عظیم مذہبی ادب ہے جس میں قرآن، حدیث، فقہ اور تصوف پر نامی گرامی کتابیں شامل ہیں۔[6] سماجی زندگی کے مختلف پہلو اور تہذیب کے مختلف رُخ سمجھنے کے لیے شاعروں کے دیوانوں اور تذکروں سے بڑی مفید معلومات ملتی ہے۔ لہٰذا اس دَور کی تحریریں تنوع اور پھیلاؤ کے اعتبار سے بڑی پُر اثر ہیں۔ ہندوستانی تاریخ کے شاید کسی اور دَور میں مذہبی، سیاسی اور سماجی پہلوؤں پر

اتنا زیادہ ادب تیار نہیں ہوا جتنا اٹھارھویں صدی میں ہوا۔[7]

زیرِ نظر دَور میں مورّخین کا خاص موضوع سیاست تھا، اور غیر مذہبی انداز کے مضامین کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ وہ اپنی کتابوں میں فوجی مہموں، میدانِ جنگ کے کارناموں اور شاہی دربار کی رنگارنگ سرگرمیوں پر خاصہ وقت صرف کرتے تھے۔ انتظامی کام اعمالِ حود و کرم نیز فن اور ادب کی سرپرستی کی تفصیلات بھی ان کے لیے جاذبِ توجہ تھے۔

خفی خاں نے سرتاپا ایک سیاسی تاریخ لکھی، اور معلومات فراہم کرنے کے لیے وہ دربارِ شاہی کے چکّر کاٹتا رہا۔ اس کی کتاب واقعات کی ایک نمایاں تخلیق نو ہے، جو اسلوبِ بیان کے اعتبار سے واضح اور تاریخ وار ترتیب کے لحاظ سے بڑی مسلّم ہے۔ اسے واقعات کا بڑا علم ہے، اور اس کے پاس موضوعات بھی بہت ہیں۔ مغل تاریخ کے تسلسل کی بابت اس کا ایک تصوّر ہے اس کے علم و فضل کے علاوہ، اس کی ترتیبِ الفاظ اور اظہارِ بیان میں غیر معمولی حُسن ہے۔ واقعات کو ایک وسیع سیاق سے وابستہ کرنے اور ماضی سے اسی انداز اور اسی قسم کی مثالیں دینے کا اسے ملکہ ہے۔ شاید وہی اکیلا مصنّف ہے جو مختلف زمانوں میں کی جانے والی ان اصلاحات کا ایک جامع اور مربوط بیان دیتا ہے، جو اصلاحات منصب داری نظام کو از سرِ نو منظّم کرنے کے لیے کی گئی تھیں، جو نظام اپنے ہی وسیع ڈھانچے کے بوجھ تلے دب کر ٹوٹ رہا تھا۔[8] مرکزی انتظامیہ، مرہٹوں کے معاملات اور جاگیرداروں کی حالت پر اس کی تحریریں بے مثل ہیں۔ ان میں نہ صرف نئی معلومات شامل ہے، بلکہ اُن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان معاملات پر مصنّف کی کتنی گہری نظر تھی۔

بہادر شاہ کے دَور میں مغل انتظامیہ کے اندر زوال کا جو عمل شروع ہو گیا تھا اس کا تجزیہ کرتے ہوئے خفی خاں لکھتا ہے کہ "ہندوستان میں تیموری حکومت کے قیام کے بعد سے ایک خطاب دو اشخاص کو نہیں دیا گیا، ہاں ایک دو حروف کے ردّ و بدل کی اجازت تھی۔ صفدر خاں بابی، جو اورنگ آباد میں تعینات تھا، اورنگ زیب کے

زمانے سے ایک موروثی خطاب کا مالک تھا۔ لیکن بہادر شاہ نے یہی خطاب اپنے ایک پُرانے ملازم کو عطا کر دیا۔ صفدر خاں نے اس خطاب کو برقرار رکھے جانے کی عرضداشت پیش کی جو اس سے بنا کسی نافرمانی کے چِھن گیا تھا۔ شہنشاہ نے اس کی درخواست پر عطا کیا، عطا کیا، عطا کیا، لکھ دیا۔ حالانکہ وہی خطاب پہلے ہی ایک دوسرے شخص کو عطا کیا جا چکا تھا۔ اسی دن سے یہ رواج بن گیا کہ ایک ہی خطاب دو یا تین اشخاص کو دے دیا جاتا ہے۔ اسی طرح، منصب، ہاتھی، جھنڈا اور سرپیچ کی بخشش پانے والے کے رُتبے اور وقار کے مطابق نہیں کی جاتی۔[9]

افسرانِ خزانہ یہ دیکھ کر پریشان ہوئے کہ انتظامِ مال تیزی سے انحطاط پذیر ہے اور انھوں نے ایسی اصلاحات کی ضرورت محسوس کی جن کے ذریعے منصب داری نظام کو معیاری اور اثر آفریں بنایا جا سکے۔ انھیں توقع تھی کہ اصلاح کے بعد یہ نظام اس صورتِ حال پر قابو پالے گا۔ جس میں خرچہ آمدنی سے بڑھ گیا تھا، اور شہنشاہ بے سوچے سمجھے جاگیریں عطا کر رہا تھا۔ حالانکہ اس مقصد کے لیے زمینیں کم تھیں۔ اخلاص خاں، اراض مکرر، جو اپنی دیانت داری اور محنت کی وجہ سے مشہور تھا، اس نے منعم خاں وزیر کی توجہ اس مالی بحران کی طرف مبذول کرائی جو ان مسائل کے باعث پیدا ہوا تھا۔[10] اس نے مشورہ دیا کہ منظوری سے پہلے تقرری یا ترقی کے لیے دی جانے والی درخواست کی جانچ پڑتال پہلے وزیر خود کرے۔

یہ یقینی تھا کہ اس انداز کی اصلاح کی مخالفت دربار کے وہ لوگ کریں گے جن کے حقوق اور اختیارات پر چوٹ پڑتی ہوگی۔ منعم خاں نے اس ڈر سے کہ عہدوں کے متلاشی لوگوں میں اس کی مقبولیت کم ہو جائے گی، یہ ناخوشگوار فرض ادا کرنا منظور نہ کیا اور اخلاص خاں سے کہا کہ اصلاح کا کام خود کرے۔ اخلاص خاں کو جب اپنے سے اعلا عہدیدار کی مدد اور اشتراک نہ ملا تو اسے لگا کہ یہ کام اس کے قابو سے باہر ہے۔ اس نے خود بھی ان

اشخاص کے جذبات کو روندنے سے انکار کر دیا جو حکومت میں مرتبے حاصل کرنے کے خواہشمند تھے۔

آخر میں ہر منصب دار کی ابتدا، منصب اور وقار کی تفتیش کا کام مستعد خاں کے سپرد کیا گیا، جو معاصرِ عالمگیری کا مصنف تھا۔ اس سے پہلے کہ ارض مکرر اور وزیر منصب داروں کی درخواستیں آخری منظوری کے لیے شہنشاہ کو بھیجیں مستعد خاں کو یہ ساری درخواستیں جانچنا اور تصدیق کرنا ہوتی تھیں۔ لیکن اس کی ساری محنت رائیگاں گئی۔ اصلاح کا یہ منصوبہ نہ صرف ان لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے ناکام ہوا جو دولت کے متلاشی تھے بلکہ بہادر شاہ کی بے تکلفی کی وجہ سے بھی ہوا۔ امیدواروں کی جو درخواستیں مستعد خاں کے سامنے پیش ہونے سے پہلے شہنشاہ کی دو بیگمات، مہر پرور اور امتہ الحبیب شہنشاہ کے سامنے پیش کر دیتی تھیں وہ ان پر دستخط کر دیتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہنشاہ کے دستخطوں کی اہمیت ختم ہو گئی۔ عالی جاہ اپنے افسروں سے کہتے کہ ان کے پاس سوائے اس کے دوسرا راستہ نہیں رہ گیا کہ ہر امیدوار کے لیے جاگیر عطا کرنے کا فرمان جاری کر دیں۔ اس کے افسران بہرحال، آزاد تھے کہ موقع کی مناسبت سے جو بہتر سمجھیں وہ کریں[11]

مقامی سطح پر انتظام مال کی بابت خفی خاں کا علم معتبر لگتا ہے، کیونکہ تحصیل و حصول کا معاملہ اس کے عملی تجربے پر مبنی تھا۔ وہ عامل کی حیثیت سے خاصے عرصے تک حکومت کا ملازم رہا، حالانکہ اسے اس عہدے سے سخت متنفر تھا۔ وہ عاملوں بدخو، بدکردار اور ظالم کہتا ہے۔ افسرِ مال حکومت کی رقم پر ناجائز تصرف کرتا ہے اور مجبور کاشتکاروں کو لوٹتا ہے۔ مصنف خود یہ اعتراف کرتا ہے کہ اس نے کسانوں پر ظلم کیا اور مسلمانوں کی جائداد و املاک تباہ کی۔ اس کے نزدیک کتے ہانکنا اور سؤر چرانا تحصیل وصول سے بہتر کام ہیں[12]

افسرانِ مال کی زیادتیوں پر لعنت بھیجنے کے علاوہ خفی خاں دوسروں افسروں کو بھی مورد الزام ٹھہراتا ہے، جنھوں نے بگڑتی ہوئی سیاسی صورت حال پر، کاشتکاروں کی حالت

بہتر بنانے پر، نئی آبادیاں بسانے پر، اور زمینوں سے آمدنی بڑھانے پر سنجیدگی سے غور کیا۔ اس نے صاف لفظوں میں اجارہ داری یا زراعت برائے آمدنی کی وہ لعنتیں بتائی ہیں جن کی وجہ سے رعیت پریشانی میں مبتلا ہو کر بپتی میں جل گئی اور دیہات ویران ہو گئے۔ وہ بڑے تیکھے انداز میں امیروں پر تنقید کرتا ہے جو ضرورت مندوں کی داد رسی نہیں کرتے، بس اپنی ذات میں محبوس رہتے ہیں اور عیش و عشرت کی زندگی گزارتے ہیں[13]۔

انتظامی تفصیلات نیز کاروبار اور تجارت کے بیانات پر مشتمل ایک کتاب مرات الحقائق ہے[14]۔ اس کا مصنف اعتماد علی خاں بن اعتماد خاں عالمگیری، احمد آباد کا باشندہ تھا، جہاں اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزارا تھا۔ یہ ضخیم کتاب مرات احمدی کے انداز پر لکھی گئی ہے۔ یہ روزمرہ کے ان واقعات اور خبروں کی بیاض ہے جن کا تعلق گجرات اور دارالسلطنت دہلی سے تھا۔ یہ کتاب ایسی تفصیلات کی ایک کان ہے جن کا تعلق ملک کے مختلف حصوں میں رائج قیمتوں سے، اور بعد کے مغلوں کے دور میں حکومت کے عائد کردہ ٹیکسوں سے ہے۔ مراتِ احمدی کے برعکس، اس کتاب میں نہ صرف گجرات کے اقتصادی حالات کا ذکر ہے، بلکہ دہلی، آگرہ اور الہ آباد کا ذکر بھی ہے۔ اس کا مصنف مختلف ابواب میں ان اسباب کی تشریح کرتا ہے جن کے باعث منصب داری نظام ٹوٹ گیا۔ ان منصب داروں کے حالات کا بڑی وضاحت کے ساتھ تجزیہ کیا گیا ہے جن کے پاس یا تو جاگیریں نہ تھیں یا جو اپنی زمینوں پر اپنا اختیار قائم نہ رکھ سکے۔

اس دور کے مورخین کو خیال تھا کہ وقت کی راہ سفر چند منتخب لوگوں کی تعریف و ستائش کرکے اور ان کی تصویروں پر مبالغہ کی رنگ آمیزی کرکے بیان کی جا سکتی تھی۔ اُن کے نزدیک قفلِ تاریخ کی کنجی اُن افراد کے عروج و زوال میں پوشیدہ تھی جنھوں نے سیاسی معاملات کی راہ متعین کرنے میں ایک واضح کردار ادا کیا تھا۔ بادشاہ یا امیر سارے واقعات کا مرکز اور سرچشمہ تھا۔ سماج کے مختلف طبقے وقت کے اندھیرے میں پھینک دیے گئے تھے۔ حالانکہ

یہ محققین مغل تمدن کی مادی بنیاد سے خوب اچھی طرح واقف تھے، پھر بھی یہ ان اقتصادی اور سماجی عنصروں کا تجزیہ نہ کر سکے جو مغل انحطاط کے اسباب میں شامل تھے۔

مغل قوت کے زوال کی تشریح کرتے وقت ان مورخین نے عام طور پر ان چند امرا کی اخلاقی اور سماجی پستی پر زور دیا جو کاہل اور مطمئن بالذات ہو گئے تھے اور اپنے فرائضِ منصبی سے غفلت برتتے تھے۔ مثال کے طور پر، شاہ نامہ دکن کا مصنف احسن ایجاد[15] طبقۂ امرا کے کردار پر تنقید کرتا ہے اور اس کے زوال کا تعلق سیاسی قوت کے انحطاط سے قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ شاہ نامہ دکن میں انتظامیہ اور جنگوں کے بارے میں اس کا بیان گو سرسری ہے لیکن بے لاگ اور درست ہے۔ وہ اورنگ زیب کے جانشینوں کی بداطواری اور عیش پسندانہ زندگی پر، امرا کی گٹھ بندی اور رقابت پر، اور مغل حکومت کے دشمنوں سے نپٹتے وقت ان کے بزدلانہ برتاؤ پر طیش میں آجاتا ہے۔ وہ سپاہیوں، چھوٹے منصب داروں اور کم تنخواہ والے ملازموں کی مفلسی اور مصائب کی بھیانک تصویر پیش کرتا ہے، اور وہ باعزت اور تعلیم یافتہ لوگ اس تصویر میں شامل ہیں جو اپنی روزی کے واسطے حکومت کی سرپرستی پر تکیہ کرتے تھے۔

جب مرہٹوں نے دو اہم اور زرخیز صوبوں، گجرات اور مالوہ، پر قبضہ کر لیا، تو تحصیل وصول کرنے والے چھوٹے افسران اور ملازمین کی ایک بڑی تعداد بے روزگار ہو گئی۔ سیاسی مسائل پر بحث کرتے وقت احسن ایجاد مرہٹوں اور اندرونِ سلطنت دوسری تفرقہ انگیز قوتوں کے خلاف ایک نمایاں اور موثر حکمتِ عملی کی حمایت کرتا ہے۔ دوسرے مصنفین کی طرح، یہ بھی راجہ جے سنگھ کے رول پر ملامت کرتا ہے جس نے مرہٹوں کی بات مان لی، اور جو خاصے وسائل کے باوجود شاہی مقبوضات کو مرہٹوں کی یورشوں سے بچانے میں ناکام رہا۔

لیکن سیاسی، سماجی اقتصادی قسم کے پیچیدہ مسائل کا اس نے جو تجزیہ کیا ہے اس تجزیے میں بصیرت اور گہرائی کم ہے۔ جو کچھ گزرا اس کے اسباب وہ بڑی سادگی سے

دے دیتا ہے، لیکن اس کی تفتیش سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ جو تاریخی عمل رونما ہوئے ان کے پیچھے کیا مقصد تھا یا کیا معقولیت تھی۔ وہ کاشتکاروں کی حالت پر بحث کرنے سے گریز کرتا ہے اور ان برائیوں کی تشریح نہیں کرتا جو مغلوں کے فوجی نظام میں داخل ہو گئی تھیں۔

چونکہ یہ زمانہ سیاسی انحطاط اور اقتصادی پریشانی کا زمانہ تھا، اس لیے تاریخ کی ساری عصری تحریروں پر افسردگی چھائی ہوئی ہے۔ اس دور کے مورخ شاذ ہی ایسا اسلوب اختیار کرتے ہیں جو خطیبانہ اور آراستہ پیراستہ ہو۔ وضاحت اور سادگی اس مقصد کے حصول میں ان کی مدد کر سکتے تھے جو ان کے ذہن میں تھا۔ اُن کا تصورِ تاریخ ان اخلاقی نصیحتوں پر مبنی تھا جس نے لوگوں کی تہذیب اور نظریات پر اثر ڈالا تھا۔ یہ مورخین ماضی سے منتخب کرکے ایسی مثالیں دینا پسند کرتے تھے جن کا مقابلہ اس صورتِ حال سے کیا جا سکے جس کا سامنا بادشاہ اور امرا کر رہے تھے۔ واقعاتِ ماضی سے اخذ کیے ہوئے اخلاقی سبق شاہوں اور سیاسی مدبروں کے سامنے پیش کیے جاتے تھے۔[16] وہ تاریخ کی تشریح اس انداز سے کرنا چاہتے تھے جیسے تاریخ نیک و بد کے درمیان ہونے والی کشمکش ہو۔ یہ گویا فلسفہ بالمثال کی تدریس تھی، کیونکہ جن لوگوں نے انصاف اور عوامی بہبود کے بنیادی اصولوں کی پیروی کی انھیں قوت اور ترقی ملی، اور جو لوگ اس راہِ مستقیم سے بھٹک گئے انھیں اذیت اور تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔

بیشتر مورخوں نے اپنے زمانے کے واقعات خاص طور پر تحریر کیے۔ وہ یا تو دربارِ شاہی کے حاضر باش تھے یا پھر دارالسلطنت میں رہنے والے وزرا کے ملازم تھے۔ ان میں چند مورخ دُور افتادہ صوبوں کے عہدیداروں اور صوبہ داروں کے بھی ملازم تھے۔ اس طرح ان کے پاس وہ عمدہ ذرائع موجود تھے جن کی مدد سے مختلف واقعات کی بابت مناسب اور درست معلومات حاصل کر سکیں۔ جن واقعات کا انھیں براہِ راست طور سے علم نہ تھا، ان کی بابت ان لوگوں سے معلومات حاصل کی جو عینی شاہد تھے۔ تاریخِ ارادت خاں

کا مصنف' ' ارادت خاں' اورنگ زیب کے زمانے میں پہلے جگنا کا اور پھر اورنگ آباد کا اور مانڈو کا فوجدار رہا۔ بعد میں شاہ عالم بہادر شاہ کے دور میں اسے دو آب کا صوبیدار مقرر کر دیا گیا۔ وہ اپنے دیباچہ میں لکھتا ہے: "اپنے عہدے کے سبب' اور چونکہ میں خود ان معاملات میں شامل رہا ہوں۔ اس لیے بیشتر واقعات کے ذرائع کا مجھے مکمل ہو گیا ہے' اور جن واقعات کی اطلاع بھی دوسروں کو بڑی مشکل سے ملے گی' ان کے منصوبے میرے سامنے بنے اور ان پر میری نظروں کے سامنے عمل درآمد ہوا۔ اور چونکہ میں سارے خطروں اور مصیبتوں میں شریک رہا اور دیکھتا رہا' اس لیے میں نے انھیں درج کر لیا۔"[17]

ان مورخوں کے پاس جو تاریخی مواد موجود تھا اسے تحریر کرتے وقت انھیں اپنے سے پیشتر کے مورخین کی کتابوں سے بڑی ہدایت ملی۔ سابق مورخین کی کتابیں بڑی تعداد میں ان مورخیں کے کتب خانوں میں موجود تھیں۔ خفی خاں سچائی کا چونکہ پُرجوش حامی تھا اس لیے اس نے زور دیا کہ ہر شہادت کی مکمل تحقیق کرنا ضروری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر مورخیں کا یہ فرض ہے کہ وہ حقائق کو دیانت داری اور خلوص کے ساتھ تحریر کرے "اسے (مورخ کو) یہ نہیں کرنا چاہیے کہ ایک کا پاس کرے اور دوسرے سے دشمنی۔"[18] مرات وریدات کا مصنف' شفیع وارید' دعوا کرتا ہے کہ اس نے وہ واقعات اور حادثات تحریر کیے ہیں جو یا تو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھے یا دوسروں سے سنے۔ اس نے بڑی کاوش سے دوسروں کے بیانات کی تفتیش کی اور جو بیانات پوری اور گہری چھان بین کے بعد غلط ثابت ہوئے انھیں رد کر دیا۔[19]

ان مورخیں نے جن طریقوں سے مواد اکٹھا کیا وہ طریقے عام طور پر دوسروں سے مختلف اور ان کے اپنے طریقے تھے' اور ہر چند کہ حقائق ایک ہی تھے لیکن ان کی ترجمانی مختلف تھی۔ یہ اختلافات مختلف صورت حال' مختلف سماجی پس منظر اور مختلف سیاسی مفاد کے باعث رونما ہوئے درباریوں اور امیروں کے گروہی جھگڑوں میں وہ کسی نہ کسی

فریق سے وابستہ ہوگئے۔ اپنے سرپرستوں کے مفاد سے وابستہ ہوجانے کے سبب اُن کا اندازِ فکر متاثر ہوگیا۔ لہٰذا، سیاسی قوتوں کے جوڑ توڑ کے بارے میں ان کی تشریحات اسی عنصر داخلیت سے متاثر ہوگئیں۔

ان سب مصنّفین کا عقیدہ یہ تھا کہ تاجِ مغل ایک مقدّس ادارہ تھا، جو ملک پر ہمیشہ حکومت کرنے کے لیے مقدر ہوچکا تھا، اور اسی بنا پر وہ حکمراں طبقے کی قوت اور استحکام کی علامت تھا، اور زمانہ سازوں نیز قوت فروشوں کی غارت گری سے لوگوں کو محفوظ رکھنے کی آخری ڈھال تھا۔ لیکن جس دَور کی ہم بات کر رہے ہیں، اس دَور میں بادشاہ کی حیثیت گروہی سیاست کی بساط پر گھٹ کر ایک بے زور پیدل کی سی ہوگئی تھی۔ فرخ سیر کی معزولی اور وفات نے دِکھا دیا کہ بالآخر وزیروں اور امیروں کو شہنشاہ پر فتح حاصل ہوئی۔ بعد کے مغل تاج داروں کو فنِ حکومت کی پوری تعلیم نہ ملی تھی۔ وہ اس خطرناک بحران کا مقابلہ نہ کرسکے جس سے مغل حکومت برابر دوچار رہی۔

جن عصری مصنّفین نے اپنی نظروں سے دیکھا کہ سلطنت ملکی جھگڑوں کا شکار ہورہی ہے، اور اس کا عظیم ڈھانچہ بغاوتوں اور باہری حملوں کی لہروں کا سامنا کرتے کرتے بالآخر ٹوٹ رہا ہے، انھوں نے شہنشاہوں کی غیر دانشمندانہ پالیسیوں اور ان کے بُرے ملکی انتظام پر لعنت ملامت کرتے وقت جھجک سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے فوجی مہموں اور ملکی انتظام کے بارے میں بادشاہوں کے نامناسب اور بے موقع اقدامات پر کُھلم کُھلا تنقید کی۔ حتیٰ کہ ان معاملات پر بھی سخت تنقید کی جن کا تعلق ان کی نجی زندگی سے تھا۔ بہادر شاہ پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ مستحق اشخاص کو قوت و اقتدار کے عہدے اور تحائف دینے میں بڑی فیاضی برتتا ہے۔[20] جہاں دار شاہ کو ایک اوباش شرابی کی تصویر میں پیش کیا گیا۔[21] اور فرخ سیر کو تلون کا غلام کہا گیا۔[22] محمد شاہ پر یہ الزام لگایا کہ آرام طلبی اور بے اعتدالی کی وجہ سے وہ اس لائق نہیں رہ گیا کہ مطلبی امرا کو قابو میں

رکھ سکے۔[23]

اس کے باوجود مورخین کو امرا کا کوئی ایسا کام برداشت نہ تھا جسے نافرمانی کہا جا سکے۔ انھوں نے ان مقامی قائدوں کے خلاف کھل کر اپنی خفگی کا اظہار کیا ہے جنھوں نے اپنی قوت کے بل بوتے پر ان فوائد میں حصہ بٹانا چاہا جو سلطنت کے نام پر انھیں حاصل ہو سکتے تھے۔[24] مرکز اور صوبوں کے درمیان ہونے والی برتری کی جدوجہد میں مورخین دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ کچھ مورخین مرکزِ سلطنت کے پُرجوش حامی ہیں اور کچھ دوسرے مورخین مقامی سرداروں اور صوبیداروں کی حمایت کرتے ہیں۔ جن مورخین نے اپنی تاریخیں دکن میں تالیف کی ہیں جیسے قاسم اورنگ آبادی، معاصر نظامی کا مصنف، سسارام، تاریخِ فتحیہ کا مصنف، یوسف محمد خاں، نیز کچھ اور مورخین، انھوں نے مرکز سے تصادم کے معاملے میں نظام الملک کی حمایت کی۔ لیکن آشوب، رستم علی، شفیع جاوید، مرزا محمد جیسے مصنفین نے مرکزی نقطۂ نظر کی تائید کی۔ بہرحال ایسا لگتا ہے کہ وہ تاجِ مغل کے وفادار تھے، اس شخص کے نہیں جو اسے پہنتا تھا۔

حکمراں طبقے نے ذہنی تھکاوٹ اور تخلیقی قوت کی کمی کا اظہار کیا۔ شاہانِ مغلیہ کی خدمت کے پُرانے جذبے کی جگہ ریاست کے خودغرضانہ استحصال نے لے لی۔ بڑے بڑے امرا نے سارے اعلا سرکاری عہدوں پر قبضہ کر لیا، بڑی بڑی زمینیں جاگیروں کی شکل میں اپنا لیں اور شاہی قوت کی جڑ کاٹ دی۔[25] چھوٹے منصب دار ذلّت اور تنگ دستی کی زندگی گزارنے لگے۔[26] امرا کا ایک نیا طبقہ، جو خاندان یا لیاقت کی بنیاد پر کوئی حقوق طلب نہ کر سکتا تھا، عروج پا کر قوت اور اختیار کے مقامات پر پہنچ گیا۔[27] جتھے بند اور بداطوار امرا وقت کی چنوتیوں کا سامنا کرنے میں سخت ناکام رہے۔ سماج کے وہ منتخب حضرات جو سیاسی ذہن رکھتے تھے عملت کی نیند سوتے رہے اور پورے دور حالتِ جمود میں رہے۔ ان کا ذہن مریض، نظر کوتاہ اور اخلاقی کیفیت برباد ہو گئی اور پورے طبقے کی ساری انفرادیت ختم سی ہو گئی۔ طبقہ امرا کا گروہوں میں تقسیم ہو جانا، عوام سے علاحدگی اختیار کر لینا، اور فلاحِ عام سے لاپرواہی برتنا، ان

سب باتوں کی وجہ سے پورے طبقہ امرائے زوال کے واسطے زمین ہموار ہوگئی۔

طبقہ امرائے اس تنزل کو عصری مصنفین نے بڑی صاف گوئی کے ساتھ پیش کیا ہے، اور بعض اوقات بڑی سخت زبان استعمال کی ہے۔ مرہٹوں کے معاملات پر بحث کرتے وقت، تبصرہ ورید تحریر کرتا ہے کہ صوبۂ آگرہ میں پانچ سے سات ہزار ایسے منصب دار رہتے تھے جن کے پاس بڑی فوجیں تھیں۔ اسی علاقے میں بہت بڑی تعداد ایسے زمینداروں کی تھی جن کے پاس خاصے لوگ اور ساز و سامان تھا۔ لیکن یہ سارے منصب دار اور زمیندار صوبۂ آگرہ کے گاؤں اور شہروں کو مرہٹوں کی لوٹ مار سے نہ بچا سکے۔[28] حدیقۂ نادر شاہ کا مصنف لکھتا ہے کہ "حکومت کے معاملات بگاڑ دیے گئے تھے۔ شہنشاہ کے وزیروں نے، جیسے قمرالدین خاں اور خانِ دوراں جو اعلا رتبوں اور دولت کی فراوانی کے باعث غرور کے نشے میں چُور تھے، حکومت کے معاملات کو نظرانداز کیا تھا۔ وہ آرام طلب تھے، کوئی ان کی عزت نہ کرتا تھا۔ نہ خود وہ بادشاہ سے خائف تھے، اور بُرے کاموں میں ملوث رہنے کے علاوہ ان کا کوئی کام نہ تھا۔"[29]

ایک ایسے ماحول میں جو گروہی جھگڑوں سے پُر تھا، مورخین مجبور ہوگئے کہ اپنے گروہ کے قائدوں پر نظر رکھیں، اپنے سرپرستوں کی طرف داری کریں اور ان کے دعوؤں کی تائید کریں۔ اس جانبدارانہ سیاست نے ان کا صحیح ادراک ختم کر دیا اور ان کے اُفقِ خیالات پر پردہ ڈال دیا۔ تاریخ کا کینوس سمٹ کر اس معمولی سانچے تک محدود ہوگیا کہ حکمراں مملکت میں کون سا گروہ کسی شخص یا گروہ کے ساتھ ہے۔ اس مباحثے کا پوری سماجی زندگی کے وسیع تر پہلوؤں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ تاریخ گھٹ کر محض مجموعۂ حقائق بن گئی جس کو سیاسی رسالوں کی طرح پڑھا جاتا اور اُسے امرائے کسی ایک گروہ کے مفاد میں حکمراں طبقے کے کسی دوسرے گروہ کے خلاف ایک موثر حربے کی طرح استعمال کیا جاتا تھا۔ حق کی چھان بین اور تاریخی مواد کی فراہمی اور استعمال کی اہمیت سمجھنے کے واسطے جس تنقیدی شعور کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں کم تھا۔

اس مشاہدے کی وضاحت کے لیے تین مخصوص مثالوں کا انتخاب کیا گیا ہے، ان مثالوں سے ظاہر ہوگا کہ نزاعی مسائل کی ترجمانی کتنے مختلف انداز میں کی گئی ہے۔ یہ مثالیں مندرجہ ذیل ہیں۔

(I) فرخ سیر اور سید برادران کے درمیان تصادم

(II) مغلوں اور سادات بارہا کے درمیان حصولِ قوت کے واسطے مقابلہ

(III) ہندوستان پر نادر شاہ کے حملے کے وقت مختلف امرا کا رول

ان مخصوص مسائل تنقیدی مطالعہ ہمیں یہ طے کرنے میں مدد دے سکتا ہے کہ ہمعصر مورخین کے ذہن کن تعصبات سے متاثر ہوئے۔

(I) فرخ سیر اور سید برادران کے درمیان جو طویل تصادم ہوا، اس کے باعث شاہی دربار پر تقریباً مستقل خوف اور بے چینی چھائی رہی۔ اپنی بقا کے واسطے سخت مقابلے میں مصروف رہنے کے باعث شہنشاہ اور اس کے وزیروں نے ملکی انتظام کی طرف توجہ نہ دی اور ایک دوسرے کے خلاف منصوبے بنانے میں منہمک رہے۔[30] ہوشیاری اور استقلال کی ملی جلی حکمت عملی کی بنا پر سید برادران نے اپنا اثر قائم کر لیا اور سارے معاملات کو پورے طور سے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اٹھارہویں صدی کے مورخین جب ان عظیم واقعات کو تحریر کرتے ہیں تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ انتخابِ حقائق اور ان کی ترجمانی کے معاملے میں ان کے رویے جدا جدا ہیں مصنفین کی ایک جماعت سید برادران کے برے کاموں پر سخت تنقید کرتی ہے، اور اس کے برعکس بعض دوسرے مصنفین حکومت کی ساری برائیوں کی مکمل ذمہ داری فرخ سیر کے کاندھوں پر ڈالتے ہیں۔ سید برادران کی نافرمانیوں کے باعث، نیز حصولِ قوت کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش اور انتظامی فرائض کی ادائیگی سے لاپرواہی کے باعث، ان کا ذکر بڑی حقارت سے کیا جاتا ہے۔[31] اسی طرح فرخ سیر پر الزام لگایا جاتا ہے کہ اپنے طاقتور وزیروں سے نپٹتے وقت اس نے کمزور اور ناپائیدار حکمتِ عملی اپنائی۔[32]

خفی خاں واضح طور پر یہ لکھتا ہے کہ سیّد عبداللہ اور حسین علی کو اعلا فوجی اور مالی عہدے دے کر فرخ سیر نے سخت غلطی کی کیونکہ ان دونوں کو انتظامی امور کی نہ کوئی تربیت ملی تھی نہ اس کا انھیں تجربہ تھا۔[33] اس سے برخلاف، قاسم لاہوری، جو خود کو سادات کا غلام کہتا ہے، سیّدوں کا پُرجوش حامی ہے اور شہنشاہ کو موردِ الزام ٹھہراتا ہے جس نے سیّدوں کے خلاف سازشیں کر کے اور ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر انھیں اپنا سخت مخالف بنا لیا۔[34] مرزا محمد[35] اور شفیع وارید[36] کا بیان یہ ہے کہ سیّدوں کے عروج پر جب ایسے امرا کو حسد ہونے لگا جیسے میر جملہ، جو مُغل تھا اور خانِ دوراں جو ہندی نژاد مسلمان تھا تو انھوں نے پسِ پردہ سازشیں کرکے اور اپنے اختیارات برقرار رکھنے کا تہیّہ کر لیا۔ ان امرا نے شہنشاہ کو وزیر اور میر بخشی کے خلاف اُکسایا، اور اس طرح دربار میں جھگڑے پیدا کر دیے۔

فرخ سیر کا میر منشی، یحییٰ خاں، کچھ اور باتیں بھی تحریر کرتا ہے جن کی وجہ سے بادشاہ اور وزیروں کے درمیان خلیج اور گہری ہو گئی۔ وہ لکھتا ہے کہ وزارت، صدارت اور دیوان کے عہدوں پر تقرری کے جو جھگڑے ہوئے ان کے علاوہ فرخ سیر اجارہ داری شروع کرنے اور جزیہ ختم کرنے کے سخت خلاف تھا۔[37] محمد آشوب پوری صورتِ حال کو ایک فرقہ پرست کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک اس تصادم کا سبب وہ پُرانی دُشمنی تھی جو مغلوں اور بارہے سیّدوں کے درمیان رہی تھی۔ اس کے بموجب، سیّدوں نے سارے اعلا سرکاری عہدوں پر قبضہ کر رکھا تھا اور مغل جو سلطنت کی پشت پناہ تھے، بے روزگاری اور مالی مُصیبتوں کے شکار تھے۔[38]

تاریخِ ہند جو نہایت مختصر اور جامع کتاب ہے، اس کا مصنف رُستم علی خاں دلیری کے اُن قابلِ دید کارناموں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے جو حسین علی خاں نے انجام دیے۔ اس کی سخاوت اور صوفیوں نیز اہلِ علم کی کُھلے دل سے سرپرستی کی بھی بڑی تعریف و توصیف کی ہے۔[39] لیکن آشوب، حسین علی خاں کی خوبیوں اور کارناموں کو نظر انداز کرنا بہتر

سمجھتا ہے۔ وہ بڑی کاوش کے ساتھ اس کے کردار کی خامیاں سامنے لاتا ہے[40] ایک قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ تقریباً سارے ہی مورّخین مرہٹوں، راجپوتوں اور جاٹوں کے معاملے میں حسین علی کی اس مصالحانہ پالیسی کے بارے میں کچھ نہیں لکھتے جس پر وہ عمل پیرا رہا۔ ان کی تحریروں سے سیّدوں کے خلاف تعصّب ظاہر ہوتا ہے، اور سیّدوں نے زمینداروں اور علاقائی سرداروں کے معاملے میں جو طریقِ کار اختیار کیا وہ اِسے غلط رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ یہ دُرست سہی کہ انھوں نے مقامی حکمرانوں سے جس انداز سے روابط قائم کیے تھے اُن کا مقصد یہ تھا کہ فرخ سیر سے کسی کا کوئی تعلّق نہ رہے، لیکن اس حکمتِ عملی کی بنا پر بالواسطہ طور سے ان علاقوں میں شاہی اقتدار کا بول بالا ہوا، جن علاقوں میں جھگڑے فساد کا دَور دورہ تھا۔

جب فرّخ سیر کو سفّاک انداز میں معزول کیا گیا اور اس کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا گیا تو سیّدوں کے خلاف غم و غصّے کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ بادشاہ کے ساتھ جو زیادتیاں کی گئیں ان پر نہ صرف غیر مطمئن امرا برہم ہوئے بلکہ سماج کے ادنا طبقے بھی طیش میں آگئے۔[41] فاتح وزیروں نے مغل تاج کی بے عزّتی کی، سرکاری عہدے اپنے عزیزوں اور رفیقوں سے بھر دیے، اور معزول بادشاہ کی ذات پر سختیاں ڈھائیں۔ اُن مورّخین کے رویّے بھی یک لخت بدل گئے جو اس سے پہلے تک سیّدوں کو حق بجانب ٹھہراتے تھے، اور وہ ان کے بُرے افعال پر لعنت ملامت کرنے کے لیے سخت زبان استعمال کرنے لگے۔ یہ بات میر قاسم لاہوری[42] اور محمد قاسم اورنگ آبادی[43] پر خاص طور سے صادق آتی ہے۔ فرّخ سیر کی کمزور اور غیر مستقل حکمتِ عملی کے بارے میں اپنے سابقہ مشاہدات کے برخلاف، اُن مصنّفین نے ان طریقوں کی مذمّت کرنا شروع کر دی جو سیّدوں نے اختیار کیے تھے۔

(11) ایک اور اہم معاملہ جس پر راویانِ واقعات ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں، اقتدارِ اعلا کے واسطے وہ سخت جدوجہد ہے جو مغلوں اور سیّدوں کے درمیان ہوئی۔ حکمراں جماعت کے دو گروہوں کے درمیان مفادات کے اس ٹکراؤ کی وجہ سے

تسمینہ' اس کی وسعت اور نوعیت سمجھنے کے لیے' اس بات کی تشریح کرنا ضروری ہے کہ مورخ خود کن گروہوں سے وابستہ تھے' ان کے تعلقات اور تحریک ذہنی کے ذرائع کیا تھے جن سے اس کے نظریات متاثر ہوئے۔ بیشتر کتابیں محمد شاہ یا نظام الملک کی سرپرستی میں لکھی گئیں' جو مغلوں کے تسلیم شدہ قائد تھے۔ مثال کے طور پر خفی خاں نے محمد شاہ کے دور میں اپنی کتاب مکمل کی' اور وہ لمبے عرصے تک نظام الملک کے تحت ملازم رہا۔ محمد محسن آشوب مغل بھا' اور اقتدار کی جدوجہد کا بیان مغل نقطۂ نظر سے پیش کرتا ہے۔ محمد قاسم اورنگ آبادی احسن ایجاد' یوسف محمد خاں' مبیم خاں اورنگ آبادی[44] خنسارام اور دوسرے لوگوں نے اپنے روزنامچے اس زمانے میں تالیف کیے جب نظام الملک کا آفتاب اقتدار نصف النہار پر تھا۔

یہ مصنفین' دکن میں حکومت کے ملازم ہونے کے ناتے' اس نظام الملک سے ذاتی وفاداری کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے' جو ان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ سیدوں کے پاس ایسے چند ہی مورخین ہیں جو اُن کے معاملے کی وکالت کر سکیں۔ سیدوں کے حمایتوں کی فہرست میں شاید رُستم علی خاں اور غلام حسین طباطبائی[45] آسکتے ہیں۔ ان مختلف رائیوں پر غور کرتے ہوئے خفی خاں لکھتا ہے:

"فرخ سیر کے زمانے میں لوگوں نے ایک یا دوسری جانب وہ جانبداری یا دشمنی دکھائی ہے جس کا کوئی حد و حساب نہیں' ان کی نظر اپنے فائدے یا نقصان پر رہی ہے' اور اپنے اسپ تصور کو اسی کے مطابق موڑ دیا ہے۔ ایک جانب کی ساری خوبیوں کو غلطیوں میں بدل دیا ہے' اور دوسری جانب کی غلطیوں سے آنکھیں موند لی ہیں۔"[46]

خفی خاں یہ لمبے چوڑے دعوے کرتا ہے کہ واقعات تحریر کرتے وقت اس نے دیانت داری اور صاف گوئی سے کام لیا ہے' پھر بھی نظام الملک کے واسطے اپنی ہمدردیوں کو چھپا نہیں پاتا۔ وہ اپنے سرپرست کی غلطیوں کی بے جا تاویلیں کرتا ہے اور اس

کے دشمنوں کو قصور وار ٹھہراتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نظام الملک اس خیال کا مخالف تھا کہ سید برادران کو نمک بہ حرام اور حرام نمک کہا جائے۔[47] لیکن نظام الملک نے شہنشاہ اور اپنے دوستوں نیز ماتحتوں کو جو عرضداشتیں اور خطوط بھیجے ان میں سے ہر ایک میں اس نے ان دونوں بھائیوں کے لیے خود یہ کلمات ناز یبا استعمال کیے۔[48]

(iii) یہ مورخین اس بات پر بالکل متفق نہیں ہیں کہ نادر شاہ نے 1738ء میں ہندوستان پر جو حملہ کیا اس کی دعوت آیا سادات خاں اور نظام الملک نے دی تھی یا یہ کہ خان دوراں نے صورت حال بگاڑ دی اور ایرانی حملے کے سیلاب کی روک تھام کے لیے جو تیاریاں ضروری تھیں ان کی طرف سے سخت غفلت برتی۔ رسالہ محمد شاہ و خانِ دوراں کے گمنام مصنف اور جوہر صمصام کا مصنف ان دونوں اعلا مغل امیروں پر کھلے طور سے غداری کا الزام لگاتے ہیں کہ اس نے کابل اور لاہور کے صوبیداروں کی مالی امداد نہ کی جس کی وجہ سے شمالی مغربی سرحد کے دفاعی مورچے مضبوط نہ کیے جا سکے۔ اس نے ناصر خاں اور ذکریا خاں سے لاتعلقی برتی جس کے سبب بے حسی اور بیجا اطمینان کا ماحول بن گیا، شہنشاہ ایک غلط قسم کے احساس سلامتی سے مطمئن ہو گیا اور سرکاری عہدیدار باہری حملے کا سامنے کرنے کے واسطے جو کوششیں کر رہے تھے وہ ختم ہو گئیں۔[50]

رسالہ محمد شاہ و خانِ دوراں اور جوہر صمصام بڑے رنگین اور مبالغہ آمیز انداز میں لکھی گئی تھیں، اور لگتا ہے کہ ان کے مصنفین نے اپنے سرپرست' خانِ دوراں' کی حیثیت بڑھانے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اس کے مخالفین نظام الملک اور سادات خاں نے کرنال کے میدانِ جنگ میں جو رول ادا کیا' وہ اس پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ قمر الدین خاں جو نظام الملک کا بھتیجہ اور وزیر تھا' اس کا دیوان آنند رام مخلص اور آشوب' جو مغل موقف کا سرگرم حمایتی تھا' یہ دونوں میر بخشی پر تہمتیں لگاتے ہیں اور

اسے باہری حملے سے تباہ کن نتائج کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ امرا کے درمیان جو باہمی عداوتیں تھیں ان کے پیشِ نظر مورخین کے اس سارے بیانات کی بڑے غور سے جانچ کی جانی چاہیے۔ ہمارے پاس کوئی ایسی براہِ راست یا اتفاقی شہادت نہیں ہے جو سادات خاں اور نظام الملک پر لگائے جانے والے غداری کے الزامات کی تائید کر سکے۔

اٹھارہویں صدی کا تاریخی ادب اتنا کثیر ہے کہ ایک مقالے میں پورے طور سے اس کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ بہر کیف، اس ادب کی جانچ فنِ تاریخ نویسی کے جدید معیاروں سے نہیں کرنی چاہیے۔ مورخین نے سطح سے نیچے دیکھے بغیر وہ سب باتیں لکھ دی ہیں جو پیش آئی تھیں۔ وہ باتیں جن کی تشریح یا توکی نہ جا سکی یا جنھیں کسی مصلحت کے تحت چھپایا گیا ان کو مورخین نے اتفاق یا مرضیِ خدا پر یہ کہہ کر محمول کر دیا کہ اس معاملے کی اصلیت اللہ ہی جانتا ہوگا۔ ان افواہوں کے بارے میں کہ نظام الملک کے اشارے پر سیّد عبداللہ کو زہر دے کر مارا گیا، خفی خاں نے اپنے سرپرست کو بچانے کی کوشش کی ہے۔ حقیقت کی چھان بین اور معاملے کی تہہ میں جائے بغیر اس نے یہ فیصلہ کر دیا کہ اصل حقیقت سے اللہ ہی واقف ہے۔ یہ مصنّفین اپنے زمانے کی پیداوار تھے، اور ان کی تحریروں سے اس حکمراں طبقے کے رویّوں اور روایتوں کی عکّاسی ہوتی ہے، جو اس دور کے سیاسی حالات پر فیصلہ کن انداز میں اثر ڈالتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ نواب شاکر خاں، گلشنِ صادق، پٹنہ دستاویز فولیو 44ہ ز نواب صدرالدین محمد خاں فیض، کلیاتِ فیض۔ بوڈلیان دستاویز۔ علی گڑھ روٹوگراف، فولیو 122 تا 125۔

2۔ اعتماد علی، مراتِ حقائق۔ بوڈلیان دستاویز۔ مرزا محمد علی خاں، مراتِ احمدی، گیکواڑ اور ینٹل سیریز، 1927، آسد رام، سیاق نامہ، سینٹرل ریکارڈ آفس، حیدرآباد۔ تھیمی رائن تشفیق، حقیقتِ ہندوستان، آصفیہ دستاویز، حیدرآباد۔ جواہر مل بیکس، دستور العمل بیکس، علی گڑھ دستاویز۔

3۔ موسوی خاں جرأت، منشاتِ موسوی خاں، آصفیہ لائبریری دستاویز، حیدرآباد، منشی دیارام، بالمکند نامہ، پٹنہ دستاویز۔ صائب رائے جمعہ کلام۔ بھگوان داس، عزیز القلوب، علی گڑھ دستاویز۔

4۔ نظام الدین، نادر نامہ، آصفیہ دستاویز۔ احسن ایجاد، شاہ نامہ دکن، آصفیہ دستاویز۔ میر رضا ذوالفقار، شرف نامہ محمد شاہ، بی۔ ایم۔ دستاویز۔

5۔ کیول رام، تذکرۃ الامرا، علی گڑھ دستاویز۔ مرزا محمد، تاریخ محمدی، رام دستاویز۔ شاہ نواز خاں، معاصر الامرا۔ رستم علی خاں، تاریخِ ہندی بی۔ ایم دستاویز، خواجہ گل محمد، تکملہ سیر الاولیا۔

6۔ شاہ ولی اللہ کی کتابوں کی تفصیلات کے لیے دیکھیے، الفرقان، بریلی۔ اسلامک کلچر،

1951 - خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، دہلی 1953 -

محمد بخش آشوب نے 1781 میں لکھا تھا کہ اس دور میں فن تاریخ نویسی متروک ہوچکا ہے۔ لیکن اٹھارہویں صدی کے کثیر تاریخی ادب کی روشنی میں یہ بیان غلط لگتا ہے۔ تاریخِ شہادتِ فرخ سیر و جلوسِ محمد شاہ، بی۔ ایم۔ دستاویز، وولیو، 13 -

8- خفی خاں، منتخب اللباب، سب، اٹڈ کلکتہ، 1874 جلد دوم، صفحات 600، 769 -

9- ایضاً جلد دوم، صفحات 627 تا 628 -

10- معاصر الامرا، جلد اوّل، صفحات 350 تا 352 -

11- منتخب اللباب، جلد دوم، صفحہ 630

12- ایضاً جلد دوم صفحہ 677 -

13- ایضاً جلد اوّل، صفحات 157 تا 158 - ایضاً جلد دوم، صفحات 600 تا 769 -

14- اعتماد علی خاں، مرات حقائق، لوڈلین دستاویز سیتا متورو ٹوگراف۔

15- احسن ایجاد فرخ سیر نامہ کا بھی مصنف ہے، جس میں محض فرخ سیر کے زمانے کی سیاسی تاریخ کا ذکر ہے، بی۔ ایم دستاویز گریہ 25 (ریو 1273a)

16- میر محمد قاسم اورنگ آبادی، احوال خواتین، بی ایم دستاویز، وولیو 103 تا 105 -

17- ارادت خاں، تاریخ ارادت خاں، علی گڑھ دستاویز، وولیو 2 ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن، جلد ہفتم، صفحہ 535 -

خفی خاں اورنگ زیب کے دور میں سرکاری ملازم تھا جب فرخ سیر تخت نشیں ہوا تو اسے نظام الملک کا دیوان مقرر کر دیا گیا۔ وہ اپنے ذریعہ معلومات کی بابت یہ الفاظ لکھتا ہے:

"جو میں نے خود دیکھا، جو اُن لوگوں کی زبان سے سُنا جو وقتاً فوقتاً فرخ سیر سے وابستہ رہے تھے، اور جو سیدوں سے سُنا جو جنگ اور ضیافت میں اس کے شریک رہے تھے،

اسے بڑی دیانت داری سے سپردِ قلم کر دیا ہے۔ اور جب بیانات میں اختلاف معلوم ہوا تو حق تک پہنچنے کی سخت کاوش کی ہے۔"

منتخب اللباب، جلد دوم، صفحہ 727۔ ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن، جلد ہفتم، صفحہ 44۔

18- منتخب اللباب، صفحہ 726۔

19- مراتِ واردات، علی گڑھ دستاویز، صفحہ 10۔

20- منتخب اللباب، جلد دوم، صفحات 601 تا 602، 627 تا 628۔ کامراج بن بیں سنگھ عبرت نامہ، بی۔ ایم دستاویز، علی گڑھ روٹو گراف، فولیو 36a۔

21- نور الدین فاروقی، جہاندار نامہ، بی۔ ایم دستاویز، علی گڑھ روٹو گراف، فولیو 36 تا 38 شیخ محمد معین، فرخ نامہ، بی۔ ایم دستاویز، علی گڑھ روٹو گراف، فولیو 74 تا 75، 89۔

22- مرزا محمد، عبرت نامہ، پٹنہ دستاویز، فولیو 95 تا 96۔

23- یحییٰ خان، تذکرۃ الممالک، بی۔ ایم دستاویز، علی گڑھ روٹو گراف، فولیو 132b۔

24- تاریخِ شہادت فرخ سیر و جلوسِ محمد شاہ، بی۔ ایم دستاویز، فولیو 43a، مراتِ واردات، صفحات 644 تا 645۔

25- اس پہلو پر تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے، اسٹڈیز ان اسلام، دہلی جنوری 1955، صفحہ 33۔

26- احوالِ خواتین، فولیو 181۔ مراتِ حقائق۔ فولیو 92a۔

27- منتخب اللباب، صفحہ 776۔ عبرت نامہ، کامراج، فولیو 46a، 54a۔

28- مراتِ واردات صفحہ 644۔

29- حدیثہ بادشاہ، (گمنام)، آصفیہ دستاویز، فولیو 4a۔

30- کامراج، عبرت نامہ، فولیو 54a۔

31 احوالِ خواتین، فولیو 77a۔ تاریخ شہادت فرخ سیر و جلوس محمد شاہ، فولیو 42a۔
32- مرزا محمد، عبرت نامہ، فولیو 102 تا 103۔ میر قاسم لاہوری، تاریخ سلطنتِ فرخ سیر، بی۔ ایم دستاویز، فولیو 62a۔
33- منتخب اللباب، صفحہ 738۔
34- تاریخ سلطنت فرخ سیر، فولیو 1b، 2a، 66b۔
35- مرزا محمد عبرت نامہ، فولیو 30۔
36- مرات واردات، صفحہ 505۔
37- تذکرۃ الممالک، فولیو 122، 124۔
38- تاریخِ شہادت فرخ سیر و جلوسِ محمد شاہ، فولیو 70a، 43
39- تاریخ ہندی صفحہ 772
40- تاریخ شہادت فرخ سیر و جلوس محمد شاہ، فولیو 38، 42، 43۔
41- شاہ نامۂ منور کلام، فولیو 316۔
42- تاریخ سلطنتِ فرخ سیر، فولیو 76، 77، 80۔
43- احوالِ خواتین، 88a، 145b، 152a۔
44- منیم خاں اورنگ آبادی، سوانحِ دکن، سینٹرل ریکارڈ آفس، حیدرآباد دستاویز۔
45- غلام حسین طباطبائی، سیر المتاخرین، (متن) کلکتہ، II، 1836۔ صفحات 21، 22، 30، 37 تا 39۔
46- منتخب اللباب، صفحہ 726۔
47- منتخب اللباب، صفحہ 940۔

حق ماں مصطفےٰ آباد دکن کے خالصہ محل میں فوجدار اور امین کے عہدوں پر فائز رہا۔ یہ محل برہان پور کے صوبیدار کے افسران نے تباہ کر دیا تھا۔ رعیت بھاگ

گئی تھی اور کاشتکاری ختم ہو گئی تھی، خفی خاں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ محل دوبارہ بسایا اور تحصیل وصول کے لیے سپاہی بھرتی کرنے پر دولت صرف کی۔ 1718 میں دکن کے صوبیدار حسین علی خاں نے دہلی کی سمت کوچ کا ارادہ کیا، جہاں اس کی موجودگی نہایت ضروری ہو گئی تھی کیونکہ وزیر سید عبداللہ خاں اور فرخ سیر کے درمیان تصادم ایک نازک مقام پر پہنچ گیا تھا۔ حسین علی خاں نے توپ خانے کے خرچ کے لیے خفی خاں سے بیس ہزار روپے طلب کیے۔ چونکہ خریف کی فصل ابھی کٹی نہیں تھی، اس لیے خفی خاں مطلوبہ رقم فراہم نہ کر سکا۔ صوبیدار نے یہ رقم دوسرے ذرائع سے حاصل کی اور مورخ کو برخواست کر دیا۔ اس عہدے سے برطرفی جسے خفی خاں نے بڑی مشکلات کا سامنا کر کے حاصل کیا تھا، غالباً اس کے ذہن میں کھٹکتی رہی اور وہ حسین علی خاں سے بدظن ہو گیا۔ جلد دوم، صفحہ 798۔

48۔ منتخبات موسوی خاں، فولیو 48، 51۔

49۔ رسالہ محمد شاہ و خان دوران، گمنام، بی۔ ایم دستاویز، فولیو 100، 103 تا 105۔ محمد محسن، جوہر صمصام، بی۔ ایم دستاویز یا 1898، ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن، جلد ہشتم، صفحہ 75۔

50۔ آنند رام مخلص، تذکرہ، علی گڑھ دستاویز، فولیو 119 تا 120۔ تاریخ شہادت فرخ سیر و جلوس محمد شاہ، فولیو 162، فولیو 162، تا 164۔

محمد قاسم اور خفی خاں کے تاریخی اندازِ نظر کا ایک تقابلی مُطالعہ

مُحمّد عُمر

محمد قاسم اور خفی خاں اٹھارہویں صدی کے دو مورخ ہیں۔ یہ دَور شدید سیاسی سرگرمی، درباری سازشوں اور درباریوں کے پوشیدہ تعلقات، سیاسی گٹھ بندیوں نیز امرا اور گروہوں کی بدلتی ہوئی وفاداریوں، اور سب سے زیادہ یہ کہ مُغل سلطنت کے تیز رفتار سیاسی اور معاشی زوال کے لیے مشہور ہے۔

محمد قاسم اور خفی خاں نے اسی سیاسی منظر کا دو مختلف زاویوں سے مطالعہ کیا ہے۔ اسی لیے اگر ہم اُن کے نظریوں، رَویّوں اور تعصّبات نیز معلومات فراہم کرنے اور اسے پیش کرنے کے طریقوں کا مطالعہ کریں تو ہمیں اٹّھارہویں صدی کی تاریخی تحریروں کا دُرست اندازہ لگانے میں مدد مل سکتی ہے۔

محمد قاسم کے بارے میں عصری ادب سے بہت کم معلومات حاصل ہوتی ہے۔ وہ غالباً اہلِ علم اور مورّخ کی حیثیت سے بہت مشہور نہ تھا۔ وہ ہمیں خود یہ بتاتا ہے کہ کچھ عرصے تک وہ شاہ عالم (بہادر شاہ) کے بیٹوں کے ساتھ بہار میں رہا، جہاں وہ شہنشاہ کے بھتیجوں، علی تبار اور بیدار کی خدمت پر مامور تھا۔ اس نے اس کی بہت خدمت کی اور ان کا منظورِ نظر بن گیا، اور آخر کار انھوں نے اس سے وعدہ کیا کہ اگر ان میں سے کوئی ہندوستان کا شہنشاہ بنا تو اسے اعلا عہدہ دیا جائے گا۔

محمد قاسم نے اورنگ آباد میں امیرالامرا حسین علی خاں سے ملاقات کے کئی موقع نکالے، جہاں وہ اپنے بیٹے کی شادی میں شرکت کے لیے گیا ہوا تھا لیکن پھر اسے اوّل الذکر کے غرور کی بنا پر اس سے تنفر پیدا ہو گیا۔

اس کے بعد ان دنوں جب نظام الملک مرہٹوں سے برسرِ پیکار تھا، وہ اس کی فوج میں بخشی بن گیا۔ اسے نظام الملک کی حمایت اور اعتماد حاصل ہو گیا تھا اور وہ اس کی ادبی محفلوں میں شریک رہنے لگا تھا۔ لہٰذا احوال الخواتین میں اس نے جو معلومات فراہم کی ہے وہ ذاتی مشاہدے پر مبنی ہے۔ اس نے نظام الملک کے داماد، متوسل خاں (وفات 1158ھ مطابق 44-1743ء) سے، جو بگلانہ کا صوبیدار تھا، بڑی گہری دوستی پیدا کر لی تھی۔

احوال الخواتین 1151ھ مطابق 39-1738ء تک اورنگ زیب کے جانشینوں کی تاریخ ہے، اور یہی سال اس کتاب کا سالِ تکمیل بھی ہے۔ یہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ جس میں اورنگ زیب کے دور سے فرخ سیر کی معزولی تک کا ذکر ہے، 2 رمضان 1147ھ مطابق 35-1734ء کو مکمل ہو گیا تھا۔ دوسرا حصہ رفیع الدرجات کی تخت نشینی سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں خاص طور سے نظام الملک اور سیّد برادران کا تصادم نیز نظام الملک اور مرہٹوں کی جنگوں کا ذکر ہے۔ اس کا بیان نادر شاہ کے حملے سے پہلے 1151ھ مطابق 39-1738ء کے واقعات پر ختم ہو جاتا ہے۔

محمد ہاشم خفی خاں، منتخب اللباب کا مصنّف ہے، دہلی کے ایک باعزت خاندان سے تعلّق رکھتا تھا۔ اس کا والد خواجہ میر بھی مورّخ تھا۔ وہ پہلے شہزادہ مراد بخش کے تحت اور پھر اورنگ زیب کی ملازمت سے اپنی ترقّی کی ابتدا کی۔ اورنگ زیب نے اسے سیاسی اور فوجی امور پر مامور کیا تھا۔ فرخ سیر کے دَور میں وہ نظام الملک کا دیوان بنا دیا گیا تھا۔

منتخب اللباب نہایت اعلا درجے کی تاریخ ہے۔ اس میں بابر کے حملے سے محمد شاہ کے دور کے چودھویں برس تک کا بیان ہے۔ چونکہ اورنگ زیب نے ممانعت کرا دی تھی کہ اس کے زمانے کے واقعات درج نہ کیے جائیں اس لیے خفی خاں نے اس دور کے سارے چھوٹے بڑے واقعات ایک رجسٹر میں درج کر لیے اور شہنشاہ کی وفات کے بعد اسے چھپوایا۔ اس کی کتاب بڑی قابلِ قدر ہے کیونکہ اس میں اورنگ زیب کے دور کا مکمل بیان ہے۔

خفی خاں شیعہ تھا،[1] اور اسی بنا پر اس نے اپنی کتاب میں شیعہ امرا کی طرف داری کی ہے۔ وہ سوائے نظام الملک کے سارے تورانی امرا سے تعصب رکھتا ہے۔ نظام الملک کا وہ ملازم تھا، اور اس کی تعریفوں سے معمور ہے۔ اسی جانبداری کی وجہ سے اسے بعض اوقات نظام الملکی کا نام دیا جاتا ہے۔

خفی خاں ہمیں وہ اصول اور طریقے بتاتا ہے جو اس نے اپنی کتاب لکھتے وقت استعمال کیے۔ وہ کہتا ہے کہ مورخ پر لازم ہے کہ وہ دیانت داری سے کام لے۔ اسے انعام کی توقع اور نقصان کے خوف سے بالاتر ہونا چاہیے۔ وہ کہتا ہے کہ تاریخی تحریروں میں جانبداری کی ابتدا فرخ سیر کے دور سے ہوئی۔ جب مفاد پرستوں نے صورتِ حال سے فائدہ اُٹھایا اور جانبدارانہ بیانات تحریر کیے اور واقعات کا بیان اور ان کی اہمیت باہمی رقابت کی بنا پر طے کی گئی۔ ایسے لوگوں نے محض اپنے مفاد پر نظر رکھی اور حقیقت کے تقاضوں کو مسترد کر دیا۔ مخالف گروہوں کی خوبیوں کو برائی بنا کر پیش کیا گیا اور اپنے گروہ کی برائیوں کو خوبیاں بنا دیا گیا۔ اس کے بعد خفی خاں تاریخ کے بارے میں اپنے اندازِ نظر اور طریقِ کار کا ذکر کرتا ہے۔

''میں نے نقصان کے خوف سے نہ دوستوں کی حمایت کی ہے، نہ دشمنوں کو برا بھلا کہا ہے۔ میں نے کسی وزیر یا امیر کو محض خوش کرنے کے لیے کوئی بات نہیں کی ہے۔ میں نے صرف وہ تحریر کیا ہے جو یا تو خود دیکھا ہے یا اُن لوگوں سے سُنا ہے جن کی فرخ سیر یا سید برادران

کی محفلوں تک رسائی تھی، اور جو اُن کی سرگرمیوں سے پورے طور سے واقف تھے۔ مختلف ذریعوں سے حاصل کی ہوئی معلومات کی خوب اچھی طرح چھان بین کرنے کے بعد میں نے وہ تحریر کر دیا ہے جو مجھے سچ لگا۔[2]

مندرجہ بالا سطور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمد قاسم اور خفی خاں دونوں نظام الملک کے تحت ملازم رہے، اور اس حد تک دونوں کا پسِ منظر ایک جیسا ہے۔ اپنی کتابوں میں انھوں نے دوسری باتوں کے علاوہ اس زمانے کے سیاسی منظر کا ذکر کیا ہے۔ خفی خاں اپنا بیان مُغل سلطنت کی ابتدا سے شروع کر کے محمد شاہ کے دَورِ حکومت کے چودہویں برس پر ختم کرتا ہے۔ محمد قاسم اورنگ زیب کی وفات سے اپنے زمانے تک سیاسی واقعات کا جائزہ لیتا ہے۔ تاریخی اندازِ نظر، معلومات پیش کرنے کا انداز صورتِ حال کے تجزیے نیز دوسرے بہت سے معاملات میں یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ خفی خاں کے نزدیک تاریخ فہرست واقعات کے مترادف تھی، جن واقعات کو بڑے واضح انداز میں تاریخ وار ترتیب میں پیش کیا جانا چاہیے۔ محمد قاسم کا خیال تھا کہ صورتِ حال کا تجزیہ کرنا چاہیے، سببی تعلقات تلاش کرنے چاہئیں، اور سارے جھگڑوں کا منبع درباری سیاست کو سمجھنا چاہیے۔ وہ شہنشاہوں کی زندگی، محل کی سازشوں، دربار کے سازشی گروہوں کی تفصیلات بیان کرتا ہے۔ اور پھر یہ بتاتا ہے کہ اُن کا عوام کی زندگی اور انتظامیہ پر کیا اثر پڑا۔ خفی خاں کہیں بھی خاص طور سے یہ اشارہ نہیں کرتا کہ سیاسی انتشار اور انتظامی افراتفری کو بڑھاوا دینے میں مغل شہنشاہوں نے کیا رول ادا کیا۔ اس کے نزدیک تاریخ محض حقائق کا انبار ہے جس میں کوئی ربط اور یکسانیت نہیں ہے۔

ملک میں جو افراتفری اور انتشار پھیلا ہوا تھا اس کا ذمے دار شہنشاہ کو ٹھہراتے ہوئے محمد قاسم کہتا ہے:

"بادشاہ عورتوں کی طرح چہار دیواری (محل کی) میں بیٹھا ہوا ہے۔ اگر بادشاہ

عورتوں کے اندار اختیار کر لیں، اور نامردوں کے مشورے پر عمل کرنے لگیں تو پھر لازم یہ ہے کہ مسلمان مکّے اور مدینے کی راہ لیں اور اگر ان کے پاس سفر خرچ نہ ہو تو بہتر ہوگا کہ زہر کھا کر مر جائیں۔"

یہاں وہ سخت کرب اور مایوسی کا اظہار کرتا ہے اور ہمیں یہ بتاتا ہے کہ لوگ کس کسمپرسی کے عالم میں تھے۔

محمد قاسم نے حقی خاں سمیت سارے ہمعصر مصنفین کے مقابلے میں سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ طبقہ امرا کے کردار کا تجزیہ کیا ہے۔ اسے عام طور پر اس دَور کے سارے ہی امرا غدار، دغاباز اور مکّار لگے۔ ان کی وفاداری سطحی تھی اور وہ ضمیر کی آواز پر ذرا بھی کان دھرے بغیر اپنا دل بدل لیتے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ اس دَور کے امرا نہ صرف محض تدبّر سے معرّا تھے بلکہ ہمّت سے بھی عاری تھے، حالانکہ اس سے پہلے کے دور میں ہمّت ہی طبقہ امرا کا امتیاز تھی۔ محمد قاسم کا خیال تھا کہ سماج میں انتشار، اختلافات اور عدم استحکام کا اصل منبع درباری جھگڑے اور سازشیں تھیں جو محل سے چھوٹ کر جھونپڑیوں تک پہ آ گئی تھیں اور سارے ماحول کو تصادم اور تناؤ سے بھر دیا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

"وہ بادشاہ جس کے امرا ایک دوسرے کے جانی دشمن اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں، زیادہ دن بچ نہیں سکتا۔ بادشاہوں کو لازم ہے کہ عیش و عشرت سے پرہیز کریں۔ انھیں اپنا وقت امورِ سلطنت پر صرف کرنا چاہیے۔ انھیں چاہیے کہ سلطنت کے اہم اور غیر اہم معاملات کی چھان بین کریں۔ کسی امیر کو یہ اجازت نہیں دینی چاہیے کہ وہ ان پر حاوی رہے۔ ان کی تقرری اور ترقی کا معیار لیاقت اور قابلیت ہونا چاہیے، چاپلوسی نہیں۔ انھیں یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ کوئی بادشاہ کی ذات کا وفادار ہے یا وفادار نہیں ہے، وہ اس گروہ سے تعلق رکھتا ہے یا اُس گروہ سے۔ اسی صورت میں بادشاہ ان مصیبتوں اور آفتوں سے بچ سکتا ہے جو چاپلوسوں کی درباری سازشوں اور جعل سازیوں کے جلو

میں آتی ہیں۔[4]

محمد قاسم بادشاہوں کے اُن فرائض کی بھی تشریح کرتا ہے جنہیں وہ ترک کر چکے تھے اور جس کے نتیجے میں ایک طرف تو خود اُن پر اور ان کے عوام پر ناقابلِ بیان مصائب ٹوٹے تھے اور دوسری طرف ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ اس کا مشاہدہ یہ ہے:

"شہنشاہوں کے لیے یہ اور بھی زیادہ لازم ہے کہ خود کو مصروف رکھیں (انتظامی معاملات میں) اور اَدنا معاملات پر اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ خصوصاً انھیں اپنا زیادہ وقت سپاہیانہ مشاغل اور تاریخ کی کتابوں کے مطالعے پر صرف کرنا چاہیے اور اس مقولے سے ایک انچ نہ ہٹنا چاہیے، کہ ایسی مثالوں سے سپاہیوں کو سبق ملتا ہے۔ اس سے فوج کی قوت اور استحکام بڑھتا ہے۔ یہ توقع نہ رکھنی چاہیے کہ ایک آدمی دس آدمیوں کا کام کر سکتا ہے۔ تاریخ مطالعے سے انسان کی رسائی سابقہ تجربات و مسائل نیز (گزرے ہوئے شہنشاہوں کے) قابلِ قدر اقدامات تک ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ایک طرف وفاداری اور دوسری طرف دولت، عزت و وقار نیز اعلا مرتبے کے درمیان ہمیشہ دُشمنی رہتی ہے۔ یہ چیزیں اس وقت تک بُری نہیں ہوتیں جب تک کوئی شخص اندازِ شاہانہ اختیار نہ کرنے لگے۔ اگر وہ غرور اور غلط کاری کی راہ اختیار کرتا ہے تو خود خُدا اُسے سزا دیتا ہے۔ اسے انصاف اور مساوات کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے کیونکہ ان ہی سے دائمی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اور بُرے خیالات کو اپنے دِل میں جگہ نہ دینی چاہیے۔"[5]

محمد قاسم نے جہاندار شاہ کے زمانے میں پُرانے اور نئے امرا کے درمیان جو تصادم اور جھگڑے تھے ان پر بھی خوب روشنی ڈالی ہے۔ خفی خاں نہیں محض یہ بتاتا ہے کہ امرا دو گروہوں، ایرانیوں اور تورانیوں میں تقسیم تھے۔ لیکن محمد قاسم طبقۂ امرا اور ان کے جھگڑوں کو یوں تقسیم کرتا ہے کہ ایک طرف پُرانے باعزت مغل امرا تھے اور دوسری طرف نو دولتوں کے نئے طبقے جن کو وہ نو دولتاں کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"وہ خواہ جو بھی ہوں، انھوں نے سیاہ رُخ، بے مغز، چاپلوسیوں اور چغل خوروں

کی رائے پر عمل کیا اور دین و دُنیا دونوں سے ہاتھ دھوئے۔ کیا ہمیں نظر نہیں آتا کہ کتنے ملک اور (انتظامی ادارے) ایسے ہی رُسوائی کرنے والے بداعمال لوگوں کے باعث تباہ ہوگئے؟ انھوں نے اپنے فرمان (وہ جگہ جہاں فصلیں کاٹ کر ڈھیر کر دی جاتی ہیں) بھرنے کے لیے بادشاہ کی فصل (فصلیں) تباہ کر دی۔"[6]

حقی حال کے مطابق اس دور کے جھگڑوں کی تشریح یہی کہہ کر کی جا سکتی ہے کہ یہ جھگڑے ایرانیوں (شیعہ) اور تورانیوں (سُنّی) کے درمیان تھے۔ لیکن محمد قاسم کی رائے میں اس طبقے نے سیاسی توازن بگاڑا تھا جو گمنامی اور خراب سماجی پس منظر سے اُبھر کر نیا نیا اُوپر آیا تھا۔ اپنے اس دعوے کی حمایت میں وہ ذیل کی مثال دیتا ہے:

"وزیر مقرر کیے جانے کے بعد، نظام الملک نے، جو انتظامیہ کی خامیوں سے خوب واقف تھا، محمد شاہ کو چند ایسے اقدامات کرنے کا مشورہ دیا جن کی مدد سے وہ خرابیاں دُور کی جا سکتی تھیں جو ملک کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہی تھیں۔ اور جن اقدامات کی مدد سے انتظامی اور مالی شعبوں میں نظم اور کارکردگی بحال کی جا سکتی تھی۔ لیکن نو دولتیوں نے ہر اُس کوشش کی سختی اور ضد سے مخالفت کی جو اصلاح کے لیے کی گئی۔ محمد قاسم نے اس مخالفت کے اسباب اور اس کی نوعیت کا بڑے تنقیدی طور سے جائزہ لیا ہے۔" وہ لکھتا ہے:

"وہ یہ کیونکر مان سکتے تھے کہ گھوڑے کے بجائے گدھے کی سواری کریں؟ وہ نو دولتیاں جو اپنے احساسِ کمتری کے باعث ضرورت سے زیادہ اطمینانِ ذاتی میں گرفتار تھے، جنھوں نے تصویر میں یا پردے پر گدھا بھی نہیں دیکھا تھا، اب یک لخت گھوڑوں، دولت اور سماجی رتبے کے مالک بن گئے تھے۔ یہ گروہ اپنے منصوبوں میں کسی کمی کو کیسے برداشت کر سکتا تھا اور کیوں کر یہ مان سکتے تھے کہ گھوڑے کے بجائے گدھے کی سواری کریں؟"[7]

لیکن خفی خاں بٹی ہوئی وفاداری کی ایک دوسری ہی تصویر پیش کرتا ہے کیونکہ نظام الملک سے اس کے تعلقات تھے اور سید برادران کے لیے اس کے دل میں عزت تھی۔ سیدوں سے اس کا تعلق کسی حد تک مشترکہ مذہبی رشتوں کے باعث تھا۔ اسی لیے وہ سید برادران کے افعال کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے تورانی گروہ کو مورد الزام ٹھہراتا ہے۔ ان حالات پر محمد قاسم اور خفی خاں دونوں نے بحث کی ہے جن حالات کے تحت نظام الملک دکن روانہ ہوگیا۔ جو اسباب خفی خاں نے دیے ہیں ان سے نظام الملک کے شمالی ہند چھوڑ دینے کے فیصلے کا پس منظر بالکل بدل جاتا ہے۔ اس بیان سے پڑھنے والے کے ذہن پر یہ تاثر بنتا ہے کہ خفی خاں ثابت کرنا چاہتا ہے کہ نظام الملک کی شمالی ہند میں مسلسل موجودگی عوام کے مفاد میں نہ تھی۔ وہ کہتا ہے کہ کئی ایسی باتیں تھیں جن کے باعث وزیر اور شہنشاہ محمد شاہ میں کشیدگی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ باتیں یہ ہیں:

(1) یہی وہ دور تھا جب مغل دربار میں یہ خبر پہنچی کہ ایران میں سیاسی بے چینی ہے، اور محمد خاں، افغان نے سلطان حسین شاہ پر قابو پالیا ہے اور اسے قید کر دیا ہے۔ اس نے ایران کا خاصہ علاقہ اپنے تحت کر لیا ہے اور عوام ناقابلِ بیان مصائب کا شکار ہیں۔ نظام الملک نے محمد شاہ کے سامنے وہ سارے گزرے ہوئے واقعات دہرائے جب سلاطینِ ایران نے بابر اور ہمایوں کی بڑی مدد کی تھی اس نے شہنشاہ کو مشورہ دیا کہ اپنی فوجیں بھیج کر شاہ ایران کی مدد کرے۔ اس کام کے لیے اُس نے اپنی خدمات پیش کیں۔ لیکن جب شہنشاہ نے لو دولتیے مشیروں سے مشورہ کیا تو انھوں نے نظام الملک کی نیت پر شبہ ظاہر کیا، لہٰذا فوجیں ایران بھیجنے کا منصوبہ ترک کر دیا گیا۔

(2) نظام الملک نے شہنشاہ کو مشورہ دیا کہ نظامِ اجارہ داری ختم کر دے اور خالصہ زمینوں کو جاگیروں کی شکل میں دینا بند کر دے یہ تجویز بھی مسترد کر دی گئی۔

(3) اس نے شہنشاہ کو مشورہ دیا کہ اس کے منھ لگے لوگ اس کے نام سے

جو تحائف دیتے ہیں انھیں وہ قبول نہ کرے، کیونکہ اس سے وہ بدنام ہوتا ہے۔ لیکن یہ رواج بند نہ کیا گیا۔

(۶) وہ چاہتا تھا کہ شہنشاہ جزیہ پھر سے نافذ کرنے پر رضامند نہ ہو ملے۔ لیکن شہنشاہ نے اس تجویز پر ذرا کان نہ دھرا۔[8]

اس کے برخلاف، محمد قاسم ایک بالکل مختلف بیان دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے: کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ محمد شاہ کے رُو برو بے تکلفی سے یہ کیسے کہہ سکتا تھا اس نے یہ علاقہ اپنی تلوار کے زور سے فتح کیا تھا، اور اسی لیے شہنشاہ یہ علاقہ اپنے ادنا خادم کے لیے چھوڑ دے۔ اس کے بجائے اس نے یہ کہا:

"جو عالی جاہ کی مرضی۔" لیکن اسے بڑا دھکا لگا اور وہ تفکرات کے گرداب میں گھر گیا، اور پھر اس نے اپنے آپ کو یوں سمجھایا کہ دکن کے مقابلے میں وزارت مہنگا اور بے معنی سودا ہے، اور پھر کون جانتا ہے کہ میں کتنے عرصے اس عہدے پر فائز رہوں۔" اگر دکن بھی میرے ہاتھ سے جاتا رہا تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔" خود کو یوں سمجھا کر اس نے سیاسی چالیں اور ترکیبیں شروع کر دیں اور دربار سے علاحدگی اختیار کر کے دکن واپس ہو گیا۔[9]

فرخ سیر کی وفات کے بارے میں خفی خاں اور محمد قاسم نے جو مختلف نوعیت کی معلومات فراہم کیں ان میں دو تین ایسے واقعات بیان کیے گئے جن پر غور کرنے سے دونوں کے نقطۂ نظر کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ ان دونوں ہمعصر مصنّفین کے بیانات بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ ان کی تحریروں میں صرف اس بات پر اتفاق ہے کہ فرخ سیر کو نہایت ظالمانہ اور خبیثانہ طور پر گرفتار کیا گیا، لیکن بعد میں سیّد برادران نے شہنشاہ سے جو سلوک کیا اس کی بابت دونوں کے بیانات مختلف ہیں۔

محمد قاسم کہتا ہے کہ سیّدوں نے شہنشاہ کو قید کرنے کے فوراً بعد مروا ڈالا۔ خفی خاں وہ ماحول بنانے کی کوشش کرتا ہے جس ماحول میں فرخ سیر کا قتل ناگزیر ہو جاتا ہے

اور اس المیے کا منطقی نتیجہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قید کے دوران فرخ سیر نے ان اشخاص کو رشوت دے کر قید خانے سے بچ نکلنا چاہا جن کی تحویل میں اسے دیا گیا تھا۔ اس نے عبداللہ خاں کو پیش کش کی کہ اگر وہ کسی ترکیب سے اسے قید خانے سے نکال کر راجہ جے سنگھ سوائی کے پاس بھجوا دے تو وہ اسے سات ہزار کا منصب عطا کرے گا۔ اُسے خیال تھا کہ راجہ جے سنگھ سوائی کی مدد سے وہ دوبارہ تخت حاصل کرے گا۔

جن حالات میں رفیع الدولہ اور الدرجات کی موت واقع ہوئی وہ بھی بحث طلب ہیں۔ خفی خاں کہتا ہے کہ وہ طبعی موت مرے۔ دوسری طرف محمد قاسم کہتا ہے کہ ان کی موت دیر اثر زہر کے نتیجے میں واقع ہوئی۔ وہ کئی ایسے اسباب دیتا ہے جن کے باعث سید برادران کو ارتکابِ جرم کی ترغیب ملی۔

چونکہ دونوں شہزادے عقل سے کورے، جرأت سے عاری اور جاہل تھے۔ اس لیے سید برادران کو لگا کہ شہزادے اس طرح انتظام نہیں چلا سکتے جس طرح وہ چاہتے ہیں لہٰذا انھوں نے انھیں دیر اثر زہر کی مدد سے ہٹا دیا۔

اس وقت تک انھیں ہر معاملے میں کامیابی ہوئی تھی، لیکن اب خوف پیدا ہوا کہ کہیں انھیں کوئی ہزیمت نہ اُٹھانی پڑے اور ذلت کا منھ دیکھنا پڑے۔ اس لیے شہزادے راہ سے ہٹا دیے گئے۔

محمد قاسم کے بیان سے ایسا لگتا ہے کہ اس دَور میں رائے عامہ نے بڑا اہم رول ادا کیا تھا۔ سیدوں کو خوف ہوا کہ اگر انھوں نے کھلم کھلا یا پوشیدہ طور سے شہزادوں کو قتل کیا تو لوگ بڑے ناراض ہوں گے اور واویلا مچائیں گے، اور نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے مقصد حاصل نہ کر سکیں گے۔ اُن کا قیاس تھا کہ جب تیمور کی نسل کا کوئی فرد باقی نہ رہے گا تو وہ خود بخود تخت کے مالک بن جائیں گے۔ انھوں نے ذیل کا انتظام کیا تھا۔ قطب الملک شمالی ہندوستان پر حکومت کرے گا اور دکن نیز مالوہ امیر الامرا کے زیرِ انتظام رہے گا۔ ان کے دو علاوہ صدر

مقام ہوں گے اور دونوں خود مختار ہوں گے۔ یہ مصنفین ہمیں یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں
کہ سید برادران تیمور کی نسل برباد کرنا اور مغل تخت پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ ان دونوں مورخین
نے حسین علی خاں کے قتل کے بارے میں جو بیانات دیے ہیں وہ بھی اس طرح کے ہیں۔

اختتام

محمد قاسم اور خفی خاں نے بڑے تنقیدی طور سے ان عناصر کا جائزہ لیا ہے جن کے باعث
مغل سلطنت کا زوال ہوا۔ دونوں اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ درباری گٹھ بندی اس
زوال کا سبب تھی۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ محمد قاسم سید برادران کو فرخ سیر کے قتل کا ذمہ دار ٹھہراتا
ہے اور خفی خاں اس کے بیان سے اتفاق کرتا ہے۔ حالانکہ محمد قاسم بہت تفصیل کے ساتھ سید
برادران کے ان مقاصد کی تشریح کرتا ہے جن کے تحت رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ کو دیا نثر
زہر کے ذریعے مروادیا گیا، لیکن خفی خاں کہتا ہے کہ وہ طبعی موت مرے۔

محمد قاسم نے جنگوں وغیرہ کی تفصیلات دینے کے بجائے صرف ان مسائل کا انتخاب کرلیا
ہے جو مغل فرمانروا اور سلطنت کی سالمیت پر مُلا اثر ڈال رہے تھے، اور اس نے چند بار بڑی تفصیل
سے یہ بتایا ہے کہ انتشار کی قوتوں کو روکنے کے لیے شہنشاہوں کو کیا تدابیر اور اقدامات کرنے
چاہیے تھے۔ وہ زیادہ تنقیدی اور صاف گو ہے، اور اس نے دربار کی سازشوں، مغل بیٹوں نیز
گروہی سیاست اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ، مغل سلطنت کے تیز رفتار اقتصادی نیز سیاسی
زوال پر بڑی روشنی ڈالی ہے۔ دوسری طرف تاریخ کے روایتی انداز کی تقلید میں، خفی خاں
نے جنگوں اور مہموں کی ذرا ذرا سی تفصیلات بیان کرنے پر زیادہ وقت صرف کیا ہے۔ اس
نے اُس بیماری کی دوا تجویز کرنے سے گریز کیا ہے جو مغل مملکت کو گھن کی طرح کھا رہی تھی۔

بعد کی مغل سلطنت کے ان دو ہمعصر مستند مورخوں کے تقابلی مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا
ہے کہ سیاسی اور گروہی جھگڑوں نے مورخین کے نقطۂ نظر کو متاثر کیا تھا۔ اس لیے کسی

شخص کا کسی خاص واقعے کے دوران یا زمانے میں محض موجود ہونا ہی کافی نہیں سمجھا جانا چاہیے۔
اگر اٹھارہویں صدی کے سیاسی حالات کا دُرست طور سے جائزہ لیتا ہے تو ضروری ہوگا کہ ان
تعصبات کا تجزیہ کیا جائے جو سماجی، سیاسی اور مذہبی سرچشموں سے اُبھرے تھے۔ اور اسی
صورت میں یہ طے کیا جا سکتا ہے کہ اس دَور کی تاریخ کو دوبارہ ترتیب دیتے وقت کسی مورخ
کا بیان کس حد تک دُرست یا اہم سمجھا جائے۔

حوالہ جات

1- C A Storey Persian Literature, Section II, P 464

2- خفی خاں: منتخب اللباب، جلد دوم، صفحات 727 تا 737، ب، انڈ، کلکتہ، 1874۔

3- محمد قاسم اورنگ آبادی، احوال الخواتین (برٹش میوزیم روٹوگراف، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) فولیو 1966۔

4- احوال الخواتین، فولیو 74a تا 75a۔

5- ایضاً فولیو 105ab

6- ایضاً فولیو 183a

7- ایضاً

8- منتخب اللباب، دوم، صفحات 947 تا 949، 974 تا 978۔

9- احوال الخواتین، فولیو، 186a

10- ایضاً، فولیو، 172a

11- ایضاً، فولیو 176a تا 176، منتخب اللباب، دوم، صفحات 904 تا 909۔

دَورِ وُسطیٰ کے کچھ مورّخین کی نجی تاریخ اور اُن کی تحریریں

جگدیش نرائن سرکار

ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے مُسلم مورّخین کے اصولوں اور کارناموں کو سمجھنے کے لیے کئی باتوں پر نظر رکھنی ہوگی۔ ان باتوں میں تاریخ کی نوعیت، دورِ وسطیٰ کے مورّخین کا عام رویّہ، مصنّف کی تاریخ کا اثر، اس کی تکنیک اور اسلوبِ بیان پر مورّخ کے مقصد میں کامیابی کی حد، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مصنّف کی نجی تاریخ (یعنی اس کا خاندانی پسِ منظر، تربیت، تعلیم، سرکاری تعلقات، کردار، طبیعت کا خاصہ اور مزاج) عام طور سے اس کے نظریے اور اس کی تحریر کے مزاج پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ وہ تاریخ کے رویّے پر اثر ڈالتی ہے، اور ہمیں مورّخ کے خیالات، رویّہ اور نظریہ سمجھنے میں نیز یہ سمجھنے میں مدد دیتی ہے کہ آیا مورّخ شوق سے مشاہدہ کرتا تھا یا اس میں مشاہدے کا کوئی شوق نہ تھا۔ اس مقالے میں کچھ مخصوص مثالوں کی مدد سے یہ دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مورّخ جو تاریخ لکھتا ہے اس پر اس کی نجی تاریخ کا کتنا اثر پڑتا ہے۔

ہمیں ابوریحان محمد بن احمد البیرونی الخوارزمی تقریباً 970ء تا 39-1238 اے ڈی) (جو یورپ میں علی بورون کہلاتا ہے) کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہے۔ وہ واقعی ایک نہایت دانشور شخص تھا۔ یہ مشہور قاموسی عالم، فلسفہ، ریاضی، نجوم، جغرافیہ، طب، منطق، [illegible] سے خوب اچھی طرح واقف تھا اور آگے چل کر نیز عظیم ترین ماہر ہندوستانیات [illegible]

کہنا جا ئز ہے۔ ہندوستان اور ہندو علوم میں البیرونی کے شوق کی بنیاد کیا ہے؟ کیا یہ تحقیق سے لگاؤ کے باعث تھا یا کوئی اور وجہ تھی؟

اس کا سب سے پہلا سوانح نگار (شمس الدین محمد شہرازوری) اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ اسے مطالعے کی بڑی عادت تھی اور ہمیں یہ باور کراتا ہے کہ وہ سال میں صرف دو دفعہ کتاب اور قلم چھوڑتا تھا، ایک نوروز (موسم بہار میں سال نو کا پہلا دن) پر اور دوسرے مہراجن (موسم خزاں) پر "جب رسول خدا کے احکام کے مطابق، بس اس قدر ضروریات زندگی فراہم کرنے میں مصروف رہتا تھا جو قیام حیات اور تن پوشی کے لیے کافی ہوں"۔ یہ واضح نہیں ہے کہ کہیں یہ بات زمانۂ طالب علمی کے دوران معلمی کی حالت کے بارے میں تو نہیں کہی گئی ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ علم اور ادب میں ممتاز ہونے کے بعد وہ ترقی کرکے خاندانی مانی کے خوارزمی فرماں رواؤں کا مشیر بن گیا۔ اپنے اس رتبے کی وجہ سے وہ غزنہ کے سلطان محمود اور اس کے وزیر احمد بن حسن میمندی (1007 تا 25) کا مخالف بن گیا کیونکہ سلطان آزاد خوارزم کے معاملات میں دخل انداز ہونا چاہتا تھا۔ چنانچہ سلطان محمد نے جب خوارزم فتح کیا تو اسے جنگی قیدیوں اور یرغمال بنائے ہوئے افراد کے ساتھ بطور یرغمال غزنہ لے جایا گیا (1017)۔ وہ محمود کے پیچھے پیچھے ہندوستان میں بہت گھوما پھرا اور ہندوؤں کے فلسفے، عوام اور زبان کا بڑا مطالعہ کیا اور اس زمانے کے ہندوؤں کے سماجی اداروں نیز مذہبی حالات کے بارے میں جو مشاہدے کیے ان کو قلم بند کر لیا۔ (1017 تا 30)۔ لیکن نہ سرکاری طور پر اس کی حوصلہ افزائی کی گئی یا تحریک دلائی گئی اور نہ سلطان محمود نے اسے انعام کی توقع دلائی۔ رشید الدین کے بموجب "البیرونی نے محمود بن سبکتگین کی ملازمت اختیار کی، اور ملازمت کے دوران اس نے لمبا عرصہ ہندوستان میں گزارا اور اس ملک کی زبان سیکھی"۔ لیکن سچاؤ لکھتا ہے کہ "ہمیں کسی بات سے یہ پتہ نہیں لگتا کہ البیرونی کبھی غزنہ کی سلطنت یا دربار میں ملازم رہا ہو"۔ اور "شاید عظیم منجم یعنی نجومی اور جیوتشی مشہور ہونے

کے باعث اس کے تعلقات دربار اور حاکمِ وقت سے ہوگئے تھے۔" وہ جس انداز سے سلطان محمود کا ذکر کرتا ہے اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ اس کا ملازم تھا اور اسے اپنا محسن خیال کرتا تھا۔ "محمود نے خوشحالی ختم کرکے ملک کو تباہ و برباد کر ڈالا' اور بڑے حیرت انگیز کارنامے انجام دیے جس کی وجہ سے ہندو خاک کے ذرّوں کی طرح ہر سمت بکھر گئے' اور ان کی باتیں پرانی کہانیوں کی طرح لوگوں کو یاد رہ گئیں۔"[2]

اس کے برعکس البیرونی نے سلطان مسعود کی بڑی تعریف کی اور اپنی قانونِ مسعودی اس کے نام معنون کی، کیونکہ مسعود نے مصنف (جو اس وقت 61 برس کا تھا) کو ایک خاص انعام (پنشن؟) عطا کرکے اس لائق کر دیا تھا کہ وہ اپنا وقت علمی کاموں میں صرف کر سکے۔ اس لیے وہ بڑے فخر سے لکھتا ہے کہ مسعود نے اس پر عنایات کیں اور اس کو اور اس کی تحقیقات کو مدد بہم پہنچائی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ البیرونی جیسے شخص کا نظریہ بھی ذاتی مفاد سے متاثر ہو گیا تھا۔

ہندوستان' ہندوؤں اور اُن کی دُنیائے خیال کے بارے میں البیرونی کے شوق کا سبب بڑی حد تک وہ جبر تھی جس کو ڈاکٹر سخاؤ "آفت زدوں کی ایک جماعت" کہتے ہیں۔ یہ مبالغہ ہو سکتا ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ البیرونی اور اس کے ہم وطن محمود کے جبر کا اسی قدر شکار تھے جس قدر ہندوستان کے ہندو' اور شاید اسی بات سے البیرونی کے دل میں ان کے لیے ہمدردی پیدا کر دی تھی۔ اگر محمود کے لیے ہندو کافر تھے اور لُوٹ مار کو روکنے کی وجہ سے موجبِ قتل تھے' تو البیرونی کے لیے۔ یہی لوگ "نہایت عمدہ فلسفی' اچھے ریاضی داں اور نجومی . . . تھے۔" وہ "مسلمان قاری کو یہ اشارہ کرتا ہے کہ وہ اس غریب اور پریشان حال ہندو کو بہت حقارت کی نظر سے نہ دیکھے' جسے سلطان محمود کے وحشی جرگوں نے روند ڈالا ہے۔"

ہندوستان پر کتاب لکھنے کا خیال اس وقت البیرونی کے ذہن میں گزرا جب وہ

اپنے ایک دوست سے ساتھ اپنے زمانے کے مذہبی اور فلسفیانہ ادب پر بحث کر رہا تھا۔ یہ کتاب
اس نے عربی ادب کا ایک خلا پورا کرنے کے لیے لکھی تھی کیونکہ اس زمانے کے عربی ادب میں
"ہندوؤں کے عقائد کے بارے میں ایک نہایت غیر تنقیدی اور دوسرے درجے کا بیان"
ملتا ہے۔ اس کی کتاب کوئی باضابطہ تاریخ نہیں ہے۔ یہ ایک گہری عمرانی تحقیق ہے جس کی
خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک نادر جوہر تحقیق، جدید سائنسی رویہ اور ہمدردانہ بصیرت ملتی
ہے۔ البرونی خود کہتا ہے: "یہ کتاب مباحثے پر مشتمل نہیں ہے میں اس میں اپنے مخالفوں کی
دلیلیں اس خیال سے ہرگز نہ دوں گا جو دلیلیں غلط سمجھتا ہوں انھیں رد کروں میری
کتاب حقائق کے سیدھے سادے تاریخی بیان پر مبنی ہے۔ میں قاری کے سامنے ہندوؤں
کے نظریات جوں کے توں پیش کر دوں گا، اور اس ضمن میں اسی نوع کے یونانیوں کے
نظریات پیش کروں گا تاکہ دونوں کے درمیان جو تعلق ہے وہ ظاہر ہو جائے . . . ."[4]
اس کے بارے میں میکس ملر نے کہا ہے: "ہندوستانی ادب اور مذہب کا پہلا درست اور
جامع بیان پیش کرنے کی وجہ سے دنیا اس کی ممنون ہے۔" البرونی نے ماحول سے عدم تاثر اور
غیر جانبداری کے ایک نادر جوہر کا مظاہرہ کیا ہے۔ البرونی کی کتاب اس اعتبار سے مسلم ادب
میں بے مثل حیثیت کی مالک ہے کہ اس میں دیانت داری کے ساتھ بت پرستوں کی
دنیائے خیال کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کوشش اس دنیائے خیال پر حملہ کرنے
یا اسے جھٹلانے کی نیت سے نہیں کی گئی ہے، بلکہ تحریر سے برابر ظاہر ہوتا رہتا ہے کہ مصنف
اس صورت میں بھی انصاف پسند اور غیر جانبدار رہنا چاہتا ہے جب کسی مخالف کے
نظریات اس کے نزدیک اعلانیہ ناقابلِ قبول ہوتے ہیں۔" مزید برآں، البرونی نے جس طرح
ماخذوں سے استفادہ کیا ہے وہ اس کے سائنسی ذہن کا غماز ہے۔ اس نے تقریباً ہر باب
کے ساتھ سنسکرت ماخذ دیے ہیں، اور سچاؤ پیش لفظ میں ان بہت سے مصنفوں کی
فہرست دی گئی ہے جن کا حوالہ اس نے نجوم، تاریخ، جغرافیہ اور جیوتش کے ضمن میں

دیاہے۔ اس نے عربی ترجموں کے ذریعے یونانی ادب سے بھی واقفیت پیدا کرلی تھی' اور ہندو مابعد الطبیعیات سے یونانی زبان اور یونانی فکر کا مقابلہ کرتے وقت جن حوالوں کا انتخاب کرتا ہے... ان سے اس کی بصیرت اور غیر معمولی لیاقت ظاہر ہوتی ہے" اور وہ شاذ ہی ماخذوں کے حوالے دینا بھولتا ہے...' البیرونی بڑی آزادی سے ماخذوں کے حوالے دیتا ہے' اور جہاں وہ غلط یا مبالغہ آمیز لگتے ہیں' وہاں حوالوں کے بعد مختصر اور چبھتی ہوئی تفسیر دے دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی تحریریں دلچسپی قائم رہتی ہے۔ وہ ان موضوعات پر نہایت عالمانہ طور سے لکھتا ہے' جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علوم یقینی کے مطالعے سے اس میں وسعتِ علم اور درستیِ فکر کی خوبیاں پیدا ہوگئی تھیں: "ماہرانہ تنقید" کی بنا پر اسے "مشرق کے مصنفین میں ایک بے مثال مقام" حاصل ہوگیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ البیرونی کی کتاب "اُس دُنیا میں' جہاں تلواریں ٹکرا رہی تھیں' شہر جل رہے تھے' اور مندر لُوٹے جا رہے تھے' ایک ایسی طلسماتی دُنیا کی مانند تھی جہاں سکون اور غیر جانبدارانہ تحقیق کا دَور دورہ تھا۔ یہ محمود کے ظلم اور بت شکنی کا روحانی بدل تھی۔[5]

ابوالنصر محمد بن محمد الجبار العبتی خاندانِ عتبی سے تعلق رکھتا تھا۔ اس خاندان کے بہت سے افراد سامانی فرمانرواؤں کے تحت اہم عہدوں کے مالک تھے۔ سلطان محمود کا معتمد ہونے کی وجہ سے عتبی اس کی سرگرمیوں سے پورے طور سے واقف ہوگیا تھا لیکن وہ اپنے آقا کی مہموں میں شریک نہ رہا تھا۔ اس کی کتاب تاریخِ یمینی یا کتاب یمینی' جو سبکتگین کے پورے دَور اور محمود کے دَور کے ایک حصّے (۱۰۲۰ تک) کا احاطہ کرتی ہے' محمود کی مہموں کی معلومات کے واسطے اصل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن اس میں ہندوستان کی دُرست جغرافیائی معلومات کم ہے۔ اس کا رویہ راسخ العقیدہ مصنفوں کا سا ہے' جیسے سبکتگین اور محمود کے افعال میں حکمِ خدا نظر آتا ہے' جیسے کہ ریانا "اکثر اوقات حکمِ خدا سے ایک چھوٹی فوج' بڑی فوج پر غالب رہتی ہے۔" خدا کے دوسرے

کذب اور بت پرستی کے آقاؤں کے خلاف آگے بڑھ رہے تھے"۔ "خدا کے دوستوں نے ہر کوہ اور وادی میں قتلِ عام مچادیا"۔ "خدا اپنے مذہب کو عزت بخشتا ہے اور کفر کو ذلیل و خوار کرتا ہے"۔ وغیرہ۔

خواجہ ابوالفضل بن الحسن البیہاقی (سی 996 تا 1077 اے۔ ڈی) نے "کئی (30) جلدوں میں غزنویوں کی ایک بڑی جامع تاریخ لکھی ہے" جس کا نام تاریخِ بیہاقی یا مجلدات بیہاقی ہے۔ اس کی مختلف جلدوں کے کئی کئی نام ہیں جیسے تاریخ سبکتگین یا تاریخ السبکتگین یا تاریخ ناصری، تاج الفتوح (محمود کے واسطے)، تاریخِ مسعودی (مسعود کے واسطے) وغیرہ۔

لگتا ہے دربار سے اور اس زمانے کے طبقاتِ امراء سے بیہاقی کا بہت نزدیکی تعلق تھا تاریخِ السبکتگین اپنی ظاہری شکل میں تفصیلی تاریخ نہیں بلکہ افواہات پر مبنی ایک توزک لگتی ہے۔ مصنف برابر اپنے بارے میں، اپنے تعلقات کے بارے میں، اپنی کارروائیوں کے بارے میں اور اپنے تجربات کے بارے میں حوالے دیتا ہے۔ وہ اپنے ہمعصر امرا کا حال بڑی وضاحت سے بیان کرتا ہے۔ شہنشاہ مسعود بن محمود کے مشاغل، مسعود کا اپنے معتمدوں کو فرماں تحریر کرتا، اس کی شراب خوری کی عادت، ہندوستان میں اس نے جو دورے کیے ان میں سے ایک دوسرے کے دوران اس کا نادم ہونا اور شراب چھوڑ دینے کی قسم کھانا، اور شراب اور شراب کے پیالے دریائے جیلم میں پھنکوا دینا، جس سے ہمیں بعد کے زمانے میں بابر کی ایک ایسی ہی ترنگ کا خیال شدت سے آتا ہے، یہ سب بیانات بھی وہ ہمیں بڑی وضاحت سے دیتا ہے۔ ہمیں دربار، اس کی کارروائی کا طریقِ کار، کارروائی میں شریک ہونے والے افراد اور غزنہ کی مجلس میں زیرِ بحث رہنے والے موضوعات کی نوعیت کے بارے میں ایک نہایت واضح خاکہ ملتا ہے۔ (ان سب کے ساتھ اتنی زیادہ باتیں اور تفصیلات جوڑی گئی ہیں کہ ان بیانات پر بیجا طول کا الزام لگایا جاسکتا ہے، اس الزام کا خطرہ خود مصنف کو بھی تھا۔ لیکن

تھکا دینے والی تفصیلات کے باوجود یہ کتاب نمایاں طور پر علمی ہے اور اس زمانے کے طور طریق نیز کاموں کی ایسی جھلک پیش کرتی ہے کہ اوقات بھی جزئیات اور ادنا باتیں اس کی خاص خوبی جاتی ہیں۔ مصنف کو مشرق کا مسٹر پیپیز کہنا ناموروں ۔ ہوگا۔"[8]

ہمیں تاج المعاصر (کارناموں کا سرتاج) کے مصنف حسن نظامی کے بارے میں سوائے ان حوالوں کے کچھ نہیں معلوم جو اس نے خود اپنی کتاب میں دیے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو "غلام ابن غلام حسن نظامی" کہتا ہے اور اپنے سرپرستوں میں "ابوالمظفر محمد بن سام بن حسین" (یعنی محمد غوری) اور "قطب الدنیا والدین ابوالحارث ایبک" کے نام لیتا ہے۔ حسن نظامی نیشاپور میں پیدا ہوا تھا اور اسے صدرالدین محمد بن حسن نظامی بھی کہا جاتا ہے۔ پروفیسر عسکری کے مطابق اس کا باپ عالم ابوالحسن نظامی عروضی تھا جو سمرقند کا رہنے والا تھا گو لاہور نہ اس کی جائے پیدائش تھی اور نہ مستقل مسکن پھر بھی ہمیں اس کا تعلق اسی شہر سے ملتا ہے۔ اسے خراسان کے سیاسی ہنگاموں کے باعث اپنا آبائی وطن چھوڑ کر غزنہ کے راستے دہلی آنا پڑا۔ اس زمانے کے خراسان میں نہ لیاقت کو سراہا جاتا تھا اور نہ اس کا اجر ملتا تحریر کرتے وقت وہ گہرے احساس محرومی کا شکار تھا حسن نظامی کے تعلقات اور واقفیت (صوفی محمد شیرازی اور غزنہ کے قاضی القضاۃ مجدالملک، اور دلی کے قاضی القضاۃ شرف الملک) سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف نہایت اہل علم تھا اور دانشوروں میں شمار کیا جاتا تھا بلکہ سماجی نظام میں خاصی اونچی حیثیت کا مالک تھا۔ اس نے اپنی اس فارسی کتاب کی ابتدا 602ھ مطابق 1205ء نہ صرف اپنے دہلی کے (جہاں عربی قلم کی بظاہر قدر نہ تھی) دوستوں کی درخواست پر کی تھی بلکہ اس شاہی حکم کو پورا کرنے کے لیے بھی کی تھی جس میں اس سے کہا گیا تھا کہ فاتح حکومت (فرمانروا کا نام نہیں دیا گیا ہے) کے واقعات کی تفصیلات قلم بند کرے۔ اس میں جزوی طور سے محمد غوری (1191ء سے) کی اور خاص طور سے قطب الدین ایبک اور التمش کی تاریخ دی گئی ہے۔ مصنف نے ہر ہر قدم پر اپنے رنگین اور طولانی انداز میں

تشبیہوں اور استعاروں وغیرہ کے ذریعے 'نثر اور نظم' میں اپنے علم کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن وہ ثبوت کہیں نہیں دیتا کہ فرمانرواؤں کے کارناموں میں خود شریک رہا تھا یا انھیں اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ سوائے اس تعریف کے جو مصنّف اپنے دیوتا صفت السالوں پر نچھاور کرتا ہے کسی بات سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ ان واقعات کے زمانے میں خود موجود تھا جنھیں وہ بیان کرتا ہے، اور چند تاریخوں کے بارے میں جو گمراہ کن اور بے ربطی ہے۔ نیز ان کی ساری تفصیلات غائب ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے سرپرست کی مہموں میں وہ خود شریک نہ رہا تھا۔ یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ وہ قطب الدین کے اصل دَور کے معاملات کے بارے میں کچھ نہیں کہتا، حالانکہ اسی چھوٹے سے باب میں اس کی تخت نشینی اور وفات کے بارے میں تحریر کیا گیا ہے۔"[9] حسن نظامی ایک مدح خواں تھا، اور دوسرے بہت سے مورخوں کی طرح تعصبات کا شکار تھا، وہ ترائن کی پہلی جنگ میں محمد غوری کی شکست کا ذکر نہیں کرتا لیکن دوسری جنگ میں اسی کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل کرنے کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن وہ انہلواڑہ کے بھیم دیو دوم کے ہاتھوں غوری فرمانروا کی اس سے پہلے کی ایک شکستِ فاش کی طرف اشارہ ضرور کرتا ہے۔ "حسن نظامی ہمیں یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ ابتدائی مُسلم فاتح اچھے مسلمان اور حامی مذہب تھے اور جنگ و فتح نیز حکومت و انتظام کی بابت اُن کا مقصد اور نیت سیاسی یا معاشی نہیں بلکہ مذہبی تھی اور انھوں نے جو شہر اور مقامات فتح کیے اُن میں مشکل ہی سے کوئی مورتی مندر یا مذہبی پناہ گاہ باقی بچی ہوگی جسے مُسلم ادارے میں تبدیل نہ کر دیا گیا ہو۔" (جیسے اجمیر میں فولیو 48 ہ)[10]

منہاج الدین بن سراج الدین پیدائش اور شادی دونوں کے اعتبار سے طبقۂ امرا سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے آباؤ اجداد بڑے ممتاز لوگ تھے۔ اس کے سگر دادا امام عبدالخالق جوزجانی (جوزجان مرو اور بلخ کے درمیان واقع ہے) کی شادی غزنہ کے سلطان ابراہیم کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ اس کا والد (محمد غوری) کی کمان میں ہندوستان آنے والی فوج کا قاضی تھا (1186ء) منہاج

خود بڑا عالم تھا۔ اسے اُچ کے فیروزی مدرسے کا نگراں (1227ء) افسرِ قانون پر مذہبی، اخلاقی اور قانونی امور کی تبلیغ کا ناظم (1232ء) دہلی کا قاضی (1241ء)، دہلی کے ناصریہ مدرسے کا نگراں اور اس کی جائیداد و املاک کا منتظم، گوالیار کا قاضی، ام البلاد کی مسجد میں مبلغ (45-1244ء) صدرِ جہاں، ناصرالدین کے تحت سلطنت کا قاضی اور دارالسلطنت کا حاکم فوجداری (1246ء) مقرر کیا گیا تھا۔ بنگال کے صدر مقام لکھنوتی میں تقریباً تین سال (42-1241ء تا 44-1243ء) قیام کے باعث اسے مسلمانوں کے دُور دراز کے علاقوں کے بارے میں درست معلومات حاصل ہوگئی تھیں۔

ان سب باتوں نے اس کی کتاب پر، جو بڑی فاضلانہ اور مدلانہ تصنیف ہے، اثر ڈالا۔ اس نے اپنے سرپرست ناصرالدین کی تعظیم میں اپنی کتاب کا نام اس کے نام پر رکھا اور تحریر کرتے وقت بڑا مداحانہ انداز اختیار کیا۔ اس میں ناصرالدین کے دور کے جاری رہنے کے واسطے بعض بے ساختہ قسم کی دُعائیں ہیں۔ اس کے باوجود لائق نقادوں کا خیال ہے کہ وہ "شاذ و نادر ہی مبالغہ آمیز تعریف و توصیف کرتا ہے، اور سیدھے سچے انداز میں حقایق بیان کر دیتا ہے جس سے اس کے بیانات کی سچائی اور اس کے علم کی دُرستی پر اعتماد بڑھ جاتا ہے۔"

لگتا ہے کہ اس کے قانونی پیشے اور علمی نقطۂ نظر نے اس کے طریقِ کار پر اثر ڈالا۔ اس نے لائقِ اعتماد اشخاص سے معلومات فراہم کرنے کی بڑی کاوشیں کیں، اور اکثر اپنے حقایق کی اسناد کا حوالہ دیا۔"

امیر خسرو یا میر خسرو (1253ء تا 1325ء) اس زمانے کے طبقۂ امرا کے رکن تھے۔ ان کے والد التمش کے دور میں ایک امیر تھے۔ ان کی والدہ ایک ہندوستانی خاتون تھیں، اور ملبن کے ایک اعلا عہدیدار عمادالملک کی بیٹی تھیں۔ انھوں نے اپنے والدین کے بل بوتے پر دہلی کے درباری حلقوں میں بڑا نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا۔ انھوں نے خود دہلی کے چھ سلطانوں کے تحت ملازمت کی۔ سلطانوں سے تعلقات کے باعث، اور امیروں، فوجی کارکنوں اور صوفی

نظام الدین اولیا سے نزدیکی تعلقات کے باعث انھیں اپنے زمانے کے دُرست سیاسی تعلقات اور سماجی حالات کا علم حاصل کرنے کا ایک نادر موقعہ ملا تھا۔ لیکن انھوں نے اس موقع سے فائدہ نہ اُٹھایا۔ ان کی تاریخی کتابیں 35 برسوں (1289ء تا 1325ء) کی مدت میں تحریر کی گئی ہیں لیکن یہ کتابیں موقع موقع سے لکھی گئی ہیں اور کسی ایک موضوع سے متعلق نہیں ہیں موقع موقع سے لکھی جانے والی ان کتابوں نے بعض سلطانوں اور شہزادوں کی درخواست پر لکھی گئی ہیں اور بعض انعام کی توقع پر یا اظہار تشکر کے واسطے یا پھر ادبی شہرت حاصل کرنے کے لیے لکھی گئی ہیں کیونکہ خسرو مورخ سے زیادہ شاعر اور جانبدار مصنف سے زیادہ مدح خواں تھے۔ اس سب سے ان کی (اہم) اور نیم تاریخی تصنیفوں پر اثر ڈالا قرآن السعدین (دو ستاروں کا اجتماع 1289ء) کئی بیانی نظموں پر مشتمل ہے جس کا نقطۂ عروج وہ سوال و جواب ہیں جو باپ (بغرا خان، حاکم لکھنوتی) اور بیٹے (سلطان معزالدین کیقباد) کے درمیان ہوئے۔ خزائن فتوح یا تاریخ علائی (نثر میں) علاالدین کے دور کے پہلے سولہ برسوں (دیوگری کی فتح سے لے کر وارنگل کی فتح تک) کی نہایت مستند اور دُرست تاریخ ہے۔ اس پر مصنف کے شاعرانہ مزاج، ادبی مہارت، سیاسی موقع پرستی اور ہندوستانی نیز ہر ہندوستانی چیز سے لگاؤ کی چھاپ پڑی ہوتی ہے۔ اس میں پیراگراف کے پیراگراف "نسبت" (وہ استعارے، تشبیہیں یا تلمیحیں جو کسی شے سے اخذ کی گئی ہوں) پر مبنی ہیں، قرآن کی آیات کثرت سے استعمال کی گئی ہیں۔ (تحریر میں قوت اور وقار پیدا کرنے کے لیے) اور مادۂ تواریخ اور ہندی الفاظ کی کثرت ہے۔ جیسا کہ واحد مرزا لکھتے ہیں: "خسرو کو اپنے شاہی سرپرست کے دور کے محض سال وار واقعات لکھنے کی ہی فکر نہ تھی، وہ اسے ادبی شہ پارہ بھی بنانا چاہتے تھے"۔ وہ واقعات کو جمالیاتی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، افعال تانے کے زیر نگیں ہیں۔ وہ نہ صرف علاالدین کی فوجی فتوحات بیان کرتے ہیں بلکہ اس کے وہ کارنامے بھی بیان کرتے ہیں جن کا تعلق استحکام سلطنت، قیام سلطنت، نظم و ضبط اور ایسے متعدد اقدامات سے تھا جو

عوام کی فلاح و بہبود کے لیے اُٹھائے گئے۔ لیکن امیر خسرو کی موقع پرستی نے انھیں مجبور کردیا کہ وہ علاالدین کی اس دغا باری کو نظرانداز کریں جو اس نے تخت حاصل کرنے کے لیے اپنے چچا سے کی تھی۔ امیر خسرو علاالدین کے چچا کے قتل کا حوالہ دیے بغیر سلطان کی تخت نشینی کو خدا کی مرضی سے تعبیر کرتے ہیں۔

امیر خسرو کی افضل الفوائد نظام الدین اولیائے صوفیا۔ کردار اس شاعر کے سردیکی تعلق پر بڑی لائق قدر روشنی ڈالتی ہے۔

امیر خسرو کی آخری تاریخی نظم تغلق نامہ جو یہ کہانی سناتی ہے کہ غیاث الدین تغلق نے دہلی پر کس طرح قبضہ کیا، ایک مذہبی اور اخلاقی رنگ کی نظم ہے۔ سلطان نیکی کا نمونہ تھا جو اسلام کی خاطر اندھیرے کی ان قوتوں سے لڑ رہا تھا جن کی نمائندگی خسرو خاں (کافر) کر رہا تھا۔

انھوں نے واقعات کے ثبوت باقاعدہ طور سے اور لگاتار استعمال نہیں کیے۔ وہ اپنے ذرائع معلومات ظاہر نہیں کرتے (سوائے دیول رانی کے)۔ وہ برنی اور عصیف کی طرح (جو کسی حد تک کرتے ہیں) راسخ العقیدہ لوگوں کو نقل نہیں کرتے۔ قاری اُن کی بات دُرست ماننے پر مجبور ہے۔ یہ مذہبی اور اخلاقی اصطلاحات کی زبان میں لکھی گئی ہے۔ تجزیے کے آخری درجے پر یہ پتہ لگتا ہے کہ اگر تاریخ کو مقدر یا حکمِ خدا پر محمول نہ کیا گیا تو وہ ناقابلِ فہم بن جائے گی۔[12])

ہندوستان کی تاریخ تصنیف کرنے والے پہلے مُسلمان، ضیاالدین برنی (پیدائش 1285ء) کے تعلقات دہلی کے حکمراں طبقوں میں خوب تھے۔ چونکہ دربار تک اس کی رسائی آسان تھی۔ اس لیے صحیح تفصیلات جاننے کا اسے خوب موقعہ تھا۔ محمد بن تغلق کا رہینِ منت ہونے کی وجہ سے اس نے تغلق کی زندگی میں اس پر تنقید نہ کی۔ جب اسے دربار سے نکال دیا گیا اور بدبختی نشـ ـرپی کرنے لگی تو اس نے احساسِ ظلم اور یاس کے تحت

لکھنا شروع کیا۔ اگر فیروز اسے نہ بچاتا تو جیسا وہ خود کہتا ہے، وہ "مادرِ گیتی کی آغوش میں سو گیا ہوتا۔" چونکہ وہ باطنی طبیعت کا شخص تھا اس لیے اس کا ضمیر کچوکے لگاتا تھا۔ اور وہ اپنی بدبختی کو اپنی اخلاقی ناکامی سے منسوب کرتا تھا۔ اس لیے اس کی کتاب کا ایک عملی مقصد تھا، کتاب دوہری مدد ثابت ہو سکے ـــــ خدا کی نذر، تاکہ اس کے گناہ معاف ہو جائیں اور ان کا ازالہ ہو جائے ـــــ سلطان کی نذر، تاکہ اس کی سرپرستی حاصل ہو جائے اور تنگ دستی سے چھٹکارا مل جائے، پر دشمنوں کی افترا پردازی سے محفوظ ہو جائے۔ لہٰذا اس کا نام فیروز شاہ کے نام پر رکھا گیا۔

ایک شیخ والد اور سید والدہ کا بیٹا اور شیخ نظام الدین اولیا کا گہرا دوست ہونے کی وجہ سے برنی پر مذہب اور تصوف کا بڑا گہرا اثر پڑا تھا۔ وہ الحادی علم سے نفرت کرتا تھا۔ اس سے ہمیں اس کا مذہبی نظریہ تاریخ سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ برنی کے نزدیک تاریخ دینیات تھی، خدا اور اس کی صفات اور احکامات کا مطالعہ، نہ کہ انسان کی سرگرمیوں کا، جو خدا کی مرضی کے اظہار کا ایک ذریعہ تھا۔

برنی دراصل ایک عالمی تاریخ لکھنا چاہتا تھا جو آدم سے شروع ہوتی۔ لیکن بعد میں اس نے ارادہ بدل دیا ـــــ تاریخِ فیروز شاہی (جو 1358ء میں لکھی گئی) میں وہ اس دور کے کل آٹھ بادشاہوں کا تذکرہ کرتا ہے، جو بلبن سے فیروز شاہ کے پہلے چھ برسوں تک کا دور ہے، اور یہ تذکرہ تقریباً اس جگہ سے شروع ہوتا ہے جہاں منہاج نے اپنی تاریخ ختم کی تھی۔ یہ درحقیقت "منہاج کے روزنامچے سے پیوستہ ہے" اس کا سبب کہ اس نے سابقہ موضوعات کا احاطہ نہیں کیا غالباً ایک جذباتی کمزوری ہے جو کسی مورخ کو زیب نہیں دیتی، لیکن اس سے اس زمانے کے مورخوں کی ذہنیت پر روشنی پڑتی ہے۔ "اگر میں وہ نقل کردوں جو اس مشہور و معروف قابلِ تعظیم مصنف نے لکھا ہے، تو وہ لوگ جنہوں نے اس کی تاریخ پڑھی ہے میری تاریخ سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکیں گے۔ اور اگر میں کوئی ایسی

بات کہوں تو اس اُستاد فن کی تحریر کے خلاف ہو یا اس کے بیانات کی تلخیص کروں یا انہیں طول دوں تو مجھے گستاخ اور بے دھڑک سمجھا جائے گا۔ اس کے علاوہ میں قاریوں کے ذہن میں دشواریاں اور شکوک پیدا کر دوں گا۔" اس بات سے اس منطق کا بودا پن یاد آتا ہے جو سکندریہ کے مشہور کتب خانے کو جلانے کے سلسلے میں الزام کے طور پر خلیفہ عمر سے منسوب کی جاتی ہے۔ کیونکہ تاریخ کے ایک صاحب ادراک اور تنقیدی ذہن رکھنے والے طالب علم کے نزدیک اتفاق رائے یا تکرار بیاں اور اختلاف رائے یا تشکک کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں ہوتی ہیں۔

حالانکہ برنی نے اُستاد کی تکنیک استعمال نہیں کی لیکن وہ تسلیم شدہ حقیقت پر انحصار کرتا تھا۔ تاریخی حقایق کی تصدیق تنقیدی شکوک و تجسس کے ساتھ نہیں بلکہ مذہبی یا بزرگ صفت لوگوں کی شہادت پر کی گئی۔ اس نے منہاج سے اختلاف نہ کیا جو ایک مذہبی شخص تھا۔ اس نے اپنی یادداشت پر اعتبار نہ کیا، لیکن امیر خسرو، امیر حسن اور اپنے رشتے داروں پر اعتبار کیا۔ باوجود اس کے، اس نے اسناد کا لحاظ کیے بغیر تاریخ ایک قصّہ گو کی طرح لکھی۔ لہٰذا اس کے کام میں "گہری تحقیق، عظیم شعور اور سعی مسلسل" کی کمی رہی۔

برنی خود اعتراف کرتا ہے کہ اس کی کتاب کچھ سُنے سُنائے بیانات پر اور کچھ ذاتی مشاہدے پر مبنی ہے۔ بلبن کے بارے میں اسے اپنے والد، دادا اور بلبن کے افسران سے معلوم ہوا اور کیقباد کے دور کے بارے میں "اپنے والد سے اور اپنے اساتذہ سے معلوم ہوا جو اس زمانے کے قابلِ ذکر حضرات تھے۔" اس نے ان بیانات میں اپنے مشاہدے کی بنا پر اضافے کیے۔ جلال الدین کے دور کے سارے واقعات اور معاملات اس کتاب کے خاتمے تک خود اس کی نظروں سے گزرے۔ ان واقعات کی گہری تفصیلات میں جائے بغیر وہ سارے معاملے کو بحیثیت مجموعی دیکھتا ہے۔ جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے: "اس کتاب میں، میں نے سلطنت

کے سارے سفارتی انتظامی معاملات تحریر کر دیے ہیں اور فتوحات کے بیان میں ہر واقعے اور سانحے کا ذکر نہیں کیا ہے نہ ان رعایتوں کا ذکر کیا ہے جو مخصوص لوگوں کو دی گئی تھیں، کیونکہ عقل مند لوگ انتظامی معاملات کے مطالعے سے ان چیزوں کو خود ہی جان لیں گے"۔ وہ ایک ایسا شخص ہے جو کچھ چیزوں کا انتخاب کر لیتا ہے۔

اگر برنی کو اس کے مذہبی نظریے اور اُن عیوب کے واسطے جو مورخین کے جدید معیاروں کے مطابق اس میں پائے جاتے ہیں، ایک جائز انداز کی رعایت دے دی جائے، تو اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں رہتا ہے کہ تاریخِ فیروز شاہی (357ء) "تاریخ کے ایک شعوری فلسفے کا نہایت پُر زور اور موثر اظہار تھی جو برنی کو ان معمولی مصنفوں کی صفوں سے اُوپر لے جاتی ہے جنھوں نے روزنامچے اور وقائع تصنیف کیے"۔ اسے تاریخ سے ایک جذباتی لگاؤ تھا، اور وہ اسے ایک علم بلکہ "ملکۂ غلام" سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ تاریخ کے مطالعے کے فوائد کا بھی ذکر کرتا ہے۔

شمس الدین سراج عفیف، گو عہدیداروں کے خاندان میں پیدا ہوا تھا (پیدائش 1342ء) لیکن خود کوئی عہدیدار نہ تھا۔ لیکن برنی اور عصامی کے برخلاف وہ کہیں یہ اشارہ نہیں دیتا کہ اس نے شکستِ آرزو یا پامال لیاقت کے احساس کے تحت لکھا۔ اس نے اپنے قاریوں کے اخلاق کی اصلاح کے لیے لکھا۔ اس کی تاریخِ فیروز شاہی (پندرہویں صدی میں لکھی گئی) ایک بڑی تاریخی کتاب کا حصّہ تھی جس میں تین تغلق فرمانرواؤں (غیاث الدین، محمد اور فیروز) کی خوبیوں (مناقب) اور تیمور کے ہاتھوں دِلّی کی تباہی کا ذکر تھا۔ وہ سوانح عمری کی ایک مثال تھی۔ چونکہ مناقب کی اصطلاح سلطانوں کے لیے نہیں بلکہ بزرگ لوگوں کے لیے استعمال ہوتی ہے، اس لیے اس کتاب میں ایک زیریں قسم کی تصوّفانہ موج تھی۔

عفیف نے اسناد کی مدد سے لکھا، اور قابلِ اعتماد واقعہ گو اشخاص کی شہادتیں

قبول کریں، لیکن اس نے نزاعی معاملات کا فیصلہ کرنے کے لیے اپنے ثبوت اور شہادت دلیل کے طور پر پیش نہیں کیے۔ تاریخی حقائق کی تصدیق کے واسطے برنی کی عصبیت کا آخری معیار بھی مذہبی ہی تھا۔ جب وہ اپنی کتاب کے بیانات کی حمایت میں دوسرے مصنفین کی کوئی عام خبر یا مخصوص سند نہیں دیتا ہے، تو علمی شواہد پر تکیہ کرتا ہے۔ وہ تاریخ میں غیر تاریخی حقائق کی مدد سے فہم و بصیرت تلاش کرتا ہے۔ اور یہ تلاش تاریخ سے ماورا اس پورے نظام میں کی جاتی ہے جو پوشیدہ ہے اور جسے خدا نے تخلیق کیا ہے۔ ماخی ایک منظرِ نیکی تھا، مدرسہ مذہب صادق نہ تھا۔ وہ اس کی ترجمانی کے واسطے نہیں کرتا کہ لوگوں کو مخصوص اصول اور افعال کے اسباب کا صحیح سبق مل جائے۔"[4]

یحییٰ بن احمد سرہندی حکومت دہلی کا درباری نہ تھا۔ لیکن بن جانے کی توقع تھی۔ کہ جب وہ سلطان سید مبارک شاہ کو اپنی کتاب پیش کرے گا تو اسے شاہی سرپرستی حاصل ہو جائے گی۔ تاریخ مبارک شاہی (سالِ تصنیف 35-1434ء) میں یحییٰ بن احمد سرہندی نے منہاج، برنی اور امیر خسرو جیسے سابقہ مصنفین سے 1351ء تک کے واقعات مستعار لیے ہیں۔ لیکن وہ محض ایک نقل نگار نہ تھا۔ انتخاب حقایق کے بارے میں اس نے اپنے اصول وضع کیے تھے جیسے سلطانوں، امیروں اور سپاہیوں کے کام بہ اعتبار ادوارِ حکومت اور تاریخ وار ترتیب یعنی تخت نشینی، تقررات، جنگیں اور فوجی حرکات، بغاوتیں وغیرہ تحریر کرنا۔ 1351ء کے واقعات کے سلسلے میں اس نے تحریری چیزوں پر نہیں بلکہ قابلِ اعتبار لوگوں کی شہادت پر بھروسہ کیا۔ لیکن دونوں صورتوں میں اس کی زبان ایک ہی رہی۔ لگتا ہے کہ وہ واقعات کو محض اوپری طور سے دیکھتا ہے اور افعال کی محض شکلِ ظاہری تحریر کر دیتا ہے۔ اس کی کتاب درحقیقت ایک علاقائی روزنامچہ تھی اور وہ افعال ہیں روزنامچے میں قلم بند کرتا تھا۔ وہ تاریخ کو یوں ظاہر کرتا جیسے وہ محض پے بہ پے ہونے والے فوجی اور سیاسی واقعات کا مجموعہ ہو، مثال کے طور پر وہ علاالدین کے اقتصادی اقدامات نظرانداز

کر دیتا ہے۔

تاریخ نویسی کی بابت اس کا طرزِ نظر گو بے قاعدہ اور بے پرواہ انداز کا تھا پھر بھی وہ تاریخ کی ترجمانی رُوحانی انداز میں کرتا ہے۔ وہ ہر دورِ حکومت کو اس جملے پر ختم کرتا ہے۔ " اصل حقیقت خدا ہی جانتا ہے"۔ محمد غوری کے زمانے سے ہندوستان میں اسلام کی بدلتی ہوئی تقدیر کو وہ خدا کی مرضی سے تعبیر کرتا ہے۔ جب وہ محمد بن تغلق کی دُشواریوں کے اسباب کا تجزیہ کرتا ہے تو واقعات کو انسانی افعال اور انسانی فیصلوں سے منسوب کرتا ہے[15]

عصامی (1350ء تصنیف) نے اپنی طویل تاریخی رزمیہ نظم "فتوح السلاطین" ایک ایسے شخص کی طرح لکھی جو سرپرست کی تلاش سے مایوس ہو چکا ہو۔ وہ محمد بن تغلق کے ظلم کا شکار ہو گیا تھا۔ اسے اپنے نوّے سالہ بوڑھے دادا کے ساتھ دہلی سے دیوگری (دولت آباد) جانے پر مجبور کیا گیا جو راستے میں فوت ہو گیا۔ یہاں نہ اس کی بیوی تھی نہ بچے، نہ دوست، نہ رشتے دار، اس لیے وہ ایک دوست یا سرپرست کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اس نے ہندوستان میں ادب کے نیچے معیار اس غیر دوستانہ دُنیا میں ان مصنّفوں کی بُری حالت کی شکایت بڑی تلخی سے کی ہے جو کینہ ور نقادوں کے رحم و کرم کے محتاج تھے۔ سخت تنفر کے باعث وہ ہندوستان چھوڑ کر مکّہ چلا جانا چاہتا تھا۔ اس کے خوابوں کا سرپرست علاالدین بہمن شاہ کی ذات میں ظاہر ہوا۔ اس نے دولت آباد میں قیام کر لیا اور اس کی سرپرستی میں اس طرح لکھنا شروع کیا کہ بہمنی سلطان کے واسطے وہ فردوسی بن گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی فتوح السلاطین شاہ نامہ ثابت ہو۔ اس نے فتوح کو اسی کے نام معنون کیا تاکہ اس کی سرپرستی حاصل رہے اور ایک دائمی ادبی شہرت حاصل ہو۔ اس نے محمد تغلق کو جو سخت لعنت ملامت کی ہے اس کا جزوی سبب اس کے اپنے مصائب تھے۔ تغلق دور کے مورّخ کی حیثیت سے عصامی ایک یکتا حیثیت کا حامل ہے، کیونکہ

وہی ایک اکیلا مصنف ہے جو سلطان کے خوف یا عنایت سے بالاتر ہے۔

عصامی کی فتوح السلاطین (50 - 1349ء میں تصنیف کی گئی) ہندوستان میں محمود غزنوی کے زمانے سے لے کر کتاب کی تصنیف کے زمانے تک مسلمانوں کے کارناموں کا ایک سرسری جائزہ تھی جو طویل رزمیہ نظم کی صورت میں تھی۔ اسے گو پرانے مآخذوں پر تکیہ کرنا پڑا لیکن اس نے آنکھیں بند کر کے اُستاد کی تقلید نہ کی۔ اسے جو رودادیں یا روایتیں ملیں ان کو اس نے محض نقل نہیں کیا۔ اس نے معلومات کو اپنے خیالات کی روشنی میں بدلا اور اپنے انداز سے پیش کیا اور اس میں اپنے دوستوں اور رفیقوں سے جمع کی ہوئی عام قسم کی رودادیں، واقعات، روایتیں اور کہانیاں (سنی سنائی باتیں) شامل کر دیں۔ وہ ان حقائق کا اصل مآخذ نہیں بتاتا ہے اور محض یہ کہہ دیتا ہے۔ "میں نے سنا ہے" مواد کا انتخاب جمالیاتی اسباب کی بنا پر نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ تنقیدی تاریخ نہیں بلکہ محض تاریخی ثبوت پیش کرتا ہے۔ وہ دورِ وسطیٰ کے مسلم مصنفین کے روایتی انداز کی تقلید کرتا ہے جس میں خدا کے حکم کے پورا سرار ارادہ کا اور تقدیر کے ناقابلِ فہم ہونے کا رور دیا جاتا ہے حالانکہ بعض اوقات وہ واقعات کو انسانی افعال سے منسوب کرتا ہے کیخسرو کو کیقباد کے مقابلے میں اس لیے مسترد کر دیا گیا کہ اُمرا کا یہی فیصلہ تھا۔

ابتدائی دورِ وسطیٰ کی زیادہ تر ہندوستانی تاریخی کتابوں پر تاریخ نویسی کی عربی روایت کی نہیں بلکہ فارسی روایت کی چھاپ پڑی ہوئی ہے۔ کیونکہ مصنفین یا تو شاہی دربار سے متعلق تھے یا شاہی سرپرستی کے خواستگار تھے۔ ہند مسلم مورخین نے تاریخ کو اپنے "عظیم اشخاص" کے گرد گھمانا شروع کر دیا۔ تاریخ کا جو تصور امیر خسرو (1253ء تا 1325ء) عصامی (تصنیف 1350ء) ضیاالدین برنی (1358ء میں تحریر کی) شمس سراج عفیف (پیدائش 1342ء تصنیف پندرہویں صدی) اور یحییٰ بن احمد سرہندی (تصنیف

1434ء تا 35) نے زیادہ بڑے آدمیوں، فرمانرواؤں، شہزادوں اور امیروں کی تاریخ تھی، نیچے اور کمتر اشخاص کی نہیں، اور نہ عوام کی تاریخ تھی۔ برنی کے نزدیک تاریخ پیغمبروں، خلفا، سلطانوں اور حکومت اور مذہب کے دوسرے بڑے لوگوں کے واقعات اور روایات کا علم ہے۔ اگر وہ کمتر اور نااہل لوگوں کے کام بیان کرنے لگتی ہے تو اس کی افادیت ختم ہو جاتی ہے۔ حقیقتاً ایسے اشخاص کو عموماً اس علم کا ذوق نہیں ہوتا اور اس کے مطالعے سے انھیں کوئی فائدہ بھی نہیں ہوتا۔[17] لہٰذا کچھ مصنفین نے فرمانرواؤں اور افراد کی شان میں قصیدے لکھے۔ جیسے العتبی (تاریخ یمنی 1020ء تا 1021ء)، عفیف (تاریخ فیروز شاہی، تصنیف 1398ء تا 1399ء) یہ کتابیں فرمانرواؤں یا افراد کے مناقب یا تاریخِ فضائل یا تحریری قصیدے کے درجے میں شمار کی جاتی ہیں۔

مزید براں، ابتدائی دور وسطیٰ کے ہندوستانی مورخین اپنے یورپین ہمعصروں کی طرح یہ سمجھتے تھے کہ تاریخ خدا کے حکم سے ہونے والا ایک تماشا ہے انسانی اعمال کی نہیں بلکہ فعل خدا کی ایک کہانی ہے جس میں انسان محض معمولی کارکنوں کی حیثیت رکھتے ہیں تیسرے، انھوں نے کوشش کی کہ تاریخ کی ترجمانی روایتی قسم کے مذہبی و اخلاقی پس منظر کے ساتھ کی جائے، جس میں اس ظالم دنیا کی بے حقیقت چیزوں سے گریز کیا جائے۔ (جیسے یحییٰ اور عصامی)۔

چوتھے، انھوں نے تاریخ کو مذہب کا مقصد حاصل کرنے اور اسلام کی عظمت بڑھانے کے لیے استعمال کیا۔ اسلام کی عظمت بڑھانے کا یہ رویہ ہندوستان کے تعلقات کے بارے میں اس دور کے بیانات کی تشریح کرنے میں مدد دیتا ہے۔ (جنگیں، لڑائیاں وغیرہ) اور ان بیانات میں جس مبالغے سے کام لیا گیا ہے اس کا سبب بہت کچھ سمجھ میں آجاتا ہے۔

پانچویں یہ کہ ابتدائی ہندو مسلم مورخین (برنی، یحییٰ، امیر خسرو اور دوسرے مصنفین)

نے تاریخ میں ناصحانہ عنصر پر زور دیا ہے، کیونکہ تاریخ اخلاقیات کی ایک شاخ اور اخلاقی اصولوں کا ذخیرہ سمجھی جاتی ہے۔

مُغل دَور

مغل زمانے کے تاریخی ادب کا مطالعہ کیا جائے تو تاریخ کی قسم اور مصنفین کے رُتبے میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔

اپنی سوانح عمری لکھنے والے بادشاہ (تیمور، بابر، جہانگیر)، توزک نگار (مرزا حیدر دغلت، گلبدن، جواہر اور دوسرے لوگ)، سرکاری تاریخ نگاری (ابو الفضل، عبد الحامد لاہوری، محمد کاظم اور محمد ساقی مستعدخاں)، غیر سرکاری مورخین (نظام الدین، عبد القادر بدایونی، خفی خاں، مرزا محمد حسن اور دوسرے) دورِ سلطنت کے مصنفین سے سماجی رُتبے، نظریے، زبان اور طرزِ نظر کے اعتبار سے مختلف تھے۔ ذاتی فائدے کا عنصر، انعام کا حصول، یا قرض احسان کی ادائیگی، یہ سب باتیں یا تو پسِ منظر میں چلی گئی تھیں یا اتنی اہم رہی تھیں جتنی سابقہ دَور میں تھیں سب سے اہم تبدیلی یہ ہوئی کہ مغل زمانے میں تاریخ نے غیر مذہبی انداز اختیار کرلیا۔

دوسرے، گو مغل دَور کی تاریخ میں مرضیِ خدا کا رویہ نظر آتا ہے، لیکن ترک افغان دَور کے مقابلے، مُغل دَور میں تاریخ کا انسانی پہلو زیادہ نمایاں اور اسباب رُوحانی کم نمایاں لگتے ہیں۔

تیسرے، مُغل دَور میں تاریخ سے ناصحانہ عنصر کم ہونے لگتا ہے اور مورخین سیاسی انتظامی یا فوجی واقعات، افعال اور اقدامات پر، اور عام اخلاقی اصولوں یا مبہم انداز کی تنبیہوں کے مقابلے میں علت و اسباب پر زیادہ توجہ صرف کرتے ہیں۔

(۱) شاہان خود سوانح نگار

تیمور:

شاہانِ تیمو اعلا تعلیم یافتہ اور تعلیم و ادب کے بڑے سرپرست تھے۔ ملفوظاتِ تیموری یا تو زکِ تیموری تیمور کی خود نوشت سوانح عمری تھی جو چغتائی ترکی زبان میں لکھی گئی تھی اور جس میں اس کی زندگی کے اکتالیس برسوں کا ذکر تھا۔ میجر ڈیوی کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس کتاب کے اصل ہونے پر جو شبہ تھا وہ اب دور ہو گیا ہے۔ وہ طریقہ جس کے ذریعے تیمور کی زندگی کے واقعات کا ذکر اور حال تحریر کیا گیا، تیمور کی وفات کے تیس سال بعد ملفوظات کی نقل ظفرنامہ کے مصنف شرف الدین یزدی نے یوں بیان کی ہے، وہ اشخاص جو اپنے علم و فضل اور نیکوں کے باعث اعلا کردار کے نمونے تھے اور العور عہدیداران اور فارسی معتمد، تیمور کے دربار میں حاضر رہتے تھے اور ان کے تحت جو عملہ تھا وہ شہنشاہ کے حکم سے ہر اس واقعے کا حال درج کرتا تھا جو رونما ہوتا تھا۔ تیمور کی نقل و حرکت، افعال اور اقوال، مختلف معمولی واقعات اور سلطنت، مذہب نیز وزرا کے سارے معاملات درج کیے جاتے اور نہایت احتیاط کے ساتھ تحریر کیے جاتے تھے۔ اس سلسلے میں نہایت سخت احکامات دیے گئے کہ ذرا بھی کمی بیشی یا ترمیم کیے بغیر واقعات کو بالکل اسی شکل میں درج کیا جائے جس شکل میں وہ رونما ہوئے ہوں۔ ذاتی طرزِ عمل اور ہمت کے معاملے میں اس اصول پر خاص طور سے کار بند رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ جب اہلِ علم اور خوش بیان لوگوں نے یہ واقعات قلم بند کر لیے تو ان کی تحریروں پر جلا کی گئی اور انھیں نظم اور نثر میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ تحریریں وقتاً فوقتاً شہنشاہ کے سامنے پیش کی گئیں اور پڑھی گئیں تاکہ اس کی منظوری کی چھاپ پڑ جائے اور اعتمادِ کامل حاصل ہو جائے۔ اس صورت سے تیمور کی زندگی کے افعال اور مختلف معمولی واقعات کے ان اندراجات پر، جو چاہے ترکی نظم کی شکل میں ہوں یا فارسی نثر کی صورت میں، نظرِ ثانی کی گئی اور بالآخر انھیں نظم اور نثر میں تحریر کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ دربار کے کچھ عہدیداروں نے تیمور کے دور کے واقعات

قلم بند کیے اور جو کچھ تحریر کیا تھا اس کی صداقت کی تصدیق بڑی محنت کاوش سے کی اور پھر باکمال مصنّفوں نے ان تحریروں کو ترکی نظم اور فارسی نثر میں ڈھال دیا۔[18] اس طریقے نے غالباً ابوالفضل کو متاثر کیا اور اس نے بھی اپنی شاہکار کتاب لکھتے وقت اسی طریقے کا استعمال کیا۔

تیمور نے خود اپنی خود نوشت سوانح عمری میں ہندوستان پر حملے کرنے کے جو محرکات بیان کیے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مہم کے پیچھے مذہبی، اقتصادی، مادّی اور سیاسی عناصر کام کر رہے تھے۔ ایک جگہ تیمور دو مقاصد کا ذکر کرتا ہے جو مذہبی اور سیاسی تھے: میرے ہندوستان آنے اور تکالیف و مصائب اُٹھانے کا خاص مقصد دو باتوں کی تکمیل کرنا ہے، ایک یہ تھا کہ کافروں سے اور دین محمد کے دشمنوں سے جنگ کروں تاکہ اس کے بعد والی زندگی میں اس مذہبی جنگ کے عوض اجر کا طالب ہو سکوں۔ دوسرا ایک دُنیاوی مقصد تھا کہ افواج اسلام کافروں کا مال و دولت لوٹ کر کچھ حاصل کر لیں۔ جنگ میں لوٹ مار اتنی ہی مرغوب جتنا ان مسلمانوں کو اپنی ماں کا دُودھ جو ایمان کی خاطر جنگ کرتے ہیں، اور جائز مال خرچ کرنا باعث فضل و کرم ہوتا ہے۔"[19]

(1) مذہبی

(۱) کافروں کے خلاف مہم کی قیادت اور غازی کہلانے کی آرزو، کیونکہ میرے کانوں نے سُنا ہے کہ کافروں کو مارنے والا غازی ہوتا ہے، اور اگر وہ خود کام آجائے تو شہید ہوتا ہے۔ یہی سبب تھا کہ میں نے یہ تہیّہ کیا، لیکن میرا ذہن یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ چین کے کافروں کے خلاف مہم شروع کروں یا ہندوستان کے کافروں اور اصنام پرستوں کے خلاف۔ اس معاملے میں میں نے قرآن سے فال نکالی اور جو آیت کُھلی وہ یہ تھی "اے پیغمبر کافروں اور منکروں سے جنگ کرو اور اُن سے سختی سے پیش آؤ۔"[20]

(ب) "ہندوستان پر حملہ کرنے میں میرا مقصدِ اعظم کافر ہندوؤں کے خلاف ایک مذہبی جنگ لڑنا تھا . . ."[21]

(ج) جب تیمور افغانستان پہنچا تو "امرا اور عوام، علما اور کمتر" دونوں طرح کے مسلم باشندوں (اندراب کے) نے مشترکہ طور پر شکایت کی اور ظلم کے خلاف اس کی حمایت اور انصاف طلب کیا۔" کافر کستور اور سیاہ پوش ہر سال ہم سے، جو خدا کے ماننے والے ہیں، خراج وصول کرتے ہیں اور دھمکی دے کر روپیہ حاصل کر لیتے ہیں، اور اگر ہم مقررہ رقم میں ذرا بھی کمی کرتے ہیں تو ہمارے مردوں کو مار ڈالتے ہیں اور عورتوں اور بچوں کو لے جا کر غلام بنا لیتے ہیں، اس لیے ہم بے یار و مددگار مسلمان، دوڑ کر عظیم بادشاہ کے سایہ عاطفت میں آئے ہیں تاکہ ان کافروں کے خلاف وہ ہم مظلوموں کی دلی خواہش پوری کر دے۔ یہ الفاظ سن کر میرے اندر جوش اسلام اور اپنے مذہب سے لگاؤ کی جوت جل اٹھی:[22]

(2) اقتصادی

ہندوستان کی دولت نے تیمور کو ترغیب دی۔ شہزادہ محمد سلطان نے بتایا ہندوستان کا پورا ملک سونے اور جواہرات سے بھرا ہوا ہے، اور اس میں سونے اور چاندی، ہیرے اور لعل اور زمرد اور ٹین اور لوہا اور تانبہ اور سیماب وغیرہ کی سترہ کانیں ہیں اور اس میں ایسے پودے اور پیڑ اُگتے ہیں جن سے پہننے کے کپڑے بنائے جا سکتے ہیں، اور خوشبودار پودے اور گنّے اُگتے ہیں، اور وہ ایک ایسا ملک ہے جو ہمیشہ سرسبز و شاداب رہتا ہے، اور اس ملک کا ہر انداز خوشگوار اور مسرت افزا ہے۔"[23] لیکن ہندوستان کی صرف اس دولت کے باعث نہیں بلکہ اس دولت کے باعث حملہ آور کو اپنا حملہ خصوصاً جائز لگا جو کافروں اور بت پرستوں کے پاس تھی۔ "چونکہ ہندوستان کے زیادہ تر باشندے اصنام پرست اور کافر اور بت پرست اور آفتاب کی پوجا کرنے والے ہیں، اس لیے خدا

اور اس کے پیغمبر کے حکم سے اب یہ جائز ہو گیا ہے کہ ہم انہیں مفتوح بنا لیں۔"[24]

(3) سیاسی

مذہبی اور اقتصادی عناصر کے علاوہ ایک سیاسی محرک بھی تھا۔ ہندوستان پر ایران اور وسطِ ایشیا کا جو غلبہ رہا ہے تیمور کا حملہ اسی پرانے غلبے کو دوبارہ قائم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

(ا) اس وقت شہزادہ شاہ رخ نے بتایا: "ہندوستان ایک وسیع ملک ہے، جو کوئی سلطان اسے فتح کر لیتا ہے وہ کرۂ ارض کے چاروں کونوں کا حکم اعلا بن جاتا ہے۔ اگر ہم اپنے امیر کی قیادت میں ہندوستان کو فتح کر لیں تو ہفت اقلیم کے فرمانروا بن جائیں گے۔" اس کے بعد اس نے کہا: "میں نے ایران کی تاریخ میں دیکھا ہے کہ ایرانی سلطانوں کے زمانے میں ہندوستان کا بادشاہ پوری تعظیم اور تکریم کے ساتھ دارا کہلاتا تھا۔ اس وقار کے باعث اس کا کوئی اور نام نہ ہوتا تھا۔ اور روم کا شہنشاہ سیزر کہلاتا تھا، اور ایران کا سلطان کسریٰ کہلاتا تھا، اور تاتاریوں کا سلطان خاقان، اور چین کا شہنشاہ فغفور لیکن ایران اور توران کے بادشاہ کا لقب شہنشاہ ایران و توران تھا، اور بڑی افسوسناک بات ہو گی اگر ہم ہندوستان کے ملک کے حاکم اعلا نہ بن سکے۔ میں شہزادہ شاہ رخ کے ان الفاظ سے نہایت خوش ہوا۔"[25]

(ب) امیر تیمور سلطان محمود سے کسی طرح کمتر نہیں تھا بلکہ برتر تھا: اوّل الذکر نے تیس ہزار گھوڑوں سے ہندوستان فتح کیا تھا، جبکہ تیمور کے ساتھ ایک لاکھ بہادر تاتاری شہسوار تھے .... "اگر وہ اس مہم کا فیصلہ کر لیتا ہے تو خداوند تعالیٰ اسے فتح نصیب کرے گا، اور وہ خدا کے حضور غازی اور مجاہد بن جائے گا، اور فوج مطمئن اور خزانہ مالا مال ہو جائے گا، اور ہندوستان کے سونے سے ہمارا امیر فاتح عالم بن جائے اور [illegible]"[26]

(ج) تیمور مسافروں کو جاٹوں سے محفوظ کرکے امن اور اندرونی سلامتی بھی قائم کرنا چاہتا تھا۔ "وہ محض نام کے مسلمان، نیز مسافروں کے لیے سخت خطرہ تھے۔ وہ اب گاؤں چھوڑ کر گئے کے کھیتوں، وادیوں اور جنگلوں میں بھاگ گئے تھے۔ جب یہ حقایق میرے کانوں تک پہنچے تو میں نے ایک فوج تیار کی اور اس کی کمان ہسدو کرترا کے بیٹے کو کل بہادر کے سپرد کی، اور اسے جاٹوں کے خلاف روانہ کر دیا۔"[27] "۔۔۔۔۔ یہ سرکش جاٹ اتنی بڑی تعداد میں تھے جیسے چیونٹیاں یا ٹڈیاں، اور کوئی مسافر یا سوداگر ان کے ہاتھوں ضرر اٹھائے بغیر گزر نہیں سکتا تھا۔"[28] یہ مقصد مرضیٔ خدا سے نمایاں طور پر مختلف لگتا ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ گو مذہبی عناصر بالکل غائب نہیں ہوئے تھے، پھر بھی ان پر غیر مذہبی عناصر کا غلبہ ہو گیا تھا۔

مہم چلائے جانے سے پہلے ابتدائی بحث کے دوران بہت سے لوگوں نے اس بات کی مخالفت کی کہ ہندوستان پر ہمیشہ کے لیے قبضہ کر لیا جائے، لیکن تیمور نے ان کے اعتراضات رد کر دیے۔ "بعض امرا نے کہا: خداوند تعالیٰ کی عنایت سے ہم ہندوستان فتح کر سکتے ہیں، لیکن اگر ہم نے وہاں مستقل قیام کیا تو ہماری نسل بگڑ جائے گی اور ہمارے بچے ان علاقوں کے باشندوں کی مانند ہو جائیں گے، اور چند ہی نسلوں کے بعد ان کی قوت اور شجاعت کم ہو جائے گی۔" فوجی دستوں (کشونت) کے امیر ان الفاظ سے پریشان ہو گئے۔ "لیکن میں نے ان سے کہا! "ہندوستان پر حملہ کرنے سے میرا مقصد کافروں کے خلاف مہم کی قیادت کرنا ہے، تاکہ ہم اس ملک کے لوگوں کو قانونِ محمد (خدا ان پر اور ان کی آل اولاد پر اپنا فضل و کرم قائم رکھے) کے مطابق، دینِ حق پر لا سکیں، اور اس ملک کو کفر اور اصنام پرستی کی گندگی سے پاک کر سکیں، اور تاکہ ہم ان کے مندروں اور مورتیوں کو تباہ کر سکیں اور خدا کے روبرو غازی اور مجاہد بن سکیں۔"[29]

بابر کی خود نوشت سوانح عمری محض ایک سیاسی تحریر ہی نہیں، ایک ماہر حیوانیات

ونباتات کا رسالہ بھی ہے۔ اپنے تجربوں اور جوہروں کی بنا پر اس میں اپنی تزک جیسی بیش بہا کتاب لکھنے کی لیاقت بدرجہ اتم موجود تھی۔ وہ ایک عظیم سپہ سالار اور جید سیاستداں تھا۔ گو وہ ایک سپاہی تھا جو قسمت آزمانے کے لیے ہر دم تیار رہتا تھا، پھر بھی تعلیم یافتہ اور باشعور شخص تھا۔ وہ عربی فارسی (تہذیب کی زبان) کا ایک ممتاز عالم تھا، اور اپنی مادری زبان ترکی کا صاحب طرز استادِ تر تھا۔ وہ ایک نفیس شاعر (اس کے دیوان کے لیے دیکھیے، جے۔اے۔ایس۔بی، 1910ء صفحات 875) تھا۔ وہ ایک ایسا باریک بین اور نازک مذاق نقاد تھا جس کی زبان میں ساری لطافت اور نفاست موجود تھی۔ وہ جس علاقے میں گیا وہاں جیروں کو گنتی کے اعتبار سے بڑے پُر تجسس انداز میں ٹھیک طور سے دیکھا۔ وہ خوبصورت لطاروں اور عمدہ پھولوں کا بڑا شیدائی تھا۔[30] اسے "حسن فطرت سے بڑا پیار تھا، اس کی آنکھ حسن کو ہر شکل میں دیکھ لیتی تھی، اور وہ ایک سائنس داں کی طرح گہرا مشاہدہ کرتا تھا۔"[31]

جہانگیر کی خودنوشت سوانح عمری پر نہ صرف اس کے کردار، علم و فضل اور اس کی زندگی کے نشیب و فراز کی چھاپ پڑی ہوئی ہے، بلکہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ کوئی معمولی لیاقت کا آدمی نہیں تھا۔ وہ اپنی کمزوریاں تحریر کرتا ہے، بڑی صاف دلی سے غلطیوں کا اعتراف کرتا ہے، اور اگر محض اس کی کتاب پڑھ لی جائے تو اس کی صلاحیتوں اور دونوں کی بابت بڑا اچھا اثر پڑتا ہے۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی جواہرات کا شایق تھا، اور ایک سچے نقاد کی طرح ان کی قیمت کا اندازہ لگا لیتا تھا۔ وہ ایک زبردست شکاری تھا اور اپنی زندگی کے آخری برسوں تک اسے اس کھیل میں مزہ ملتا رہا۔ وہ فطرت کا شیدائی تھا، خواہ وہ جاندار کی شکل میں ہو یا بے جان شکل میں، اور اسے بڑی تیز اور مشتاق نظروں سے دیکھتا تھا۔ وہ بہت سے جانوروں اور پرندوں کی

خصوصیات کا ذکر کرتا ہے' اور تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بڑی سرگرمی اور مستقل مزاجی سے ان کی عادتوں کو دیکھتا رہتا تھا درخت، پھل اور پھول بھی اس کے مشاہدے میں رہے' اور وہ اس انداز سے فنِ تعمیر اور باغبانی پر رائے زنی کرتا جیسے اس نے ان چیزوں پر بڑا وقت صرف کیا ہو اور غور کیا ہو۔[32]

◆ جہانگیر کی توزک بابر کی توزک سے کم دلچسپ نہیں ہے۔ اگر بابر میں اپنی سیاستی کی غلطیوں میں شامل کر لیتا ہے تو جہانگیر بھی تزکِ کے برعکس انداز میں نہیں یہ بتا دیتا ہے کہ اس نے ابوالفضل کو کس طرح قتل کروایا۔ لیکن وہ نورجہاں سے اپنی شادی کا ذکر نہیں کرتا[33]

گلبدن بیگم بابر کی بڑی تعلیم یافتہ بیٹی (1523ء تا 1603ء) اور ایک چغتائی مغل خواتین خضر خاں کی بیٹی تھی۔ اس نے اکبر کی درخواست پر ہمایوں نامہ لکھا تھا۔ (ستّرہ سال کی عمر میں)۔ وہ جب آٹھ برس کی تھی تو بابر فوت ہو گیا تھا۔ لہٰذا اس نے اس کا بہت مختصر طور پر ذکر کیا ہے' اور یہ ذکر ان روداروں کی بنیاد پر کیا ہے جو اسے دوسروں سے وصول ہوئی تھیں۔ ہمایوں نے 1530ء کے بعد اس سے بڑا اچھا سلوک کیا۔ 1540ء کے بعد اس نے کابل میں قیام کر لیا۔ ہمایوں کی فتوحات' شکستوں' دشواریوں اور مصائب (جو اسے بے وفا کامران کے ہاتھوں اٹھانے پڑے) کی وہ تقریباً عینی شاہد تھی۔ جہاں وہ ذاتی مشاہدہ پورے طور سے نہ کر سکی وہاں اُسے دوسروں' خصوصاً حرم کی بزرگ خواتین پر بھروسہ کرنا پڑا جیسے خانزادہ' ماہم اور حمیدہ بانو بیگم ہیں جن کی وہ عزت کرتی تھی اور جن کا اعتماد اُسے حاصل تھا۔ یہ کتاب فطری طور پر مغلوں کے سماجی اور تہذیبی پہلو پر زیادہ روشنی ڈالتی ہے اور فوجی تفصیلات (جیسے چوسہ اور فتوح) پر کم۔ بعض اوقات واقعات کی ترتیب غلط ہو جاتی ہے۔[34]

تاریخ رشیدی کے مصنف مرزا حیدر دغلت (پیدائش 1499ء یا 1500ء وفات 1551ء) کے آباؤ اجداد بڑے ممتاز لوگ تھے۔ وہ محمد حسین مرزا (امیر کاشغر کا بیٹا) اور بابر کی

خالہ کا لڑکا تھا اور اس لیے بابر کا خالہ زاد بھائی تھا۔ لہٰذا اسے ورثے میں بڑی جسمانی قوت
اور لیاقت ملی تھی۔ جب ہرات سے شیبانی خاں نے اس کے باپ کو مار ڈالا (1508ء)
بابر کی "پدرانہ شفقت اور نگرانی" نے اس نقصان کا ازالہ کر دیا۔ وہ بابر کے تحائف کی تعریف
کرتا ہے اور اس کے احسانوں کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ وہ بابر ہی کی طرح جری اور جاں باز
تھا اور اس نے مختلف مقامات پر بڑی غیر معمولی فوجی سرگرمی دکھائی۔ خاصی ادبی صلاحیت
اور تیز قوتِ مشاہدہ کا مالک ہونے کی وجہ سے اس نے اپنے میرے بھائی کی طرح جو کچھ دیکھا
اور چھان بین کے بعد سنا، اسے تحریر کر دیا۔ ارسکائن کے مطابق، تاریخ رشیدی ایک ہما...
اور صاحبِ علم شخص کی کاوشوں کا نتیجہ ہے، اور بعد کے دو حصے ایک ایسے ہمعصر کے ہیں جو بیان
کیے جانے والے واقعات اور افراد سے خوب اچھی طرح واقف تھا۔[35] مغل خانون اور امرا...
کاشغر کی تاریخ کے واسطے یہ ایک قابلِ قدر کتاب ہے۔ اسے کاشغر کے سلطان سعید...
نام معنون کیا گیا تھا۔ ہندوستان کی خبریں کہیں کہیں ہیں اور خاص طور پر
واقعات سے متعلق ہیں جن میں وہ خود شریک رہا، جیسے کامران کے تحت اس کی لا...
کی صوبیداری اور ہمایوں کو مدد کی پیشکش اور کشمیر کی فتح (1540ء) اور اس...
تک کشمیر پر اس کی حکمرانی جب تک 1551ء میں وہ سازشوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ ق...
کی جنگ کا بیان اس کی عینی شہادت پر مبنی ہے کیونکہ ہمایوں کی فوج کا ایک بازو اس...
کمان میں تھا۔ وہ ہمایوں کا جاں نثار تھا اور اس نے ہمایوں سے کہا تھا کہ سلطنت کے د...
حصول کے لیے کشمیر کو تختۂ چھلانگ کی طرح استعمال کرے۔[36]

جوہر تذکرۃ الواقعات کا مصنف تھا۔ آفتابچی یا آب دار ہونے کی وجہ سے وہ ...
برس سے زیادہ ہمایوں کا مستقل خدمت گار رہا۔ لہٰذا وہ ایک ہمعصر مورخ تھا۔ یہ ...
معلوم کہ کتاب لکھتے وقت اس کی اصل حیثیت کیا تھی۔ جوہر خود یہ لکھتا ہے کہ ہمایوں
پرگنہ ہیبت پور کی آمدنی وصول کرنے کا کام اس کے سپرد کیا تھا۔ ابوالفضل بھی

پہلے ضلع ہیبت پور کا محصل اور بعد میں مہتر جوہر، خازنِ پنجاب لکھتا ہے۔[37] اس لیے یہ بات صاف ہوگئی ہے کہ اُسے کوئی مرتبہ مل گیا تھا۔

کتاب کا مقصد ہمایوں کی زندگی و ترقی کا ایک "حقیقی اور واقعی بیان پیش کرتا ہے۔" ایک معمولی ملازم ہونے کے باعث جوہر کوئی صاحبِ علم شخص نہ تھا۔ اس کی کتاب علم و فضل سے خالی ہے اور سادہ انداز میں لکھی ہوئی ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے اس شخص نے لکھا ہے جو عینی شاہد اور معتبر شخص تھا اور اسی لیے الفنسٹن کا خیال ہے کہ وہ ہمایوں کے ہر فعل کو درست بنانے کے لیے مضطرب رہتا تھا۔ لیکن اس کی تحریر مبالغے سے اور قصیدہ گو لوگوں کی روایتی مدح و ثنا سے اکثر اوقات آزاد نظر آتی ہے۔ وہ اس شہنشاہ کی ایک "واضح اور زندہ تصویر" پیش کرتی ہے جو دُنیاوی معاملات میں اُلجھا ہوا ہے — جیسے اس کا فرار، ایران میں اس کی دُشواریاں اور اس کی ایسی خوبیاں بتاتی ہے جیسے جرأت، تحمل، حلم، رحم دلی، انکساری، تقدس اور قناعت۔ ڈاکٹر ایس۔ رے کے الفاظ میں "ایران میں ہمایوں کے قیام کا اتنا تفصیلی بیان کسی دوسرے مورّخ نے نہیں دیا جتنا جوہر نے دیا ہے۔ کوئی دوسرا مورّخ جو مغل نقطۂ نظر سے لکھ رہا ہو، ان مصائب اور بے قدریوں کو ظاہر نہیں ہونے دیتا جو ہمایوں کو صفوی دربار میں اُٹھانی پڑیں۔"

جوہر نے اکبر کی حکم کی تعمیل میں تاکہ اکبرنامہ کو مواد فراہم ہو سکے، اسے لکھنا شروع کیا (1587ء) یعنی ہمایوں کی وفات کے تیس سال بعد۔ لہٰذا اس کی وہ ایمانداری اور حق گوئی جو شبہات سے بالاتر تھی بگڑتی ہوئی یاد داشت کے باعث یقیناً کم ہوگئی ہوگی۔ "دیر میں سوچنا اور اس کے بعد لکھنا" یہ بات واقعات کا درست خاکہ بتاتے وقت اور صحیح بیان لکھتے آڑے آئی ہوگی۔ ہاں، ڈی۔ اسمتھ ضرور یہ سوچتا ہے کہ جوہر نے "واقعات بیان کرتے وقت ضرور ان یادداشتوں سے مدد لی ہوگی جو اس نے کبھی درج کر لی تھیں۔"[38] لیکن بعض دوسرے اہلِ علم اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ ڈاؤسن لکھتا ہے: "یہ اس انداز کی

تحریر نہیں کی جس زمانے میں واقعات رونما ہوئے اسی زمانے میں انھیں لکھ لیا گیا۔ بلکہ یہ تیس سال سے زیادہ پہلے کی یادیں ہیں۔ اس لیے مصنّف خواہ کتنا ہی پُر خلوص اور صاف دل رہا ہو؛ وقت نے اس کے تاثرات کا رنگ ہلکا کر دیا ہوگا اور بلاشبہ یادداشت نے ان یادوں پر جو ایک نہایت محبوب آقا کی یادیں تھیں، طرف داری کا رنگ چڑھا دیا ہوگا۔ اس کی توزک میں جن اشخاص سے جو مکالمے منسوب کیے گئے ہیں ان مکالموں میں ضرور بہ ضرور اتنی ہی باتیں اور شامل ہوگئی ہیں جتنی واقعی کہی گئی ہوں گی' یہ اضافہ وہ ہے جس کی بابت مصنّف نے سوچا ہوگا کہ شاید ان لوگوں نے کہی ہوں گی یا انھیں کہنی چاہیے تھیں۔" ڈاکٹر بنرجی نے بعض سادہ غلطیوں کا حوالہ دیا ہے جو گرتی ہوئی یادداشت کی سبا پر سرزد ہوئیں۔[39]

دوسرے' اس توزک میں ایک بہت بڑی کمی ہے۔ بابر اور جہانگیر کی توزکوں کے برعکس یہ ذاتی اوصاف اور نقصوں پر کوئی روشنی نہیں ڈالتی جس سے قاری یہ اندازہ نہیں لگا پاتا کہ ہمایوں بحیثیت انسان کیسا شخص تھا۔ تیسرے' یہ ہمایوں کی ابتدائی اور شہزادگی کی زندگی (23 سال) کے بارے میں بالکل خاموش ہے۔ چوتھے' اس میں تاریخیں بہت کم دی گئی ہیں' اور جو چند دی گئی ہیں ان میں سے بھی بعض غلط ہیں۔ پانچویں دکن کی جغرافیائی خصوصیات کے بارے میں مصنّف کا علم بہت کم ہے ـــــ ہمایوں اور بہادر شاہ کی جنگ کُرہاں پور کے مقام پر بتاتی ہے۔ چھٹے' اس میں احساسِ تناسب کی کمی ہے' اور یہ صلاحیت کروہ" اہم اور معمولی میں فرق کرسکے" کم ہے۔

پھر بھی بعض اوقات جوہر ایک سچے مورخ کی سطح پر آجاتا ہے۔[40]

(ج) مغل دَور کے سرکاری مورخین

مغل دَور سرکاری تاریخوں یا نامہ کے اعتبار سے بڑا ممتاز زمانہ تھا۔ تاریخ کی اس نئی قسم کو ایرانی اثر سے تحریک ملی تھی' اور ایک پردیسی دربار میں ایرانیوں کے اثر

سے اس تحریک میں جان پڑ گئی تھی۔ یہ رواج کہ سلطنت کی سرکاری تاریخ ایک شاہی تاریخ نگار لکھے اکبر نے شروع کیا، جو اورنگ زیب سے دور تک جاری رہا پھر اورنگ زیب نے یہ رواج بند کر دیا۔ جب تجربے کار عہدیداروں اور درباریوں، مشاق محرّروں اور معتمدوں نے واقعات قلم بند کرنے شروع کیے تو تاریخ کی "مشکل" مضمون اور انداز سب میں ایک تبدیلی آگئی: تاریخ ایک مسلسل روزنامچہ بننے لگی۔ یہ سرکاری تاریخیں عصری دستاویزوں پر مبنی تھیں جن کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود رہتا تھا یعنی لوں کی سرکاری دستاویزات اور اخبارات دربارِ معلّٰی یا دربار کی سرکاری اطلاعات یا جو نامے شاہی ہدایتوں کے تحت درست کیے جاتے تھے۔ لہٰذا یہ کتابیں کسی بادشاہ کے دور کے واقعات فراہم کر دیتی تھیں جو عموماً قابلِ اعتبار ہوتے تھے۔ (کسی سال کی یہی درست بنیاد ہوتی ہے)۔ اس معلومات کی مدد سے کرداروں اور سیاسی قوتوں کے بارے میں ہم خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف، تاریخ کو پیش کرنے کا انداز لامحالہ طور پر دربار کے سماجی، سیاسی اور مذہبی رجحان کی غمازی کرتا نظر آتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ابوالفضل، عبدالحمید لاہوری، محمد کاظم اور محمد ساقی مستعد خاں جیسے سرکاری مورّخین، فرمانرواؤں اور وزیروں کے افعال کے بارے میں کوئی آزاد اور تنقیدی رویہ نہیں اپنا سکتے تھے۔ وہ بڑی دانائی سے ان تفصیلات کو ٹال گئے جن کا تعلق ہمایوں کے قیام ایران و افغانستان سے تھا کیونکہ شاہ طہماسپ نے اس کے ساتھ بڑا شرمناک سلوک کیا تھا۔ لہٰذا انھوں نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ شاہی گھرانے کو جو عارضی گرہن لگا تھا اِسے نظر انداز کر دیں۔

جب پرانا دینیاتی تصوّر مسترد کر دیا گیا، تو تاریخ کی توجہ زیادہ سے زیادہ دربار اور بادشاہ کی سرگرمیوں پر مرکوز ہونے لگی۔ تاریخ غیر مذہبی بننے لگی۔ مورّخین جو پہلے اس کے مطالعے کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے دینیاتی جواز پیش کرتے تھے، اب اس کی اخلاقی

افادیت کی وکالت کرنے لگے۔ درباری روزنامچے اپنے سرپرستوں کی نفرت انگیز خوشامد" اور طولانی تفصیلات کے عادی بننے لگے۔ لیکن خوشامد کے "اس عیب کا تعلق جتنا اندازِ بیان سے تھا اتنا حقایق سے نہ تھا" (سرکار)۔ ان سرکاری تاریخوں میں دی ہوئی کوئی حقیقت غلط ثابت نہیں ہوئی، اور اکثر اوقات اس کا سہرا شہنشاہ ہی کے سر باندھا جاتا ہے گو بعض اوقات وہ اس کا مستحق نہیں ہوتا۔ ابوالفضل جب اکبر کے دَور کی مالی اصلاحات کا ذکر کرتا ہے تو ایک دفعہ بھی ٹوڈرمل کا نام نہیں لیتا اور شہنشاہ کو آئینِ دہ سالہ کا موجد بنا دیتا ہے[41]۔

اکبر کا وزیر اور دوست، مصنّف، سیاسی مدبّر، سفارت کار اور فوجی کمان دار، شیخ ابوالفضل (1551ء تا 1602ء) حجاز کے ایک عربی خاندان سے تعلق رکھتا تھا، جو ہجرت کر کے سندھ آگیا تھا اور پھر اجمیر کے شمال مغرب ناگور میں مُقیم ہوگیا تھا۔ اسے تصوّف، علم اور وسیع المشربی کی روایتیں اپنے والد مبارک اور اپنے دادا خضر سے ورثے میں ملی تھیں، اور برداشت کا سبق اُس نے مدرسۂ جبر و مصائب میں سیکھا تھا، کیونکہ مہدوی رُجحانات کی وجہ سے اس کے والد مبارک کو مصائب اُٹھانے پڑے تھے۔ پندرہ برس کی عمر میں مختلف علوم پر قدرت حاصل کر کے، اور بیس برس کی عمر سے پہلے ہی خود اُستاد بن کر اس نے اپنی قبل از وقت غیر معمولی ذہنی نشوونما اور وسعتِ علم ظاہر کرنا شروع کر دیا تھا۔ رشتے داروں کی ملامتوں کے باعث اُسے زاہد علی کی خلوت کو خیرآباد کہنا پڑا۔ 1573ء میں وہ اپنے بڑے بھائی فیضی کے ذریعے شہنشاہ سے متعارف ہوا، اور چونکہ علم و فضل نیز مخلصانہ وفاداری کے باعث اسے تیزی سے ترقی ملی، اس لیے حریفوں اور دشمنوں کو جلن پیدا ہونے لگی۔ اس کا رتبہ، انتظامی تربیت، ہر معاملے سے ذاتی تعلق، سرکاری کاغذات تک رسائی، علم و فضل اور حیرت خیز ادبی اسلوب، ان سب باتوں نے مل کر اس کی دونوں کتابوں کو انمول کتابیں بنا دیا ہے۔

ابوالفضل ہمیں تاریخ کی اپنی تجربہ گاہ میں لے جاتا ہے اور اکبر نامہ نیز آئینِ اکبری میں استعمال کیے جانے والے اپنے طریقوں کی وضاحت کرتا ہے، جو ہمیں ان طریقوں کی یاد دلانے میں جن کا استعمال تیمور کی خودنوشت سوانح عمری میں کیا گیا ہے۔ اس نے خام اشیا حاصل کیں اور ذیل کے طریقوں سے ان کے اجزا ملاکر مرکب بنایا:

(i) روداروں اور واقعات کو محنت سے جمع کرنا۔

(ii) خاص عہدیداروں، بلند مرتبہ آدمیوں، ذی حیثیت واقف کاروں اور شاہی خاندان کے پرانے لوگوں سے شہادتیں جمع کرنا۔

(iii) شہادت حاصل کرنے کے واسطے شاہی تلاش۔ صوبوں کو شاہی فرمان جاری کیے گئے کہ پرانے ملازمین اپنی تحریری سرگزشتیں روانہ کردیں۔ یہ سرگزشتیں چھان بین کے واسطے شہنشاہ کے سامنے پڑھی گئیں۔

(iv) شاہی محافظ خانہ سے اشیا حاصل کی گئیں۔

(v) وزیروں اور عہدیداروں کی رودادیں۔

(vi) شہادتوں کی جانچ (شہنشاہ سے بار بار منہ در منہ بات چیت کے ذریعے)۔

(vii) "اعلاترین اصولی ماہرین" کی مدد سے حقایق کو ترتیب دینا۔

(viii) سات سال کی محنتِ شاقہ اور بار بار نظرِثانی (پانچ مرتبہ) کرنے کے بعد اکبر نامہ مکمل ہوا۔[42]

اپنے دادا کی طرح شاہ جہاں نے بھی اپنے دور کی تاریخ لکھوائی، جو پہلے مرزا امینائی قازوینی اور پھر جلال الدین طباطبائی اور عبدالحمید لاہوری نے تصنیف کی۔ قازوینی افضل خاں کا آوردہ اور ایک شاہی ملازم تھا۔ اس نے پہلے دس برسوں (1627ء تا 1637ء) کی بابت لکھا، لیکن وہ ابوالفضل کے تک نہ پہنچ سکا۔ چنانچہ شاہ جہاں نے اسے بدل دیا اور

تاریخ لکھنے کا یہ کام عبدالحمید (وفات 1654ء) کے سپرد کیا' جو سعیداللہ خاں کی سرپرستی میں تھا۔ ابوالفضل کو نمونہ مان کر' اس نے پہلے بیس برسوں کا تفصیلی حال لکھا' اور پھر اپنی کہنہ سالی کی وجہ سے بقیہ دَور (اکیس تا تیس برس) کا کام اپنے شاگرد' وارث کے سپرد کر دیا۔ قازوینی اور لاہوری دونوں نے جب خرّم کی بغاوت کا ذکر کیا تو نورجہاں پر بڑی تنقید کی۔ لاہوری کی اس کتاب کے بارے میں کہا گیا ہے: "اس میں ان کارروائیوں کی نہایت معمولی تفصیلات دی گئی ہیں جن میں شہنشاہ مصروف رہتا تھا' وظائف اور اعزازات جو شاہی خاندان کے مختلف افراد کو عطا کرتا تھا' امرا کو جو خطابات بخشتا تھا' ان کے عہدے میں جو تبدیلیاں کرتا تھا' ان کے منصوبوں میں جو اضافہ کرتا تھا' اور اس کتاب میں مختلف قسم ان سارے تحائف کی فہرست دی ہوئی ہے جو سرکاری موقعوں' جیسے نوروز' شاہی سالگرہ' تخت نشینی وغیرہ' پر دیے یا لیے گئے تھے۔ لہٰذا یہ کتاب ایسے بہت سے معاملات پر مشتمل ہے جن میں اس زمانے کے امرا اور درباریوں کے علاوہ کسی کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ کہنا جائز نہ ہوگا کہ یہ کتاب ان ہی ادنا باتوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس میں ایسی باتیں واقعی بہت زیادہ ہیں۔ پھر بھی اس میں تاریخ مواد کی ٹھوس بنیاد موجود ہے جس کی مدد سے بعد کے مصنفین نے اس دورِ حکومت کی تاریخ اخذ کی ہے۔"[43]

اکبر کی قائم کی ہوئی روایت کی تقلید میں' اورنگ زیب نے پہلے پہل محمد امین منشی کے بیٹے محمد کاظم کو حکم دیا کہ اس کے دور کی تاریخ لکھے (عالمگیر نامہ' 1688ء)۔[44] جب اس کا اسلوبِ بیان بادشاہ نے پسند کر لیا تو اُسے حکم دیا گیا کہ سے تعلق رکھنے والے سارے غیر معمولی واقعات کے بارے میں معلومات اور اس کی انجام دی ہوئی شاندار فتوحات کا احوال ایک کتاب میں جمع کرے۔ اور اسی کے ساتھ شاہی دستاویزات کے ذمہ دار عہدیداران کو بھی حکم دیا گیا کہ وہ بڑے بڑے واقعات کے بارے میں پرچہ نویسوں اور مختلف ممالک کے اعلا عہدیداروں سے حاصل ہونے والے سارے کاغذات ہر قسم کے

جاسوسوں نے حیرت انگیز واقعات کے بارے میں ماہوارنی اور سالانہ چٹھے اور مختلف صوبوں نیز ممالک سے تفصیلی بیانات مورخ کے حوالے کردیں۔''[44] عالمگیر نامہ ایک درباری قصیدہ ہے جو ''خوشامد کرنے میں نفرت انگیز حد تک اور ملامت کرنے میں بیہودگی کی حد تک بڑھا ہوا ہے۔ اورنگ زیب کی تعریف میں القاب ستائش کی بھرمار ہے اور اس کے بدقسمت بھائیوں کو نہ صرف برا بھلا کہا گیا ہے اور سنسنی اڑائی گئی ہے بلکہ ان کے نام تک بگاڑ دیے گئے ہیں داراشکوہ کو بار بار بے شکوہ (بے وقار) اور شجاع کو نا شجاع (غیر مردانہ) کہا گیا ہے۔[45] لیکن گیارہ سال کے بعد شہنشاہ نے تاریخ نویسی اس خیال کی بنیاد پر ممنوع کردی کہ ''ایسے کارناموں کی زرق برق نمائش سے اندرونی پاکیزگی کی سعی کہیں بہتر ہے۔''

محمد ساقی مستعد خاں (عنایت اللہ خاں کا منشی بہادر شاہ کا وزیر) جو چالیس برس تک شاہی ملازم رہا تھا اور بہت سے واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے، وہ شخص تھا جس نے اپنے سرپرست کی درخواست پر اس کی وفات کے تین سال بعد (1170 میں)، سرکاری کاغذات اور اپنی یادداشتوں کی مدد سے اورنگ زیب کے پورے دور کی سرکاری تاریخ مرتب کی۔ پہلے دس سال عالمگیر نامہ کی تلخیص ہیں بقیہ کتاب اس کی اپنی تخلیق ہے۔ اورنگ زیب کی ممانعت کے باعث اس نے دکن کی مہم کا ''ایک تلخیص بیان پوشیدہ طور سے لکھا'' جس میں اس مہم کی مصیبتوں کا ذرا بھی حوالہ دیے بغیر محض قلعوں اور ممالک کی فتوحات کی تفصیلات لکھ دی ہیں۔''[46]

(د) غیر سرکاری تاریخیں

اس دور میں ادب کی شاہی سرپرستی سے تحریک پاکر جو غیر سرکاری تاریخیں لکھی گئیں انھوں نے معلومات میں اضافہ کیا اور بعض اوقات اس معلومات کی تصحیح بھی کردی جو اس دور کی مداحانہ تاریخی تحریروں سے اخذ کی گئی تھی۔

ہمیں (مرزا یا) خواجہ نظام الدین (سی 1551ء تا 94ء) کے بارے میں بہت کم

معلومات ہے۔ اس کے والد، احمد خواجہ مُقیم ہراوی (ہرات کے باشندے) نے بابر، ہمایوں اور اکبر کے تحت ملازمت کی ـــــ پہلے کے تحت بحیثیت دیوانِ بیوتات (دیوان خانہ)، دوسرے کے تحت گجرات میں عسکری کے وزیر کی حیثیت سے (1535ء) اور تیسرے کے تحت کسی اور سرکاری منصب پر (1567ء)۔ بابر کی وفات کے بعد ہمایوں کو تخت سے بے دخل کرنے کی سازش ختم کرنے میں بھی اس نے فیصلہ کن رول ادا کیا تھا۔ وہ ہمایوں کے ساتھ آگرہ گیا اور جب شیرخاں نے اُسے چوسہ (1539ء) میں شکست دی تب بھی وہ اس کے ساتھ تھا۔ خواجہ نظام الدین مُلّا علی شیر کا شاگرد تھا، جو ایک عالم فاضل شخص تھا اور شیخ اللہ داد، فیض سرہندی (اکبر نامہ کا مصنف) کا والد تھا۔ نظام الدین بڑا تعلیم یافتہ تھا اور اس کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ تاریخ اور ادب کا طالبِ علم تھا۔ "تاریخ نویسی کی قدر" اس نے اپنے والد سے سیکھی تھی، تاریخی کتابوں کے مطالعے کی بابت انہی کی ہدایتوں پر عمل کیا تھا اور ان کی یادداشتیں بھی اسے مل گئی تھیں۔ طبقات لکھتے وقت بھکر کا میر معصوم اس کا شریکِ کار بن گیا تھا، جو ایک مورّخ اور عالم فاضل شخص تھا۔ نظام الدین ان سات مصنّفوں میں سے ایک تھا جن کو اکبر نے تاریخ الفی (1582ء) مرتّب کرنے کا حکم دیا تھا۔ بدایونی اس کے بارے میں لکھتا ہے کہ "وہ ایک رحم دل اور با اخلاق صاحبِ ثروت شخص تھا، جو راسخ العقیدہ تھا اور مذہبی رُجحانات کا حامل تھا۔" واقعہ یہ ہے کہ اس کے تعلقات صوفیوں، شیخوں اور عموماً مذہبی لوگوں ہی سے تھے۔"

لیکن نظام الدین زمانہ سازی کا فن خوب جانتا تھا، کیونکہ اسی فن کے سہارے اس پارسا مسلمان نے اپنا مذہبی نظریہ اپنے ہی تک محدود رکھا اور شاہی عنایتوں کی سیڑھیوں پر چڑھتا چلا گیا۔ 1589ء میں اسے گجرات سے دوبارہ واپس بُلا لیا گیا۔ یہاں کے ماحول میں اس کی راسخ العقیدگی کا رنگ دھیما پڑنے لگا۔ لہٰذا نظام الدین نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ اکبر کی مذہبی اختراعات کے خلاف احتجاج نہ کرے۔ جیسا کہ ڈاکٹر بینی پرشاد لکھتے ہیں ـــــ

نظام الدین کی یہ چال کہ جب دربارِ شاہی میں کچھ راسخ العقیدہ قائدین طلب کیے گئے تو

اس نے شیخ حسین کا نام بتادیا' اس شاطرانہ طریقے کا اظہار بھی کرتی ہے جس کی مدد سے وہ اپنے مذہبی عقائد کی تشریح کرنے سے بچا رہا۔"[47]

نظام الدین ایک سپاسی اور منتظم بھی تھا۔ وہ محتاط قسم کا دیانت دار شخص تھا۔ اور استطاعی علم کے معاملے میں اپنے ہمعصروں سے کہیں بہتر تھا۔ وہ بڑی مدت تک گجرات کا بخشی رہا تھا۔ اپنی ذمہ داریاں اچھی طرح انجام دینے کے باعث اسے بعد میں دربار میں واپس بلالیا گیا' اور وہ بخشی اول کے اعلا عہدے پر بھی فائز رہا (1591ء تا 1592ء)۔ بدایونی نے اسے یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے: "خواجہ نظام الدین نے اپنے پیچھے بڑی نیک نامی چھوڑی.... کوئی آنکھ اس کی موت پر خشک نہ تھی اور کوئی شخص ایسا نہ تھا جس نے اس کے جنازے کے دن اس کی اعلا خوبیوں کو یاد نہ کیا ہو۔" اس کی کتاب جو 1592ء تا 93ء میں لکھی گئی تھی' ہمعصر مورخوں کے واسطے ایک معیاری تاریخ کی حیثیت رکھتی تھی' اور بعد کے مصنفوں نے بھی اس کتاب سے پورے اعتماد کے ساتھ معلومات حاصل کی۔[48]

مُلّا عبدالقادرؒ بدایونی (1540ء تا 1615ء) کے نام سے زیادہ جانا جاتا ہے' بدایوں میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے والد شیخ ملوک شاہ' سنبھل کے صوفی بچوے شاگرد تھے۔ خود بدایونی نے پہلے شیخ حاتم سنبھلی سے' اور پھر فیضی اور ابوالفضل کے ساتھ' شیخ مبارک سے تعلیم حاصل کی۔ اس زمانے کے نہایت معروف اور دیندار لوگوں کے تحت بہت سے علم کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ بڑا عالم فاضل شخص بن گیا اور موسیقی تاریخ اور نجوم کا ماہر ہوگیا۔ اسے بچپن ہی سے تاریخ سے بڑا لگاؤ تھا' اور وہ گھنٹوں کسی تاریخ کو ایسے پڑھتا لکھتا رہتا۔ جیسے وہ اسی کی لکھی ہوئی ہو۔[49] 1573ء یا 1574ء میں اسے اکبر سے متعارف کرایا گیا' جو اس کے علم دینیات کی وسعت اور مُلّاؤں کو لاجواب کر دینے کی لیاقت سے بڑا متاثر ہوا' اور اچھی قرأت کی بنا پر اسے درباری امام مقرر کر دیا اور ایک ہزار بیگھا زمین کی مدد معاش دی۔ اکبر اکثر اس سے عربی اور سنسکرت کتابوں (جیسے مہابھارت) کا ترجمہ فارسی میں کراتا تھا' لیکن وہ اکبر مد معاندانہ تنقید کرنے

لگا، فیضی اور ابوالفضل سے رشک کرنے لگا۔ (جنہوں نے اسے پس منظر میں پھینک دیا تھا) اور اکبر کی آزاد خیالی اور لا مذہبی نظریات" علاوہ، اصلاحات اور غیر مسلموں کی سرپرستی (مسلمانوں کے اس دعوے کے خلاف کہ سارے عہدوں اور اعزازوں پر ان کا قبضہ ہونا چاہیے) سے غیر مطمئن رہنے لگا۔ جب توقعات کے مطابق شاہی ملازمت میں اسے برتری اور ترقی نہ ملی اور اس کا ذہن شہنشاہ کی طرف سے کھٹا ہو گیا تو اس نے احساسِ محرومی کے تحت اپنی کتاب لکھنی شروع کی اور اکبر کی پریشانیوں پر بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ بدایونی نے اکبر کے دور کے ہنگاموں، جیسے بہار اور بنگال کے افغانوں کی بغاوتیں، مرزا حکیم کی بغاوت وغیرہ کو عتاب الٰہی سے منسوب کیا کیونکہ اس کی استطاعتی حکمت عملی کی بنا پر صدر کی یہ قوت، کہ وہ لوگوں کو زمین عطا کر سکتا تھا، ختم کر دی گئی تھی۔" بادشاہ نے ہماری مدد معاش زمینوں میں گڑبڑ کی تھی اور اب خدا نے اس کے ملک میں گڑبڑ پھیلا دی ہے"[50] اس کی کتاب ابوالفضل کی مدحیہ لفاظی پر روک کا کام دیتی ہے۔ گو یہ واقعی ایک دلچسپ کتاب تھی، لیکن اس میں اکبر پر اتنی معاندانہ تنقید کی گئی تھی کہ اس کی زندگی میں اسے پوشیدہ رکھا گیا، اور جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد ہی شائع کیا جا سکا۔ پروفیسر ایس آر شرما کے مطابق "یہ سوائے ان واقعات کے بیانات کے جن میں بدایونی خود شریک رہا کوئی بہت قابلِ قدر کتاب نہیں ہے۔"[51] مورلینڈ کہتا ہے کہ یہ تاریخ سے زیادہ صحافیانہ یادوں کی کتاب ہے[52] موضوعات کا انتخاب ان کی اصل اہمیت کی بنا پر کم مصنف کی بنا پر زیادہ کیا گیا تھا، اور جب اس طرح حقایق کا انتخاب کر لیا تو ان پر ذاتی احساسات اور تعصبات کا رنگ چڑھا کر طنز و مزاح کی ایسی زبان میں پیش کیا۔ چنانچہ اس سے استفادہ کرتے وقت ان اثرات کو ہٹا کر اصلیت کا پتہ لگانا پڑتا ہے۔ مصنف نہ صرف یہ کہ بعض غیر مستعمل الفاظ استعمال کرتا ہے بلکہ مذہبی تنازعے، طعن و تشنیع، مدح و ثنا، خواب، سوانحیں اور ذاتی نیز خاندانی تاریخ کی تفصیلیں خوب مزے لے کر بیان کرتا ہے جس سے بیان کے تسلسل میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے ... لیکن اصل

موضوعات سے ہونے والے یہی انحرافات اس کی کتاب کا نہایت دلچسپ زیتہ ہیں۔ . . .
عصری تاریخ کے بارے میں اس کی وسعت علم بھی اکبرائے یہ فرض کر لینے پر آمادہ کر لیتی ہے
کہ قاری بھی اس سے لاعلم نہ ہوں گے۔ اس لیے وہ اکثر اوقات بہت سے حقایق یا تو نظر انداز
کر دیتا ہے یا پھر غیر واضح طور سے محض ان کی طرف اشارہ کر دیتا ہے[53]

اس کے باوجود اس میں کوئی شک نہیں کہ بدایونی ایک تخلیقی ذہن کا مالک تھا۔ اس کا
عکس اسلام شاہ کے ان اسطائی اعلانات میں نظر آتا ہے جو اس نے تحریر کیے ہیں، اور جن سے
یہ لگتا ہے کہ اس میں مذہب سے بالاتر ہونے کا احساس موجود تھا۔ وہ اپنے دیباچے میں لکھتا
ہے "جونکہ میری اُمنگوں کا مقصد یہ ہے کہ جو کچھ لکھوں دُرست لکھوں، اس لیے اگر میرے قلم
سے جو میرے خیالات کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے، اگر اتفاقاً کوئی لغزش ہو جائے یا خیالات میں،
جس کے باعث قلم حرکت میں آتا ہے، کوئی غلطی ہو جائے تو مجھے توقع ہے کہ وہ قادر مطلق جو ازل
ہی سے رحمٰن اور رحیم ہے، اسے نظر انداز کر دے گا اور مجھے معاف کر دے گا۔"[54]

محمد ہاشم یا ہاشم علی خاں، جو خفی خاں کے نام سے مشہور ہے، ایک اچھے خاندان سے
تعلق رکھتا تھا جو خاندان خواف (ضلع خراسان میں) سے ہجرت کر کے دہلی میں مقیم ہو گیا تھا۔
اس کا والد خواجہ میر بھی ایک مورخ تھا اور مراد بخش کے تحت ایک اعلا عہدیدار تھا۔ جب
مراد بخش فوت ہو گیا تو اس نے اورنگ زیب کی ملازمت اختیار کر لی۔ ہاشم علی خاں نے بھی
اورنگ زیب کی ملازمت کے ذریعے ترقی حاصل کی۔ اور مختلف سیاسی نیز فوجی عہدوں
پر مامور رہا۔ خیال اغلب ہے کہ اس کا تعلق اپنے بعض ہم وطنوں (خواف کے) سے تھا جو
سُورت میں محصول درآمدات کے محصل تھے۔ چونکہ وہ مغربی ہندوستان سے خوب واقف
تھا اس لیے گجرات کے شاہی حاکم نے اسے ایک سفارتی مہم پر بمبئی بھیجا تھا۔ فرخ سیر کے دَور میں
حیدرآباد کے نظام الملک نے اسے دیوان مقرر کر دیا تھا، اور اسی واسطے وہ نظام الملکی کہلاتا
ہے[55]

منتخب اللباب یا تاریخ خفی خاں خاندانِ تیمور کی ایک مکمل تاریخ ہے، یہ بابر (1519ء اے۔ڈی) سے لے کر محمد شاہ کے دَور کے چودھویں برس تک (1733ء) کی مغل تاریخ ہے۔ یہ شیواجی کی وفات کے تریپن برسوں کے بعد مرتب کی گئی تھی۔ تمہید میں حضرت نوح سے بابر تک مغلوں اور تاتاریوں کی تاریخ کا خاکہ دیا گیا ہے۔ پہلا حصہ جس میں بابر سے اکبر تک کے دور کا ذکر ہے، مختصر لیکن واضح ہے۔ لیکن اس کے بڑے حصے میں 1605ء سے 1733ء تک اس کے قابلِ قدر ہونے کا خاص سبب یہ ہے کہ اس میں اورنگ زیب کے دَور کا پورا بیان شامل ہے۔ شہنشاہ کی مشہورِ عالم ممانعت کی وجہ سے اس کے دَور کی پوری اور مسلسل تاریخ حاصل کرنا مشکل ہے۔ لیکن ہم اسی ممانعت کے ممنونِ احسان ہیں جس کے باعث جدید ہندوستان کی بہترین اور نہایت غیر جانبدار تاریخوں میں سے ایک ہمیں دستیاب ہو گئی۔"[56] 1680ء تا 1733ء کا دَور، جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے، "ذاتی مشاہدوں اور ان لوگوں کے زبانی بیانات کی مدد سے لکھا گیا ہے جنہوں نے اس زمانے کے واقعات اپنی نظروں سے دیکھتے تھے" اس سے اورنگ زیب کے دَور کے "سارے واقعات کا نہایت تفصیلی چھوٹا پوشیدہ طور سے مرتب کیا تھا۔"

ایک مورخ کے فرائض کی بابت خفی خاں کا نصیب العین بہت اعلا تھا — دیانت دار ہونا، فائدے کی توقع نہ رکھنا، ضرر کا خوف نہ کرنا، نہ کسی کا طرفدار ہونا نہ کسی سے دشمنی برتنا، دوست اور اجنبی میں فرق نہ کرنا، اور خلوص کے علاوہ کسی اور نیت سے نہ لکھنا . . ." اس نے بڑے قابلِ ستائش انداز میں اس معلومات کا استعمال کیا جو سرکاری کاغذات (جو چند ہی لوگ دیکھ سکتے تھے لیکن جن تک اس کی رسائی تھی) سے اخذ کی گئی تھی۔ لیکن اس نے سرکاری نقطۂ نظر سے لکھا۔ وہ شیواجی کو سلطنت کا باغی اور افضل خاں بیجاپوری کا قاتل بتاتا ہے۔ شیواجی کی تاریخِ وفات اس نے "کافر بہ جہنم رفت" سے نکالی تھی۔ اس کے باوجود اس نے شیواجی کی شجاعت کی بڑی تعریف کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ اس کا قاعدہ تھا کہ "مسجدوں، قرآن او

عورتوں" کو نقصان پہنچانے کی سختی سے ممانعت کر دی تھی[57]

مرزا محمد حسن، مراتِ احمدی کا مصنف، ایرانی مہاجرین کے ایک خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ 1700ء میں برہان پور میں پیدا ہوا، جہاں اس کا والد اورنگ زیب کی دکنی فوج میں ایک عالی عہدیدار تھا۔ شہزادہ بہادر شاہ کو گجرات کی جاگیر عطا کی گئی تو وہ 1708ء میں گجرات چلا گیا۔ اس نے احمد آباد میں تعلیم پائی جہاں اس کا والد شہزادے کے وزیر سید عاقل خاں کا وقائع نگار یعنی نامہ نگار خصوصی مقرر کیا گیا تھا۔ اپنے والد کی وفات کے بعد وہ کٹڑا بازار کا نگران مقرر کر دیا گیا۔ اور بالآخر 1747ء سے 1755ء تک یعنی جب تک مرہٹوں نے صوبہ گجرات اپنی سلطنت میں شامل کیا، وہ صوبہ گجرات کا دیوان بنا رہا۔ لہذا اسے خاتم الدیوان کہا جاتا تھا۔ مرزا محمد غیر معمولی ذہن اور زیست تھا اور اس کی تربیت مدرسہ آفات و مصائب میں ہوئی تھی۔ دیوان کی حیثیت سے اس نے دیکھا کہ ایک ٹوٹتی ہوئی مملکت کی نراجی کیفیت، خانہ جنگیوں اور مرہٹہ یورشوں کے باعث انتظامیہ انتہائی غیر منظم ہو چکا تھا۔ اس نے اس طوائف الملوکی بارے میں اور صوبے کی اس معلومات کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے، جو معلومات اس نے بڑی سخت تلاش کے بعد حاصل کی تھی۔ گجرات کی یہ تاریخ (1000ء تا 1760ء) جس کے مرتب ہونے میں دس برس (1750ء تا 1760ء) صرف ہوئے، لکھتے وقت اس کا ایک ہندو نائب اس کی مدد کرتا رہا۔ اس کا نام متھالال کائتھ تھا اور وہ گجرات کا موروثی صوبہ نویس تھا[58]

مراتِ احمدی دو حصوں میں تقسیم کی گئی ہے اور ہر حصہ مضامین کی نوعیت کے اعتبار سے دوسرے سے نمایاں طور پر مختلف ہے۔ اورنگ زیب تک کا دور مختصر اور ماخذ کیا ہوا ہے، کیونکہ یہ سابقہ کتابوں پر، جیسے مراتِ سکندری اکبر نامہ، بادشاہ نامہ وغیرہ پر مبنی ہے لیکن دوسرا حصہ (اور ضمیمہ) مصنف کا اپنا کام ہے اور اس زمانے کے ان واقعات کی بابت، جن واقعات میں وہ خود شریک رہا تھا، اس کے اپنے مشاہدات اور تجربات پر مبنی ہے۔

ضمیمے کا خاتمہ گجرات کی جغرافیائی کیفیات، صوفیا کی زندگی، سرکاری طبقوں اور عام انتظامی نظام کے تفصیلی بیانات کے اعتبار سے بڑا قابلِ قدر ہے۔[59]

مغل ہندوستان کے ہندو مورخین

مسلم مصنفین کے علاوہ ایسے بہت سے ہندو بھی تھے جو فارسی زبان پر قدرت حاصل کر کے ہند فارسی فنِ تاریخ نگاری کے اکھاڑے میں داخل ہو گئے۔

سندا من 'لقب رائے' راجہ بھارامل (دارا کا دیوان) کا بیٹا 'شروع ہی سے سرکاری معاملات کے علم سے واقف ہو گیا تھا۔ اس کی نیت ایک ایسی کتاب لکھنا تھی "جس میں مختصراً یہ بیان ہو کہ یہ فتوحات (یعنی خاندانِ تیموری کی فتوحات جن میں اورنگ زیب کی فتوحات بھی شامل ہیں) کیسے اور کتنی مدت میں حاصل ہوئیں۔ وہ سابقہ بادشاہوں کی تاریخ 'ان کی ابتدا اور وہ اسباب دینا چاہتا تھا جن کے باعث انھیں عروج یا زوال ہوا . . ." وہ ایسا اس سبب سے کرنا چاہتا تھا کہ فرشتہ کی کتاب میں یہ عیب تھا کہ "باوجود یہ کہ وہ تاریخ کا خلاصہ ہے، پھر بھی اس کے بہت سے حصے طولانی ہیں" اس کے خیال میں کی اپنی کتاب (1696ء میں لکھی گئی) دوسروں کی کتابوں سے افضل تھی کیونکہ اس نے اورنگ زیب کی "وسیع اور درخشاں فتوحات" بیان کی تھیں، اس اورنگ زیب کی فتوحات جس کی سلطنت کے برابر روم' کے علاوہ کوئی اور سلطنت نہ تھی۔[60]

بھیم سین برہان پوری (پیدائش 1649ء) نے اپنے والد رگھونندن داس، جو ذات کا کائستھ تھا، کے پاس اورنگ آباد جانے کے لیے آٹھ برس کی عمر میں اپنی جائے پیدائش برہان پور کو چھوڑ دیا تھا۔ آخر الذکر کچھ عرصے تک دکن کا دیوان رہا تھا۔ مغلوں کا موروثی کائستھ سرکاری عہدیدار ہونے کے سبب، بھیم سین نے اپنی زندگی مغل شہروں اور دکن کے کوچ میں گزاری تھی، اور راس کماری سے دہلی تک ہندوستان کے بہت سے مقامات دیکھے۔ ۔ ۔ ۔ اعلا مغل عہدیداروں سے واقف تھا، اور واقعات میں خود بہت نمایاں

طور سے شریک رہا تھا۔ بندیلا عہدیدار ہونے کے باعث اس نے دتیا کے سردار، دلپت رائے کی ملازمت اختیار کرلی (دلپت رائے، بیر سنگھ دیو بندیلا کی نسل سے تھا)۔ دکن کی مہم میں بندیلا راجہ اورنگ زیب کے ممتاز سپہ سالار ذوالفقار خاں جس کا لقب نصرت جنگ تھا کے نائب کی حیثیت سے شامل ہوا۔ اس کا رسالا نسخۂ دلکشا (سالِ تصنیف 1708ء) معاصرِ عالمگیری کے ضمیمے کی حیثیت سے بڑا قابلِ قدر سمجھا جاتا ہے۔ اس نے اورنگ زیب کے دور کو ایک ہمعصر ہندو کی نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ "مغل عہدیداروں کے اتنے نزدیک تھا کہ واقعات صحیح طور سے سمجھ سکے، لیکن تخت شاہی سے اتنا نزدیک نہ تھا کہ دروغ گو خوشامدیوں میں شامل ہو جائے۔" وہ "یہ جانتا تھا" سچ کیا ہے، اور سچ بولنے کی جرأت کرسکتا تھا۔" اس نے بہت سی ایسی باتیں فراہم کردی ہیں جو اورنگ زیب کے دور کی مکمل سرکاری تاریخ میں نہیں ملتی ہیں، جیسے ـــــ

(1) واقعات کے اسباب و نتائج
(2) ملک کی حالت
(3) عوام کی حالت، ان کی تفریحات
(4) غذائی اشیا کی قیمتیں
(5) سڑکوں کی حالت
(6) سرکاری طبقے کی سماجی زندگی، اور
(7) دکن میں مغل جنگ و جدل کے واقعات

اس عیب کے باوجود کہ تاریخوں کا تسلسل قدرے غلط ہے یہ کتاب شیواجی کے دور کی مرہٹہ تاریخ کے واسطے بھی بڑی قابلِ قدر ہے۔ بھیم سین شیواجی کی تنظیمی صلاحیت پر اسے بڑا خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔

مندرجہ ذیل عبارتیں بہت کچھ بتاتی ہیں اور یہ دکھاتی ہیں کہ بھیم سین اس زمانے کا

ایک سماجی مورخ تھا:

"جب سے عالی جاہ تخت نشین ہوئے تھے ایک شہر میں نہ رہے تھے بلکہ ابھی سب جنگوں اور اس تکلیف دہ موچی کو بچ کو ایسا رکھا تھا" اس لیے ان کی چھاؤنی کے مسکینوں نے طویل جدائی سے تنگ آکر اپنے کنبے چھاؤنی ہی میں بلا لیے تھے اور وہیں زندگی گزارنے لگے تھے۔ لہٰذا ان ہی شامیانوں کے نیچے ایک نئی نسل پیدا ہو گئی تھی . . . . . صرف یہ جانتے تھے کہ اس دنیا میں خیمے کے علاوہ کوئی دوسری پناہ کی جگہ نہیں . . . . سارا انتظام ختم ہو چکا ہے . . . . ."

"اب یہ توقع ختم ہو چکی ہے کہ کوئی جاگیر کسی عہدیدار کے پاس اگلے سال بھی رہے گی . . محصل لگان وصول کرتے وقت کوئی بھی ظلم ڈھانے سے ذرا نہیں جھجکتا۔ کاشتکاروں نے کاشت کرنا چھوڑ دی ہے۔ جاگیرداروں کو ایک پیسہ نہیں ملتا:"

"ایک حکومت کو دو قسم کے جاگیرداروں کی حمایت کرنا پڑتی ہے! . . . . . جو کسان اس دہرے استحصال کا شکار تھے انھوں نے ہتھیار اور گھوڑے اکٹھا کیے اور مرہٹوں میں جا ملے۔"

وہ کہتا ہے کہ مرہٹہ شورشوں کا سبب وہ انتظامی استحصال اور ظلم تھا جو مہاراشٹر کے نزدیک علاقوں کے کسانوں پر کیا جا رہا تھا اور اسی بنا پر کاشتکار مرہٹہ دلیش مکھوں اور سیناپتیوں کے ساتھ جا ملے۔[6]

پٹن گجرات کا ایک برہمن، ایشور داس ناگر (پیدائش 1655ء) فتوحات عالمگیری (1731ء) کا مصنف تھا۔ وہ شیخ الاسلام یعنی سلطنت کے سب سے بڑے قاضی کا 1685ء تک ملازم رہا چونکہ آخر الذکر چھاؤنی اور دربار دونوں جگہ شہنشاہ کے ساتھ رہتا تھا "اس لیے مصنف کو خاص عہدیداروں یا ان کے ملازموں سے براہ راست صحیح حقائق دریافت کرنے کا خاصہ موقع ملتا تھا۔ اس کے بعد وہ گجرات کے شاہی حاکم، شجاعت خاں کے تحت

1684ء سے 1701ء تک ملازم رہا۔ اس کی تاریخ، فتوحاتِ عالمگیری (1731ء میں لکھی گئی) میں اورنگ زیب کے دَور کے چونتیسویں برس تک کا حال موجود ہے۔[62]

دَورِ وسطیٰ کے مسلم مورخین کو سماجی رتبوں اور طبقوں کے اعتبار سے خانوں میں بانٹنا شاید مشکل ہوگا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ بہت سے مورخین کی ان کی تاریخوں کے بارے میں ہماری معلومات بہت محدود ہے، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس زمانے کی سماجی تنظیم کے بارے میں پورا علم نہیں ہے۔ اشرف اور مورلینڈ دونوں نے اُوپری، درمیانی اور نیچے طبقوں کی بات کی ہے۔ لیکن یہ اچھی طرح نہیں معلوم کہ اس کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ یہ مشکل خاص طور سے ترک اعیان دور میں پیش آتی ہے۔ اشرف نے مسلمانوں میں بعض سماجی طبقوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔[63] لیکن یہ واضح نہیں ہے کہ ہم اپنے مورخین کو کن طبقوں میں جگہ دیں۔ دربار یا فوج میں ترقی سماجی رُتبے کے واسطے پروانۂ راہداری کی حیثیت رکھتی تھی، لیکن محض یہ کہہ دینا کہ مورخین درباری طبقے سے تعلق رکھتے تھے دراصل کوئی معنی نہیں رکھتا۔ بہت سے لوگ نسبتاً گمنام حیثیت سے اُٹھ کر درباری اور عہدیدار بن گئے، اور کسی طرح یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ وہ طبقۂ امرا یا اُونچ طبقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ بعض مورخین ضرور اعلا تعلیم یافتہ تھے اور اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جس کو طبقہ دانشوراں یا درمیانی طبقہ کہا جا سکتا ہے۔ فیروز تغلق، تیمور، بابر، جہانگیر، گلبدن بیگم اور مرزا حیدر دغلت ان مورخوں اور توزک نگاروں میں شمار ہوتے ہیں جنھیں شاہی خاندان کے خانے میں رکھا جا سکتا ہے۔ منہاج الدین اور امیر خسرو کو ہم شاید طبقۂ امرا میں شامل کر سکتے ہیں۔ معاصر الامرا میں دوسرے امرا کے ساتھ ابوالفضل، محمد ساقی مستعد خاں، خواجہ نظام الدین اور محمد ہاشم علی خاں (خفی خاں) کے نام لیے گئے ہیں، اس لیے ہمیں یہ خواہش پیدا ہو سکتی ہے کہ انھیں طبقۂ امرا میں داخل کرلیں۔ لیکن سماجی اعتبار سے شاید یہ کہنا جائز ہوگا کہ مغل زمانے کے بیشتر مورخین تعلیم یافتہ درمیانی طبقے کے دانشوروں

کی جماعت کے افراد تھے، اور ان کی حیثیت طبقہ امراء کے فرد کی سی نہ تھی۔ دورِ وسطیٰ کے بیشتر مورخین یا مصنف یا تو خود ہجرت کرکے آئے تھے، جیسے البیرونی (خوارزم سے)، حسن نظامی (نیشاپور سے) یا غیر ملکی مہاجر خاندانوں کی اولاد تھے، جیسے منہاج (جرجان سے، جو مرو اور بلخ کے درمیان ہے)، شیخ ابوالفضل (حجازی خاندان)، خواجہ نظام الدین (ہراتی خاندان)، مرزا امین القازوینی (قازوین)، فرشتہ (استرآباد سے)، مرزا محمد حسن (ایرانی مہاجر خاندان)، خفی خاں (خراسانی مہاجر خاندان)۔ ان میں سے بہت سے واقعی ہندوستانی الاصل تھے جیسے اہلِ ہندوستان یعنی ضیاالدین برنی، امیر خسرو، یحییٰ، عبدالقادر بدایونی اور عبدالحمید لاہوری۔ ہمایوں کا آفتا ، جو ہر ایک ادنیٰ ملازم تھا جو ترقی کرکے عہدیدار بن گیا تھا۔

اختتام

تاریخی معروضیت کا مسئلہ فلسفہ تاریخ کے واسطے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ عام طور پر مان لیا گیا ہے کہ تاریخی فکر میں داخلی عنصر ضرور شامل رہتا ہے، جس کے باعث متوقع معروضیت میں تبدیلی آجاتی ہے یا یوں کہنا چاہیے کہ معروضیت محدود ہو جاتی ہے۔ یہ امید رکھنا کہ علمِ طبیعیات کی سی لاشخصیت تاریخ میں بھی ہو غلط ہوگا، کیونکہ تاریخ کی تعریف بعض اوقات یوں کی جاتی ہے کہ یہ علمِ اشخاص یا علمِ دماغِ انسانی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا دورِ وسطیٰ کے بعض مثالی مورخین معروضی تھے یا نہیں، اور اگر تھے تو کس معنی میں تھے۔ ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے بعض مثالی مورخوں کی نجی تاریخوں اور ان کی تحریروں کا یہ مختصر خاکہ ان کے نقطۂ نظر اور رجحانوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پہلی بات تو ذاتی میلان کے سوال سے تعلق رکھتی ہے۔ بعض ٹھوس مثالوں سے یہ بات تو ظاہر ہوتی ہے کہ ان کے خیالات اور نقطۂ نظر پر ان کے ذاتی معاملات اور ان کی پسند و ناپسند کا رنگ چڑھ گیا تھا

ترک افغان دَور کے بعض مورخوں نے اور مغل دَور کے سرکاری مورخوں نے بڑے لوگوں کی تعریف کی ہے۔ ایسی صورتوں میں تاریخ ان دیوتا صفت لوگوں کے افعال اور خیالات کے گرد گھومتی رہی ہے۔ ان دنوں بڑے لوگوں کے خلاف اپنے تنفر کا کھل کر اظہار کرنا بیشتر مورخوں کے لیے مشکل تھا۔ لیکن بعض قابلِ ذکر لوگ ایسے بھی تھے جو اس سے مُستثنا تھے جیسے البیرونی اور ترک افغان دَور میں عصامی۔ مغل دَور میں بدایونی کی تاریخ اکبر کے زمانۂ حیات میں پوشیدہ رکھی گئی، کیونکہ اس میں اکبر کے خلاف شدید طعن و تشنیع تھے۔ دکن میں مرہٹوں کے خلاف اورنگ زیب کے طویل جنگ جدال پر ایک طرح سے بھیم سین نے تنقید کی ہے لیکن وہ اپنے حالات کی بنا پر ایسا کر سکتا تھا۔

دوسری بات گروہی تعصبات کے سوال سے تعلّق رکھتی ہے۔ اس کے تحت مورخوں کے وہ تعصبات یا مفروضات آتے ہیں جن کا سبب کوئی خاص گروہ، قوم، نسل یا سماجی طبقہ یا مذہب ہوتا تھا۔ ان مفروضات کا دائرہ عمل حالی جولی تعصب کے مقابلے میں کہیں زیادہ نازک یا وسیع ہوتا ہے اور ذاتی پسند یا ناپسند کے مقابلے میں اسے پہچاننا یا اس کا اثر زائل کرنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ مذہبی عقائد غیر معقول تعصب کا نتیجہ ہی نہیں بلکہ استدلال پر مبنی یقین کلی کا معاملہ بھی ہو سکتے ہیں۔ اس لیے مورخین کے سوچ بچار پر مذہبی عقائد کے اثر کو ناگزیر اور پورے طور سے جائز سمجھا جا سکتا ہے۔ ان دنوں مذہب ہی مورخین کے سوچ بچار کی ٹھوس بنیاد ہوتا تھا اور وہ تاریخ کے ذریعے مذہب کی خدمت کرتے تھے۔ ابتدائی ہند مسلم مورخین نظامِ عالم اسلامی کو مانتے تھے اور تاریخ کو مذہب اور دینیات کے مقصد کے تحت استعمال کرتے تھے تاکہ اسلام کا بول بالا ہو۔ وہ اپنی ساری توجہ مسلمانوں کے کاموں پر مرکوز رکھتے تھے اور ہندوؤں کو ان بے حرکت لوگوں کی سی حیثیت دیتے تھے جن کو ہر طرح استعمال کیا جا سکتا ہو، جیسے تلوار سے زیر کر کے، نومسلم بنا کر یا جزیہ وصول کر کے۔ یہ لوگ اس انداز سے لکھتے تھے جیسے وہ سارے لوگوں کے نہیں بلکہ

صرف ایک مذہبی گروہ کے مورّخ ہوں۔

لیکن یہ بات قابلِ شک ہے کہ مندرجہ بالا سطور میں جن گروہی تعصبات اور ذاتی میلانات پر بحث کی گئی ہے کیا وہ واقعی تاریخی معروضیت میں مانع ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ میلان یا تعصب والی تحریریں بہرصورت اصلاح کی جا سکتی ہے، اسے نظر انداز کیا جا سکتا یا اس سے چوکنا رہا جا سکتا ہے۔

ذاتی خیالات یا گروہی تعصبات سے زیادہ نازک وہ فلسفیانہ، اخلاقی یا مابعدالطبیعاتی عقائد تھے جو ان تحریروں کے پیچھے کارفرما تھے، کیونکہ ان ہی عقائد کی بنا پر بالآخر یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ ماضی کو کس طرح سمجھا جائے۔ فطرت انسانی کا کیا تصور ہو اور انسان کو کائنات میں کیا مقام دیا جائے۔ ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے مورّخین ماضی کو اپنے فلسفیانہ خیالات کی روشنی میں دیکھتے تھے، اور تاریخ کو پیش کرنے کا انداز ان خیالات سے پورے طور پر متاثر ہو جاتا تھا۔ تاریخ کے مفہوم کی بات ان کے نظریات آج کے نظریات سے مختلف تھے۔ پہلی بات یہ تھی کہ دورِ وسطیٰ کے مورّخ کے واسطے تاریخ افعالِ انسانی کے باعث نہیں بلکہ مرضیٔ خدا کے باعث بنتی تھی۔ اگر واقعات حکم خدا کے پابند تھے تو اس کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ تاریخ کو پیچیدہ قسم کی سماجی یا اقتصادی قوتوں کے حوالے سے پیش کیا جائے۔ برنی، عفیف یحییٰ، امیر خسرو، عصامی، ان سارے مورّخوں کا عقیدہ تھا کہ تاریخ میں خدا کی مرضی شامل ہوتی ہے۔ مغل دور میں بھی حکم خدا کا رویہ نظر آتا ہے، لیکن ترک افغان زمانے کے مقابلے اس دور میں تاریخ کا انسانی پہلو زیادہ نمایاں ہونے لگا اور اسبابِ رُوحانی کی حیثیت کم ہونے لگی۔

دوسرے تاریخ روایتی انداز میں مذہبی و اخلاقی پس منظر کے ساتھ پیش کی جاتی تھی۔ عصامی اور یحییٰ جیسے مورّخوں نے اپنے قاریوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی جو یہ چاہتے تھے کہ مقبولِ عام مذہبی اور اخلاقی احکامات کے تحت اس بُری دُنیا کی نمائشوں اور دِکھاوے سے

گریز کیا جائے۔ ابوالفضل نے اکبر کے اس دعوے کی حمایت میں کہ وہ دینوی اور دنیاوی معاملات میں سدِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے، اکبرنامہ کو استعمال کیا۔ اس نے اکبر کے نظریہ بادشاہت کا ایک علمی جواز دینے اور عقلی پروپیگنڈا کرنے کی کوشش کی۔ بدایونی نے کٹر سُنی نقطۂ نظر کی عکاسی کی۔

تیسرے، برنی، یحییٰ، امیر خسرو جیسے ہند مسلم مورخوں نے تاریخ کے ناصحانہ عنصر پر زور دیا۔ اور حالانکہ ابوالفضل اور نظام الدین جیسے مورخوں نے تاریخ کی اخلاقی اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے، پھر بھی مغل دور میں ناصحانہ عنصر پر زور کم ہو گیا تھا۔

1 Elliet and Dowson Vol II pp2 3

2 Sachah s al Birun Vol I p 22

3 Sach in s al Biruni p p 17 19

4 Sachan s al Biruni p 7

5 Jarrett s Preface to Ain i-Akbari Vol IIIed Sarkar Intro VIII IX

6 Elliot and Dewson V I IV pp 11 16-25 29 36 39

7 Elliot and Dowson V pp 53 60

8 Patna University Journal July 1963 p 57

9 Elliot and Dowson Vol II pp 210, 204-12

10 Patna University Journal op cit

11 Elliot and Dowson Vol III pp 259 66 Rawerty s Intre

12 Elliot and Dowson Vol III pp 97-69 App 52-3-

567 M W Mirza s ed of Khazain-ul-Futah p 12 Harby

Historians of Medieval India Ch 5 Philips Historians of

India, Pakistan and Ceylon, 146

29 Elliot and Dewson Vol III p 397

30 Elliot and Dowson Vo III p 3^7

31 Elliot and Dowson Vol III, IV,559-63 ,218-229

32 Elliot and Dowson Vol VI p 282

33 Elliot and Dowson Vol III pp 251-5 , Rogero and Beveridge vol I S R Sharma, Bibliography of Mughal India

34 Mrs Beveridge Tr of Humayun-nama, I Prasad Life and time of Humayun

35 Quoted in rskine

36 Elliot and Dowson, vol V pp 127 129

37 Beveridge Akbar namo vol I pp 627

38 Smith Akbar 464

39 S Banerju Banerji Humayun Padshah I 291, 123n 3

40 E D V 136 138, S Ray Humayun in Persia , I Prasad, Op cit S Banerji, Humayun Padshah

41 J N Sarkar Tr of Maasir-i Alamgiri Perface III

42 Blochmann Rev by Phillot Vol I Aini Akbari Introduction Ain vol2 and 3 (Jarrett rev by J N Sarkar)

43 Maasir ul Umara I 4 391 B P Sexena III V
Elliot and Dowson Vol VII p 4

44 Ibid p 175

45 Maasir Ul Umara I p 177

46 Maasir ul-Umara pp 181 183 J N Sarkar Naasir i-
Alamgiri [Eng tr] Intro Studies in Mughal India
Maasir ul Umara Eng ter I p 4 n 7 666

47 Badauni Hi3g III 137 138 151 Lowe II 309

48 Elliot and Dowson Vol V pp 177 ft B De
Eng tr of Tabaqat Completed by B Prasad [A S B]
Smith Akbari Akbar [App] Maasir ul Umara

49 Elliot and Dowson Vol V pp 480

50 Badauni

51 Sharma Bibliography of Mughal India 38 39

52 Maoreland Agrarian System of Moslem India

53 Elliot and Dowson Vol V p 481

54 M U Eng Gr I E D V 4777 ff Eng.tr.by Rankind
Lowe and Haig Presidental Address Indian
History Congress (1955) Sec IV by Sarkar

55 Elliot and Dowson Vol VII pp 207 210

56 Elliot and Dowson Vo VII pp 207

57 Khafi Khan II 2 726 E D VII (S Gupta ect)

53 54 M U Eng Tr I 4 32 47 70 226 II 139 468

58 J N Sarkar Foreword Eng of Miret i Ahmadi
by Syed Nawat Ali (Gaekwad Oriental Sec Series

59 Supplement to Mirar Tr Nawab Ali Seddon Foreward

60 E D VII 168 170

61 J N Sarkar Studies in Mughal India Aurangzeb
377 m 449

62 J N Sarkar Op cit

63 اں کے رُتبوں کی ترتیب مندرجہ ذیل ہے ..
سلطان، شاہی خاندان، خاں اور اعلا رُتبوں کے دوسرے لوگ، سیّد، علما
عام امرا، ذِمّہ دار افراد (مغلوں کے زمانے میں منصب دار) سلطنت کے بڑے
عہدیدار، مختلف قبیلوں کے سردار، شاہی خدمت گاروں کے دستے، شاہ

خزانے کے محافظ دستے (جرگہ ۹) کے افراد، سلطان کے خانگی خدمت گار، اور اس سے ادنا اور گھریلو ملازمین۔ انھیں رُتبوں کے لحاظ سے مزید اُونچے، درمیانی اور نیچے طبقوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔
بہت سی صورتوں میں یہ تقسیم واضح نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ بے ضابطہ بھی ہے۔ لیکن زیرِ نظر دور میں اسی تقسیم کے حکمراں طبقوں پر ایک سرسری نظر ڈالی جا سکتی ہے۔
(کے۔ ایم۔ اشرف۔ لائف اینڈ کنڈیشنس وغیرہ 54)۔

گجرات اور راجستھان کے حوالے سے علاقائی زبانوں کے تاریخی ماخذوں کی اہمیت کا ایک تخمینہ اور جائزہ

پی۔ سرن

ابتدائی زمانے میں جن برطانوی اور یوروپی اہلِ علم نے ہندوستانی تاریخ کے دورِ وسطیٰ (جس کا مفہوم ان کے نزدیک محض مسلمانوں فرماں رواؤں کا دور تھا) کے مطالعے پر توجّہ دی، انہوں نے تقریباً ساری تحقیقات فارسی روزنامچوں کی بنیاد پر کی تھی۔ اس قسم کا ماخذی مواد زیادہ تر روزنامچوں پر مشتمل تھا، اور ان روزنامچوں کا دائرہ عمل اس بنا پر نہایت محدود تھا کہ ان کے مصنّفین دراصل وہی باتیں تحریر کرنا چاہتے تھے جن کا تعلّق محض فاتحوں اور فرمانرواؤں کی زندگی اور سرگرمیوں نیز ان کے اچھے اور برے افعال سے ہو۔ ان کے خیال میں تاریخ کو عوام الناس یا انسانی سماج کی ترقّی و عروج کے مختلف پہلوؤں پر توجّہ دینے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ان روزنامچوں نے بڑے قابلِ قدر طور سے ان متذکرہ بالا مغربی مصنّفین کی مطلب برادری کی، جن کا خود کا تصوّرِ تاریخ بھی فارسی روزنامچوں سے بہت زیادہ جدا نہ تھا۔ لہذا تاریخ نگاری اپنے دائرہ عمل کے اعتبار سے نہایت محدود ہو کر رہ گئی پھر اس بات پر کہ سماج کی جو تصویر پیش کی گئی وہ نہایت غیر مکمّل اور غیر متوازن تھی، کیوں تعجب کیا جائے۔

لیکن ٹوڈ کے اس نہایت جائز دشنام کے باوجود، جو اس نے بہت پہلے

پچھلی صدی کی تیسری دہائی کے ابتدائی برسوں میں دیا تھا، یہ خیال اپنی جگہ قائم رہا کہ نہ ہندوستان کی اپنی کوئی قومی تاریخ ہے نہ قابلِ ذکر قسم کی تاریخی تصنیفیں ہیں۔ تسلسل تاریخ کے ساتھ جس طرح فارسی میں بیشتر کتابیں ملتی ہیں۔ ویسی کتابوں کی قلّت کے دوسرے اسباب کے علاوہ ٹوڈ کا یہ کہنا بھی بڑا موزوں لگتا ہے کہ "ہندوؤں جیسے لوگوں سے ٹھیک اس طرح کی تصانیف کے نمونوں کی توقع رکھنا جو روم اور یونان کی تاریخی کتابوں کے انداز کی ہوں، پرلے درجے کی غلطی ہوگی" کیونکہ یہ غلطی اسی سے سرزد ہوگی جو ہندوؤں کے رویّے اور نظریے پر بنی اس مخصوص روایت کو بھول جائے جس روایت کا اطاق ان کی ساری ادبی تخلیقات کے معاملے میں ہوتا ہے۔ ہندوستانی تاریخ اور تہذیب کے طلبہ کو اکیلے ٹوڈ ہی نے خبردار نہیں کیا ہے۔ جی، بہلر، بھاؤ داجی، بھگوان لال اندراجی، سر اورل اسٹائن، اے۔ کے فوربیز، ایل۔ پی۔ ٹیز ٹیوری، وغیرہ جیسے ممتاز عالم فاضل لوگ بھی وقتاً فوقتاً اس پر فریب خیال کی طرف کہ قبلِ مسلم ہندوستانی ادب میں تاریخی ادب نام کی چیز تقریباً ناپید ہے، توجہ دلاتے رہے ہیں۔

ٹوڈ کے بعد کویراج شیامل داس، بھاؤ داجی، بھگوان لال اندراجی، جی ایچ اوجھا اور دوسرے لوگوں کا ایک پورا گروہ گزرا ہے جن کی تحریروں سے سنسکرت، ہندی اور ملک کی دوسری زبانوں میں تاریخی ادب کی کمی کا یہ مقبول عام خیال دور ہو جانا چاہیئے تھا لیکن پچھلی صدی کے دوران بڑی تعداد میں تاریخ کے ایسے ماخذی مواد پر روشنی پڑی ہے جو اس سے کہیں بڑے علاقے کا احاطہ کرتا ہے جس علاقے تک فارسی تاریخ نگاروں کی تحریریں عام طور پر محدود رہتی ہیں۔ یہ اس قسم کا تاریخی مواد ہے جو سرکاری اور نجی ذخیروں کی شکل میں واقعتاً سارے راجستھان (اور گجرات اور مالوہ میں بھی) میں بکھرا ہوا ہے اور جو لوگوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر، ان کی

سماجی روایتوں پر اِن کے عقیدوں اور اِرادوں پر، اقتصادی، صنعتی اور کاروباری میدانوں میں ان کی ترقّی پر، اور اس سے زیادہ سائنس اور ادب کے میدانوں میں اِن کے لاجواب کارناموں پر جن میں طبعی اور وہ مافوق الطبعی کارنامے بھی شامل ہیں جو ہندوستانی تاریخی عمل کے سیاق میں سب سے زیادہ اہم ہیں، معلومات کا ایک خزانہ پیش کرتا ہے۔

اِن خزانوں کی دریافت اور تحفّظ کے بڑھتے ہوئے جوش کے ساتھ متعدد ادارے لائقِ تحسین خدمات انجام دے رہے ہیں اور بڑی تعداد میں سنسکرت نیز دوسری زبانوں کی جو وقت وقت سے ابتدائی تحریروں کی زبانیں رہ چکی ہیں، فاضلانہ اور نقادانہ مترجِح اشاعتیں طبع کرا رہے ہیں۔ لیکن عظیم اطالوی فاضل، ڈاکٹر ایل۔ پی۔ ٹیز ٹیوری کے ممتاز اور غالباً اکیلے کارنامے کو اگر مستثنیٰ قرار دے دیا جائے، تو یہ کہنا جائز ہوگا کہ موجودہ مواد کو تقسیم کرنے اور خانوں میں باقاعدہ بانٹنے کی باقاعدہ کوشش اِن سے پہلے یا ان کے بعد کسی دوسرے نے نہیں کی۔ لیکن ٹیز ٹیوری نے بھی ایک محدود علاقے کا احاطہ کیا تھا۔ اِس مقصد کے ساتھ راجستھان میں جو حالیہ جائزہ لیا گیا تھا اس سے دستاویزوں اور دوسری قابلِ قدر اشیا کے سینکڑوں ذخیروں کا پتہ لگا تھا۔ یہاں ہم ایک سرسری سا اشارہ اس نہایت وافر کتبیاتی مواد کی طرف بھی کر دیں جو محکمۂ آثار قدیمہ اور اس میدان میں کام کرنے والی دوسری تنظیموں کی نئی دریافتوں کی وجہ سے برابر بڑھ رہا ہے۔ ابتدائی دورِ وسطیٰ اور خصوصاً گجرات کے سلسلے میں ایک نہایت غیر معمولی شخص جی، بہلر ہے، جو بہت سی تاریخوں کے مصنّف اور عالمِ متبحّر تھے اور جس نے کثیر التعداد کتابوں کی کھوج اور تلاش کر کے بیش بہا خدمت انجام دی، اور حقیقت یہ ہے کہ مغربی ہندوستان میں علمِ تاریخِ ہندوستان کی ٹھوس بنیاد قائم کر دی۔ اس کی تقلید ساونت وادی کے بھاؤ داجی اور ایک گجراتی اہلِ علم بھگوان لال اندراجی نے کی۔

ایک صدی کے پچھلے پچھتر برسوں میں بعد کے دور کے مواد کا استعمال چند ہی اہل علم نے کیا ہے۔ ٹوڈ کے بعد اس میدان میں ابتدائی نوعیت کا کام کوی راج شیامل داس نے کیا ہے، جو میواڑ کے مہارانا سجن سنگھ (1874ء تا 1884ء) کا درباری شاعر تھا۔ کوی راج شیامل داس نے اپنی ضخیم تاریخ میں، جس کا نام ویر ونود تھا اور جو 2800 صفحات پر مشتمل تھی، پورے راجستھان کی تاریخ و جغرافیے کے نہایت وسیع میدان کا احاطہ کر لیا ہے۔ مصنف نے راجستھان کے سیاسی، اقتصادی اور انتظامی پہلوؤں پر بڑی تعداد میں اعداد و شمار بھی اکٹھا کیے ہیں۔ اس نے کتبے اور مغل بادشاہوں کے فرمان بھی نقل کیے ہیں۔ لہٰذا راجستھان کی سیاسی تاریخ پر حوالوں کے لیے اس عظیم تصنیف کی حیثیت ایک معیاری کتاب کی صورت میں ہمیشہ برقرار رہے گی۔ راجستھان کے جدید مورّخوں میں دو اور نام جی۔ ایچ۔ اوجھا اور ہر بلاس ساردا کے ہیں۔ اوجھا کا کام واقعتاً زبردست ضخامت کا کام ہے۔ میواڑ، مارواڑ، سروہی اور راجستھان کی دوسری ریاستوں کی تاریخوں کے علاوہ، اوجھا نے ہندوستانی دورِ وسطیٰ کی تہذیبی تاریخ کو جو کچھ دیا ہے وہ بھی نہایت قابلِ قدر ہے۔ انھوں نے بڑی تعداد میں مضامین (نبندھ) لکھے ہیں جن کو جمع کر کے کئی جلدوں میں شائع کرا دیا گیا ہے۔ لیکن اس مضمون کا جامع بیان غالباً اُن ہی لیکچروں پر مشتمل ہے جو انھوں نے ہندوستانی اکاڈیمی، الہ آباد (1928ء) کے زیرِ انتظام دورِ وسطیٰ کی ہندوستانی تہذیب ـــــ مدھہ کالین بھارتیہ سنسکرتی ـــ کے عنوان سے دیے تھے۔ دورِ قدیم اور دورِ وسطیٰ کے ہندوستان کے بارے میں ان کی سب سے بڑی دین بھارتیہ پراچین لپی مالا (ہندوستان کے قدیم کتبوں اور تحریروں کو پڑھنے کا فن) (1918ء کا نظرِ ثانی کے بعد والا ایڈیشن) ہے، جو ہندی یا کسی بھی دوسری زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ ہر بلاس ساردا، جو ایک ہمہ گیر قسم کے عالم اور قابلِ ذکر مصنّف

تھے، انہوں نے اپنی نہایت عمدہ کتاب تاریخِ اجمیر اور رانا کمبھا، رانا سنگرام سنگھ اور دوسرے راناؤں کی سوانحوں کے سلسلے میں سنسکرت اور ہندی کے اصل ماخذوں کا بڑا وسیع مطالعہ کیا تھا۔ ان کی تقلید میں پچھلی دو دھائیوں کے دوران بہت بڑی اور بڑھتی ہوئی تعداد میں اہلِ علم لوگوں نے ان ماخذوں پر توجہ دینی شروع کر دی ہے۔ ڈاکٹر رگھوبیر سنگھ، پروفیسر دسرتھ سرما، بہاٹابر اور ان اور دوسرے بہت سے لوگوں نے ایسا تاریخی ادب تیار کیا ہے جو بڑا لائق تعریف ہے۔ انہی اہلِ علم کے کاموں کی بنا پر چند برسوں سے نئی نسلوں کے محققوں کی توجہ یہ سمجھ کر ایک زیادہ وسیع میدان کی طرف مبذول ہو گئی ہے کہ اب تک جن ماخذی اشیاء سے فائدہ نہیں اُٹھایا گیا تھا ان کا استعمال ضروری اور اہم ہے مثلاً یہ دیکھ کر بڑا اطمینان ہوتا ہے کہ راجستھان کے تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں کے علاوہ علیگڑھ مُسلم یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ نے بھی اس سمت میں پیش قدمی شروع کر دی ہے۔

اس سب کے باوجود، اب تک جو کام ہوا ہے اس کی حیثیت سمندر میں قطرے کی سی ہے، کیونکہ اہلِ علم لوگوں کا ایک بہت بڑا حصّہ، جو ہندوستانی دورِ وسطیٰ کی مدّت اور اس کے تاریخی ماخذ، دونوں اعتبار سے فرسودہ خیالات سے چپٹے ہوئے ہیں، ابھی تک ماخذی مواد کے اس ذخیرے سے نہایت لاعلم ہے۔ یہی لاعلمی، بڑے پیمانے پر پھیلے ہوئے اس غلط تصوّر کی بھی ذمہ دار ہے کہ جس زمانے کو ہم دورِ وسطیٰ کہتے ہیں وہ محض مُسلم حکومت کا کارنامہ تھا، یعنی تقریباً گیارھویں صدی سے اٹھارویں صدی کے وسط تک کا زمانہ۔ گیارھویں صدی سے پہلے ہماری تاریخ کی پانچ یا اس سے کچھ زیادہ صدیوں کا زمانہ، جو زمانہ بعد کے کارناموں اور ہندوستانی سماج کے انحطاط و زوال دونوں چیزوں کے واسطے پودے کیاری کی حیثیت رکھتا تھا، محض یہ کہہ کر نظرانداز کر دیا جاتا ہے کہ اس دور میں تاریخی دلچسپی کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ مدّت جو نصف ہزار برسوں سے کسی طرح

کم نہیں ہے تاریخی خلا کہہ کر رد کرتی جاتی ہے۔ وقت آگیا ہے کہ جو لوگ قبلِ ترک دور سے اب تک پرہیز کرتے رہے ہیں اور صرف فارسی نیز غیر ملکی ماخذوں تک محدود رہے ہیں، اور اس فائدے سے محروم رہے ہیں جو علاقائی زبانوں میں دیسی اشیاء کے وسیع خزانے سے حاصل ہو سکتا تھا، سنسکرت، ہندی اور اسی نژاد کی دوسری زبانوں سے واقفیت پیدا کریں تاکہ ان بے شمار اشیا کا استعمال کر سکیں جو اِن زبانوں میں موجود ہیں۔ محدود نقطۂ نظر کی بنا پر اپنی تاریخ اور اپنے ورثے کے ادراک کے بارے میں لامحالہ ہمارا نظریہ مفلوج ہو گیا ہے اور نظر تنگ ہو گئی ہے۔

گرجرا پرتھی ہار، گہدوار، چوہان، چنڈیل اور پرماروں جیسی ابتدائی حکومتوں پر چند ایک رسالوں کے علاوہ اس دور (ابتدائی ہندوستانی دورِ وسطیٰ) پر سب سے زیادہ قابلِ ذکر کام سی، وی، ویدیا اور ایچ، سی، رے نے کیا ہے[2]۔ لیکن روایتی خیالات کا اتنا غلبہ ہو چکا ہے اور نام نہاد دورِ وسطیٰ کے مطالعے کی بابت لوگوں کے عام طرزِ نظر کی جڑیں اتنی گہری ہو چکی ہیں کہ ویدیا اور رے کی پیش رفت کے بعد شاید ہی کسی نے اس میں کوئی قابلِ قدر اضافہ کیا ہو۔

فارسی اور غیر فارسی ماخذوں کی اہمیت کا مقابلہ :

دورِ وسطیٰ اور اس کے ماخذوں کی بابت جو بہت سے مفروضات رائج ہو کر ہر طرف پھیل گئے ہیں اور تقریباً ایک مصدقہ حقیقت کی طرح مان لیے ہیں، نیز جن کی بنا پر تاریخی تلاش و تحقیق کا کام بڑی حد تک رک گیا ہے، ان میں سے ایک مفروضہ یہ ہے کہ صرف فارسی روزنامچے ہی تاریخ نگاری کے معیاروں پر پورے اترتے ہیں، اور علاقائی دیسی زبانوں میں شاید ہی کوئی ایسی تاریخی کتاب ہو جو اُن جیسی مستند اور معتبر ہو۔ فنِ تاریخ نگاری کے تصوّر اور اس کی خاصیّت کے بارے میں یہ بتانے کے لیے ہم ٹوڈ کا حوالہ دیا ہے (پیرا پیرا 2) کہ ہندو ادب میں اس انداز کی تاریخ نگاری

کی تلاش نہایت غلط ہوگی جس انداز کی تاریخ نگاری فارسی روز ناموں میں ملتی ہے ، کیونکہ فارسی روز ناموں کے بیشتر مُصنّف یہ سمجھتے ہیں کہ عوام کی زندگی کا کوئی بھی پہلو اس لائق نہیں ہوتا کہ اسے تاریخ میں جگہ دی جائے ۔ لہٰذا فارسی کے نام نہاد تاریخی ادب کا بہت بڑا حِصّہ اُونچے اور طاقتور لوگوں کی زندگی کے غیر اہم واقعات سے پُر ہے ۔ جہاں تک ان کی تاریخی قدر و قیمت کا تعلّق ہے ، تو قطع نظر اس بات کے کہ ان میں سے بہت سے برائی کی حد تک تاریخوں سے مبّرا ہیں ، لیکن اِس سے کہیں زیادہ اہم یہ ہے کہ ان کی پسند و ناپسند ، ان کے توہمات اور کٹرپن ، اور ان کے اپنے میلانات جن کے باعث سچائی پوشیدہ رہی ہے اور ذہن صحیح راہ سے بھٹک جاتا ہے ، اِن سب باتوں سے اکثر اوقات ان کے بیانات خراب ہو جاتے ہیں اور نہایت ناقابلِ اعتبار بن جاتے ہیں ۔ روز نامچہ نگاروں کی یہی وہ خامیاں ہیں جن کے باعث بعض محققین کو یہ بہانہ ہاتھ آجاتا ہے کہ جو چیز ان کے مفروضہ مقاصد کو پورا کرتی نظر آئے اسے مان لیں اور جو چیز ایسا نہ کرے اسے رد کر دیں ۔ دوسری طرف یہ ہوا ہے کہ تحریری باتوں کو ساتنقید اور بلا شک و شبہ مان لینے کی وجہ سے ایسی متعدد کتابیں تیار ہوگئی ہیں جنھیں تاریخ کہا جاتا ہے ، لیکن جب گہرائی سے جانچ پڑتال کی جاتی ہے تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تاریخ نہیں جھوٹے قصّے ہیں ۔ لہٰذا ، مندرجہ بالا سطور میں جن مختلف خامیوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ ہر قسم کی تاریخی ادب میں عام ہیں ۔ غیر فارسی تاریخی ادب میں بھی بلا شبہ بعض ایسی خصوصیات ہیں جو بڑی عام ہیں اور ان میں بھی خوبیاں اور خامیاں ہیں ۔ ہندی (یہ لفظ بڑے وسیع معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے) کے بیشتر روز ناموں کی بڑی نمایاں خصوصیات یہ ہے کہ جنم پتریوں میں اہم واقعات ، جیسے کسی شخص کی پیدائش ، تخت نشینی ، وفات وغیرہ کی نہ صرف تاریخ دی جاتی ہے بلکہ دن ، گھنٹہ اور ساعت (پَل)[3] تک دی جاتی ہے ۔ لیکن جو لوگ یہ جانتے ہیں انہیں تعجب نہ ہوگا ایک بڑا پُرانا رواج

یہ تھا کہ جو لوگ ایسے اندراجات کے ذمہ دار تھے، وہ ایک مذہبی پرہیز فریضے کی طرح یہ ساری چھوٹی چھوٹی تفصیلات درج کرتے تھے۔

اس ادب کے خاصے بڑے حصّے کی ایک اور قابلِ ذکر خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عوام کے کارناموں اور زندگی پر براہِ راست یا بالواسطہ طور سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن راجپوت سرداروں کی بیشتر تاریخوں اور کتبات میں دیوتا صفت انسانوں کے شاندار کارنامے بیان کرتے وقت جب مضحکہ خیز اور ناممکن قسم کے دعوے کیے جاتے ہیں تو فارسی ہم چشم بالکل ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود، سنسکرت، اپابھرنشا اور ہندی میں ایسی بہت سی کتابیں ہیں جو کہیں زیادہ قابلِ اعتبار اور مواد کے لحاظ سے کہیں زیادہ مالا مال ہیں۔

اب یہ بات بالکل طے ہو چکی ہے کہ پُرانوں میں جن حکومتوں کی فہرستیں شامل کی گئی ہیں جیسے متسیا، وایو، وشنو اور بھگوت وہ نندا، موریہ، شنگا، کنوا اور آندھرا حکومتوں تک بالکل صحیح ہیں۔ اس کے بعد گو ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے عظیم ادبی ذخیرے کا ایک معمولی حصّہ بچ چکا ہے پھر بھی تاریخی کتابوں کی خاصی بڑی تعداد پر روشنی پڑ چکی ہے۔ مندرجہ بالا سطور میں ہم بتا چکے ہیں کہ تاریخی اور نیم تاریخی کتابوں کی ایک بڑی تعداد پر جو روشنی پڑی ہے وہ خصوصاً ممتاز جرمن اہلِ علم جی، بہلر اور دوسرے لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے ان میں سے بیشتر یا تو چیرتاز ہیں یا پربندھاز ہیں یعنی جین اہلِ علم کی سوانحیں یا تاریخی قصّوں کے مجموعے۔ ہم ذیل میں دورِ وسطیٰ کی چند اہم کتابوں کے نام دے رہے ہیں۔

اپنی کتاب "حیات ہیم چندر اچاریہ" (اصل کتاب جو جرمن زبان میں ہے اس کا ترجمہ منی لال پٹیل نے انگریزی میں کیا ہے)، (سنگھی جین سیریز، نمبر 11، 1936) میں بہلر ذیل کے پربندھاز کا ذکر کرتا ہے:

پربھاودکا چرترا، جو 22 جین اچاریوں، پربھا چندرا اور پرادیومنا سوری کی

سوانحوں کا مجموعہ ہے (سرکا 1250)۔

مرُوتنگا کی پربندھا چنتامنی، جسے پہلے پہل اے۔ کے فوربیز نے اپنی کتاب رس مالا (تاریخ گجرات) میں استعمال کیا ہے اور جس کا انگریزی ترجمہ سی۔ ایچ۔ ٹونی نے کیا ہے۔ ایچ۔ وی۔ ویدی نے ہندی میں ترجمہ کیا ہے۔ (سنگھی جین سیریز 1929)۔ یہ تاریخی قصّوں کا ایک بہت بڑا مجموعہ ہے، جو بہلر کے کہنے پر، کے مطابق، خاصی تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کا مُصنّف جو کاٹھیاواری وردھامانوا کا مرُوتنگ تھا، اس نے 1305ء میں اسے مکمّل کر لیا تھا۔ پربندھا جین رشیوں اور منیوں کی زندگی کی کہانیاں ہیں۔ پربندھا کا لہجہ گو حکایتی ہے پھر بھی اِن میں بہت کچھ ایسا مواد موجود ہے جس کی تصدیق کتبات اور دوسرے قابلِ اعتبار ماخذوں سے ہوتی ہے۔ (بہلر، حیاتِ ہیم چندر اچاریہ، صفحہ 4)۔

راج شیکھر کی پربندھ کوش، جو مشہور رشیوں، شاعروں اور سیاسی مدبروں کی سوانحوں کا مجموعہ ہے اور جو وکرم سمیت 1405 مطابق 49 — 1348ء اے، ڈی میں دِلّی (دہلی) میں مکمّل ہوئی۔

جن من دان اپادھیا کی کمار پال چرتا جو 36 — 1435ء اے، ڈی میں مکمّل ہوئی۔

راجہ کمار پال چولکیہ کی تین بڑی سوانحیں ہیں، جن کے تینوں مُصنّفوں یعنی جے سنگھ سوری، چرتر سندر گنی اور جن من دان اُپادھیا نے ایک ہی نام کمار پال چرت دیا ہے۔ لیکن مشہور جین اچاریہ ہیم چندر جین نے راجا کمار پال چولکیہ (پیدائش 1092ء، تخت نشینی 1142ء، وفات 1173ء) کی بیس سے زیادہ سوانحوں کا خلاصہ کر دیا ہے۔ یہ مجموعہ سنگھی جین سیریز (نمبر 41، 1956ء) میں کمار پال چرتر سنگرہ کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔

ہیم چندر اچاریہ نے دوالیشرے مہاکاویہ کے نام ہی سے دو اور تاریخی کاویہ لکھی ہیں، جن میں ایک سنسکرت میں اور دوسری پراکرت میں ہے۔ پہلی میں چولکیہ حکومت کی تاریخ کا خلاصہ دیا گیا ہے، اور دوسرے میں کمار پالا کہ زندگی کے حالات دیئے گئے ہیں۔

شہنشاہ ہرش وردھن کے درباری شاعر بان بھٹ کی ہرش چرت۔(سنسکرت) یشوورمن کے درباری شاعر، وکپتی راج (آٹھویں صدی) کی گوروا ہو (پراکرت)۔ یشوورمن کی فتح بنگال کا حال دیا ہوا ہے۔

پدم گپت عرف پاریمل (دسویں صدی کے آخر میں) کی نواشاسنک چرت (سنسکرت)۔ مالوہ کے فرمانروا، وگپتی منجا (975 تا 995) کی زندگی۔

بلاّل کی بھوج پربندہ گیارھویں صدی کے شروع میں۔۔۔ راجہ بھوج کے انتظام سلطنت کا حال دیا گیا ہے۔

بلھانا (بارہویں صدی کے شروع میں) کی وکرانامک دیو چرت (سنسکرت) کلیانی کے چولکیہ، راجہ وکرامانک کی زندگی اور دور، (1076ء تا 1126ء)۔

سندھیاکرنندی (گیارہویں صدی کے آخر میں) کی رام چرت (سنسکرت) بنگال کی پال حکومت کے رام پال کی تاریخ۔

کلہن (1148ء تا 1150ء) کی راج ترنگی (سنسکرت) کشمیر کی تاریخ۔ اس کے مصنّف کا کہنا ہے کہ یہ تاریخ لکھتے وقت اس نے کشمیر کی تقریباً چودھا تاریخوں سے استفادہ کیا تھا۔ جناراج ترنگنی (سنسکرت)۔۔۔ کشمیر کے زین العابدین (1411ء تا 1463ء) کا ہم عصر تھا۔۔۔ کلہن کی تاریخ کے تسلسل میں ہے۔

شری ور پنڈت کی راج ترنگی (سنسکرت)۔ جناراج 1434ء میں فوت ہوگیا تو

اس کے شاگرد شری ور نے اس کی نامکمل کتاب لکھنا شروع کی۔ شری ور کو زین العابدین، اس کے بیٹے اور پوتے، حیدر شاہ اور حسین شاہ کی سرپرستی حاصل رہی۔ شری ور کی تاریخ فتح شاہ کی تخت نشینی تک کے دور (1434ء تا 1479ء) کا احاطہ کرتی ہے۔

چوتھی راج ترنگنی دو مصنفوں یعنی پراجیہ بھٹ اور شکا کا کام ہے۔ شکا ہمیں بتاتا ہے کہ پراجیہ بھٹ نے ایک کتاب راجیہ ولپتکا نامی لکھی جس میں کالی یگ یعنی 4589 مطابق 1486ء اے، ڈی تک کے واقعات درج کیے۔ جب فتح شاہ حکومت کر رہا تھا۔ اس کے بعد شکا نے، جو اکبر کا ہم عصر تھا، 1588ء تک کشمیر کی کہانی لکھی، اور ابوالفضل کے کہنے کے مطابق 1588ء میں جب شہنشاہ پہلی دفعہ وادی میں پہنچا تو راج ترنگنی اسے پیش کی گئی۔

راجہ پرتھوی راج چوہان کے ایک کشمیری نثراد درباری شاعر جیانک (جیرتھ) نے پرتھوی راج وجے (سنسکرت) لکھی یہ کتاب 1178ء تا 1200ء دوران کبھی لکھی گئی تھی۔ یہ اُس کے سرپرست کی ایک لائقِ اعتبار تاریخ ہے۔

جے سنگھ سوری (بارہویں صدی) کی ہمیر مد مرداں (سنسکرت)۔ بھیم دوئم چالوکیہ اور محمد غوری کے درمیان ہونے والی جنگ کا حال دیا ہے۔

نیا چندر سوری کی ہمیر مہا کاوے (سنسکرت) رنتھمبور کے ہمیر دیو کی تاریخ جیسے 1298ء میں علاالدین خلجی نے شکست دی تھی۔

جنا ہرش گنی (تیرہویں صدی) کی وستو پال چرت (سسکرت)۔ دھوالکا (ضلع احمد آباد کا ڈھولکا) کے راجہ وردھاول کے وزیر اور ایک دولت مند تاجر شہزادے مہاتیہ وستو پال کی سوانح حیات وردھاول تیرہویں صدی میں انہلواڑہ، پٹن کے راجہ بھیم دوئم کا ایک باج گذار تھا۔ (دیکھیے بی، جی، سینڈسن کی مہاتیا وستو پال اور اس کا ادبی حلقہ) (تذکرہ بہادر سنگھ سیریز نمبر 3)۔

گنگا دھر پنڈت کی منڈلک مہا کاوے (سنسکرت)۔

ان میں بیشتر سنسکرت میں اور بعض پراکرت میں لکھی گئی ہیں۔

مندرجہ بالا فہرست میں ابتدائی دورِ وسطیٰ کی محض تھوڑی سی تاریخی اور نیم تاریخی کتابیں دی گئی ہیں۔ تقریباً یہ ساری ہی کتابیں شمالی ہندوستان کی تاریخ سے تعلق رکھتی ہیں۔

بعد کے دور کے واسطے ہمارے پاس بڑے انواع واقسام کا تاریخی ادب موجود ہے جس کو ذیل کی قسموں میں بانٹا گیا ہے۔

ابھیلیک، القاب نامہ، ایتیّ گرنتھ، ایتہاسک بٹن، کرسی نامہ، حیات، گجلّ، چرت، جاس، جنم پتری، جیونی، تحقیقات، دفتر بہی، پٹّہ، پروانہ، رقعہ، پٹّاولی، ماٹ یا ورت، پرشاستی، یادداشت، رسو، رسیا یارسا، وگت و شاولی یا بنساولی۔

ان کے علاوہ بہت سی ایسی اصطلات مغل انتظامیہ کی اصطلاحات سے لی گئی تھیں جن سے سرکاری اندراجات کی مختلف قسموں کے نام ظاہر ہوتے تھے، جیسے عوارج، پروانہ، رقعہ، مسند، سیاہ بقایا وغیرہ۔ یہ سب بیکانیر میں راجستھان کے پُرانے محافظ خانے میں محفوظ ہیں[4]۔

آخر میں مغل دور کی تاریخ سے تعلق رکھنے والی سنسکرت اور ہندی کی ان چند ایک کتابوں کا ذکر اس نظر سے کیا جاسکتا ہے تاکہ تاریخ کے طالب علموں کی توجہ اس امر کی طرف مبذول ہو کہ یہ دستاویزات ان پہلوؤں کے بارے میں بے شمار معلومات اور اعداد و شمار فراہم کرتے ہیں جن پہلوؤں کو فارسی روزنامچہ نگار عام طور سے نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ایک نہایت دلچسپ اور بصیرت بخش کتاب ایک جین رشی کی سوانح حیات ہے جس

کا نام بھانو چندر گنی تھا اور جو شہنشاہ اکبر کا ہم عصر تھا۔ اسے ایک اور جین رشی سدی چندر اوپادھیا نے لکھا ہے (سنگھی جین سیریز نے شائع کیا ہے)۔ جیساکہ ہمیں خود مُصنّف کے اعتراف سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نہایت صحیح اور سچّا بیان ہے۔ رشی کی زندگی کا حال بیان کرنے کے علاوہ مُصنّف نے عظیم شہنشاہ، اس کے متعدد سماجی بہبودی کے کاموں نیز شہنشاہ کے دِل و دماغ کی غیر معمولی صلاحیتوں اور اس کے عظیم وزیر ابوالفضل کا نہایت درفشاں بیان دیا ہے۔ مصنّف شہنشاہ کی ہمہ گیر خوبیوں کو تعریف و توصیف کے اِن الفاظ کا نذرانہ عقیدت پیش کرتا ہے۔ "کوئی ایک فن، کوئی ایک شاخ علم، کوئی ایک طاقت اور بہادری کا کام ایسا نہ ہوگا جسے نوجوان شہنشاہ نے انجام دینے کی کوشش نہ کی ہو۔"[6] مُصنّف ابوالفضل کی وسعت علم اور اس کی بے پیاں ذہانت کا زبردست مداح ہے۔ ابوالفضل کی صحبت میں اسے بہت برس گذارنے کا موقع ملا تھا۔ وہ کہتا ہے! "(ابوالفضل) ہر ادب کے بحر دخار میں غوطہ زن ہو چکا تھا اور اہل علم حضرات میں سب سے افضل تھا۔ ادب میں کوئی ایسی بات باقی نہیں بچی ہے جو اس نے دیکھی یا سنی نہ ہو۔"[7]

ایک اور غیر معمولی کتاب جو لائق توجّہ ہے۔ ایک خاصے غیر معمولی شخص بنارسی داس (1586ء تا 1643ء اے، ڈی) کی لکھی ہوئی خود نوشت سوانح عمری ہے جو اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کا ہم عصر تھا۔ بنارسی داس یو،پی کے ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے تقدیر کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے تھے اور ایک دفعہ وہ سخت مفلسی کی حالت پر پہنچ گیا تھا۔ وہ شاعر بھی کچھ کم رُتبے کا نہ تھا۔ اس مُصنّف کے کردار کا ایک غیر معمولی وصف یہ ہے کہ اپنی خود نوشت سوانح عمری (جسے اردھ کتھانک کہا جاتا ہے یعنی آدھی زندگی کی کہانی۔ کیونکہ 1641ء میں جب یہ کتاب لکھی گئی تو وہ برس کا تھا اور اسے توقع تھی کہ وہ پورے ایک سو دس سال زندہ رہے گا، لیکن

قسمت کو یہ منظور نہ تھا چنانچہ 1643ء میں دو ہی سال بعد وہ مرگیا) میں خود بنارسی
داس علاحدہ ہو جاتا ہے اور ایک مشاہد کی سی مکمّل بے تعلّقی سے اپنی زندگی کے واقعات
اور افعال پر نظر ڈالتا ہے اور اتنی نمایاں دیانت داری نیز صاف گوئی سے انہیں منعکس
کرتا ہے کہ بس تعجب ہی ہوتا ہے۔ وہ اپنی اِن ساری مشتبّہ اور رکیک حرکتوں کا کُھلے
طور سے اعتراف کرتا ہے جو اس سے کبھی سرزد ہوئیں، اور اس کا بھی کہ اس نے آگرے
میں مفلسی اور گمنامی کی زندگی گذاری۔ اس کی ترک کا ہر ورق ایک نایاب عطیے کا شاہد
ہے یعنی خود کو دوسروں کی نظر سے دیکھنا، اور وہ خاصی حد تک انسانیت کے اس
بنیادی عنصر کا حامل ہے یعنی اس میں خود اپنے اُوپر ہنسنے کی صلاحیت ہے۔ وہ ضمناً
کاروبار و تجارت اور ذرائع آمد و رفت نیز سڑکوں کے محفوظ ہونے کے بارے میں
بڑی دلچسپ معلومات فراہم کرتا ہے۔ وہ اس بات کا بھی شاہد ہے کہ خود دارالسلطنت
آگرہ میں ضروریات زندگی بے حد ارزاں تھیں۔

اگر صحیح طور سے مستقل مزاجی کے ساتھ تحقیق کی جائے تو اسی طرح کی اور زیادہ
کتابوں پر روشنی پڑسکتی ہے۔ یہاں زور دے کر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہندو اہل
علم اور شاعروں کی تحریریں، جو زیادہ تر شاعرانہ تحریریں ہی ہیں، بڑی تاریخی
اہمیت کا حامل ہیں۔ یہ ہندو اہلِ علم اور شاعر وہ لوگ تھے جنہیں نہ صرف راجاؤں،
شہنشاہیوں اور صوبائی فرمانرواؤں کی سرپرستی ملی بلکہ امراء اور دوسرے صاحبِ اقتدار
لوگوں کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔

یہاں مثال کے طور پر چند ایک مثالیں دُینا ہی کافی ہوگا۔ غالباً گووند بھٹ ہندو
شاعروں میں وہ سب سے ممتاز شخص ہے جسے اکبرِ اعظم کی سرپرستی ملی۔ اور جس کو شہنشاہ نے
اکبر یہ کالی داس کے خطاب سے نوازہ۔ اِس شاعر کی تحریروں (جو زیادہ تر پرشاستیاں یا
قصیدے ہیں) سے ہمیں مغلوں کی اُس حوصلہ افزائی اور اہل دلی کا ثبوت ملتا ہے جو

انھوں نے سنسکرت زبان کے ذریعے ہندو تہذیب کی احیا کے لیے دکھائی۔[8] سترہویں صدی کے ہندو درباری شاعروں میں جگن ناتھ پنڈت راج کا نام بڑا مشہور اور معروف ہے۔ اسے آصف خاں اور خود شہنشاہ شاہجہاں کی بڑی عنایات حاصل رہیں، اور اس نے اپنے سرپرست کی تعریف میں آصف ولاس لکھی۔ ان شاعروں کی تحریروں سے ہمیں ہندو اور مسلمان دونوں کے نام نہاد اونچی سماجی طبقوں کے رجحانات کے بارے میں بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ یہ ایک طرف تو بڑے بڑے مسلم لوگوں کی کیفیتِ انتشار اور بدلتی ہوئی نفسیاتی حالت اور دوسری طرف دورِ آخر کے مغل دربار کے پر تغیر ماحول کی عکاسی کرتی ہیں لیکن اسی کے ساتھ مختلف مذہبی برادریوں کی قربت اور ایک ملے جلے بیر صحت مند سماجی تانے بانے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو فرقہ پرستی اور اختلافات سے پاک تھا اور جو اس زمانے کے ہندی ادب میں نظر آتا ہے، جس ادب میں دورِ آخر کے شہنشاہوں کی وہ کوششیں بھی شامل ہیں جو انہوں نے ہندی شاعری میں کیں۔ رام پور کے ریاستی کتب خانہ کی شائع کردہ نادرات شاہی (۱۹۴۴ء) شہنشاہ شاہ عالم دوئم کی ہندی (ہندوستانی) نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ نظمیں دربار اور شہری لوگوں کی سماجی ومذہبی زندگی کی ایک زندہ تصویر پیش کرتی ہیں۔ ہمیں بہت سی ایسی جھلکیاں نظر آتی ہیں کہ شہنشاہ اپنے ہندو اور مسلمان درباریوں کے ساتھ کس طرح ہولی اور دیوالی جیسے ہندو تہواروں کا لطف اُٹھاتا تھا۔ ہمیں انواع واقسام کے بہت سے آلاتِ موسیقی، آتش باریوں، پھلوں اور پھولوں، نوروز، شادی اور پیدائش کی تقریبوں اور دوسرے جشنوں کے بارے میں معلومات ملتی ہے، جن میں دونوں مذہبی برادریاں یکساں جوش وخروش سے شامل ہوتی تھیں۔ شہنشاہ ہولی کا اتنا شائق تھا کہ اس نے ہولی یا ہوری پر بیسیوں حسین شعر لکھے تھے۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ عظیم مغلوں کے تخت پر متمکن ہونے والے بادشاہوں میں شاہ عالم دوئم سب سے زیادہ عمر دہ شخص تھا۔ اس نے مہدجی سندھیا کو خطاب کر کے جو شعر لکھا

اس میں اپنی بیکسی اور قابلِ رحم حالت کا بڑی شدت سے اظہار کیا تھا اور مہدجی سندھیا کے کہنے پر انگریزوں کی پناہ سے نکل کر آلہ آباد سے دہلی چلا آیا تھا۔

راجستھان کے بعض مندروں اور نجی ذخیروں کے ایک مطالعہ معائنے سے ایسے موروں اور مختلف قسم کی دستاویزوں کا پتہ چلتا ہے جن کا تعلّق اقتصادی، سیاسی اور سماجی حالات، فن اور علمِ تعبیر، اوراں اور سمائنشوں اور دوسرے بہت سے دلچسپ مضامین سے ہے۔ تقریباً دوسو سے زائد مسودوں اور طبع شدہ نادر کتابوں کا انتخاب کیا گیا ہے اور محقوق کی رہنمائی اور مدد کے واسطے اِن منتخب کتابوں کی مدد سے نمونے کا ایک تفصیلی کیٹیلاگ تیار کیا گیا ہے۔ لیکن اس قسم کا مواد اکیلے راجستھان ہی میں اتنا زیادہ ہے کہ سرکار اور علمی اداروں کو انہیں تلاش کرنے، محفوظ رکھنے اور کیٹیلاگ کرنے پر پوری توجہ دینی چاہیئے ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ موسم کی سختوں اور لاپرواہی کی وجہ سے یہ برباد ہو جائے۔

حوالہ جات

1- دیکھیے : Annals and Antiquities of Rajasthan پر ٹوڈ کی تمہید۔

2- History of Hindu Medieval India

Dynastic History of Northern India تین جلدیں، اور دو جلدیں یہ دونوں کتابیں موجودہ صدی کی تیسری دہائی میں شائع ہوئیں۔ 1960ء میں بی، پی، مزمدار کی ایک تحقیقی کتاب اور شائع ہوئی جس کا نام ہے — Socio — Economic History of Northern India (1030ء تا 1194ء) تاریخ گہدوال، چندیل چند ایک مونوگراف ہیں جو ہندی اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوتی ہیں۔

3- ایک پل 24 سیکنڈ کے برابر ہوتا ہے۔

4- تفصیلات کے لیے دیکھیے مصنف کی کتاب : Descriptive Catalogue of Non-Persian Sources of Medieval India History

5- "نہ میں نے غرور کی وجہ سے مبالغہ کیا ہے نہ میں نے عاجزی کے باعث کم کر کے دکھایا ہے۔ یہاں وہ بیان کر دیا ہے جو واقعی گذرا ہے۔

6- صفحہ، VII

7- صفحہ، VII

8- Introducing India (R A-Sec of Bengal, Part II) P.84 ء

دَورِ وَسطیٰ کے دوران تاریخِ پنجاب کے بعض غیر مُسلم مآخذ

گینڈا سنگھ

ہندوستانی تاریخ کے دَورِ وَسطیٰ کے دَوران، پنجاب بے مسلمانوں کے زیرِ نگیں رہا جو شمال مغرب سے آئے تھے۔ وہ یا تو ترکی بولتے تھے یا پشتو یا فارسی۔ لیکن اس وقت پشتو پورے طور سے ادب کی زبان نہ بن پائی تھی۔ اور چونکہ افغانستان پر لمبے عرصے تک ایرانیوں کا سیاسی تسلط رہا تھا۔ اس لیے افغان عالموں نے ان کی زبان اپنالی تھی اور اسی زبان میں اپنی اپنی تاریخی کتابیں لکھی تھیں۔ ترکوں اور افغانوں کے علاوہ ایرانی بھی بڑی تعداد میں پہلے پنجاب آئے اور بعد میں دہلی سلطنت جانے لگے۔ یہ لوگ یا تو حملہ آوروں کے ساتھ آئے یا پھر تلاش معاش میں آئے۔ ان میں سے بعض لوگ اچھے عالم تھے۔ جس طرح سلطنت کے سرکاری کاغذات کی زبان فارسی تھی۔ اسی طرح ان کی کتابوں کی زبان بھی فارسی تھی جو تاریخ، سوانحِ حیات، سیاحت اور مذہب وغیرہ پر تھیں۔ لہٰذا ملک میں فارسی کی حیثیت حکومت کی سرکاری زبان کی طرح مستحکم ہو گئی۔

گو یہ صحیح ہے کہ فارسی مآخذ ہیں اور مضامین سے مالا مال ہیں، لیکن ادب کی ایک قسم اور بھی ہے، جس کی جانب بدقسمتی سے مورخین کی توجہ نہیں جا سکی ہے یہ ادب ملک کی دیسی زبانوں میں ہے اور عوام الناس نیز حکمراں طبقے دونوں کی سماجی، مذہبی، اقتصادی اور سیاسی زندگی پر روشنی ڈالتا ہے۔ دَورِ وَسطیٰ کے دوران جن مذہبی تحریکوں نے جنم لیا یہ ادب ان

تحریکوں کے بانیوں کی کہاوتوں میں محفوظ ہے۔ پنجاب میں سب سے اہم تحریک سکھوں کی تھی، جس نے نہ صرف عوام کی زندگی کے مختلف گوشوں پر اثر ڈالا، بلکہ انھیں ایک مخصوص قسم کی برادری میں بدل دیا اور ایک سیاسی قوت بنا دیا، جس قوت نے اٹھارویں صدی میں مغل حکومت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور افغانوں کو اپنے ملک سے مار بھگایا۔

لودی سلطانوں کے دورِ حکومت میں گورو نانک (1469ء تا 1539ء) نے سکھ تحریک کی بنیاد ڈالی۔ شہنشاہ اورنگ زیب کے دورِ حکومت کی آخری دہائی میں 1699ء میں جب گورو گوبند سنگھ نے خالصہ کی تخلیق کی تو یہ تحریک اپنے بام عروج پر پہنچ چکی تھی۔ پہلے پانچ گوروؤں اور نویں گورو کی کہاوتیں گورو گرنتھ صاحب میں شامل ہیں اور دسویں گورو کی دسم گرنتھ میں ہیں۔ گوروؤں کی مذہبی تعلیمات کا مطالعہ سکھوں کی بعد کی تاریخ اور ان گوروؤں کی زندگی میں رونما ہونے والے مختلف واقعات کے ادراک اور اظہار کے لیے تو ضروری ہے ہی، لیکن دو گرنتھوں میں بڑی تعداد میں ایسے اشلوک موجود ہیں جو اس زمانے کے سماجی، مذہبی اور سیاسی حالات کی صحیح قلمی تصویریں ہونے کی بنا پر بڑی تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔

گورو نانک کو لودی سلطانوں اور دو مغل بادشاہوں کے زمانے میں عوام کی حالت کا اور ان کی جانب طبقہ امرا کے رویّے کا براہ راست علم تھا۔ بابر کی تیسری مہم (21-1520ء) کے دوران سیدپور (امین آباد) میں لوگوں کے قتل عام کے وہ عینی شاہد تھے، اور اس بارے میں ان سارے بیانوں سے زیادہ تاریخی اہمیت رکھتا ہے جو ہمیں معلوم ہیں۔ نسلوں پرانی رواج پرستی کے خلاف ان کی بغاوت نیز محض طبقہ امرا کو خوش کرنے کے لیے اپنی زبان اور لباس وغیرہ کو ترک دینے والی غلامانہ ذہنیت کے خلاف ان کا احتجاج، یہ دونوں چیزیں اسادی واریں نظر آتی ہیں۔ اس کے علاوہ گرنتھ میں بڑی تعداد میں ایسے شبد ہیں جن میں ان کی اور ان کے جانشینوں کی اصلاحوں، سکھ برادری اور فکرِ سکھ کا ارتقا اور اُن کی

تدریج اسووسما اور ان دنوں کے متعدد واقعات کے حوالے ملتے ہیں۔

واروں کے مصنف بھائی گورو داس (1551ء تا 1629ء) گورو انگد سے لے کر گورو ہرگوبند تک پانچ گوروؤں کے ہمعصر تھے، اور ان میں سے آخری چار سے ان کے نہایت نزدیکی تعلقات تھے۔ انھوں نے کوئی پچاسی پوڑیاں گورو نانک کی آمد سے قبل عوام کی مذہبی اور سیاسی حالات پر، ہندوؤں اور مسلمانوں کے مقامات مقدسہ کے واسطے گورو کے سفر پر، مذہبی پیشواؤں سدھوں اور ملاؤں سے ان کے مباحثوں پر اور دوسرے گوروؤں کی زندگی پر صرف کی ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے گوروؤں کے زمانے کے نامور سکھوں کے نام دیے ہیں اور چھٹے گورو ہرگوبند کے زمانے تک پنجاب اور پنجاب سے باہر ہونے والے سکھ اجتماعوں کے قائدین کے نام دیے ہیں۔

پانچویں گورو ارجن کے بڑے بھائی پرتھی چند اور ان کے بیٹے مہربان کے زمانے میں جب نزاعی رجحانات بڑھنے لگے تو پروپیگنڈے کے لیے سوانحی اور دوسری قسموں کا ادب تیار کرنے کا خاصہ جوش پیدا ہو گیا۔ مارچ 1932ء میں لاہور کے ناوا اُدھم سنگھ نے کہانیوں (ساکھیاں) کے مسودوں کا ایک مجموعہ اور مہربان اور ہرجی کے مضامین جنھیں ان کے مقلدوں نے سترھویں صدی میں تحریر کیا تھا، خالصہ کالج امرتسر کو پیش کیا تھا۔ بعد میں مجھے مہربان اور ان کے جانشینوں کے حالات زندگی ملے جو کسی شخص درباری نے تحریر کیے تھے حال میں پٹیالہ کے پروفیسر پریتم سنگھ مہربان سے تعلق رکھنے والے ادب کے کچھ اور مسودات دستیاب ہوئے ہیں جو پرتھی چند کے جانشینوں کی ادبی اور دوسری سرگرمیوں پر خاصی روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کے مضامین جن میں سکھ گوروؤں کی طرح قلمی نام "نانک" جوڑا گیا ہے، اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ خود کو گورو ارجن اور گورو ہرگوبند کے مدمقابل بنانے کے لیے کوشاں تھے اور اپنے مضامین کو گورو نانک اور ان کے مستند جانشینوں کا درجہ دلوانا چاہتے تھے۔ یہ ان اسباب میں سے ایک نمایاں سبب تھا جن کے باعث گورو ارجن کو گوروؤں کے اصل مضامین ایک

جگہ جمع کرنے اور 1604ء میں انھیں ایک مستند کتاب کی شکل میں ترتیب دینے کی ترغیب ہوئی جسے اب گورو گرنتھ صاحب کہا جاتا ہے۔ اصل کتاب جسے ہم مقدس کتاب کا پہلا مسوّدہ کہہ سکتے ہیں کرتارپور (جالندھر) میں سودھی "گورو" کے پاس اب بھی محفوظ ہے۔

مہربان کی لکھی ہوئی گورو نانک کی جنم سکھی، جس کی ترتیب و تدوین کرپال سنگھ نے کی ہے، خالصہ کالج امرتسر نے 1965ء میں کی تھی۔ سودھی مہربان اور ان کے جانشینوں کی تحریروں کے مسوّدے سکھ حوالی کتب خانہ، ایس۔جی۔پی۔سی۔ امرتسر کے ذخیروں میں محفوظ ہیں۔

بھائی گورداس کے بعد ضلع بھٹنڈہ کے مقام بسانے کے نزدیک پھاپھرے بھائی کے مقام کے رہنے والے بھائی بالو آتے ہیں۔ وہ گورو ارجن کے ہمعصر تھے اور ان کی وفات 1660ء بی کے مطابق 1604ء اے، ڈی بمقام جھتیرا ہوئی تھی۔ ان کے سلوکوں، واکوں اور سہارفیوں میں جگہ جگہ گورو سے گفتگو کے حوالے ملتے ہیں اور صحیح معنوں میں گورو کی تعلیمات ملتی ہیں۔ انھوں نے اسی کتاب سوچک پرسنگ گورو کا میں مختصراً گورو نانک کی زندگی کے وہ حالات دیے ہیں جو پہلے گورو کے ایک ساتھی بھائی بالا نے گورو انگد کو سنائے تھے۔ اس سے بھائی بالا، جو تلونڈی، رائے بھوئی (جو اب مغربی پاکستان میں ننکانہ صاحب کے نام سے مشہور ہے) میں گورو اور سلطان پور لودھی کا ساتھی تھا، کے بارے میں شکوک و شبہات دور کرنے میں مدد ملتی ہے۔

موضع سور سنگھ کے ایک دھاوی یا بھاٹ، ناتھا کی کتاب وارن میں گورو ہرگوبند کی لڑائیوں کا مفصل ذکر ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ناتھا گورو ہرگوبند کا عصر تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ یہی شخص وہ ناتھ مل ہے، جس نے ستمبر 1708ء میں دکن کے مقام ناندیر میں گورو گوبند سنگھ کے دربار میں فارسی کا امرنامہ لکھا اور پڑھا، جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ گورو ستمر کو سورج گرہن کے موقع پر مادھو داس (جن کا دوسرا نام بندہ سنگھ ہے) کے منڈھ پڑ گئے" اور یہ بھی کہ شہر کے لوگوں نے شہنشاہ سے یہ شکایت کی کہ مادھو داس بدل کر بندا سنگھ ہو گئے ہیں۔

کرم سنگھ نے امرتسر کے رسالہ پھلواری میں شائع ہونے والے اپنے مضامین سے کسی ایک مضمون میں اس وارن (جو چھٹے گورو کی بات ہے) کا ذکر کیا ہے، لیکن اس وقت اس کا پتہ نشان معلوم نہیں ہے۔ لیکن طبع شدہ امرنامہ موجود ہے، جسے سکھ ہسٹری سوسائٹی امرتسر، پٹیالہ نے 1953ء میں چھاپا ہے۔

ہنومنت سوامی کی سری سمرتھنچا بکھار (مراٹھی زبان میں سری سمرتھ رام داس کی زندگی کی کہانی) میں چھٹے سکھ گورو ہرگوبند اور عظیم مراٹھا سنت کی اس ملاقات کا ذکر ہے جو تقریباً 1634ء میں گڑھوال کے مقام سری نگر میں ہوئی۔ گربکھی کا ایک مسودہ پنجاہ ساکھیاں ہے۔ اس میں بھی اس ملاقات کا حال دیا ہوا ہے۔ اس کی اُنتالیسویں ساکھی اور بکھار کو اگر ملا کر پڑھا جائے تو اس گفتگو کا جو تاثر سمرتھ رام داس کے ذہن پر ہوا اس کی واضح تصویر سامنے آجاتی ہے۔ سمرتھ رام داس نے جب یہ دیکھا کہ گورو ایک جنگجو سپاہی کا لباس پہنے، ایک طرف تلوار لٹکائے، اپنے پیچھے ہتھیار بند مُریدوں کا جتھا لیے شکار سے واپس لوٹ رہے ہیں، تو انھوں نے تعجب سے پوچھا: "میں نے سنا تھا کہ تم گورو نانک کی گدّی سنبھالے ہوئے ہو۔ گورو نانک تو ایک تیاگی سادھو تھے، ایک سنت جنھوں نے دُنیا تیاگ دی تھی۔ تم ہتھیار لگاتے ہو اور فوج اور گھوڑے رکھتے ہو۔ تم خود کو سچا بادشاہ (اصل بادشاہ) کہلواتے ہو تم کس طرح کے سادھو ہو؟ گورو ہرگوبند کا جواب بڑا معنی خیز تھا، اور اس سے واقعتاً سکھوں کے فلسفہ فکر و عمل میں جس رُوحانیت اور فطری اخلاقیات کا امتزاج ہے اس کی ترجمانی ہوتی تھی۔ گورو نے کہا وہ "باطنی طور پر سادھو اور ظاہری طور پر شہزادے ہیں۔ ہتھیاروں سے مُراد غریب کی حفاظت اور ظالم کی تباہی ہے۔ بابا نانک نے دُنیا نہیں تیاگی تھی یعنی خودی اور انا تیاگی تھی۔"

"گورو ہرگوبند کہیا: باطن فقیری، ظاہر امیری، سستار غریب کی رکھیا، جروانے کی بھچھیہ، بابا نانک سنسار نہیں تیاگیا، مایا تیاگی تھی۔"

گورو تیغ بہادر، گورو گوبند سنگھ وغیرہ کے وہ خطوط جنھیں حکم نامے کہا جاتا ہے اور جو پٹنہ کے ہر بیندر صاحب مندر میں اور دوسرے مقامات پر محفوظ کر لیے گئے ہیں، اور وہ خطوط جو شبنام کے تحصیل دار گوردت سنگھ، پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ کے بھائی رندھیر سنگھ اور دوسرے حضرات نے جمع کیے ہیں، اس لائق ہیں کہ ان کا غور سے مطالعہ کیا جائے۔ گورو گوبند سنگھ کا بہادر شاہ اورنگ زیب کے نام وہ خط جسے ظفر نامہ کہا جاتا ہے خصوصاً اس آخری معرکے کے نقطۂ نظر سے جو شاہی افواج سے ہوا، خاص تاریخی اہمیت کا دستاویز ہے۔ ان کا پچھتر بانک جو جو تو تنت سوانح عمری کے انداز میں لکھا گیا ہے، ان کے زمانے کے بہت سے واقعات بتاتا ہے۔ خصوصاً ان تھارموں کے بارے میں بتاتا ہے جو سوالک کے راجاؤں سے ہوئے یا ان مغل عہدیداروں سے ہوئے جو اُن کی تحریک کو دبانے کے لیے آئے تھے۔

بھگت سنگھ کی گربلاس چھیویں پادشاہی اور گربلاس پادشاہی داس (سکھا سنگھ کی) بالترتیب چھٹے اور دسویں گورو کی مشہور سوانحیں ہیں اور چھپی ہوئی شکل میں مل سکتی ہیں۔ شاعر سوہن کی گربلاس چھیویں پادشاہی مسودے کی شکل میں ہے اور محققوں کی توجہ کی طالب ہے۔ اسی طرح مہاپرکاش بھی اتنی ہی مشہور ہے اور نثر اور نظم دونوں میں موجود ہے۔ منظوم مہاپرکاش کو چھپوانے کی خاطر سعیۂ لسانیات پٹیالہ کے ایک محقق اس کی ترتیب و تدوین کر رہے ہیں۔ گورو گوبند سنگھ (اور دوسرے گوروؤں کی) کچھ اور مشہور سوانحوں میں کویر سنگھ کلال کی گربلاس پادشاہی داس، سنگھ ساگر اور ویر سنگھ بال کی گرکرت پرکاس کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ برچھیاں سیوا داس (پٹیالہ 1963ء)۔ برچھی گورو گوبند سنگھ جی سکھیاں گورو۔ گورو صاحباں، بہاء ساکھیاں، سوکھی، سکھی پوتھی سری گورو تیغ بہادر تے۔ سری گورو گوبند دے۔ مالوہ دیس رتن دی (جنت سکھی ٹبک 1873ء اور ٹریولس آف گورو تیغ بہادر اینڈ گوبند سنگھ، 1876ء کے ناموں سے سردار

عطار سنگھ نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے)۔ وہ کتابیں ہیں جن میں گوروؤں کی زندگی کی کہانیاں دی ہوئی ہیں اور جو تنقیدی اور بغور مطالعے کی طالب ہیں۔

درشن کی کتاب وار امرتسر کی میں اس ضمن میں بڑا واضح بیان دیا ہوا ہے کہ دکن کے مقام ناندیر میں گورو گوبند سنگھ کی وفات کے چھ مہینے کے اندر اور باندا سنگھ بہادر کی بسمبر پہاڑ سے ایک سال پہلے مارچ 1709ء امرتسر میں سکھوں اور صوبہ لاہور کی مغل سرکار کے درمیان کھول تصادم شروع ہو گیا۔ مصنف لکھتا ہے کہ شہنشاہ بہادر شاہ کے دورِ حکومت میں سمت 1766ء بی کے، مطابق 1709ء اے ڈی مارچ 29 ، بیساکھی کے دن کچھ سکھوں اور امرتسر کے ایک کھتری سوداگر چھوہر مل کے بیٹے (رامو مل) اور اس کے نوکروں کے درمیان شہتوت کی ایک چھوٹی سی ٹوکری پر جھگڑا ہو گیا۔ مزاج میں گھمنڈ ہونے کے باعث چھوہر مل نے شہر کے سکھوں سے بُرا سلوک کیا اور ان کے خلاف اپنے عزیزوں کا ایک وفد لے کر لاہور کے صوبیدار نواب اسلم خاں سے ملا۔ تاہم بلاس کے مصنف سیولسنگھ کے مطابق چھوہر مل ایک نمایاں منا سبھا اور ہاجی پسر سودھی مہربان بسر پرتھی چند کے خلاف سودھی ہرکرشن داس کا کارکن تھا، اور سکھوں کی دشمنی کے واسطے بہت مشہور تھا۔ سرکاری پروانوں سے لیس ہو کر چھوہر مل مقامی سکھوں کی جانب ایک جارحانہ رویے کے ساتھ امرتسر واپس پہنچا۔ اس کی یہ بڑھتی ہوئی جارحیت سکھوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ ایک چھوٹی سی لڑائی میں چھوہر مل کے آدمی مارے گئے، اور اس کا مکان اور جائداد لُٹ گئے۔ تب چھوہر مل نے پٹی بیسٹ پور کے امیں، ہرسہائے سے مدد مانگی، جو اس خیال سے سکھوں پر دوڑ پڑا کہ انھیں ان کے مقدس شہر سے نکال باہر کرے۔ یہ سُن کر نواحات کے سکھ بھی اپنے برادران مذہب کی حفاظت کے لیے دوڑ پڑے۔ اس لڑائی میں ہرسہائے اور اس کے بعض ممتاز اشخاص جن میں کچھ سید اور برہمن بھی شامل تھے، مارے گئے (بیساکھ 9 ، مطابق 6 اپریل 1766ء) اور سکھوں کو فتح حاصل ہوئی۔ یہ دیکھ کر لاہور کے صوبے دار اسلم خاں نے سکھوں کے خلاف قدم اُٹھایا اور اس علاقے

کے ایک اہم سردار دیواجات (لوتیراپتوں کا چودھری) کو لاہور سے آدمی اور اصلاحِ جنگ دے کر سِکھوں کے خلاف فوج کشی کرنے پر مامور کیا۔ دیوا مکمل سرکاری حمایت کے باوجود لڑائی ہار گیا، اور میدانِ جنگ سِکھوں کے ہاتھ چھوڑ کر اپنی جان بچا کر بھاگ گیا۔ یہ پہلی فتح تھی جو سِکھوں نے کسی سوچے سمجھے منصوبے اور منظم قیادت کے بغیر ایک قوم کی حیثیت سے لاہور کی مغل حکومت کی سرکاری سختیوں کے خلاف حاصل کی۔ اس شکست سے صوبیدار اسلم خاں بڑا ناامید ہوا اور اس واقعہ کی اطلاع شہنشاہ بہادر شاہ کو دکن بھجوائی۔ شہنشاہ ان دنوں اس بار سِکھوں کا احسان مند تھا کہ گورو گوبند سنگھ نے جنگ وراثت کے معرکہ جاجو (8 جون 1707ء) میں اس کے چھوٹے بھائی شہزادہ اعظم کے خلاف اس کو مدد دی تھی۔ وار امرتسر کی کا مصنف ہمیں بتاتا ہے کہ شہنشاہ نے اسے نانک کے مقلدین کے خلاف تلوار اٹھانے کی حماقت پر فہمائش کی جو عالم رسیدہ لوگوں کی ایک جماعت تھی۔

اس جھگڑے کی کہانی اور بعد کے تصادموں کی تصدیق بھٹ سیوا سنگھ کی کتاب بھائی منی سنگھ کی شاہد بلاس (ترتیب و تدوین گرچا سنگھ، سجابی اکاڈمی لدھیانہ 1961ء) سے خوب اچھی طرح ہوتی ہے۔ یہ کتاب اس کے بھٹ آباؤاجداد کے پشتینہ ورانہ اندراجات پر مبنی ہے۔ اسے پہلی سکھ برطانوی جنگ کے دوران بڈول کے ہیرو راجہ (سردار) اجیت سنگھ کی سرپرستی میں بمقام لڈوا لکھا گیا تھا، اور مصنف کے آبائی وطن بھیدسر میں مکمل کیا گیا تھا۔

لاہور کی حکومت کے خلاف اور پنجاب میں سدا سنگھ کی آمد سے بیشتر سرہند کے وزیر خاں کی فوجوں کے خلاف امرتسر اور اس کے نواحات کے سِکھوں کی فتوحات کا حوالہ شہنشاہ بہادر شاہ کے شاہی دربار کے اخبار یعنی اخبارِ دربارِ مُعلّا بتاریخ 29 ربیع الاوّل 1122ھ میں ملتا ہے یہ اخبارات دربار شاہی کی کارروائیوں کی تاریخی معلومات حاصل کرنے کا ایک بے بہا ذریعہ ہیں، اور بیکانیر میں راجستھان کے ریاستی محافظ خانے میں محفوظ ہیں۔

حال میں گوسائیں گربانی ۔ گوسائیں مت کا گورو گرنتھ (National Publishing House, Delhi – 1964) شایع ہوئی ہے۔ جو ضلع گجرانوالہ (پنجاب جو اب مغربی پاکستان میں ہے) میں بدو کی گوسائیں کے سین داس کی فکر اور ان کی تعلیمات پر روشنی ڈالتی ہے۔ وہ گورو نانک کے ہمعصر تھے۔ ان کے بعد ان کے متعدد جانشیں ہوئے جنھوں نے سین داس کے مت کو کم و بیش ہندو فرقے کے انداز پر جاری رکھا۔ حالانکہ کتاب کا بڑا حصہ (صفحات 56، 86، 631، 704 تا 724، 751 تا 85) کسں رائے کی کتاب وار سری بھگوت داس اوتار اور ہرس چند کتھا، سین داس اور ان کے مقلدین کی زندگی اور تعلیمات، پر مشتمل ہے، پھر بھی اس نے دورِ وسطیٰ کے پنجاب کی مذہبی اور سماجی تاریخ پر ایک مفید مطلب بار کا اضافہ کیا ہے۔

لیکن ان میں سے کوئی بھی سوانح کسی ہمعصر مصنف کی لکھی ہوئی نہیں ہے۔ صرف سینا پتی کی سری گر سوبھا ہی وہ اکیلی کتاب ہے جو ہم عصر ہونے کا دعوا کر سکتی ہے۔ حالانکہ لگتا ہے کہ یہ گورو گوبند سنگھ کی وفات کے تینتیس برس بعد 1798 ء بی کے مطابق 1741ء اے ڈی میں مکمل ہوئی، پھر بھی اس میں درج کیے جانے والے بعض واقعات کے بارے میں سینا پتی اس یقین کے ساتھ لکھتا ہے جیسے وہ چشم دید ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ اس کتاب میں بعض بڑی فاش غلطیاں ہیں، جیسے گورو کی ان سرگرمیوں کے بارے میں جو راجپوتانہ میں رہیں، اور خصوصاً ان کی شادی کے بارے میں جو لفظاً ہر یہ واقعہ تھا کہ ان کی بیوی برہان پور آ کر ملیں اور زور آور سنگھ کا حوالہ دیا گیا ہے وہ اصل زور آور سنگھ یعنی گورو گوبند سنگھ کا بیٹا نہ تھا۔ وہ چمکور کی لڑائی (دسمبر 1704ء) میں مارا جا چکا تھا۔ وہ خود گورو کی نظروں کے سامنے لڑتا رہا، جس نے خود اپنی آنکھوں سے اسے میدانِ جنگ میں گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ جو زور آور سنگھ راجپوتانہ میں گورو کی چھاؤنی میں پہنچا وہ وہ لڑکا تھا جو گورو کے اصل بیٹوں کے چمکور میں مارے جانے اور سرہند میں پھانسی دیے جانے کے بعد ان کی بیوی

مانا شدری نے گورو نے لیا تھا۔ یہ غلطیاں اور ترتیب واقعات نے بعض جگہ جو انحرافات پائے
جاتے وہ ان واقعات کا صحیح علم نہ ہونے کے باعث ہیں جن واقعات کے بارے میں اس نے سنائی
باتیں تحریر کر دی ہیں۔ لیکن چند ایک مستثنیات کے علاوہ یہ کتاب گورو گوبند سنگھ کی حیات اور
ان کے زمانے پر مفید مطلب معلومات کی ایک کان ہے۔

دھول کی سنگت (سکھوں کا مذہبی اجتماع) کو مخاطب کر کے جو خط گورو گوبند سنگھ
نے تاریخ پہلی کاتک، 1764ء بی کے مطابق 2 / اکتوبر 1707ء اے ڈی کو لکھا تھا وہ شہنشاہ
بہادر شاہ اور گورو کی ملاقات (4 جمادی الاول، 1119ھ مطابق 23 / جولائی 1707ء)
اور شہنشاہ کے مصالحانہ اور باعزت رویے کا ایک براہ راست دستاویزی ثبوت ہے۔ شہنشاہ
نے گورو کو اجازت دی تھی کہ وہ اس کے سامنے ہتھیاروں سے پوری طرح لیس ہو کر آسکتے ہیں۔
اس نے انھیں چھ ہزار روپے مالیت کی اعزازی خلعت عطا کی تھی جس میں جواہرات سے
مرصع ایک پڑکا (ڈھلدڑکی) بھی شامل تھا۔ گورو کے لیے یہ ایک بے مثال اعزاز تھا جس سے
بظاہر اس کی اعلا مذہبی حیثیت کا اعتراف مقصود تھا۔۔ واضح نہیں ہے کہ گورو کے ان الفاظ
کا کیا مفہوم ہے کہ اور بھی کام گورو کا مسدکا سہ ہوتے ہیں (مقدس آقا کی عنایت سے اور بھی
سارے کام پورے ہو جاتے یا طے ہو جاتے ہیں)۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ شہنشاہ سے اس کی جو گفت و
شنید ہوئی وہ اس سے مطمئن تھے، اور جب پنجاب لوٹتے وقت وہ کہلور پہنچے (جو بظاہر کہلور
کے علاقے میں مقام آنند پور رہے) تو انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ خالصہ کے لوگ ہتھیار بند
آئیں جس سے بظاہر یہ مقصد تھا کہ اگر سرہند کے صوبیدار نواب وزیر خاں باشوالک کی طرف
سے کوئی مخالفت ہو تو اس کا مقابلہ کیا جائے۔

گورو گوبند سنگھ کے آخری ایام کے بارے میں دھن سنگھ کا مستوداتی بیان جسے انیسویں
صدی کے وسط کے آس پاس نقل کیا گیا تھا۔ نابدیر میں لگنے والے گورو کے زخم پر پٹیاں باندھنے
اور عمل جراحی کے بارے میں بڑی خوش آئند روشنی ڈالتا ہے۔ یہ جان لیوا زخم سرہند کے

نواب وزیر خان نے بھیجے ہوئے دو پٹھانوں نے لگایا تھا اس کے مطابق یہ خرچ جو زخم سینے کے لیے شہنشاہ بہادر شاہ نے بھجوایا تھا۔ ایک انگریزی شخص تھا جس کا نام کول ابڈ کال تھا۔ اور سے اس کی خدمات کے سلسلے میں گوروے روزانہ دس موہریں دیں تھیں۔ شہنشاہ نے پیش کش کی تھی کہ گوروے قاتلوں کے ساتھیوں ماسٹر کا نے حرم کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ لیکن گوروے اس بات سے اتفاق نہ کیا اور یہ کہا کہ یہ تو کسی اور شخص کے آلہ کار تھے۔ اور اس ڈرامے میں ان کا حصہ خود مختار اداکاروں کا سا منا تھا

کلیات بھائی نند لال گویا شہزادہ معظم (شہنشاہ بہادر شاہ) کے دیوان بھائی نند لال کی فارسی اور پنجابی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ وہ دسویں گورو کا بڑا عقیدت مند چیلا تھا۔ اور اس کا دیوان (غزلیات) زندگی نامہ اور جوت لباس (جو فارسی اور پنجابی زبانوں میں ہے) سکھ فلسفے کی کتابیں ہیں، گنج نامہ اور توصیف و ثنا گوروؤں کی شان میں قصیدے ہیں، جن میں گورو گوبند سنگھ کا خصوصی ذکر ہے، اور جو مصنف کے مطابق زمین پر خدا کا عکس تھے۔ چونکہ یہ قصیدہ ایک ہمعصر کا لکھا ہوا ہے جس نے انھیں خاصے عرصے تک بڑے قریب سے دیکھا تھا، اس لیے اس بنا پر اس کی بڑی تاریخی اہمیت ہے کہ یہ قصیدہ روحانی اور غیر مذہبی قائد کی حیثیت سے گورو گوبند سنگھ کے اس اعلا کردار کو بیان کرتا ہے جس کی بنا پر شہنشاہ بہادر شاہ ان کی تعریف و تعظیم کرنے لگا تھا۔ نند لال کا راحت نامہ اور تنخواہ نامہ ان باتوں کے تلخیصی مجموعے ہیں جو سکھوں کو کرنی چاہئیں یا نہ کرنی چاہئیں، اور اس کی عرض الالفاظ ان عربی اور فارسی الفاظ کا مجموعہ ہے جو گوروؤں کی قصیدہ خوانی اور تعریف ربانی کے واسطے استعمال کیے گئے ہیں۔ دستور الانشا کلیات میں شامل ہے، اس میں اشخاص اور مقامات کے بارے میں جو حوالے ملتے ہیں وہ کئی بار اتنے مبہم ہیں کہ تاریخی تحقیق میں مددگار ثابت نہیں ہو سکتے۔

بندا سنگھ کا خط تاریخ پوہ 12 ، سمت[1] (1767ء بی کے) مطابق 12 دسمبر 1710ء

ان بہت سی غلط فہمیوں کو صاف کر دیتا ہے جو بعض لاعلم لوگوں کی تحریروں کے باعث پیدا ہو گئی ہیں۔ اس کی مہر کے یہ الفاظ کہ دیگ و تیغ و فتح و نصرت بیرنگ یافت زر نانک گورو گوبند سنگھ (دیگر حاجت مندوں کی حاجت روائی اور شکم سیری کے لیے، تلوار غریبوں اور لاچاروں کی حفاظت کے لیے اور فوری فتح خالصہ کی فوجوں کے لیے گورو نانک سے حاصل ہوئی ہے گوبند سنگھ) گوروؤں اور خصوصاً گورو گوبند سنگھ کے لیے، جنھوں نے اسے خالصہ کی صفوں میں داخل کر لیا تھا، اس کی گہری عقیدت اور احسان مندی ظاہر کرتے ہیں۔ وہ جونپور کے مذہبی اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ آپ معبودِ ازلی کہ خالصہ ہیں اور آپ کو اس رہتِ (اصولِ برتاؤ) کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیے جو خالصہ کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ خود اپنی طرف سے وہ یہ کہتا ہے:

"میں تاکیداً کہتا ہوں کہ جو خالصہ کی رہت کے مطابق زندگی بسر کرے، گا گورو اسے بچائے گا"

غیر مسلم معصروں کی جو مستند کتابیں بندا سنگھ کی زندگی اور کارنامے تشکیل دینے میں مدد کرتی ہیں ان میں کام راج کی کتاب عبرت نامہ' 1718ء سیوا داس (شیو داس) کی کتاب شاہ نامہ یا فرخ سیر نامہ' 1721ء اور کوشل چند کی کتاب تواریخ محمد شاہ نادر الزمانی ہیں۔ آخر الذکر کتاب 1154ھ مطابق 1741ء میں لکھی گئی تھی۔ یہ بات کہ اس زمانے میں سکھوں نے کس غیر معمولی صبر کے ساتھ مسکراتے ہوئے اپنی زندگیاں اپنے عقیدے کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھاویں، ایسٹ انڈیا کمپنی کے سفیر (جون سرمن اور ایڈورڈ اسٹیفنسن) کے مراسلے، بتاریخ ۱۰/مارچ 1761ء سے اخذ کی جا سکتی ہے، جو مراسلہ دہلی سے فورٹ ولیم اور بنگال کاؤنسل کے صدر اور گورنر عزت مآب روبرٹ، ہیجیز کے نام بھیجا گیا تھا۔

یہ خط سرور منگل، 5/جون 1716ء کو فورٹ سینٹ جارج میں صلاح و مشورے

کے ایک موقع پر پڑھا گیا تھا۔ یہ خط مدراس ڈائری میں اور انڈیا آفس میں رکھی 1715ء سے 1719ء تک کی کتاب صلاح و مشورہ، نمبر ۸۶ ، ریخ 239 بی اور جی۔ ٹی وھیلر کی ارلی ریکارڈس آف برٹس انڈیا، صفحہ 180 میں، اور سی۔ آر۔ ولس کی وی ارلی اینلس آف دی انگلش ان بنگال، 96 تا 98 (ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ 1963ء، ایڈیشن، جلد دوئم، حصہ دوئم، 120 تا 121) میں دیکھا جاسکتا ہے۔

کیسر سنگھ چھبر اپنی کتاب بنساولی نامہ دساں پاتشاہیاں کا میں دعوا کرتا ہے کہ گروؤں خصوصاً دسویں گورو کے بارے میں اس کے بیانات ایک بہی پر مبنی ہیں، جو گورو کے زمانے کے اندراجات کی کتاب تھی اور اس کے آباؤ اجداد کے قبضے میں تھی۔ یہ کتاب ان واقعات کی مفید مطلب معلومات سے پُر ہے جو اس نے ذاتی مشاہدے یا براہِ راست علم کی بنا پر تحریر کیے ہیں۔

اٹھارویں صدی کی تاریخ سے متعلق پنجابی کی سب سے اہم کتاب بھنگو رتن سنگھ صاحب کی پراچین پنتھ پرکاس (امرتسر 1914ء، 1962ء) ہے۔ اس کا مصنف مرات کوٹ کے سردار مہتاب سنگھ کا پوتا اور کرور سنگھیا مسال کے سردار شیام سنگھ کا نواسہ تھا۔ یہ دونوں سردار دل خالصہ کے قائدین تھے۔ مصنف نے اپنے آباؤ اجداد اور ان سے تعلق رکھنے والے دوسرے لوگوں سے اس صدی کے پہلے نصف میں سکھوں کی قربانیوں اور تکلیفوں کے بارے میں، دلوں، جتھوں اور مسالوں کی تشکیل کے بارے میں، اور ان مقابلوں، کارناموں اور فتوحات کے بارے میں، براہِ راست معلومات حاصل کرلی تھی جن کے نتیجے میں بالآخر پنجاب خودمختار ہوگیا، اور سکھوں کی جمہوری حکومتیں قائم ہوگئیں۔ یہاں پہنچ کر کتاب ختم ہوجاتی ہے رتن سنگھ نے اُنیسویں صدی کے پہلے نصف (1898ء بی کے مطابق 1841ء اے ڈی میں مکمل ہوئی) پراچین پنتھ پرکاش لکھی۔ اس وقت سکھ مسالوں کے کئی قائدین اور ان کے نزدیکی "نشین زندہ تھے اور درّانیوں۔ احمد شاہ و تیمور شاہ۔ رہیلوں اور مرہٹوں سے

مقابلوں کی یاد بھی تازہ تھی۔ اگر اس کتاب میں ..... مسلمانوں اور ..... یوں کے خلاف ..... وہ تعصب موجود نہ ہوتا جو اسے ابتدائی مخالف گروہ کے قائدین سے ورثے میں ملا تھا اور جو محض ایک معمولی غلطیاں ہیں وہ نہ ہوتیں تو کہا جا سکتا تھا کہ یہ ابتدا میں انیسویں صدی سے پنجاب کی تاریخ کی بہت لائق اعتبار ماخذ ہے۔ ..... نے اپنی کتاب ..... لکھی ہے کیونکہ یہی اس زمانے کا رواج تھا لیکن چونکہ اس کا تخیل تخلیقی تھا اس لیے اچھی بات نہ ہوئی کہ واقعات کا بیان بڑی حد تک مبالغہ کی رنگ آمیزی سے پاک اور معروضی ہی رہا۔

جیمس براؤن کی دی سٹیٹ آف دی اوریجن اینڈ پروگریس آف سکھس فارسی رسالہ نانک شاہ (رسالہ در احوال نانک شاہ درویش جو عبدالسلام سکس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مطابق تاریخ افغانان 22/156 ہے) پر مبنی تھی جسے اس کے واسطے لاہور کے بدھ سنگھ اروڑا ملہ (کوڑلہ) کے لالہ بحائت سنگھ سورج کے ساتھ مل کر ایک دیوناگری مسودے سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ جیمس براؤن نے فارسی مسودے کا انگریزی آزاد ترجمہ کر دیا۔ یہ جیمس براؤن شاہ عالم کے دربار میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا کارندہ تھا جو وہاں اپنے اعلا افسر گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کو اطلاعات بھیجنے پر مامور کیا گیا تھا۔ یہ مسودہ انتہائی ناقص تھا اور سکھوں کے طور و طریق اور رسم و رواج کی بات بالکل خاموش تھا، حالانکہ اس زمانے میں انہی باتوں کا مطالعہ ..... کے لیے وہ بے تاب تھا۔ ان دنوں سکھ پنجاب میں، مغل سلطنت کی سرحدوں پر اور اودھ کے نواب وزیر کے علاقوں میں ایک بڑی زور آور سیاسی قوت کی طرح ابھر رہے تھے اور راجپوتوں اور مرہٹہ سرداروں سے معاہدے کر رہے تھے اس لیے جیمس براؤن نے صرف یہ کہا کہ تمہید میں وہ سب کچھ لکھ دیا جو اس موضوع اور دوسرے موضوعات پر اسے معلوم ہوا تھا، بلکہ اس میں اپریل 1785ء یعنی ترجمے کی تاریخ تک کا بیان شامل کر دیا۔ اس میں اس نے جس آخری بات کا ذکر کیا ہے وہ 31 مارچ 1785ء

کا معاہدہ ہے جو مرہٹوں کے نمائندے اساجی انگلے اور سکھ سرداروں کے یعنی خالصہ جی کے نمائندے سردار گھیل سنگھ کے مابین ہوا۔ اپنی ساری چھپی ہوئی خرابیوں کے باوجود یہ کتاب پہلا باقاعدہ رسالہ ہے جو کسی شخص نے سکھوں کے بارے میں تالیف کیا۔

سکھوں کی بات یورپین لوگوں کے لکھے ہوئے ابتدائی مسلسل سالوں میں ایک اور سال ایک سوئس انجینئر کرنل اینٹوئن لوئی ہنری پولیر کی کتاب سقس (Siques) میں ہے۔ فورٹ ولیم کی تعمیر میں اس انجینئر کا کام سارے ماہرین فن بیحد سراہتے ہیں۔ کچھ عرصے کے لیے اسے اودھ کے شجاع الدولہ کی ملازمت کے واسطے بھیجا گیا تھا۔ اودھ کا دارالسلطنت تھا، جو اٹھارہویں صدی میں تہذیبی اور تعلیمی اداروں کا ایک عظیم مرکز رہا۔ یہاں کرنل پولیر کو صاحب علم لوگوں سے ملنے کا موقع ملا اور وہ ہندوستان کے مذاہب اور تاریخ میں دلچسپی لینے لگا۔ وہ کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (جو اب محض ایشیاٹک سوسائٹی ہے) کے ابتدائی رکنوں میں سے تھا اور 29 جنوری 1784ء کو اس کا رکن منتخب ہوا تھا۔ اس نے سوسائٹی کی مجلسوں کے لیے جو مقالے لکھے اور پڑھے ان میں سے ایک سقس پر تھا یا ہسٹری آف سیکس تھا، جو اس نے 20 دسمبر 1787ء کو پڑھا تھا!

سقس پر پولیر کا مقالہ صریحاً ان اتفاقی معلومات پر مبنی تھا جو اس نے شجاع الدولہ کی ملازمت کے دوران، اور استعفا دینے کے بعد والے برسوں میں جمع کی تھی جب بالو دہلی کے نواحات میں کبھی اتفاقاً سکھوں سے اس کی ملاقات ہو جاتی تھی یا کہیں اس بارے میں سن لینا تھا کہ سکھوں کے تعلقات مغلوں، رہیلوں، جاٹوں، راجپوتوں اور مرہٹوں سے کیسے ہیں۔ حقائق کی بات اس میں بہت سی ایسی غلطیاں ہیں جو اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کی ابتدا کے غیر ملکی مصنفوں کی تحریروں میں عام طور سے پائی جاتی ہیں، کیونکہ گہرے ذاتی تعلقات کی کمی کے باعث انہیں سکھوں کے اداروں اور تاریخ کا براہ راست علم نہ ہو پاتا تھا، اور مستند کتابوں نیز اصلی دستاویزوں کی عدم موجودگی کے باعث انہیں

اپنی تحقیقوں کے لیے لائقِ اعتبار مآخذ نہیں مل پائے تھے۔ مزید برآں سکھوں کے بارے میں پولیر کے اپنے تعصّبات بھی تھے جو ان مغل عہدیداروں کی یک طرفہ رپورٹوں کے باعث اس کے ذہن پر طاری ہو گئے تھے، جن مغلوں کے خلاف وہ اسّی برسوں سے زیادہ مدّت سے جدوجہد کر رہے تھے۔ اس لیے مقالہ لکھتے وقت اسے جو کچھ معلومات دی گئیں اس نے ان پر فوراً یقین کر لیا۔[2]

جارج فاسٹر کا خط نمبر XI میں، جو اس کی کتاب اے جرنی فرام بنگال ٹو انگلسٹڈ (لندن 1798ء) کی پہلی جلد میں دیا ہوا ہے، سکھ لوگوں کی ابتدا اور ترقّی کی مختصر تاریخ گورونانک کے زمانے سے فروری، مارچ 1783ء تک دی ہوئی ہے۔ فروری، مارچ 1783ء وہ زمانہ تھا جب وہ پنجاب کے مشرقی پہاڑی علاقوں میں سفر کر رہا تھا۔ اس خط کے علاوہ جو پورا کا پورا سکھوں کے بارے میں ہے، اس نے ان کے بارے میں کہیں کہیں اور بھی حوالے دیے ہیں، جیسے صفحات 128 تا 30، 198 تا 99، 227 تا 28 اور جلد دوئم صفحات 83، 88۔ ایک حقیقی محقق کی طرح فاسٹر میں "رنگ آمیزی کرنے اور حقایق کو غلط انداز میں پیش کرنے کا میلان نہ تھا۔" "وہ کہتا ہے چونکہ میری کوئی دلچسپی یا نظریہ نہ تھا اور نہ میں کسی قوت سے مرعوب تھا اس لیے حیثیت میں تھا کہ جو چیز میرے سامنے آئے اسے جذبات سے علاحدہ ہو کر جانچوں۔" اور وہ اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب رہا ہے اس کا خط نمبر XI اٹھارھویں صدی کے سکھوں کا ایک خاصہ معروضی مطالعہ ہے اور مفید مطلب معلومات کا خزانہ ہے۔

حکومت بمبئی نے چھیالیس جلدوں میں جو پیشوا دفتر انتن لوادلیلے کا گد (دفترِ پیشوا کے منتخبات) شایع کی ہے، اس کے واسطے وہ ہندوستانی دورِ وسطیٰ کی تاریخ کے طلبہ اور محققین کے شکر و احسان کی مستحق ہے۔ اس کی پینتالیس جلدوں کی تدوین راؤ بہادر گوبند سکھرام دیسائی نے کی تھی، اور متفرق مقالات والی چھیالیسویں جلد (فارسی میں) کی

تدوین ڈاکٹر ایم۔ ناظم نے کی تھی۔

بعد میں حکومت بمبئی نے دفتر پیشوائے منتخبات کو ڈاکٹر پی۔ ایم۔ جوشی کی ادارت میں مقالات کے ایک نئے سلسلے کی طرح جاری رکھا۔ اتنی ہی تاریخی اہمیت کی کچھ اور بھی کتابیں ہیں جیسے راجوادے کی مراٹھیا یچیہ اتیہاساچی سادھنے کی جلد نمبر 1، 3، 6 اور 12، ڈی۔ بی۔ پرالنی کی دِلّی وتھیل مراٹھیا نچی، راجہ کرّارے (ہنگنے کی خط وکتابت) دو حصّوں میں اور ساتھ میں ایک ضمیمہ، اور جودہ پوریتھل راجہ کارے (کرشنا جی جگن ناتھ وکیل کی خط وکتابت) جو پہلے بہت سے مختلف سلسلوں کے متعدد دوسرے دستاویزوں کے ساتھ اتہاس سنگراہا (نرنایا ساگر پریس، بمبئی) میں چھپی تھی۔

جی۔ ایس۔ سردیسائی کے تدوین کیے ہوئے دی ہسٹوریکل پیپرس آف دی سندھیار آف گوالیار جو ستارا ہسٹوریکل ریسرچ سوسائٹی نے 1934ء اور 1940ء میں دو جلدوں میں شایع کیے ہیں، اور سردیسائی ہی کے تدوین کیے ہوئے دی ہسٹوریکل پیپرس ریلیٹنگ ٹو مہہ جی سندھیا جو حکومتِ گوالیار نے 1937ء میں شایع کیے ہیں، درانیوں، رہیلوں، بیگم سمرو، سکھ سرداروں اور ریاستِ پٹیالہ کی بات شمالی ہندوستان کے ان امور کے بارے میں جن کا تعلق دہلی کے شمال اور جنوب دونوں سے تھا، نہایت براہِ راست قسم کے مآخذی مواد پر مشتمل ہیں۔

اس جگہ پونا کی اتہاس سمشودک منڈل کی اشاعتوں کا بھی ذکر کیا جاسکتا ہے، جس نے اپنے دو سلسلہ مقالات سویا گرنتھ مالا (تقریباً 100 اشاعتیں) اور پر سکرت گرنتھ بالا کے ذریعے پیشوائے وکیلوں اور خبر نویسوں کی خط وکتابت کے مجموعوں پر مشتمل کوئی دو سو جلدیں شایع کی ہیں جیسے ہنگنے دفتر (تدوین، جی۔ ایچ۔ کھرے)، چندرا چد دفتر (تدوین، ڈی۔ وی۔ آپٹے)، ویدیا دفتر اتس نونہ لیلے کاگد وغیرہ۔ منڈل نے مرہٹی زبان کے علاوہ سویا گرنتھ مالا سلسلہ مقالات میں ہندوستانی تاریخ کے فارسی مآخذوں (اتہاسک

فارسی ساہتیہ) کی بھی متعدد جلدیں منڈل کے مہتمم محافظ خانہ جی۔ ایچ۔ کھرے کی اِدارت میں شایع کی ہیں۔ ان جلدوں میں فارسی کے جو خبر نامے اور دستاویز شامل ہیں۔ (جلد پنجم، حصّہ اوّل 1961ء میں شایع ہوا تھا) ان میں عام طور سے شمالی ہندوستان کا ذکر ہے، اور پنجاب کے بھی بہت سے حوالے ہیں جو زیادہ تر اٹھارہویں صدی کے دوسرے نصف سے تعلق رکھتے ہیں۔

جیساکہ میں نے مندرجہ بالا سطور میں ذکر کیا ہے، اٹھارہویں صدی میں آخری تین دہائیوں کے علاوہ مصنفوں کی توجّہ اس صورت میں سکھوں کی طرف ہوتی ہے جب وہ لاہور کی حکومت کے خلاف اور وقتاً فوقتاً سرہند اور دہلی کے خلاف جدوجہد کرتے یا پھر درانیوں، رہیلوں، بھٹیوں اور مرہٹوں کے خلاف لڑتے۔ اور یہ سب باتیں اس زمانے کی عام تاریخی کتابوں اور سوانحوں میں دی ہوئی ہیں جو زیادہ تر مسلمان مصنّفوں نے لکھی ہیں۔

جن کتابوں کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے ان کے علاوہ غیر مسلموں کی کتابوں میں سدھ رام کی رقعاتِ عالمگیری یا دمزد استادہٴ عالمگیری (1708ء)، جگ جیون داس گجراتی منتخب التواریخ (1708ء)، بھیم سین کی دلکشا (1728ء)، لالہ رام کی تحفۃ النہد، دونی چند کی گکتر نامہ، آنند رام مخلص کی تذکرہ، وقائعہ اور سفر نامہ (1748ء)، جتر مان کی چہار گلشن (1759ء)، گاہسی راج کی احوالِ جنگِ بھووا احمد درّانی یا جنگِ پانی پت (1761ء)، شیو پرشاد کی تاریخِ فراخ بخش یا فیض بخش (1776ء)، متا لال کی تاریخِ شاہ عالم جسے شاہ عالم نامہ بھی کہا جاتا ہے (1782ء)، صاحب سنگھ کی منتخب المسوّدات (1784ء)، بہاری لال کی احوالِ نجیب الدولہ و علی محمد خاں و دوندے خاں (1787ء)، ہرچرن داس کی چہار گلشنِ شجاعی (1787ء)، ستر سین کی دَور نامہ (1793ء) اور دلپت رائے کی امیر الاملا (1800ء)، وہ کتابیں ہیں جو اس بنا پر خاص طور سے لایقِ ذکر ہیں

کہ ان میں کبھی کبھی پنجاب کے حوالے ملتے ہیں۔ ان کتابوں کے ناموں کے ساتھ جو
تاریخیں دی گئی ہیں اِن میں سے ہر تاریخ تصنیف یا نقل کی تاریخ نہیں ہے، بلکہ بعض
صورتوں میں یہ کتاب میں دیے ہوئے آخری واقعے کی تاریخ ہے۔ فارسی میں صرف ایک
چھوٹی سی کتاب رسالۂ نانک شاہ ہے جو خاص طور سے سکھوں کے بارے میں ہے۔
یہ لاہور کے مدہ سنگھ اروڑا اور ملیر (کوٹلہ) کے عجائب سنگھ سورج کی لکھی ہوئی ہے۔
لیکن جیسا پہلے بتایا جا چکا ہے، یہ محض ایک ہندی مسودے کا ترجمہ ہے، جسے کسی ایسے شخص
نے لکھا ہے جو سکھوں کے مذہب اور تاریخ سے پوری طرح واقف نہ تھا۔ بخت مل کا
خالصہ نامہ (1810ء تا 1814ء) اور خوشوقت رائے کی کتاب تواریخِ پنجاب، جسے تواریخِ
سکھیاں (1811ء)، بھی کہا جاتا ہے، ان کتابوں میں شمار ہوتی ہیں جو انیسویں صدی
کی پہلی دو دہائیوں میں لکھی گئی ہیں اور جن میں زیادہ تر اٹھارہویں صدی کے
پنجاب کا ذکر ہے۔ بخت مل نے اپنی کتاب کیتھوال کے بھائی لال سنگھ کی سرپرستی
میں لکھی، اور اس کا پہلا مسودہ (جو اب رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کی لائبریری
میں محفوظ ہے) جون میلکوم نے اپنی کتاب اسکیچ آف دی سکھس لکھتے وقت استعمال
کیا تھا، جو 1812ء میں لندن میں شایع ہوا۔ خوشوقت رائے ایسٹ انڈیا کمپنی کا پہلا
سرکاری خبر نویس تھا۔ اس نے اپنی کتاب تواریخِ پنجاب 1811ء میں کرنل ڈیوڈ
اوکٹرلونی کی خواہش پر لکھی تھی، اور اسے جون 1811ء کی مٹکاف ــــ رنجیت سنگھ
گفت و شنید پر ختم کیا تھا۔ حالاں کہ دیا رام کی سیر و شکار مہاراجہ رنجیت سنگھ
کے دور میں قدرے بعد کے زمانے میں لکھی گئی ہے پھر بھی اس میں زیادہ تر اٹھارہویں
صدی کے آخر میں ستلج کے اس پار والے معاملات اور خصوصاً ان معاملات کا
ذکر ہے جن کا تعلق ڈی بوئن، پیرون، لوئی بورکوئن، جارج تھومس، مرہٹوں اور
مالوہ کے سکھ سرداروں سے ہے۔ اس میں دیے ہوئے آخری واقعات میں مہاراجہ

رنجیت سنگھ اور شاہ شجاع الدولہ کی گفت و شنید اور اس کی کشمیر کی مہم ہے۔

اس کے علاوہ، غیر مسلموں کی لکھی ہوئی تحریروں کا ایک اتنا بڑا میدان موجود ہے جسے اب تک کسی ہندوستانی یا غیر ملکی محقق نے چھوا تک نہیں ہے یہ بھٹ اور پنڈا تحریریں ہیں جنھیں پیشہ ور محافظینِ تحرات اور رزمیہ نظمیں گانے والے لوگوں نے قائم اور محفوظ رکھا ہے۔ پنجاب کے بھٹ بھدسن تلودہ (جنڈ)، کرکتیتر، سوری، کرسمدھو، سرسا، کیتھال اور ستلج کے اس پار والے متعدد مقام پر ملتے ہیں، جبکہ پنڈے ایسے تیرتھ استھانوں میں رہتے ہیں جیسے ہردوار، پہوا، کروکیتر، پریاگ، گیا، اجودھیا، کماکھیا دیوی (گوہاٹی)، پوری وغیرہ۔ پرانے باضابطہ گروہوں کی طرح بھٹ لوگ راجاؤں، سربرآوردہ لوگوں، سرداروں اور دوسرے لوگوں کے نسل نامے محفوظ رکھتے تھے، اور ان کے افعال شجاعت و فیاضی تحریر کرتے رہتے تھے۔ وہ اپنے بہاسوں یا سرپرستوں کے سال وار واقعات بھی تحریر کرتے تھے اور انھیں پڑھ کر سناتے تھے۔ مقررہ مدت کے بعد وہ اپنے مقررہ حلقوں میں گاؤں گاؤں پھرتے اور خانداں کے مرد بچوں کی پیدائش اور موت اور ان موقعوں پر سربراہِ خاندان سے جس قدر تفصیلات حاصل ہوتیں وہ سب اپنی بہی میں تحریر کر لیتے تھے۔ پیدائش اور شادی کے موقعوں پر وہ نسب نامے پڑھ کر سناتے تھے اور اس خاندان کے آباؤ اجداد و نیز نمایاں لوگوں کے کارنامے گا کر سناتے تھے۔ بھٹوں میں جو لوگ زیادہ پڑھے لکھے تھے انھوں نے جذبات سے بھری ایسی نظمیں لکھیں جو تاریخی اعتبار سے درست اور خاصی ادبی اہمیت کی حامل تھیں اور انھیں کسی علاقے کی تاریخ اور علاقے کے لوگوں کی سوانحیں لکھتے وقت بڑے مفید مطلب ماخذی مواد کی طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ عام طور پر سنسکرتی یا

بھٹا چاری رسم الخط میں لکھی ہوئی ہیں اور مضبوط کپڑے کی تہہ دار جلد سے رجسٹر کی صورت میں محفوظ ہیں۔ انھیں بہی کہا جاتا ہے۔ بھائی منی سنگھ والی سیوا سنگھ کی شاہد بلاس بھٹ موہلو رام کی بہی میں موجود تھی، اور اسے بھدرس کے سیٹھ چھجو سنگھ نے، جو اس کے مصنف کی نسل سے تھا، 1937ء بی، کے مطابق 1870ء والے ڈی میں بھٹا چاری رسم الخط سے گورمکھی میں نقل کیا تھا۔ گذرے ہوئے وقت کے ساتھ بعض ایسی صورتیں پیدا ہو رہی ہیں کہ بھٹوں کی نئی نسل جس کے بعض افراد نئے پیشے اپنانے لگے ہیں، ان پرانی بہیوں کو نظر انداز کرنے لگے ہیں۔ اس لیے وقت آگیا ہے کہ ذرا کبھی ناچیز کیے بغیر تاریخی ماخذوں کے اس بیش بہا خزانے کو بچانے کے لیے ایک باضابطہ اور منظم کوشش کی جائے اور تاریخی تحقیق کے مفاد کی خاطر اسے پنجابی اور دیوناگیری رسم الخط میں تبدیل کرکے شایع کرا دیا جائے۔

اسی طرح ہندوؤں کی بہیوں میں ان تیرتھ یاتریوں کے نسب ناموں کی بابت بیش قیمت تحریریں موجود ہیں جو یا تو خود بھی، ورنہ اپنے مرے ہوئے رشتے داروں کی راکھ لے کر تیرتھوں پر جاتے ہیں۔ تیرتھ استھان کے پوتر پانی راکھ ڈالنے سے پہلے یا غوطہ لگانے سے پہلے اس پنڈے کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں جس کے پاس اس علاقے کی بہی ہوتی ہے، جس علاقے میں اس یاتری کا گاؤں یا شہر واقع ہوتا ہے۔ یہ پنڈا مذہبی رسوم ادا کرتا ہے جس کے واسطے اسے ایک مقررہ اُجرت دی جاتی ہے۔ یہ اُجرت اس خرچے کے علاوہ ہوتی ہے جو یاتری اس کی رہائش اور کھانے کے لیے دیتا ہے۔ یاتری کی ملاقات سے پنڈے کو موقعہ ملتا ہے کہ خاندان کے نسب نامے کو تازہ ترین شکل میں مکمل کرلے، اور ایسی ساری معلومات بھی درج کرے جو خاندان یا گاؤں کے آئندہ یاتریوں کے نقطۂ نظر سے مفید ہے۔ بعض اوقات پنڈے پڑھے لکھے یاتریوں سے اپنے اندراجات پر اس خیال سے تصدیق یا دستخط کروالیتے

تھے تاکہ سند رہے۔

بھٹوں اور پنڈوں کی ساری بہیوں میں گاؤوں، فرقوں، گوتروں اور خاندانوں کے اعتبار سے دُرست فہرستیں سی ہوتی ہیں، اور اگر کسی خاندان کا ذکر بہی میں موجود ہے تو اُسے ڈھونڈنے میں دو ایک منٹ سے زیادہ دیر نہیں لگتی۔ اگر کسی خاندان کا ذکر پہلے بہی میں موجود نہیں ہے تو پنڈا فوراً آئندہ حوالے کے لیے وہ معلومات تحریر کر لیتا ہے جو یاتری اسے دیتا ہے۔ بھٹوں اور پنڈوں کی بہیوں میں فرق یہ ہے کہ بھٹ اپنے اپنے علاقوں میں جاکر موقع پر اپنے اندراجات مکمل کرتے تھے، اور پنڈے تیرتھ استھانوں پر اپنے یاموں کی آمد کا انتظار کرتے تھے۔ اس طرح بعض ایسی صورتوں میں جب یاجمن تیرتھ استھانوں پر نہ پہنچ پاتے تو پنڈوں کے اندراجات میں بڑی مدت تک کوئی چیز تحریر نہیں ہوتی۔ اسی لیے بھٹوں کی بہیاں پنڈوں کی بہیوں کے مقابلے میں زیادہ مکمل اور زیادہ فائدے مند ہیں۔

بھٹوں اور پنڈوں کے علاوہ، جو برہمن اور نیم برہمن ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے، دَورِ وسطیٰ کے پنجاب میں بھاٹوں کا ایک اور طبقہ بھی تھا جو آلاتِ موسیقی دھاد اور رباب کے نام پر دھادی یا ربابی کہلاتے تھے، اور لوگوں کے سامنے پرفارمنس کرنے کی خاطر دھاد یا رباب بجانے میں کمال حاصل کرتے تھے۔ وہ ذات کے اعتبار سے ڈوم یا مراثی تھے، لیکن سکھ گوروؤں اور سرداروں کی سرپرستی میں رہ کر انھوں نے سکھ طریقۂ زندگی اپنالیا تھا۔ وہ پیشے کے اعتبار سے بنیادی طور پر گوئیے تھے، لیکن اکثر اوقات وہ ایسی چار بیتیں لکھ لیتے تھے جو ادبی اعتبار سے بڑی بلند پایہ ہوتی تھیں؛ اور ان میں سے بعض کو گوروؤں اور بعض مستند سنتوں کے اشلوکوں کے ساتھ سکھوں کے پاک صحیفے 'گورو گرنتھ صاحب' میں بڑا اُونچا مقام دیا گیا ہے۔ ناتھا، جس نے وار یا گورو ہرگوبند کی جنگوں پر رزمیہ نظمیں لکھیں، اور ناتھ مل دھادی، جو امرنامہ کا مصنف ہے، اسی جماعت سے

تعلق رکھتے تھے۔ مساکر میں نے مندرجہ بالا سطور میں کہیں ذکر بھی کیا ہے، میرا خیال یہ ہے
کہ یہ دونوں نام ایک ہی شخص کے ہیں۔ ستلج کے اس پار والے علاقوں، جالندھر کے
دوآبوں، اور پاری کے پرانے سردار خاندانوں کے کاغذات، نیز مغربی پاکستان کے
بعض متمول گھرانوں کے خاندانی کاغذات کی اگر اچھی طرح چھان بین کی جائے تو یقیناً دھاڑیوں
کی لکھی ہوئی بعض بیش قیمت تاریخی واریں ملیں گی۔

حوالہ جات

چونکہ سوسائٹی کے ریکارڈ میں اس مقالے کی کوئی نقل موجود نہ تھی، نہ یہ مقالہ سوسائٹی کے رسالے میں شایع کیا گیا تھا۔ اس لیے میں نے انڈیا آفس لائبریری سے اس کی ایک فوٹو اسٹیٹ نقل حاصل کر لی (Orme Mss, XIX, pp 33)۔

میں نے انھیں لائقِ اعتبار مواد کی روشنی میں درست کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ لائقِ اعتبار مواد اب 1962ء میں چھپنے والی کتاب ارلی یورپین اکاؤنٹس آف دی سکھس کے حاشیے کی عبارت میں مل جاتا ہے۔

دَورِ وُسطیٰ کے ہندوستان پر ابتدائی برطانوی تاریخی تحریر کی خصوصیات

جے۔ ایس۔ گریوال

ابتدائی برطانوی تاریخی تحریر پر یہ مقالہ اٹھارہویں صدی کے آخری اور انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں کے برطانوی مورخوں کا احاطہ کرتا ہے، دَورِ وُسطیٰ کے ہندوستان پر برطانوی فنِ تاریخ نگاری کی خصوصیات کے مطالعے کے واسطے تقریباً نوّے سال کی اس مدّت کا انتخاب بے سوچے سمجھے نہیں کیا گیا ہے۔ اس زمانے کے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے پھیلاؤ کی روش کا اور اس پھیلاؤ کے باعث عام برطانوی زندگی میں پیدا ہونے والے مسائل کے حوالی عمل کا فنِ تاریخ نگاری سے گہرا تعلق تھا۔ اس تاریخی تحریر کی روش اور خاصیت، اور اس زمانے کی عام برطانوی فنِ تاریخ نگاری کے طریقوں پر بڑے رُجحانوں کے درمیان قریبی تعلق، مورخوں کے سماجی اور تہذیبی ماحول کا ان کی کتابوں کے کردار پر گہرا اثر، ان کی فکر و نظر کا عام خاکہ، بحیثیت مجموعی اس پوری تاریخی تحریر کی نشوونما کے پیچھے کام کرنے والی منطق ——— ان ساری باتوں نے مل کر اس دَور کے مورخوں کو ایک ایسی وحدت بخش دی جو لِس انہی کا حصّہ تھی۔

ان مورخوں کے کام اور اس زمانے کے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے پھیلاؤ کی روش کے درمیان جو نزدیکی تعلق تھا وہ ان مضامین سے ظاہر ہوتا ہے جو انھوں نے تاریخ لکھنے کے واسطے انتخاب کیے ——— جیسے مثال کے طور پر، روہیلے' بعد کے

مغل فرمانروا، میسور، مرہٹے، سکھ۔ مزید برآں، پہلے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام کے امکان اور پھر قیام کے ساتھ ہند مسلم "ہمارے پیش رو" سمجھے جانے لگے۔ ان کی حکومتیں ہندوستان کے نئے فرمانرواؤں کے واسطے نہایت دلچسپ موضوع بن گئیں۔

مورخوں کے عملی اور سرکاری مقاصد ان مسائل کا جوابی عمل ظاہر کرتے ہیں جو ہندوستان میں برطانوی حکومت کے پھیلاؤ سے برطانوی عوام کی زندگی میں پیدا ہو گئے تھے۔ مثال کے طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین نے اٹھارہویں صدی میں صرف اس لیے دستوری اور قانونی تحقیقیں شروع کر دیں کیونکہ کمپنی برطانوی ہندوستان پر حکومت کرنے کے مسائل سے دوچار تھی۔ ہندوستانی دورِ وسطیٰ پر برطانوی تاریخی تحریروں کا حجم انیسویں صدی کی ابتدا میں بہت کچھ اس بنا پر بڑھ گیا، کیونکہ برطانوی ہندوستان، جو اب سلطنتِ برطانیہ کا سب سے اہم حصّہ بن چکا تھا، ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہی نہیں بلکہ ساری انگریزی قوم کی ذمّہ داری بن چکا تھا اور مصنّفین نے فطری طور پر پوری انگریزی قوم کو خطاب کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے واسطے اپنی کتابوں کے استعمال یا عملی مفہوم سے اس دور کے تقریباً سارے ہی مصنّف باخبر تھے۔ ان میں سے بعض نے دورِ وسطیٰ کے ہندوستان کی بابت اپنے علم کی روشنی میں حکومت کے مسائل پر کھلم کھلا بحث کی ہے۔

بہرکیف، عملی مقصد کے غلبے کے باوجود، دورِ وسطیٰ کے ہندوستان پر برطانوی تاریخی تحریر کا عام برطانوی فنِ تاریخ نگاری سے بہت گہرا تعلق تھا۔ مثال کے طور پر، ہندوستانی معاشروں کے بارے میں جیمس مل کی تحقیق ان اسکاچ عمرانی تحقیقوں کی نقل تھی جنھیں ایڈم فرگوسن اور جون ملیر نے مقبولِ عام کیا تھا۔ اسی طرح، الیگزینڈر ڈاؤ کو بے خوف و خطر دورِ روشن خیالی کے مورخوں کی صف میں کھڑا کیا جا سکتا ہے، کیونکہ اس نے ناصحانہ مقصد کے تحت ان حقائق کو لائق فہم انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی جو آسانی سے دستیاب

ہوگئے تھے۔ اگر اس کی کتاب کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ اس کے بڑے بڑے معروضات وہی تھے جو ڈیوڈ ہیوم اور ایڈورڈ گبن کے تھے۔

حالانکہ یہ ممکن نہیں کہ ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے سارے برطانوی مورخین کو برطانوی فنِ تاریخ نگاری سے کسی نہ کسی طور پر خیال میں جگہ دی جا سکے، پھر بھی یہ ضرور ہے کہ برطانوی فنِ تاریخ نگاری کے بڑے بڑے رجحانات ہندوستانی دورِ وسطیٰ کی برطانوی تاریخ نگاری میں پورے طور سے نظر آتے ہیں۔ راجپوتوں کے بارے میں جیمس ٹوڈ کی کتاب برطانوی دورِ وسطیٰ کے مورخین کے کام سے بیحد متاثر ہوئی ہے۔ ماؤنٹ اسٹوارٹ الفنسٹن کو بھی یقین ہو گیا تھا کہ دورِ وسطیٰ کے مسلم ہندوستان کی تاریخ "قرونِ وسطیٰ کے یورپ کی تاریخ پر روشنی ڈالے گی"۔ تاریخ کے بارے میں جوزف ڈیوی کننگھم کا تصور اس آزاد خیال انگلیکی (کلیسائے انگلستان کا حیرت پسند پیرو) کی "سائنس" اور "فلسفے" کے نزدیک آگیا تھا جس نے انیسویں صدی کی ابتدا میں انگریز فکرِ تاریخ میں "ایک انقلاب" بپا کر دیا تھا۔[3] تاریخی دستاویزوں کو جمع کرنے اور محفوظ رکھنے کا کام ـــــ جو انیسویں صدی کی ابتدا میں برطانوی تاریخی نقطۂ نظر میں ہونے والی تبدیلی کی عکاسی کرتا ہے ـــــ برطانوی ہندوستان میں بھی اتنا ہی اہم بن چکا تھا جتنا خود برطانیہ عظمیٰ میں۔ تاریخی علم وفضل نے ہندوستانی دورِ وسطیٰ پر برطانوی تاریخی تحریر کے کردار کو اسی قدر بدلا تھا جتنا عام برطانوی فنِ تاریخ نگاری کو بدلا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ برطانوی فنِ تاریخ نگاری کے طریقوں اور رجحانوں نے ہندوستانی دورِ وسطیٰ کی برطانوی تحریر کے کردار پر اثر ڈالا تھا۔ ابتدائی انیسویں صدی کے ہندوستان کے برطانوی مورخین گو بڑی حد تک ادبی مآخذوں پر بھروسہ کرتے تھے، پھر بھی وہ انھیں سند کا نہیں مآخذ کا درجہ دیتے تھے۔ ان کا مقصد، جیسا کہ ان میں سے ایک مصنف نے دوسرے سے کہا ہے، یہ تھا کہ "حقائق حاصل کرنا اور انھیں سوچ سمجھ کر ملانا تاکہ بکواس سے بھری

ٹکڑوں اور لاف گزاف سے بھری تواریخوں کے انبار سے ایک مستقل اور عقلی تاریخ تیار کی جاسکے۔"[4] اس بات کا اعتراف کہ غیر تاریخی ادب، تاریخی دستاویزیں اور علمِ آثار قدیمہ تاریخی تحقیق کے لیے موزوں ہوتے ہیں ابتدائی انیسویں صدی کے دن بہت سے برطانوی مورخوں نے کرلیا تھا جو ہندوستانی دورِ وسطیٰ کی بابت لکھتے تھے۔ لہٰذا" اس دور کے شروع میں جہاں الیگزینڈر ڈاؤ نے یورپین سیّاحوں کی فارسی تاریخوں پر قناعت کی وہاں ماؤنٹ اسٹوارٹ الفنسٹن نے اسی دور کے آخر میں خطوط، فرمان، تورکیں، سکّے، رساں اور ادب کی شہادتوں اور ایشیا اور یورپ دونوں کی تاریخوں اور سیّاحوں کا استعمال کیا۔ ان مورخوں کی بڑی بڑی کتابوں کے تفصیلی تجزیے کی مُسادیرے خوف وخطر یہ کہاجاسکتا ہے کہ ان مورخوں نے "تاریخی طریقہ" اپنے وطن کے ہمعصروں سے سیکھا تھا۔

ان کے مقاصد یا تاریخی طریقے کی بات ان کی وہ ترتیب جس کے باعث ان کی کتابوں کا ایک مخصوص کردار بنا، اس کی اہمیت کم کیے بغیر یہ بات پورے زور کے ساتھ کہی جاسکتی ہے۔ کہ ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے برطانوی مورخین کے سماجی اور تہذیبی ماحول کا اثر زیادہ لطیف تھا۔ اور اسی لیے ان کی کتابوں کا کردار بنانے میں زیادہ فیصلہ کن ثابت ہوا۔ ایڈورڈ گبن کا ہسٹری آف دی ڈکلائن اینڈ فال آف رومن امپائر ایک معنوں میں ایک "جدید یورپین نشاۃِ ثانیہ کے عہد زریں کے عام خیالات کا مظاہرہ" تھی۔[5] جیمس مل کی ہسٹری آف برٹش انڈیا بھی انگریز فلسفی انتہاپسندوں کے خیالات کے بارے میں ہمیں اس قدر بتاتی ہے جتنی انگریز دورِ روشن خیالی کے بارے میں گبن کی ہسٹری۔ ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے برطانوی مورخوں کی کتابیں جو ان کے زمانے کے ادبی، جمالیاتی، اور مذہبی غیر عقلی دھاروں کی عکاسی کرتی ہیں، دراصل اس سماج کی عکاسی کرتی تھیں جس میں وہ رہتے اور کام کرتے تھے۔ اس بات کو الٹ کر یوں کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی دورِ وسطیٰ پر برطانوی تاریخی تحریر کا کردار بناتے وقت اس دور میں اُبھرتے ہوئے انجیلی عقیدے

اور رومانیت نے بھی اتنا ہی گہرا اثر ڈالا جتنا روشن خیالی اور فلسفیانہ انتہا پسندی نے ڈالا تھا۔ اب تک کی ان تاریخی تحریروں میں سے بیشتر کا تجزیہ انہی مؤثر تحریکوں کی اصطلاح میں کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستانی دَورِ وُسطیٰ کے سارے برطانوی مورّخوں میں جو چیز مشترک تھی وہ یہ مفروضہ تھا کہ ان کے ملک میں ان کا زمانہ اس زمانے سے ہر لحاظ سے بہتر تھا جس پر وہ لکھ رہے تھے مثال کے طور پر الیگزینڈر ڈاؤ نے دستوری بادشاہت کے تحت اپنے ساتھی شہریوں کی آزادی اور خوشی کا مقابلہ استبدادی حکومت کے تحت ہندوستانی رعایا کی "غلامی" اور مصائب سے کیا۔ ماؤنٹ اسٹوارٹ الفنسٹن کے نزدیک ہندوستانی دَورِ وُسطیٰ کے دوران نہایت خوشحال اور انتظامی اعتبار سے بہترین زمانوں میں بھی عام حالت اس زمانے کے یورپ کی ریاستوں کی عام حالت سے گئی گذری تھی جن کا انتظام بس یُونہی سا تھا۔ حقیقت یہ ہے، کہ اس زمانے کے مغربی یورپ کے بارے میں عام خیال یہ تھا کہ وہ اخلاقی اور عقلی اعتبار سے دُنیا کی تاریخ کے ہر زمانے سے بہتر تھا۔ آخری تجزیے سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ جدید سائنس کے عروج اور فکرِ انسانی و ٹیکنالوجی پر اس کے اثرات نے جدید یورپین تہذیب کو ایشیا اور یورپ کی ساری تہذیبوں میں ممتاز بنا دیا تھا۔ حتّیٰ کہ سر ولیم جونس، اپنی اس شہرت کے باوجود کہ وہ ایشیا کے لوگوں کے سب سے بڑے مدّاح ہیں، یہ سمجھتے تھے کہ علوم سائنس میں وہ "محض طفلِ مکتب" تھے[6] ان کے نزدیک یورپ "حسین مالکہ" تھا اور ایشیا زیادہ سے زیادہ "خادمہ"۔[7]

بحرکیف، اس عام مفروضے کے باوجود کہ اس زمانے کا یورپ ہندوستان پر فوقیت رکھتا تھا، ہندوستان اور اس کے ماضی کی جانب ان برطانوی مورّخوں کے رویّے بہت مختلف تھے، اور ان رویّوں سے بڑی حد تک ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی نہ کسی مؤثر مدرسۂ فکر سے وابستہ تھے، جیسے دَورِ روشن خیالی کے ڈاؤ جیسے مورّخ ہند مسلموں کی سیاسی کامیابی اور

زور و قوت کو سراہ سکتے تھے اور واقعتاً سراہتے تھے۔ وہ بعض فرمانرواؤں کے بے تعصب انداز کو بھی سراہتے تھے۔ وہ اس بات میں یقین کرتے تھے کہ ہندوستان کی برطانوی سلطنت میں یا کہیں بھی امن اور سیاسی استحکام قائم رکھنے کے واسطے یہ بہتر ہوگا کہ جاہل عوام کو توہم پرستی کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ افادیت پسندوں اور انجیلیوں کے نظریے گو بڑے مختلف تھے لیکن ہندوستان اور اس کے ماضی کے بارے میں ان کا تقریباً یہی نظریہ تھا انھیں ہندوستانی معاشروں میں شاذ ہی کوئی چیز لائق تعریف نظر آتی تھی۔ اور ان کی نظر میں ہندوستان کے مستقبل کا دارو مدار یا تو ان بخششوں پر تھا جو ہندوستانیوں کو مل جائیں یا برطانوی انھیں عطا کر دیں۔ رومان پسندوں نے ہندوستانی معاشروں اور ہندوستانی تہذیبوں کے بعض پہلوؤں کو علاحدہ علاحدہ سراہا — جیسے مثال کے طور پر مذہب، اخلاقیات، شاعری، موسیقی، مصوری، سنگ تراشی یا عمارت سازی۔ بعض رومان پسند تو یہاں تک کہنے کے لیے آمادہ ہو گئے کہ ہندوستانی طریقۂ زندگی ہندوستانیوں کے لیے اتنا ہی قابلِ قدر تھا جتنا برطانویوں کے لیے برطانوی طریقۂ زندگی۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستانی اداروں کو اس وقت تک نہیں چھونا چاہیے جب تک ہندوستانی خود انھیں بدلنے کی خواہش نہ کرنے لگیں۔

اس دَور کے برطانوی مورخوں کے کائناتی مفروضات خواہ کچھ بھی رہے ہوں، لیکن وہ ریاست، تمدّن اور قومیت کے تصوّرات کو اپنا عام خیالی ڈھانچہ سمجھتے تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ دَورِ روشن خیالی کے مورخوں نے سب سے اعلا مقام ریاست کے تصوّر کو دیا تھا، اور افادیت پسند نیز انجیلی مصنّفوں کے نزدیک قومیت اور ریاست کے تصوّرات تمدّن یا سماج کے تصوّر کے ماتحت تھے۔ لیکن دوسری طرف رومان پسندوں کے خیال میں ریاست اور تمدّن کے تصوّرات قومیت کے تصوّر کے ماتحت تھے۔ ایڈورڈ گبن اور سر ولیم جونس (جنھوں نے ہندوستانی دَورِ وسطیٰ پر براہِ راست کچھ نہیں لکھا) کا عام خیالی

ڈھانچہ ہی تو تھا جس نے ان کی کتابوں کو ان خوبیوں سے مزین کیا ان خوبیوں نے ہندوستانی دورِ وسطیٰ کی بابت برطانوی تحریر کے کردار پر فیصلہ کن اثر ڈالا۔ اسلامی تاریخ پر لکھتے وقت گبن کو یہ طریقہ، کہ "اپنی تصویر میں قوموں کے گروہ" شامل کردوں، نہایت بامعنی لگا۔[9] تاہم اس نے اسلامی تمدن کے اتحاد پر زور دیا جو اس کی نظر میں مسلم دُنیا کی علاقائی خصوصیات سے بالاتر تھی۔ اس مفروضے کے مطابق ہند مُسلم لوگ سارے نسلی اور علاقائی خطوطِ تقسیم کے باوجود، اپنے طریقہ زندگی کے اعتبار سے سوائے مُسلمانوں کے، دُنیا کی ہر قوم سے جُدا تھے۔ سر ولیم جونس نے ہندو تمدن کو ہندوؤں کے خیالات کا مجموعہ بناکر یہ ظاہر کیا کہ ہندو تمدن ایک بے مثل چیز ہے اور اس طرح مغرب کے لوگوں کے واسطے ہندوستان کو تقریباً ہندو ہندوستان کے مترادف کر دیا۔ اس کے بعد ہندوستانی تاریخ کو باقاعدہ طور پر "ہندو" اور "مسلمان" تاریخ میں بانٹنے کا مسئلہ محض وقت کی بات رہ گئی۔ جیمس مل، وہ پہلا مورخ، جس نے یہ تقسیم باقاعدہ کی، اس بات پر فخر کرتا تھا کہ وہ علم تمدن کا ایک نہایت سنجیدہ طالبِ علم ہے۔ اس نے بڑی آسانی سے یہ بات مان لی تھی کہ گبن اور جونس اس کے براہِ راست پیش رو تھے۔

مزید برآں، چونکہ گبن اور جونس نے مسلم اور ہندو تمدنوں کی قدر و قیمت کو جانچا تھا، اس لیے ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے برطانوی مورخوں نے نہ صرف یہ کہ انھیں جُدا سمجھا بلکہ یہ بھی سمجھا کہ یہ دونوں تمدن معیار کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ جیمس مل نے ہندوؤں کی حکومت، قوانین، مذہب، ادب، فن، تاریخ نگاری، فلسفہ، علومِ سائنس و ٹیکنالوجی، اخلاقیات اور آداب و اطوار پر بحث کی، جان بوجھ کر مسلمانوں سے ان کا مقابلہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ تمدن کے ہر دائرے میں مسلمان ہندوؤں سے بہتر تھے۔ ہوریس ہے مین ولسن نے اس بات کے حق میں دلیلیں دے کر کہ ہندو سوائے فنِ تاریخ نگاری کے ہر اعتبار سے مسلمانوں سے

افضل ہیں، مل کے فیصلے کو دُرست کرنے کی کوشش کی۔ ماؤنٹ اسٹوارٹ الفسٹن، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے ہندوستان کا ماضی محض بیان کیا ہے، اس پر کوئی فیصلہ صادر نہیں کیا ہے،[9] اس نے واقعی ہندو اور اسلامی تمدّنوں میں معیار کے اعتبار سے فرق پایا۔

لیکن مل کے برعکس، الفسٹن قومیت کو تمدّن کا ماتحت نہیں بناتا۔ رومان پسندوں کی طرح وہ یہ سمجھتا تھا کہ "قومی" اکائیاں تمدّن کے ڈھانچے میں رہ کر زیادہ لائق توجہ ہوتی ہیں۔ ہندوستانیوں کی بابت بلا ارادہ چھوٹے چھوٹے فیصلے صادر کر دیے گئے تھے۔ اس کو نظر میں رکھتے ہوئے اس نے زور دے کر کہا تھا کہ ہندوستان میں دس قومیں آباد ہیں جو آداب و اطوار اور زبان کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اتنی ہی مختلف ہیں جیسے یورپ کی قومیں اور اسی کے ساتھ "اس عام یکسانیت کی بھی حامل ہیں جو مسیحی دُنیا کی قوموں میں نظر آتی ہے۔" جیمس گرانٹ ڈف اور جیمس ٹوڈ پہلے ہی مرہٹوں اور راجپوتوں کو ہندو سماج کے عام ڈھانچے کے اندر "قوموں" کا درجہ دے چکے تھے۔ جوزف ڈیوی کننگھم، جو الفنسٹن کو مورّخ کی حیثیت سے بڑا سراہتا تھا، سکھوں کو ایک علاحدہ قوم کا درجہ دیتا ہے۔

اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں ہندوستانی دَورِ وسطیٰ کی بابت برطانوی تحریر کو بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو لگتا ہے کہ نشوونما کے بارے میں اس کی اپنی ایک منطق تھی۔ یہ دَور الیگزینڈر ڈاؤ کے کام سے شروع ہوا، جو ہندو مُسلم سیاست کا پہلا عام مورّخ تھا اور جسے سمجھا جاتا تھا کہ وہ محض فرشتہ کی کتاب گلشنِ ابراہیمی کا مترجم ہے۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں ڈاؤ کے براہِ راست جانشینوں، یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں نے ہندو مُسلم حکومت اور قانون نیز ہندوستانی دَورِ وسطیٰ کی سیاست پر تحقیقی کام کرکے دائرۂ تلاش و جستجو کو

پھیلا دیا۔ اُدھر گبن نے اسلامی تمدن کی ایک نئی تصویر بنائی جس سے مسلم تاریخ کے اقتصادی، سماجی، اور تہذیبی پہلوؤں پر انواع و اقسام کے رنگ پڑتے تھے اور دوسری بہت سی باتیں اخذ کی جا سکتی تھیں، اُدھر جونس نے پورے ہندو تمدن کو از سرِ نو تلاش کرنے کی کوشش کی۔

اس پسِ منظر کے ساتھ اور نہایت مختلف مفروضات اور مقاصد کے ساتھ، انجیلیوں اور افادیت پسندوں نے، جن کی نمائندگی انیسویں صدی کی ابتدا میں چارلس گرانٹ اور جیمس مل کرتے ہیں، یہ اندازِ نظر اختیار کیا کہ ماضی اور حال دونوں زمانے کے ہندوستانی معاشروں پر تمدنوں کے مطالعے کے ذریعے ہندوستانی دورِ وسطیٰ کی تاریخ کو سمجھا جائے تاکہ برطانوی ہندوستان میں شاہی ذمہ داری کو "اخلاقی شہنشاہیت" سے تعبیر کیا جا سکے، اور اس طرح ہندوستانی دورِ وسطیٰ پر لکھنے والے اپنے براہِ راست پیش رو مصنفوں کے رویوں سے انھوں نے یک لخت ناطہ توڑ لیا۔

ہندوستانی دورِ وسطیٰ پر برطانوی تاریخی تحریر کے کردار اور راہِ سفر کو اس ردِ عمل نے متاثر کیا جو بنیادی سماجی تبدیلیوں کی وکالت کے باعث برطانوی ہندوستان اور برطانیۂ عظمیٰ دونوں ملکوں میں پیدا ہوا تھا۔ جون برگس جیسے بعض اینگلو انڈین حضرات نے اس بات پر زور دیا کہ شہادتوں کی کمی کے باعث ہندوستانی لوگوں پر اخلاقی فیصلے صادر نہیں کیے جا سکتے۔ جیمس ٹوڈ جیسے رومان پسندوں نے اپنی تحقیقات کے مضامین سے بہترین باتیں اخذ کر کے یہ دکھایا کہ ہندوستان میں اخلاقی شہنشاہیت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے ساتھ انھوں نے جی۔ آر گلیگ جیسے قدامت پسندوں کو موزوں مواد فراہم کر دیا، جو برطانوی ہندوستان میں بنیادی سماجی تبدیلیوں کی مخالفت تقریباً اسی انداز سے کرتے تھے جس انداز

سے اپنے وطن میں انتہا پسندی کی مخالفت کرتے تھے۔

ماؤنٹ اسٹوارٹ الفنسٹن، اس دور میں ہندوستانی دورِ وسطیٰ کا آخری عام مورخ، اس دور کے متعدد خصوصی رجحانات کی نمائندگی کرتا ہے، اور اس نے برطانیہ عظمیٰ میں ہندوستانی دورِ وسطیٰ کی تاریخ کی بابت جو بھی علم تھا اس سب کا خلاصہ کر دیا ہے۔ دورِ روشن خیالی سے اپنے عقلی رشتے کے باعث وہ تمام عمر ہیوم اور گبن کو سراہتا رہا اور انھوں نے جن قدروں کی بنیاد پر فیصلے صادر کیے تھے ان قدروں کو تمام عمر مانتا رہا۔ رومان پسندوں سے اس کا جدلیاتی تعلق اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے ہندو اور مسلماں میں تفریق کیے بغیر ہندوستانی ماضی کا مطالعہ پوری خیالی ہمدردی کے ساتھ کیا۔ ہندوستاں میں بنیادی سماجی تبدیلی کے انجیلی اور افادیت پسند داعی جس اخلاقی شہسواریت کی تبلیغ کرتے تھے، اس تبلیغ کی حمایت کیے بغیر وہ ایک ایسی اخلاقی اور عقلی حیات نو کا خواہش مند اور اس کے لیے کوشاں تھا جس کی بنا پر ہندوستاں کے ماضی سے یک لخت ناتہ نہ ٹوٹے ہندوستان کے ماضی کے بارے میں اس کی نظر، جسے ایک سیاسی آزاد خیالی سے قوت حاصل ہوتی تھی، اکثر اوقات اسے مستقبل میں ایک آزاد اور "متمدن" ہندوستان کی تصویر دکھاتی تھی۔

دورِ وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ کے بارے میں اس وقت تک جو علم موجود تھا اس کو مختصر کرتے وقت الفنسٹن نے یہ کوشش کی تھی کہ "مسلم" ہندوستاں کو اس پورے دائرے میں ایک جگہ دی جائے۔ اس کی کہانی میں راجپوتوں، مرہٹوں اور سکھوں کو بھی اتنا ہی اہم مقام دیا گیا تھا جتنا ہند مسلم "قوموں" کو دیا گیا تھا۔ ہند مسلموں کا نسلی مجموعہ، ان کی قومی خصوصیات، ہندوستان میں غیر مسلموں کی جانب ان کے رویے، ہند مسلموں کی حکومت، انتظامِ سلطنت، زبان، سماجی رسم و رواج، مذہبی عقائد اور مذہبی معمولات اور عادات و اطوار پر ہندوستانی ماحول کا

اثر، ہندوؤں پر مسلم فتوحات کا اثر، ہندو دھرم پر اسلام کا اثر ــــ الفسٹن کو دَورِ وُسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ کے ان سارے پہلوؤں میں اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی ہند مسلموں کی جنگوں، حکومت، ادب، فنون اور ان کی خوشحالی میں تھی۔ حالانکہ اس نے ہندو اور مسلم "قوموں" کو دو نہایت مختلف تمدّنوں کے افراد کی نظر ــــ سے دیکھا تھا، پھر بھی اس کے نزدیک دَورِ وُسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ ہندو مسلم مفاہمت کے نقطۂ نظر سے اہمیت رکھتی تھی۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اکبر ہندوستان میں ایک "قومی" ریاست کا خالق تھا۔

دَورِ وُسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ کی جو ترجمانی الفسٹن نے کی وہ اس کے فوراً بعد کے جانشین ایچ۔ ایم۔ ایلیٹ کو منظور نہ تھی، جس نے دَورِ وُسطیٰ کے ہندوستاں کی ایک ایسی عام تاریخ لکھنے کا منصوبہ بنایا تھا جو الفنسٹن کے مفروضات اور مقاصد سے بالکل مختلف مفروضات اور مقاصد سی تھی۔ ایلیٹ کی ببلیوگرافکل انڈیکس ٹو دی ہسٹوریس آف محمڈن انڈیا (۱۸۴۹ء) دَورِ وُسطیٰ کے ہندوستاں پر برطانوی تاریخی تحریر کی تاریخ میں نمایاں طور سے ایک نئے دَور کا آغاز کرتی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے منصوبے ہی "مُسلم" ہندوستاں کا تصوّر واضح ہوگیا ہے اور دَورِ وُسطیٰ کا ہندوستان مخصوص مطالعے کا میدان بن گیا ہے۔ لیکن اس مطالعے کی حدود گھٹ کر ہند مُسلم سیاستوں کی تاریخ بن گئی جو "دیسی روزنامچہ نگاروں" کی شہادت پر مبنی تھا۔ ایلیٹ کا علم و فضل اسے ہندوستانی دَورِ وُسطیٰ پر لکھنے والے بیشتر یس رو مورّخوں سے اتنا جُدا گانہ مقام نہیں دیتا جتنا اس کا جارحانہ رویّہ اور ذلّت آمیز انداز نظر دیتا ہے۔

ایلیٹ کو دیسی روزنامچہ نگار زیادہ تر غبی، متعصب، لاعلم اور سطحی معلوم ہوئے۔ انھوں نے اسے ہندوستانی دَورِ وُسطیٰ کے سماجی، سیاسی اور مذہبی اداروں کی بابت کچھ نہیں بتایا۔ اس کا دعوا تھا کہ اس کی تاریخ لکھنا ابھی باقی ہے۔ وہ اس معنی خیز نتیجے پر پہنچا تھا کہ دَورِ وُسطیٰ کے مسلم مورّخ جنھوں نے ہندوستان کی بابت

لکھا اس بات کو نظر انداز کر گئے کہ لوگوں ـــــ جن کے بارے میں ایلیٹ کہتا ہے کہ زیادہ تر غیر مسلم تھے ـ کی زندگی پر استبدادیت کے کتنے خطرناک اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ان روزنامچہ نگاروں نے اپنی ساری توجہ ہند مسلم دربار اور اس کی شان و شوکت پر مرکوز کر دی، اور اس طرح بے رحم قانون کے نقصان دہ اثرات کو بھی انداز کر گئے۔ اگر انھوں نے اپنے قیصروں کو سیوٹونیس کی دیانت داری سے دیکھا ہوتا، تو شاید وہ ہر دفعہ کسی نہ کسی کیلی گلا کی تصویر بناتے۔ ہندوستان میں مسلم حکومت کی بابت ایلیٹ کسی شاندار فریب نظر سے دھوکا نہ کھا سکا۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت نے پانچ دہائیوں میں اپنے عوام کی بہبودی کے لیے جو کام کیے مسلمان اتنی ہی صدیوں میں نہ کر سکے۔

ایلیٹ نے اپنے ہر پیش رو سے مختلف ہو کر یہ کہا کہ "ہندوستان کے فرمانرواؤں کی حیثیت سے ہماری تقدیر"۔[12] لہٰذا، انیسویں صدی کے وسط تک یہ ابتدائی دور خاتمے کے نزدیک آ چکا تھا۔ اس دور کی آخری بڑی کتاب جے۔ ڈی۔ کننگھم کی ہسٹری آف دی سکھس، پہلے ہی 1849ء میں شایع ہو چکی تھی۔ اسی سن میں ایلیٹ نے اپنی ببلیوگرافیکل انڈیکس شایع کی تھی۔

حوالہ جات

۱۔ اس مقالے میں دیے جانے والے سارے ہی مشاہدات مندرجہ ذیل مصنفوں کی بڑی بڑی متعلقہ کتابوں کے کم و بیش تفصیلی مطالعے پر مبنی ہیں۔

Dew. A The History of Hindostan 3 Vols 1782 72

Gladwin F The History of Hindostan Vol I

Calcutta 1788

Gladwin F. Ayeen Akbary 2 Vols London 1800

Kirk patrick W The Institutes of Ghazan Khan

The New Asiatic Miscellany Calcutta 1789 149 226

Hamilton C The Hedaya or Guide 4 Vols London 1791

Hamilton C An Historical Relation of the Origin

Progress and final Dissolution of the Government of

Rehilla Afgans in the Northern Province of Hindostan

London 1788

Scott J The memories of Eradat Khan London 1786

Scott J Ferishta s History of Dekhan, 2 Vol

Shrewsbury 1974

Francklin W The History of the Regin of Shaw Aulum London 1794

Gibbon E The History of Declinc and Fall of Raman Empire 7 vol 1776 88 edited J B Bury London 1896-1900

Jones W The Works 13 Vols London 1807

Price D Chrenological Retrospect Or Memoir of the Principal events of Mohommedan History 3 Vols, 1811-21

Maurice T The Modern History of Hindostan London London 1802 10

Grant C Observations of the State of Society Among the Asiatic subjects of Great Britain London 1813

Mill J The History of British India 3 Vols London 1817.

Erskine W, Memoirs of Zehir-ed Din Mohammed Baker London 1826

Wills M Historical Sketches of South India, 3 vol, London 1810 17

Briggs J History of the Rise of the Mohommedan Power in India 4 Vols, London 1829

Grant Duff, A History of the Mahrattas, 3 vols, London, 1826

Tod J, Annals and Antiquities of Rajasthan 2 vols London, 1829-32

Gleig G R The History of the British Empire in India vol I London, 1830

Elphinstone M. The History of India 2 vols, London 1841

Gunningham J D A History of the Sikhs, London 1849

Elliot H M Bibliographical Index to the Historians of Muhammedan India Calcutta 1849

2 Mountstuart Elphinstone to William Erskine, 18 7, 1836 quoted Colebrooke T E Life of the Honourables Mount Stuart Elphinstone 2 vols, London, II p 345

3 Forbes D The liberal Anglican Idea of History, Combridge 1952

4 Mountstuart Elphinstone to James Grant Grant Duff 20 4 1822 quoted, Colebrooke T E, the Honourable Mountstuart Elphinstone II p 137

5 Whitehead A N Adventures of Ideas, Cambridge, 1961 p 137

6. The works of Sir William Jones 13 vols London 1807 III p 19

7 Ibid III pp 1 9

8 Birkbeck Hill G [ed] The Memoirs of the l[illegible] of Edward Gibbon London 1900

9 Forbes D The Libral Anglican Idia of History p. 133 Philips C H Historians of India Pakistan and Ceylon London 1961 p 7

10 Elphinstone The History of India I p 323

11. Elliot Perface Bibliographical Index VIII XV

12 Ibid XXX

سرسید اور مولانا شبلی

زیڈ۔ ایچ۔ فاروقی

علی گڑھ تحریک کے بانی سرسید احمد خاں (1817ء تا 1898ء) کئی لحاظ سے نمایاں خصوصیتوں کے حامل تھے۔ انہیں اس لحاظ سے بھی ممتاز حیثیت حاصل ہے کہ انھوں نے ہندوستان اور ہندوستان سے باہر مسلمانوں کی توجہ ان کارناموں کی طرف مبذول کرائی جن کا تعلق ان کے ماضی سے تھا۔ انھوں نے شبلی کی کتاب المامون پر 1889ء میں جو دیباچہ لکھا تھا اس میں ان کے اس رجحان کی جھلک پورے طور پر موجود ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے سوچنے کے ڈھنگ میں یہ رجحان اس طور پر نہیں پایا جاتا کہ اسے بیماری کی حد تک بڑھی ہوئی رومانیت کہا جا سکے، لیکن یہ بات بہرحال درست ہے اور ان مختلف اصلاحی سرگرمیوں سے پہلے کی علمی دلچسپیاں اس کی گواہ ہیں۔ اس رجحان نے ان کے علیگڈھ کے ایک قریبی رفیق شبلی (1857ء تا 1914ء) کی ذات میں ایک ٹھوس شکل اختیار کرلی، جنھوں نے ادب، تاریخ اور دینیات میں اپنے گہرے لگاؤ کے باعث اردو میں فن تاریخ نگاری کو ایک ٹھوس مقصد اور سمت عطا کی۔ اس مقالے میں یہی کوشش کی گئی ہے کہ ان دونوں حضرات نے اس میدان میں جو کوششیں کی ہیں انہیں مختصراً جانچا جائے۔

سرسید کی تعلیم پرانے انداز پر ہوئی۔ لیکن ان میں آزادی سے سوچنے اور

آگے بڑھ کر کام کرنے کی صلاحیت تھی، وہ کیریکٹر اور اخلاقی قوت رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے خاندان اور اپنے روحانی پیشواؤں (شاہ غلام علی کی خانقاہ کے لوگ) کی منشا کے خلاف انگریزوں کی ملازمت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت ان کی عمر اکیس سال تھی۔ اس وقت سے لیکر 1857ء تک جب ان کی زندگی میں ایک اہم موڑ آیا، انہوں نے اگر کوئی کام کیا تو اس کا تعلق علم و ادب سے تھا۔ تاریخ اور ادب سے ان کو گہری دلچسپی تھی۔ انہوں نے روایتی انداز میں راہِ سنت اور کلماتِ حق جیسے رسالے لکھے، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہبی امور کے معاملے میں وہ ہنوز دورِ وسطیٰ میں رہ رہے تھے اور ابھی مغرب کی آزاد خیالی سے متاثر نہیں ہو پائے تھے۔ لیکن جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے ایسے شواہد ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ مغرب کی علمیت سے واقف ہو رہے تھے اس میں شک نہیں کہ انہیں ان پرمسرّت دنوں کا پورا احساس تھا جب مسلمانوں نے ہندوستان کی تاریخ اور تہذیبی ارتقا میں اہم حصّہ لیا تھا۔ ان کی یادگار کتاب آثارالصنادید اس بات کی تائید کے لیے موجود ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے:

از نقش و نگارِ درو دیوارِ شکستہ
آثار پدید است صنادیدِ عجم را

اس شعر سے ان اچھے دنوں کے متعلّق سرسید کے گہرے جذبے اور وابستگی کی ترجمانی ہوتی ہے جب ہندوستان میں مسلم تہذیب اپنے شباب پر تھی۔ اس سے ان کے اس ذہنی رجحان کا بھی پتہ چلتا ہے جس نے انہیں آمادہ کیا کہ خواہ کھنڈرات ہی کے روپ میں، اس گذرے ہوئے قافلے کے آثار ہی محفوظ کر لیں جس سے خود ان کا تعلّق تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ ذہنی رجحان برابر قائم رہا، کیونکہ شبلی کی المامون کے دیباچے میں بھی انہوں نے کچھ اسی انداز سے لکھا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا:

"یہ نہایت سچا مقولہ ہے کہ وہ قوم نہایت بدنصیب ہے جو اپنے
بزرگوں کے کارناموں کو بھلا دے یا ان کو نہ جانے"!

لیکن قطع نظر اس کے، یہ کتاب سرسید کی سخت کاوشوں اور اس علمی منصوبہ بندی پر بھی روشنی ڈالتی ہے جس کے تحت تصنیف و تالیف کا کام کیا جاتا ہے اس ایڈیشن میں کئی خامیاں تھیں مثال کے طور پر، تاریخی عمارتوں کے نقشے تو مکمل تھے؛ لیکن ان سے متعلقہ کتبات نامکمل رہ گئے تھے اور پورے طور سے نقل نہ کیے گئے تھے۔ اس کتاب کی زبان پر تکلف اور جگہ جگہ مبالغہ آمیز تھی۔ سرسید ان خامیوں سے واقف تھے، اور دوسرے ایڈیشن میں جو 1854ء میں شائع ہوا تھا آخری باب، جس میں دہلی کے شاعروں، عالموں، صوفیوں اور فنکاروں کا ذکر تھا، ایڈورڈ تھامس کے مشورے سے نکال دیا گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان اور خالص علمی تحقیق دونوں کے نقطۂ نظر سے یہ کتاب تاریخ کا ایک معیاری تحقیقی کام بن گئی بہرکیف دوسرے ایڈیشن کی بدلی ہوئی زبان سے قطع نظر، تاریخ نگاری کے فن کے پیش نظر سرسید کے بارے میں ڈاکٹر حبیب اللہ کی رائے بڑی جائز لگتی ہے۔ وہ کہتے ہیں: "عہدِ وسطیٰ کے مسلمان مورخین کی روایتوں نے اردو کی ابتدائی کتابوں پر بھی ناگزیر طور سے اپنا اثر ڈالا۔ سرسید احمد خاں کی آثار الصنادید میں، جو اردو میں تاریخ کی اولین کتابوں میں سے شمار ہوتی ہے، یہ اثر نمایاں ہے۔ اس میں ان کے اپنے شہر دہلی کے آثارِ قدیمہ کا بیان ہے اور ساتھ میں تاریخی عمارتوں کے نقشے ہیں نیز ایک باب اس زمانے کے سماج اور طور و طریق پر ہے۔ اگرچہ اس میں ماضی کی تاریخ کی سلسلہ وار بیان نہیں ملتا لیکن اس کا تاریخی مقصد واضح ہے اور روز نیتھال کی تقسیم کے مطابق یہ اسی طرز سے لکھی گئی ہے جسے "لوکل ہسٹری" کہا جاتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ سرسید احمد خاں کے دل میں اس کتاب کے لکھنے کا خیال اس وجہ سے پیدا ہوا ہو کہ اس سے چند برس پہلے ایک برطانوی افسر کی دعوت پر فارسی

میں آگرہ (اکبرآباد) کی دو تاریخیں لکھی جاچکی تھیں ۔۔۔۔ جس قسم کی تفصیلات ــــ ان کتابوں میں ملتی ہیں اسی طرح کی تفصیلات تقریباً سبھی فارسی تاریخوں میں درج کی جاتی تھیں، اور طبقاتِ اکبری اس کی کھلی ہوئی مثال ہے۔ سرسید احمد خاں نے 1839ء میں فارسی میں جامِ جم لکھی تھی، اس میں تیمور سے لیکر بہادر شاہ تک تمام مسلمان بادشاہوں کی مدتِ حکومت، سال تاجپوشی، سنِ پیدائش اور موت وغیرہ کا اندراج جدولوں کے شاتھ ملتا ہے۔ یہ دراصل تاریخ نگاری کی وہ شکل ہے جسے "تقویم" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

آثار الصنادید سے بھی اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف تاریخ نگاری کے سلسلے میں تاریخ کے ماخذوں کی اہمیت سے خوب واقف تھا۔ آثار کی تیاری میں انہوں نے جن اصل ماخذوں سے استعادہ کیا ان کی فہرست دی ہے۔ اس سے بجا طور پر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جب وہ ضروری کتابوں سے استفادہ کررہے تھے، انہیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا، مخطوطوں کی شکل میں کتابیں اس حالت میں ملی ہوں گی کہ ان سے فائدہ اٹھانے میں وقت ہوئی ہوگی اور انہوں نے یہ منصوبہ بنالیا ہوگا کہ اگر زمانے نے کچھ فرصت دی تو ان میں سے کم از کم چند کتابوں کی اشاعت کا انتظام ضرور کریں گے۔ 1855ء میں انہوں نے ابوالفضل کی آئین اکبری کا پہلا لتھوگراف ایڈیشن چھپوایا جس کا متن ان متنوں کے مقابلے کے بعد حاصل ہوا جو مہیا ہوسکے اور اس میں قابلِ قدر توضیحات کا اضافہ کیا گیا۔ محض یہی دو کتابیں (آثار اور آئین) انہیں دنیا کے عالموں میں اونچا مقام دلواسکتی ہیں"۔[2] چند برس بعد 1862ء میں انہوں نے برنی کی تاریخِ فیروز شاہی کی تدوین کی، اور 64-1863ء میں تزکِ جہانگیری کی تدوین کرکے شائع کرایا۔ یہ سب اپنی اپنی نوعیت کے پہلے کام تھے جن سے دوسروں کو یہ احساس ہوا کہ صحیح تاریخ لکھنے میں مغربی طریقہ کار کی کیا اہمیت ہے۔ سرسید کے طریقہ کار اور

اندازِ نظر سے جو اصل دستاویزوں کے مطالعے پر مبنی تھا، مولانا شبلی خاص طور پہ بے حد متاثر ہوئے۔

مولانا شبلی، بہر حال، ایک مختلف طبیعت کے شخص تھے۔ سر سید کی طرح انہیں بھی اسلام کے روایتی علوم کی تعلیم و تربیت دی گئی تھی۔ لیکن سر سید کے مقابلے میں ان کا اسلامی علوم و ادب کا مطالعہ زیادہ وسیع اور گہرا تھا۔ لیکن سر سید حقیقت پسند تھے اور نئے زمانے کی جو یتوں کو پوری طور سے جانتے اور مانتے تھے، جبکہ شبلی رفتہ رفتہ عینیت کی طرف جھکتے گئے اور ان کے یہاں ایک طرح کی رومانیت بڑھتی گئی جس سے وہ اپنے آپ کو کبھی الگ نہ کر سکے۔ سر سید اور حالی (1837ء تا 1941ء) کے برخلاف انہیں نہ صرف یہ کہ اسلام کی عظمت رفتہ کے ذکر کا شوق تھا، بلکہ انہوں نے اسے بیان کرنے کے واسطے ایک پورا پروگرام بنایا تھا۔ انہوں نے مسلم تاریخ کی عظیم شخصیتوں اور ان کے زمانے کے حالات کی تعریف کی اور انہیں دوبارہ زندہ کر دیا۔ انہوں نے رسول کی ذی اثر سوانحوں، اسلام کی ابتدائی برسوں کی عظیم شخصیتوں اور خوشحال عباسی حکومت جس میں بڑے بڑے علمائے دین اور ایرانی شاعر گزرے ہیں، ان سب کے بارے میں ایک پورا سلسلہ کتب قائم کر کے مسلمانوں کو ان کے عظیم ورثے کی یاد اس طرح دلائی کہ وہ اسے بھول نہ سکیں[4]۔ علاوہ ازیں، انہوں نے اسلام اور اس کی عظیم شخصیتوں کی وفاع کی مہم بھی شروع کر دی، جس مہم میں وہ اپنی ماخذی مواد کے موزوں استعمال کے باعث خاصے کامیاب رہے جو مواد انہیں دستیاب ہو گیا۔ وہ علمیت کے جدید تقاضوں سے پوری طرح واقف تھے لیکن بعض اوقات اپنی رومانیت کے باعث وہ غیر معروضی ہو جاتے تھے اور عذر پیش کرنے لگتے تھے۔ پھر بھی وہ اپنے زمانے کے غالباً اکیلے مورخ ہیں جو فنِ تاریخ کے بارے میں ٹھوس نظریات رکھتے تھے۔ اپنی مشہور و معروف کتاب الفاروق کے دیباچے میں وہ مسلم فنِ تاریخ نگاری کے میدان کے ابتدائی باکمال مورخوں، جیسے ابن قتیبہ (المتوفی

276ھ)، واقدی (المتوفی 230ھ)، البلاذری (المتوفی 279ھ)، طبری (المتوفی 310ھ) اور مسعودی (المتوفی 386ھ) کی بڑے پرزور انداز میں تعریفیں کرتے ہیں، لیکن ان لوگوں کی ذہنی تنزلی کا رونا روتے ہیں جو پانچویں صدی کی ابتدا میں ان کے بعد آئے۔ وہ ابن خلدون (1332ء تا 1406ء) کے علاوہ ان سب پر بڑی تنقید کرتے ہیں۔ ان کے بموجب ابن خلدون ہی وہ شخص تھا جس نے فلسفۂ تاریخ کی بنیاد ڈالی۔ وہ کہتے ہیں کہ تاریخ لکھتے وقت دو باتوں پر نظر رکھنی چاہیئے۔

(1) "جس عہد کا حال لکھا جائے اس زمانے کے ہر قسم کے واقعات درج کیے جائیں یعنی تمدن معاشرت، اخلاق، عادات، مذہب — ہر بات پر پورا زور دینا چاہیئے"

(2) "کوشش کرنی چاہیئے کہ تمام واقعات میں سبب اور مسبّب کا سلسلہ تلاش کیا جائے۔"

ان کا کہنا ہے کہ ابتدائی تاریخوں میں یہ طریقہ کار نہیں ملتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ابتدائی مورخین عام طور پر فلسفے اور عقلی علوم سے ناواقف تھے۔ وہ ان مختلف علوم سے بھی ناواقف تھے جن کا تعلق تاریخی واقعات سے ہوتا ہے۔ اس لیے نتیجہ یہ ہوا کہ بیشتر صورتوں میں سیاسی واقعوں، جنگوں، تہواروں اور حکومتوں کے عروج و زوال کو محض بیان کر دینے پر اکتفا کیا گیا۔ اس کے علاوہ ایک اور اہم نکتہ ہے: تاریخ کی کتابوں میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں وہ عام طور پر کس حد تک لائقِ اعتبار ہیں؟ واقعات کی درستی کو جانچنے کے دو طریقے ہیں — روایت اور درایت۔ چونکہ مسلمانوں میں حدیث اور رجال کے علوم کی پوری نشوونما ہو چکی تھی، اس لیے ابتدائی مسلم تاریخ نویسوں نے روایت کے طریقے کا پورے طور سے اور تنقیدی انداز سے استعمال کیا، لیکن درایت کا طریقہ کا نظر انداز کر دیا گیا۔ درایت سے ان کی مراد مختصراً یہ ہے کہ عقلِ سلیم اور اصولِ عقلی کی روشنی میں واقعات کو جانچا اور ماخذوں کو پرکھا جائے۔ وہ اس بات کے بھی حق میں تھے کہ اصول اسباب و علل کی

روشنی میں واقعات کی ترجمانی کرتے وقت قیاس اور اجتہاد سے کام لینا چاہیے۔ اور اسی باعث انہیں یورپی مورخوں میں عیب نظر آتے ہیں۔ زبان اور محاوروں کے بارے میں ان کا خیال یہ ہے کہ سادہ زبان میں بیان کر دیے چاہئیں اور انداز بیان کی لطافتوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔

یہی وہ اصول ہیں جو ان کے بیان کے مطابق تاریخ لکھتے وقت اپنانے چاہئیں۔ لیکن یہ بہر حال بدنصیبی ہی تھی کہ وہ خود پورے طور سے ان اصولوں پر کاربند نہ ہوتے۔ اسی روایتی تعلیم خصوصاً وہ تعلیم و تربیت جو انہوں نے ادب اور مکتبی دینیات میں حاصل کی، سر اسلامی تمدّن کی عظمت کے اظہار اور مدافعت کی جو ذمہ داری انہوں نے خود اپنے سر لے لی تھی، ان سب باتوں کے باعث "تاریخ ان کے نزدیک انسانی سماج کی سیاسی، سماجی اور مادی ترقی نہ رہی بلکہ بنیادی طور پر عقلی اور تہذیبی ارتقا کی تاریخ بن گئی"[5] مزید یہ کہ، المامون میں وہ عذر پیش کرتے نظر آتے ہیں اور الفاروق میں عسر معروضی ہو جاتے ہیں۔

شبلی نے ہندوستانی تاریخ پر بہت کچھ نہیں لکھا، اور اس ضمن میں بھی ایک نکتہ لائق توجہ ہے۔ وہ دنیائے اسلام کو اپنا وطن اور اس کی تاریخ کو اپنی قومی تاریخ سمجھتے تھے۔ المامون کے مقدمے میں وہ کہتے ہیں: "ہندوستان کی بہت سی تاریخیں لکھی گئیں اور مغلیہ اور تیموریہ کے کارنامے بڑی آب و تاب سے دکھائے گئے، لیکن ظاہر ہے کہ ہندوستان کی مجموعی تاریخ ہماری قومی تاریخ کا ایک بہت چھوٹا حصّہ ہے۔"[6] یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہندوستان سے باہر اسلام اور اس کے کارناموں کے بارے میں بہت کچھ لکھا۔ ان کا رسالہ' اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر' واحد کتاب ہے جو انہوں نے ہندوستان کی تاریخ پر لکھی۔ اس کے علاوہ ان کے چند مضامین اور ہیں، مثلاً 'گلبدن بیگم کا ہمایوں نامہ'، 'جہانگیر کی تُزک'، 'عبدالباقی کی مآثرِ رحیمی' 'زیب النساء'، 'مسلمانوں کی علمی بے تعصبی اور ہمارے

اور ہمارے ہندو بھائیوں کی ناسپاسی اور ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر ۔

(1) اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر :

یہ چھوٹی سی کتاب، جو ہندوستانی تاریخ کی ان چند کتابوں میں شمار ہوتی ہے جو اوریجنل کہی جا سکتی ہیں، اورنگ زیب کے دماغ میں ہے۔ شبلی کا خیال ہے کہ اورنگ زیب کو ہمیشہ غلط رنگ میں پیش کیا گیا ہے، اور انگریز مورخوں نیز ان ہندوستانیوں نے جنھوں نے آنکھ بند کرکے انگریزوں کی پیروی کی ہے، اس کے ساتھ بڑی ناانصافی کی ہے۔ گو ان کی دلیلیں سیاسی نوعیت کی ہیں۔ لیکن ان سے ان کا مذہبی رجحان بھی ظاہر ہوتا ہے، اور اورنگ زیب کے عہد سے متعلق بعد میں جو دستاویزیں ملی ہیں اور جو اس وقت انہیں حاصل نہیں تھیں، ان کی بنیاد پر کئی باتوں میں ان کی تردید کی جا سکتی ہے۔ انگریز مصنفین مثلاً الفنسٹن اور لین پول پر ان کی تنقید اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ اس سے ان کا انگریز مخالف رویّہ ظاہر ہوتا ہے۔ جو کچھ تو ان کے اتحادِ اسلامی (پین اسلام ازم) کے خیالات کے باعث تھا اور کچھ علیگڑھ تحریک سے ان کی مخالفت کے باعث تھا۔ اس کتاب میں صرف چند ایک نزاعی پہلوؤں اور واقعوں کو یہ دکھانے کے لیے پرکھا گیا ہے اور ان کی وضاحت کی گئی ہے کہ ناروا داری اور عہد شکنی کے جو الزامات اورنگ زیب پر لگائے جاتے ہیں ان کا کوئی جواز نہیں ہے۔ مصنّف جو خود ایک حنفی سنّی تھے، اس کوشش کے باوجود کہ، معروفیت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے، غیر جانبدار نہ رہ سکے ہیں۔ کیونکہ اورنگ زیب کی مذہبیت، حکومت کے کاروبار میں مذہبی اصولوں پر اس کے عمل اور کٹر مذہبی لوگوں کی بتائی ہوئی راہِ مستقیم سے دارا شکوہ کا گریز اور اس پر اورنگ زیب کی ناپسندیدگی، شبلی اس سبب کی تائید کرتے نظر آتے ہیں

(2) ہمایوں نامہ، معاصرِ رحیمی اور توزک جہانگیری شبلی کے یہ تینوں مضامین دراصل

ایک طرح کی ادبی تقریظیں ہیں، یہ علی الترتیب ۱۹۰۷ء، ۱۹۰۸ء اور ۱۹۱۰ء میں رسالہ الندوہ لکھنؤ میں شائع ہوتے رہے۔ ان مضامین کے لکھنے اور شائع کرنے کا مقصد، ایسا معلوم ہوتا ہے، یہ تھا کہ اُردو پڑھنے والے حلقے میں ان تاریخی ماخذوں کو متعارف کیا جائے اور ہندوستان کے مسلم حکمرانوں اور امراء کے شاندار کارناموں کو عام کیا جائے۔ شبلی کی عظمت اس میں ہے کہ ان میں تاریخ کا شعور بدرجہ اتم تھا اور اس کے ساتھ انہیں اس کی فکر تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ مستند اور بنیادی ماخذوں کی معقول، بے لاگ اور ایماندارانہ جانچ اور پرکھ کے بعد ازسرنو لکھی جائے۔ انہوں نے ان کتابوں کو اسی نقطہ نظر سے جانچا ہے اور پھر اس لحاظ سے ان کی اہمیت بتائی ہے کہ یہ کتابیں بنیادی ماخذ ہیں اور ان سے مغلوں کے تہذیبی کارناموں سے متعلق بادقوں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کہیں کہیں معذرت اور مدافعت کی جھلکیاں ہیں، لیکن مجموعی اعتبار سے یہ تحریریں اس کی شاہد ہیں کہ شبلی دراصل طبعاً مورخ تھے اور اپنی قوم کو تاریخ کا درس دینا چاہتے تھے۔"[7]

(3) زیب النساء — اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء کی زندگی سے متعلق یہ چھوٹا سا مضمون ۱۹۰۹ء میں الندوہ میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کے لکھنے کی تحریک یوں ہوئی کہ اس زمانے میں ایک انگریزی رسالے انڈین میگزین اینڈ ریویو میں زیب النساء پر ایک سستے قسم کا مضمون چھپا جو سنی سنائی باتوں اور بازاری افواہوں پر مبنی تھا۔ اس میں شبلی نے اس بات پر افسوس کیا ہے کہ انگریز مُصنّفین جو غلطیاں کرتے ہیں وہ عام طور پر پھیل جاتی ہیں اور بڑے جوش و خروش سے انہیں سنا اور کہا جاتا ہے۔ وہ نسل در نسل چلتی رہتی ہیں۔ اور لاعلم لوگوں کے ذہن میں مسلمانوں کی اخلاقی زندگی کے بارے میں برے خیالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان تمہیدی جملوں کے بعد انہوں نے زیب النساء کی زندگی کے حالات، مستند تذکروں اور معاصرین کی کتابوں سے اخذ کرکے لکھے ہیں۔ انہوں نے معاصر الامراء، معاصر عالمگیری، سرو آزاد، خزانۂ عامرہ، عالمگیر نامہ، ید بیضا اور مغزن الغرائب سے بہت سے حوالے دیے ہیں

اور مغل شہزادی کے کمالات ظاہری و معنوی نیز اس کے کردار کی ایک صحیح تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کی زبان سادہ اور دلیلیں وزنی ہیں۔

(4) ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدّن کا اثر ــــ یہ مضمون ایک مختصر سی تمہید سے شروع ہوتا ہے اور میرا خیال ہے کہ تاریخ کے بارے میں شبلی کے اندازِ نظر کی عکّاسی کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"کسی غیر قوم کا کسی غیر ملک پر قبضہ کرنا کوئی جرم نہیں، ورنہ دُنیا کے سب سے بڑے فاتح سب سے بڑے مجرم ہوں گے۔ لیکن یہ دیکھنا چاہیے کہ فاتح قوم نے ملک کے تہذیب و تمدّن پر کیا اثر پیدا کیا۔ چنگیز خاں فتوحات کے لحاظ سے دنیا کا فاتحِ اعظم ہے لیکن اس کی داستان کا ایک ایک حرف خون سے رنگین ہے۔ مرہٹے ایک زمانے میں تمام ہندوستان پر چھا گئے لیکن اس طرح کہ آندھی کی طرح اُٹھے، لوٹا مارا، چوتھ وصول کی اور نکل گئے۔ بخلاف اس کے متمدن قوم جب کسی ملک پر قبضہ کرتی ہے تو وہاں کی تہذیب و تمدن دفعتاً بدل جاتے ہیں۔ سفر کے وسائل، رہنے سہنے کے طور، کھانے پینے کے طریقے، وضع و لباس کا انداز، مکانوں کی سجاوٹ، گھروں کی صفائی، تجارت کے سامان، صنعت و حرفت کی حالت، ہر چیز ہر ایک نیا عالم نظر آتا ہے، اور گو مفتوح قوم ضد سے احسان نہ مانے، لیکن در و دیوار سے شکر گذاری کی صدائیں آتی ہیں۔"[9]

اس بیان میں اسی رجحان کی جھلک موجود ہے کہ اسلام سے پہلے دُنیا میں ہر طرف اندھیرا تھا؛ ہندوستان میں، جہاں تک زندگی کے تہذیبی اور تمدّنی پہلوؤں کا تعلّق ہے، ہندوؤں میں کوئی لائق ذکر بات نہیں تھی۔ البیرونی نے کتاب الہند میں جو کچھ لکھا ہے یہ رجحان اس سے کس قدر مختلف ہے۔ لیکن یہ ایک خصوصیت ہے اور یہی خصوصیت حالی، ذکا اللہ اور دوسروں میں بھی ملتی ہے۔ یہ مضمون بہر حال، قابلِ مطالعہ ہے اور شبلی نے ثابت کیا ہے کہ مسلمان کتنی ہی چیزیں اپنے ساتھ ہندوستان لاتے۔ اس کتاب میں بھی وہ اپنے

دعوے کی حمایت میں تزکِ بابری، خافی خاں، تزکِ جہانگیری، آئینِ اکبری اور معاصر الامراء جیسے اصل ماخذوں سے بہت سے اقتباسات پیش کرتے ہیں۔

(5) مسلمانوں کی علمی بے تعصبی اور ہمارے ہندو بھائیوں کی ناسپاسی۔ اس مضمون سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ مسلمان علم و فن کے قدرداں تھے اور ان کو تعلیم دی گئی تھی کہ علم مسلمانوں کا کھویا ہوا سرمایہ ہے اور جہاں یہ ملے حاصل کرلیں۔ ہندوستان آنے سے قبل انہیں علم و فن سے لگاؤ رہا تھا اور جب وہ یہاں آئے تو یہ روایت اپنے ساتھ لائے۔ شبلی نے یہ مضمون بھی ایک اشتعال انگریزی کی بنا پر لکھا تھا۔ بھارت متر کلکتہ کے ایڈیٹر نے ملا مسیح کی رامائن پر ریویو لکھا اور مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا:

" صدیوں سے ایک ایسی کتاب گمنامی کے ظلمات میں پڑی ہوئی تھی، وجہ شاید یہ ہو کہ مکانوں نے اسے پسند نہ کیا ہو۔"

" مسلمانوں نے صدیوں اس ملک پر مسلسل حکومت کی، اور اس کا خاتمہ بھی ہو گیا، مگر اس ملک کے علم و ادب کی طرف انہوں نے بہت کم توجہ کی...... امیر خسرو نے یہاں کی زبان کی طرف توجہ کی تھی مگر محض تفریح کے خیال سے ہندوؤں کی کتابوں کے مطالعے کی طرف کبھی ان کا خیال نہ ہوا، نہ وہ ان کی کچھ خبر رکھتے تھے۔"

" مگر عہدِ اکبری میں جو کچھ ہوا وہ بہت محدود تھا۔" " داراشکوہ نے البتہ ہندوؤں کے اونچے درجے کی کتابوں کی طرف بھی توجہ کی تھی ..... لیکن اس کوشش کی بدولت جو آپ نے ہندوؤں کی کتابوں کو جاننے کے لیے کی تھی، آپ کو کفر کا فتویٰ ملا اور جان دینا پڑی۔"

شبلی اسی طرح کے اقتباسات دیتے ہیں اور انہیں یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ بھارت متر کے ایڈیٹر جیسے عمدہ ذہن کے ہندو بھی بعض اوقات اپنی لاعلمی کی بنا پر ایسے

بے بنیاد الزام لگا دیتے ہیں۔ انہوں نے اس الزام کی سخت تردید کی ہے کہ ملا مسیح کی زندگی اور کارناموں کی بابت ذکر نہیں ملتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ فارسی شاعروں کا کوئی ایک تذکرہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں مسیح کا نام نہ آیا ہو ایڈیٹر نے لکھا تھا کہ ملا مسیح پانی پت کا رہنے والا تھا، اور اس کے بارے میں سوائے اس کے کچھ اور نہیں معلوم ہوتا ہے۔ شبلی کا کہنا ہے کہ جہانگیر کے امرا میں ایک امیر مقرّب خاں تھا جو دراصل پانی پت کا رہنے والا تھا لیکن اس نے کرانہ میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ مسیح کرانہ کا رہنے والا تھا، لیکن چونکہ اسے مقرّب خاں کا قرب اور سرپرستی حاصل تھی، اس لیے اس کے بارے میں بھی یہ سمجھا جانے لگا کہ پانی پت کا رہنے والا تھا، تقریباً ہر تذکرے میں اس کی رامائن کا ذکر موجود ہے، اور معاصرالامراء کے مُصنّف نے اس کے بعض منتخب اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ عوام نے اسے اس لیے بھلا دیا کہ شاعر کی حیثیت سے اس میں کوئی خوبی نہ تھی۔ فردوسی نے اپنے شاہ نامہ میں غیر مُسلم ایرانیوں کی شجاعت اور کارناموں کا ذکر کیا، اور صولت ترکستانی نے صولتِ فاروقی لکھی جس میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے کارناموں کی تعریف کی۔ لیکن کیا ہوا؟ فردوسی کو فارسی شاعری کا ہر طالب علم پڑھتا اور جانتا ہے، جبکہ صولتِ فاروقی سے کوئی واقف نہیں ہے۔ ملا مسیح محض ایک معمولی شاعر تھا۔ اس نے اگر رسولِ خدا کے بارے میں لکھا ہوتا تب بھی عوام اسے نہ جانتے۔

شبلی نے اپنے اس مضمون میں ان سارے الزامات کی تردید کی ہے، اور ماخذوں ہی کی بنیاد پر یہ ثابت کیا ہے کہ ترکوں اور مغلوں کو اس بارے میں کوئی تعصب نہ تھا لیکن یہ سوال جوں کا توں باقی رہتا ہے کہ عام طور پر ہندوؤں

اور مسلمانوں دونوں ہی نے بالکل عقلی اعتبار سے کیا یہ غلطی ہیں کی ہے کہ ایک دوسرے کے مذہب کو نہ پڑھا ہے نہ سمجھے کی کوشش کی ہے۔ آج کے مورخوں سے توقع ہے کہ اس سوال کا جواب دیں گے۔ ان سے یہ بھی توقع ہے کہ اس لاپرواہی کے اسباب و نتائج کی چھان بین کریں گے۔

حوالہ جات

۱۔ شبلی، المامون، قومی پریس، لکھنؤ، این، ڈی، صفحہ ۱ ۔

2۔ Habıb ıllah A B M Historıcal writıng ın Urdu A Survey of Tendencies ın Historions of India Pakistan by C H Philıps London 1961 p 482 83

3 M Mujeeb Indian Muslims London

4۔ W C Smith Modern Inslam ın India London,1946 p 43

5 Habıbullah Op Cıt p 478

6 Shıblı Op Cıt Parr Part I p 2

7 Habıbullah, Op cıt, p 486

8۔ مقالاتِ شبلی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، 1937، صفحہ ۹۴

مُغل ہندوستان کے بعض سوویت مورّخین

سُریندر گوپال

ہندوستان اور سوویت یونین میں بڑھتے ہوئے دوستانہ تعلقات کے ساتھ سوویت یونین میں ہندوستانی علوم سے گہری دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ وہ جدید ہندوستان کی تاریخ کا خاص طور سے مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، لیکن برطانوی فتوحات اور ہندوستان کے معاشی استحصال سے تعلّق رکھنے والے مسائل کو سمجھنے اور ان کے تجزیہ کرنے کے خیال سے سوویت مورخوں نے مغلوں کے عہد میں ہندوستان کی معاشی زندگی پر خاص طور سے توجّہ دی ہے۔

مارکس اور لینن کے مقلّد ہونے کی وجہ سے سوویت مورخین اقتصادی امور میں عقیدہ جبر کے حامی ہوتے ہیں اور زیادہ تر اقتصادی تاریخ پر توجّہ مرکوز رکھتے ہیں۔ جاگیردارانہ دور کے بارے میں وہ عموماً صنعتی اور زرعی پیداوار کی تکنیکوں اور صورتوں، نظامِ زرکی حدود و انتہا، دیہاتوں کو شہروں میں بدلنے کا عمل، شہروں کی نوعیت، زمین کی ملکیت کی نوعیت وغیرہ کی بابت مطالعہ کرتے ہیں اور اس سوال کا جواب فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آیا جاگیردارانہ اقتصادیات میں سرمایہ دارانہ نظام کے عنصر شامل تھے یا نہیں۔ اس مقالے میں عموماً ہماری کوشش یہ رہے گی کہ مغل ہندوستان میں دستکاری پیداوار کی قسموں کی بابت سوویت عالموں کے نظریات کا مطالعہ کیا جائے۔

یہ وہ موضوع ہے جو اُن کے درمیان ہونے والے گرماگرم مباحثوں کا مرکز رہا ہے۔ اس پر بڑی حد تک اس سوال کے جواب کا دارومدار رہا ہے کہ مغل دور میں آیا سرمایہ دارانہ نظام کے جراثیم موجود تھے یا نہیں۔

مرحوم پروفیسر رائزنر نے۔ جن کے سر موجودہ سوویت ماہرینِ ہندوستانیات کے گروہ میں مغل عہد کے ہندوستان کی اقتصادی تاریخ میں شوق کی جوت جگانے کا سہرا باندھا جاتا ہے، اپنے رسالے ناروونی ڈویزنیاوی انڈائی وی XVII تا XVIII وی وی (ہندوستان میں سترھویں اٹھارویں صدیوں کی مقبول عام تحریکیں) میں اسی مسئلے کو اُٹھایا تھا۔ حالانکہ مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں کی تحریکیں اس کتاب کا اصل موضوع ہیں، مگر پروفیسر رائزنر نے پہلے باب میں سترھویں صدی کے دوسرے نصف میں مغل سلطنت کی سماجی و اقتصادی تاریخ کی بعض خصوصیات پر بحث کی ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق اقتصادی زندگی کی مشترکہ خصوصیات یہ تھیں: "ایسی برادری جو کاشتکاروں اور دستکاروں کا مجموعہ تھی، طبقوں اور ذاتوں کی تقسیم ہر جگہ خلط ملط تھی۔ بچی کھچی غلامی اور آبائی املاک نیز قوم واری ڈھانچے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہندوستان میں حرفوں کو کاشتکاری سے پورے طور پر علاحدہ نہیں کیا گیا تھا، اور تجارتی تعلّقات کی نشوونما بس اس حد تک ہو پائی تھی کہ ہندوستانی مشترکہ منڈی تو ایک طرف رہی، ایسے بازار بھی نہیں تھے جو ہندوستانی عوام کے مختلف علاقوں کو چھوتے ہوں۔ ملک کے چھوٹے چھوٹے علاقوں والی جاگیردارانہ تقسیم کا خاتمہ نہ ہو پایا تھا۔"[3] مُصنّف مارکس کے اس نظریے کی تائید کرتا ہے کہ ایسے جاگیردارانہ نظام کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ گھریلو دستکاریاں ہوتی ہیں اور لوگ چھوٹی چھوٹی زمینوں کے مالک ہوتے ہیں[4]۔ ہندوستان میں جاگیرداروں کی جائداد و املاک سرکاری زمین کی صورت میں قائم رہی تاکہ ان ذرائع آبپاشی پر سب کا اختیار رہے جو زرعی پیداوار کے لیے نہایت ضروری تھے[5]۔ سرکاری زمین جائداد ایک ایسی علامت تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا

زمین اور ذرائع آبپاشی پر پورے جاگیردار طبقے کی اجارہ داری ہے، اور اسی کے باعث بڑے بڑے جاگیردار اپنی برتری جتایا کرتے تھے۔

عظیم مغل کا دعویٰ تھا کہ اس کی سلطنت کی آٹھویں حصّہ قابل زراعت زمینیں اس کی نجی زمینیں ہیں۔ جاگیروں والے نظام سے زیادہ تر زمینیں بڑے جاگیرداروں کے ایک گروہ کے سپرد کر دیں۔[6] مغل فرمانرواؤں کی اس پالیسی کے باعث کہ تھوڑی سی مدّت کے بعد جاگیرداروں کا تبادلہ کر دیا جاتا تھا، ان میں یہ ہمّت پیدا ہو جاتی تھی کہ ہر طرح کا جبر کر کے کسانوں سے روپیہ وصول کر لیں۔ لیکن یہ جاگیردار نہ ایسا کر سکتے تھے نہ انہیں اتنا وقت ملتا تھا کہ زمین کے پہلے مالکوں کی زمین پر قبضہ کر لیں۔ زمین کے پہلے مالک زیادہ تر ہندو تھے جنھوں نے زمینوں پر اس وقت قبضہ کر لیا تھا جب وہ ملک کے حکمراں گروہوں میں شامل تھے۔[7] ان جاگیرداروں میں سے اکثر جاگیرداروں کی جائدادیں شہروں میں تھی۔ لیکن ہندوستان کے شہر کاروبار اور دستکاریوں کے مرکز نہ تھے بلکہ جاگیردارانہ عناصر کے زیر اثر تھے۔ جن کے باعث شہروں میں سرمایہ دارانہ عناصر کے پھولنے پھلنے میں بڑی سنگین قسم کی رکاوٹیں حائل تھیں۔[8]

مندرجہ بالا حقائق کے باوجود پروفیسر رائزنر اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ ہندوستانی سماج میں ایسے ترقی پسند عناصر مختلف شکلوں میں ضرور اُبھرے جیسے محنت کش عوام شہروں اور گاوؤں میں تقسیم ہو گئے، شہروں اور گاوؤں میں تبادلۂ اشیا کا عمل تیز ہوتا گیا، علاقائی منڈیاں وجود میں آگئیں جن میں کچھ حد تک زرعی پیداوار کا کاروبار بھی ہونے لگا۔[9] زرعی پیداوار کے سلسلے میں ایسے اشارے ملتے ہیں کہ بعض پیداواریں بعض علاقوں میں خصوصیت سے ہوتی تھیں۔[10] اقتصادی سرگرمیوں کے مرکزوں کی حیثیت سے شہروں کی اہمیت میں اضافہ بھی ہوا۔[11] ان باتوں نے ہندوستان کی دیہی برادریوں کے کردار کی اس خصوصیت کو کہ وہ دوسری برادریوں سے الگ تھلگ رہتی تھیں، کم کیا ہوگا۔

لیکن اس ترقی نے سرمایہ دارانہ نظام کے قیام کی شرطِ اولین کو ابھی تک پورا نہیں کیا تھا، ہاں اس نے اس طبقاتی کشمکش پر ضرور اثر ڈالا تھا جو سماج میں جاری تھی[13]۔ کسان اور دستکار جاگیرداروں کے خلاف جنگ میں متحد ہو گئے۔ اور اس اتحاد کے باعث کئی مقبول عام تحریکیں پیدا ہوئیں[14]۔

اقتصادی زندگی کی ایک اور اہم خصوصیت گاؤں کے مہاجن کا رول تھا۔ پروفیسر رائنرز کے خیال میں اس کی ابتدا سولہویں صدی کے آخر میں ہوئی جب زمین کا لگان نقد روپے کی شکل میں وصول کیا جانے لگا۔ جب اورنگ زیب نے لگان بڑھا کر کل پیداوار کا پچاس فیصدی سے زیادہ کر دیا تو جاگیردار کسانوں کا اور زیادہ استحصال کرنے لگے اور کسان مہاجنوں کے مستقل شکار بن گئے[15]۔ پیداواری قوتوں کو سخت دھکا لگا اور کسان مجبور ہو گئے کہ اپنی زمینوں سے دست بردار ہو جائیں اور کاشتکاری چھوڑ دیں۔ مارکس کی تقلید میں پروفیسر رائنرز کہتے ہیں کہ تجارت اور سود خوری کے بڑھنے سے جو سرمایا حاصل ہوا اس سے کوئی ترقی نہ ہوئی، کیونکہ اس کے باعث پیداوار کی حالت اور زیادہ خراب ہو گئی اور پیداوار کی نوعیت میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی[17]۔

استحصال کے نتیجے میں کسان جاگیرداروں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور طبقاتی جنگ اور زیادہ تیز ہو گئی۔ سترھویں صدی کے آخر میں مغل سلطنت کو جس بحران کا سامنا کرنا پڑا اس کا ایک خاص سبب یہی تھا[18]۔

ایک اور اہم حقیقت جس کے سبب مغل سلطنت کو بحران کا سامنا کرنا پڑا یہ تھی کہ خود طبقہ امراء میں اختلافات بہت بڑھ گئے تھے۔ عیش و عشرت کی زندگی اور فضول خرچی کے عادی ہونے کی وجہ سے وہ مہاجنوں سے اکثر قرض لیتے، اور کسانوں کی طرح مہاجن انہیں بھی اپنے پنجوں میں جکڑ لیتے تھے۔ اس سے بالآخر کسانوں ہی پر بُرا اثر پڑتا تھا۔ اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لیے جاگیرداروں نے تجارت اور مہاجنی شروع

کردی۔ جاگیردار یہ نہیں چاہتے تھے کہ کسانوں کے استحصال سے جو آمدنی ہو اس میں مرکزی حکومت کا بھی حصّہ ہو۔ چھوٹے اور درمیانی درجے کے جاگیردار اور خصوصاً ہندو جاگیردار یہ چاہتے تھے کہ "اپنے کسانوں کا استحصال صرف انہیں کا حق رہے، اس استحصال میں کوئی دوسرا شریک نہ ہو" ملک کے اقتصادی تنزّل میں جب یہ نئی صورت سامنے ہوگئی تو اٹھارویں صدی کے وسط میں مغلیہ سلطنت کے آخری انتشار کے لیے راہیں ہموار ہوگئیں۔[20]

پروفیسر رائزنر سترھویں صدی کے ہندوستان میں یوروپی تجارتی کمپنیوں کے رول پر بھی غور کرتے ہیں، اور یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یوروپی لوگوں نے ہندوستان کو استحصال اور سرمایہ اکٹھا کرنے کے لیے اپنا ہدف بنالیا۔ انہوں نے بحرِ ہند کی گودی میں ہونے والی بحری تجارت سے ہندوستانیوں کو باہر نکال دیا۔ راسِ اُمید ہوتے ہوئے یوروپ کے واسطے جو نیا تجارتی راستہ کھلا تھا اس کے باعث بحرِ روم کے آس پاس کے علاقوں میں ہونے والی ہندوستان کی بری تجارت زوال پذیر ہوگئی، اور بہت سے شہر (خصوصاً شمالی مغربی ہندوستان کے) تباہ ہوگئے۔[21] یوروپین کمپنیوں نے ادھر اقتصادیات پر قبضہ جمانا شروع کیا اور اُدھر ہندوستانی جہازوں پر بحری ڈاکے ڈالنے شروع کردیے۔[22]

پروفیسر رائزنر کا کہنا ہے کہ اورنگ زیب کی اقتصادی پالیسیوں نے مغلیہ سلطنت کے بحران کو نہ صرف شدید کیا بلکہ آخری تباہی تک پہنچا دیا۔[23]

پروفیسر رائزنر نے مغل سلطنت کے خلاف ہونے والی مقبول عام تحریکوں کو بھی موضوع بنایا ہے، اور سلسلے وار بہت سے مضمونوں میں ان پر بحث و مباحثہ کیا ہے۔ انہوں نے خاص طور سے مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں کی تحریکوں کا ذکر کیا ہے۔

دیہی برادری کا انتشار، گاؤوں میں وسائلِ زر کا دخول، جاگیرداروں کی معاشی اور فوجی قوت میں اضافہ، ان سب باتوں نے مرہٹوں میں جاگیردارانہ نظام کی نشو و نما کے واسطے

زمین ہموار کردی اب مرہٹہ جاگیردار اس بات کے لیے تیار ہو چکے تھے کہ نہ صرف بستیوں کی زمین پر قبضہ کرکے اپنی زمینوں کو وسعت دیں بلکہ باہرے لوگوں نے جو زمین ہتھیا رکھی ہے ان سے جنگ کرکے زمین چھین لیں۔ مرہٹہ بغاوتوں کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی تھا۔[24] کسانوں نے ان جاگیرداروں کا ساتھ دیا کیونکہ ان کا استحصال نہ صرف ان کے جاگیردار کرتے تھے بلکہ احمد نگر اور بیجاپور کے جاگیردار بھی کرتے تھے۔ سترھویں صدی کے دوسرے نصف میں مغلوں کے حملے کسانوں کو مکمّل تباہی کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔[25]

پروفیسر رائز نر سکھوں کی شورش کو ایک کسان تحریک کہتے ہیں کہ یہ تحریک شہروں کے خوشحال تاجروں اور دستکاروں نے ان جاگیرداروں کے استحصال کے خلاف شروع کی جو جان و مال حفاظت کی ضمانت بھی نہ دے سکے تھے۔ دارالسلطنت کے قرب کے باعث انہیں بہت سے غیر معمولی ٹیکس دینا پڑتے تھے۔[26] سترھویں صدی کے وسط میں جب مغل سلطنت کا بحران شدید ہو چکا تھا اور ملک کی اقتصادی حالت بہت زیادہ بگڑ چکی تھی تو عوام — یعنی وہ ہزاروں کسان جن کی زمینیں چھن چکی تھیں اور وہ دستکار جن کی روزی ختم ہو چکی تھی تحریک میں شامل ہو گئے۔[27]

جاٹ، جنھوں نے مغل سلطنت کے خلاف دوسری سب سے زیادہ طاقتور تحریک شروع کی، وہ بھی دارالسلطنت کے آس پاس علاقوں میں رہتے تھے رائز نر اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ نہ صرف جاگیرداروں نے بلکہ تاجروں نے بھی ان کا سخت استحصال کیا۔ یہ تاجر دور افتادہ مقاموں سے بیل اور کپڑا خریدنے کے لیے بڑی تعداد میں جمع ہوتے تھے۔[28] ان کے مصائب بڑھ گئے تھے کیونکہ دارالسلطنت کے نزدیک رہنے کی وجہ سے ان سے زبردستی بیگاری جاتی تھی اور شاہی منصوبوں جیسے قلعوں، محلوں، مسجدوں اور سڑکوں کی تعمیر میں لگا دیا جاتا تھا۔[29] مغل فوجیں اپنی جنگی مہموں کا آغاز آگرہ سے کرتی تھیں اور ایسے موقعوں پر بے خوف نظر اطراف کے کسانوں میں خوب لوٹ مار کرتی تھیں۔ اس باعث کسان اور

زیادہ مفلس ہوگئے تھے۔

اس طرح پروفیسر رائزنر نے اُس سٹرن کو وضاحت سے بیان کیا ہے جو سترھویں صدی کے دوسرے نصف میں مغل سلطنت کی اقتصادی حالت میں پیدا ہوچکی تھی، اور یہ دکھایا ہے کہ مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں تینوں کی مقبولِ عام بغاوتوں کو اقتصادی بے اطمینانی سے قوت حاصل ہوئی۔

دوسرے سوویت محققین مغل ہندوستان کی اقتصادی حالت کے بارے میں بحیثیت مجموعی پروفیسر رائزنر کے نظریات سے اتفاق کرتے ہیں۔ ان کے اس بیان سے، کہ سترھویں صدی میں ہندوستان کی اقتصادیات میں وہ عناصر موجود نہیں تھے جن کے باعث جاگیردارانہ اقتصادیات سرمایہ دارانہ اقتصادیات میں بدل سکتی، بعض سوویت محققین اتفاق کرتے ہیں، لیکن دوسرے محققین اس کی تردید کرتے ہیں۔

پروفیسر رائزنر کی تائید کرنے والوں میں سب سے ممتاز شخصیت ڈاکٹر (میڈم) انتونووا کی ہے ڈاکٹر پاولوف، ڈاکٹر علائف، ڈاکٹر چیچیروف، ڈاکٹر (میڈم) اشرفیان پروفیسر رائزنر سے اتفاق نہیں کرتے۔

اکبری ہندوستان پر اپنے رسالے میں ڈاکٹر (میڈم) انتونووا لکھتی ہیں کہ اٹھارویں صدی تک ہندوستان کی اقتصادیات قدرتی اقتصادیات پر مبنی تھی۔[30] پیداوار کے طریقے جاگیردارانہ تھے اور اقتصادیات پر جاگیرداروں کا غلبہ تھا۔ جاگیردار تجارت میں سرگرمی سے حصّہ لیتے تھے۔ ملک میں درآمد کی جانے والی سب کی سب اشیا عیش و عشرت کا سامان ہوتی تھیں جنھیں جاگیردار استعمال کرتے تھے۔[31] تاجروں اور مہاجنوں کی خوشحالی کا دارومدار جاگیرداروں کی خوشنودی پر تھا۔ تاجروں اور مہاجنوں کے سرمائے کی وصولی پر منحصر ہوتی تھی اور اسی لیے کسانوں کے استحصال میں وہ بالواسطہ شریک رہتے تھے۔[32] لہٰذا، انہوں نے جاگیرداروں کی مخالفت نہیں کی اور اس طرح ہندوستان

میں ایک نئے معاشرتی نظام کے عناصر کی تخلیق کرنے سے قاصر رہے۔ ڈاکٹر (میڈم) انتونووا کی رائے میں انتہائی ترقی یافتہ تجارت اور مہاجنی نظام سرمایہ دارانہ نظام کو بڑھنے سے روکتے رہے۔[33]

مُصنّف کو اس بات سے بہر حال اتفاق ہے کہ ہندوستان میں اندرونی تجارت بڑی ترقی کر گئی تھی اور خصوصاً اناج ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجا جاتا تھا ملک کے دوسرے حصّوں میں جو اناج درآمد کیا جاتا تھا اس میں بنگال کا بہت بڑا حصّہ ہوتا تھا[34] میلوں اور منڈیوں کی بڑی تعداد جو عموماً تیرتھ استھانوں کے آس پاس لگتی تھیں، اس بات کا ثبوت ہے کہ اندرونی تجارت بڑے زور و شور سے ہوتی تھی[35] مُصنّف اندرونی تجارت کے عروج کو خود شہنشاہ کی بڑھی ہوئی دلچسپی سے منسوب کرتی ہیں۔ جس نے سڑکوں کا ایک جال پھیلا کر ملک کے مختلف حصّوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا تھا۔[36] ایک اہم بات یہ تھی کہ جاگیردار باہری تجارت کے برعکس ملک کی اندرونی تجارت میں شریک نہیں ہوتے تھے، غالباً اس وجہ سے کہ اس تجارت میں کم فائدہ تھا۔ مُصنّف کہتی ہیں کہ ان تبدیلیوں نے بھی ملک کے اقتصادی نظام کو سرمایہ دارانہ اقتصادی نظام میں بدلنے کے لیے راہ ہموار نہ کی۔

سود خوری کا دائرہ بہت وسیع ہوا، لیکن مُصنّفہ اپنی تائید میں مارکس کو نقل کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ پیداوار کے طریقے میں کوئی تبدیلی آگئی تھی۔ یہ نظام آخر کار مغل سلطنت کے زوال کے اسباب میں شامل ہو گیا۔[39]

شہروں کا ذکر کرتے وقت مُصنّفہ بتاتی ہیں کہ یہ چار قسموں کے تھے یعنی:

(۱) فوجی چھاؤنیوں کے آس پاس والے شہر

(۲) تیرتھ استھانوں کے آس پاس والے شہر

(۳) بندرگاہ ...

(4) اندرونی تجارت اور دستکاریوں کے مرکزوں کے آس پاس والے شہر

بعض شہروں میں بلاشبہ یہ چاروں ہی خصوصیات تھیں۔ سارے شہروں میں ایک قدرِ مشترک تھی ــــ ان سب پر جاگیرداروں کا غلبہ تھا۔ جاگیرداروں کی برتری کے باعث درمیانی طبقے کی نشوونما کے امکانات ختم ہوگئے تھے۔ تاجروں کو اس بات کا موقع نہ ملتا تھا کہ ملک کی سیاسی زندگی میں آزادی کے ساتھ حصّہ لے سکیں[41]۔

دستکار بھی جاگیرداروں کے دست نگر تھے، جو اشیا کی پیداوار اور فروخت میں مداخلت کرتے رہتے تھے[42]۔ حرفوں کی تنظیم بڑے پُرانے انداز کی تھی، اور پیداوار کے اوزار بہت سادہ تھے[43]۔ ایسی کوئی علامت نہیں ملتی جس سے پتہ لگے کہ ہندوستان میں "صنعتی دور" کی سحر ہو چکی تھی، یعنی بہت سے کاریگر اور دستکار ایک مالک کے تحت اور ایک چھت کے نیچے مل کر کام کرنے لگے تھے۔ ڈاکٹر (میڈم) انتونوا کہتی ہیں کہ ہندوستان میں یہ "صنعتی دور" کبھی وجود میں نہیں آیا[44]۔ شاہی کارخانوں میں کاریگر بھی صحیح معنوں میں ملازم نہیں رکھے گئے۔ یہ دستکار وہ لوگ ہوتے تھے جنھیں سزا کا خوف دلاکر کام کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ محنت کی کوئی اندرونی تقسیم نہیں ہوئی تھی، اور کارخانے کسی کی ذاتی تحویل میں نہیں آئے تھے[45]۔ لہٰذا ہندوستان کے اقتصادی نظام میں سرمایہ دارانہ نظام کے عناصر موجود نہیں تھے۔

ڈاکٹر (میڈم) انتونوا وضاحت کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ سرمایہ دارانہ عناصر کی کمی کا سبب جان و مال کا غیر محفوظ ہونا تھا، جس کی وجہ سے لوگ ایسی مہموں میں سرمایہ نہیں لگاتے تھے، جن سے صنعتی پیداوار ہو سکتی تھی[46]۔ مندرجہ بالا دلیلوں کی بنیاد پر ڈاکٹر (میڈم) انتونوا پروفیسر رائزنر کے اس بیان سے اتفاق کرتی ہیں کہ ہندوستان کے اقتصادی نظام میں سرمایہ دارانہ نظام کے عناصر موجود نہیں تھے۔

ڈاکٹر (میڈم) انتونووا نے اپنے دعوے کی اپنے مضمون، اوجننیری سے کیپیٹل ازماوی انڈائی (ہندوستان میں سرمایہ دارانہ نظام کی ابتدا)، میں اور زیادہ وضاحت کی ہے۔ ان کے بموجب گو وسائل زر بڑی تعداد میں موجود تھے لیکن جاگیرداری کا اثر اتنا زیادہ بڑھا ہوا تھا کہ امیر تاجر اپنی دولت چھپانے کی کوشش کرتے تھے تاکہ جاگیرداروں کی لالچی نظریں اس پر نہ پڑنے پائیں۔[47] ہوسکتا تھا کہ ڈھونڈنے پر کوئی امیر تاجر نظر آجاتا۔ لیکن کسی امیر کاریگر کا ملنا ایک نہایت ہی غیر معمولی بات تھی۔[48] وسائل زر کی یہ ترقی بھی خودکفیل گاؤوں کی علاحدگی کو ختم نہ کرسکی پیداوار کے طریقے میں تبدیلی کا تو کہنا ہی کیا اوزان اور پیمائشوں میں بھی کوئی یکسانیت نہ تھی۔[49] پیداوار کے معاملے میں محنت کی تقسیم، جو "صنعتی نظام" کا ایک نہایت ضروری جز ہوتی ہے، حرفوں کے علاوہ کہیں نظر نہیں آتی حرفوں، جیسے جہاز رانی یا کانیں کھودنے میں، بھی یہ بے حد ضروری تھی۔[50] مغلوں کے اقتصادی نظام میں ذیل کے یہ تینوں بنیادی عناصر موجود نہیں تھے، جن کے باعث سرمایہ داریت کو فروغ حاصل ہوتا ہے:

(۱) محنت کشوں کی بہت بڑی تعداد جو ذاتی طور سے کسی کے دست نگر نہ ہوں اور جن کے پاس پیداوار کے واسطے اپنے اوزار نہ ہوں۔

(2) بیشتر سرمائے کا چند ہاتھوں میں ہونا۔

(3) پیداوار کی صلاحیت کا ایک معیار تک پہنچ جانا۔[51]

ہندوستان میں سرمایہ دارانہ انداز کی پہلی فیکٹری انیسویں صدی میں انگریزی سرمائے سے قائم کی گئی تھی۔[52]

ڈاکٹر (میڈم) انتونووا کے دعوے کو ڈاکٹر پاولوف، ڈاکٹر علائف، ڈاکٹر چیچیروف اور ڈاکٹر (میڈم) اشرفیان جیسے بہت سے محققوں نے چیلنج کیا ہے۔ ڈاکٹر پاولوف نے اپنے رسالے فورمی رودانی انڈائی چکوتی بونشوازی (ہندوستانی بورژوازی کی تشکیل)

سترھویں صدی میں ہندوستان کے اقتصادی نظام پر بحث کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہندوستان کے اقتصادی نظام میں سرمایہ داریت کے عناصر موجود تو تھے، لیکن وہ اس قدر قوی نہ ہو پائے تھے کہ کسی مستقل تحریک کا آغاز کرسکیں۔[53] ڈاکٹر پاولوف کا کہنا ہے کہ گجرات کے بندرگاہوں میں بہت سے مزدور ملازم تھے، جو ایک مالک کے تحت کام کرتے تھے اور لہذا اس وقت "صنعتی دور" کا آغاز ہوگیا تھا۔[54] پیداوار کے معاملے میں محنت کش پورے طور سے تقسیم ہوچکے تھے۔[55] اور دیہی برادری کا یہ کردار کہ وہ دوسروں سے بالکل الگ تھلگ رہتی تھی تیزی کے ساتھ ختم ہو رہا تھا۔[56]

ڈاکٹر علائف نے ڈاکٹر پاولوف کی تائید کی ہے۔ انہوں نے اپنے رسالے از ہانے انڈیا (جنوبی ہندوستان) اور ایک مضمون رزویتی انڈس کوچیستوا ٹرد پرونک نودی نیاوی انڈیو اوروپی ستّو (یوروپی لوگوں کے رخوں تک ہندوستان میں کپڑا سازی کی نشوونما) میں ڈاکٹر (میڈم) انتونووا کے دعوے کو رد کردیا ہے۔ ان کے بموجب تاجروں یا ان کے نمائندوں نے کاریگروں کو پیشگی رقم دینے کا جو نظام بنا رکھا تھا، اس کے نتیجے میں کاریگر صحیح معنوں میں ان کے غلام بن کر رہ گئے تھے، اور کاریگر واقعتاً کرائے کے مزدور بن کر رہ گئے تھے۔[57] تاجروں کی گرفت اتنی سخت تھی کہ بہت سے کاریگر پیداوار کے واسطے استعمال کیے جانے والے اپنے اوزاروں سے محروم ہوگئے تھے۔[58] ہندوستانی تاجروں اور دلالوں کی جڑیں اتنی گہری جاچکی تھیں کہ یوروپی لوگ اپنی انتہائی کوشش کے باوجود ان سے پیچھا نہ چھڑا سکے اور کاریگروں سے براہ راست تعلقات قائم نہ کرسکے۔[59]

صنعتی دور کی یہ خصوصیت، یعنی کسی خاص شے کی تیاری میں محنت کشوں کی پورے طور سے تقسیم، ہندوستان میں سترھویں صدی میں موجود تھی۔ گجرات اور کارومنڈل کے ساحلی علاقے میں کپڑے کی رنگائی اور چھپائی کے ماہر پھل پھول رہے

تھے۔ گجرات میں جہازوں کی بار برداری ایک آزاد پیشہ تھی۔ کپڑے بڑے پیمانے پر ایک شہر میں تیار کیے جاتے تھے اور دوسرے شہروں میں ان کی دھلائی اور رنگائی ہوتی تھی[60]۔ الافیین کے بموجب سترھویں صدی میں تنجور شہر کے نزدیک کپڑوں کی چھپائی کی تین بڑی فیکٹریاں تھیں[61]۔ تاجروں نے سرمائے کے ذریعے جب کاریگروں کو مطیع بنا لیا تھا تو بعض ایسے حالات پیدا ہوگئے تھے جن کے باعث سرمایہ دارانہ تعلقات ـــــ کی نشو ونما ہوسکتی تھی[62]۔

ڈاکٹر چیچیروف اپنی کتاب الکنوے چیسکوے رازوتائی انڈائی پیروانگلی اسکم زوددوانیم (برطانوی فتح سے پہلے ہندوستان کی اقتصادی نشوونما) اور مضامین کوٹورائی پیٹریالائی اور ریبز لیہنوم پروئز بور استولے دی سیورو۔ ووستوچنخ رائنوف انڈائی وی XV تا XVII وی وی (سولہویں اور سترہویں صدی میں ہندوستان کے شمال مشرقی علاقوں میں دستکاری پیداوار کی بابت بعض اشیائے ماخذ)، اور پوڈچنینیی ریزلاٹور گووم کیپیٹلوم سیورو۔ ووستوچنخ آئی اُوگو۔ ووستوچنخ رایونخ انڈائی وی وی (اٹھارویں صدی میں ہندوستان کے جنوبی مشرقی اور شمالی مشرقی علاقوں میں تاجروں کے سرمائے کے ذریعے دستکاریوں کا مطیع کیا جانا) میں ڈاکٹر پاولوف اور ڈاکٹر علائف کی تائید کرتے ہیں۔ وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ "سولہویں سے اٹھارویں صدی تک ہندوستان کے جاگیردارانہ اقتصادی نظام میں اسی کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے عمل سرگرم کار تھے جن کے باعث اس دور کے خاتمے کے نزدیک پیداوار سے تعلق رکھنے والے جو رشتے تھے ان میں بعض اشد ضروری تبدیلیاں تو ہوگئیں لیکن وہ پوری طرح سے بدلے نہیں۔"

جہاں تک معیار کا تعلق ہے اس دور میں جاگیردارانہ ہندوستان کے حرفوں میں محنت کی اقتصادی تنظیم کی پرانی روایتی شکلوں کے ساتھ نئی شکلیں بھی اُبھر

محنت کی زیادہ گہری سماجی تقسیم، حرفوں کا زراعت سے اور شہروں کا گاؤں سے علاحدہ ہونا، اور زر و اشیا کے مابین تعلّقات کی نشوونما، ان سب باتوں نے سرمایہ دارانہ انداز کی چھوٹی صنعتوں اور بڑے پیمانے پر مال تیار کرنے والی صنعتوں کی شکلوں میں ایسے بنیادی عناصر مُہیّا کر دیئے جو سرمایہ دارانہ انداز کے تعلّقات کے لیے نہایت ضروری ہوتے ہیں۔[63]

بحیثیتِ مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ سوویت مورخ رخ بدل بدل کر ڈاکٹر پاولوف، ڈاکٹر علائف اور ڈاکٹر چیچیروف کے نظریات کے ارد گرد گھومتے رہے ہیں۔ اس بات کی تصدیق ان خیالات سے ہوتی ہے جن کا اظہار نووے اسٹوریا انڈائی (ہندوستان کی نئی تاریخ) میں کیا گیا ہے۔ (یہ کتاب اٹھارویں صدی کے وسط سے پہلی جنگ عظیم تک کے واقعات کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ سوویت محققین کے ایک مشترکہ منصوبے کے تحت وجود میں آئی ہے اور اسے ادارہِ عوامِ ایشیا، ماسکو نے تیار کروایا ہے، اور اسی لیے کہا جا سکتا ہے کہ اس کے ذریعے سوویت محققین کی ملی جلی رائے کا اظہار ہوتا ہے) سترھویں اور اٹھارویں صدیوں کے پہلے نصف میں ہندوستان کے سماجی اور اقتصادی حالات پر جو باب دیا گیا ہے، اس میں مُصنّف یہ لکھتے ہیں کہ "حرفوں کی مختلف شاخوں میں سرمایہ دارانہ نظام کے عناصر کبھی کبھی اور بالکل ابتدائی صورت میں نظر آئے"۔[64]

نووے اسٹوریا انڈائی کے مُصنّف جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ موجودہ تاریخی ثبوتوں اور شہادتوں پر مبنی ہے اور لگتا ہے کہ دُرست ہے۔

اس نظریے کو تسلیم کرنا غلط ہوگا کہ سترھویں صدی میں ہندوستان کی اقتصادیات جاگیردارانہ انداز سے بدل کر سرمایہ دارانہ انداز پر آگئی تھی، کیونکہ ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا جس سے یہ ظاہر ہو کہ پیداوار کی تنظیم اور طریقے میں کوئی تبدیلی آگئی تھی۔

اُس وقت بھی پیداوار پُرانے اوزاروں کے ذریعے کی جاتی تھی۔ اشیا کی بڑھی ہوئی مانگ پیداوار کی تنظیم اور طریقے میں انقلاب لاکر نہیں بلکہ زیادہ توجّہ اور مہارت کے ذریعے پوری کی گئی تھی۔ زیادہ توجّہ اور مہارت سے مراد یہ ہے کہ پہلے جو بہت سے کسان کچھ وقت کاشتکاری کرتے اور کچھ وقت دستکاری کرتے تھے، انہوں نے زراعت تج کر سارا وقت حرفوں پر صرف کرنا شروع کر دیا۔ اس بات کی تصدیق اُس زمانے کے ماخذوں سے ہوتی ہے اور سوویت محقّقین بھی اسے مانتے ہیں۔ لیکن یہ کہنا بھی اتنا ہی غلط ہوگا کہ ہندوستان کی اقتصادی حالت پر جمود طاری تھا، اور وہ اس لائق نہ تھی کہ نئی چنوتیوں کو قبول کر سکے۔

اس بارے میں ناقابلِ تردید ثبوت موجود ہے کہ ہندوستان کا اقتصادی نظام، جو خود کفیل گاؤوں پر مبنی تھا، اس کی جڑیں کھوکھلی کی جا رہی تھیں۔ زمین کا لگان نقد کی صورت میں ادا کرنے کا جو رواج سولہویں صدی میں رائج کیا گیا، اس نے اقتصادی نظامِ زر کی حوصلہ افزائی کی اور منڈیوں کے لیے مال پیدا کیا جانے لگا۔ اقتصادی نظامِ زر سترھویں صدی کے ہندوستان میں چاروں طرف رائج تھا۔[65] ایسٹ انڈیا کمپنی کے دستاویزات اور ملک میں آنے والے یورپین سیاحوں کے بیانات اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ صرّافوں اور مہاجنوں کی اہمیت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ اس بات کی صریحی علامتیں ہیں کہ اقتصادی نظامِ زر بڑھ رہا تھا۔ سوویت محقّقین، خصوصاً ڈاکٹر پاولوف، ڈاکٹر علاتف ، اور ڈاکٹر چیچیروف، بھی یورو پین کمپنیوں کے فراہم کردہ ثبوتوں اور شہادتوں کی بنیاد پر اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ ایک اور بات جو اقتصادی نظامِ زر کی ترقّی کی نشاندہی کرتی ہے یہ ہے کہ ملک میں سکّے ڈھالنے والی بہت سی ٹکسالیں قائم ہو گئی تھیں۔

سڑکوں کے اس جال نے، جو شیر شاہ اور اکبر نے بنوایا تھا، مرکزِ اقتدار کو مستحکم کرنے کے علاوہ، گاؤوں کی علاحدگی ختم کرنے میں بھی لے لیا۔[66] آمد و رفت کے ذرائع بہتر ہو جانے

کی وجہ سے دور افتادہ مقاموں میں اشیا و شامان کا تبادلہ ہونے لگا۔ مثال کے طور پر کشمیر، گجرات اور بنگال کے درمیان سڑکوں کے راستے نہ صرف بڑے پیمانے پر تیار کیے جانے والے مال کا بلکہ خام اشیا کا بھی تبادلہ ہونے لگا۔[67] لہٰذا ڈاکٹر پاولوف، ڈاکٹر علائف اور ڈاکٹر چیچیروف کا یہ کہنا درست لگتا ہے کہ پورے ہندوستان کی ایک منڈی بنانے کا رجحان موجود تھا۔ اگر یہ بات ہو جاتی تو ہندوستانی گاؤوں کی خود کفیل اقتصادی حالت پر ضرور اثر پڑتا اور پھر ایک بنیادی تبدیلی آ جاتی۔[68]

یہ بنیادی تبدیلی سترھویں صدی میں نہیں آئی، لیکن اس تبدیلی کی علامتیں نظر آنے لگی تھیں۔ ریاست کی بڑھتی ہوئی مانگ اور امرا نیز تاجروں کے جبر کے باعث کسان اور کاریگر دونوں مفلسی کا شکار ہو گئے تھے۔ کسانوں نے اپنی زمینیں چھوڑ دی تھیں اور مزدوروں کی ایک پوری ایسی فوج تیار ہو گئی تھی جو اجرت پر اپنی محنت بیچنے کے لیے تیار تھے۔[69] اہل حرفہ کی حیثیت میں ایک زیادہ اہم تبدیلی آ گئی تھی۔

کاریگروں کی آزادی سلب ہوتی جا رہی تھی عملی طور پر ان کی یہ آزادی ختم ہو چکی تھی کہ اپنا مال خود بازار میں لے جائیں، کیونکہ اب وہ جو کام کرتے تھے تاجر یا تاجروں کے نمائندے اس کی پیشگی اُجرت انہیں دے چکے ہوتے تھے۔ یہ پیشگی اُجرت محض زر نقد[70] یا خام[71] مال ہی کی شکل میں نہ ہوتی تھی، بلکہ پریشانی کی صورت میں، اناج[72] کی شکل میں بھی دیدی جاتی تھی تاجروں کے سرمائے کے ذریعے جب کاریگروں کو مطیع بنالیا گیا تو نظامِ پیداوار کی تنظیم میں غیر واضح لیکن اہم تبدیلیاں آگئیں۔

آزاد کاریگر، جو اب دشواریوں میں پھنس چکا تھا، کرائے کے کاریگر کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے تیار تھا۔ یوروپی لوگوں نے اس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھایا۔ ان کی فیکٹریوں اور کارخانوں میں ہندوستان کا دیگر اجرتوں کی خاطر اپنی مہارت کا سودا کرنے لگے۔ بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ ہندوستانی جولاہے یوروپی لوگوں کے

کارخانوں میں کام کرتے تھے۔[73] انگریزوں نے احمد آباد میں ایک رنگائی کا کارخانہ قائم کیا تھا جس میں ہندوستانی کاریگر کام کرتے تھے۔[74] اسی طرح انگریزوں نے شورہ صاف کرنے کے لیے اپنی فیکٹریاں کھولنی چاہئیں۔[75] چنانچہ ایک نیا رشتہ، مالک اور ملازم کا ــــ جو سرمایہ دارانہ نظام ایک لازمی جز ہوتا ہے ــــ فروغ پا رہا تھا ــــ یہاں صنعتی نظام کا بھی ایک جراثیم موجود تھا (جب بہت سے کاریگران اوزاروں وغیرہ کی مدد سے ایک چھت کے نیچے کام کر رہے ہوں جو اوزار وغیرہ مالک نے فراہم کیے ہوں) جو پیداوار سرمایہ دارانہ نظام کا پیش رو ہوتا ہے۔ ڈاکٹر (میڈم) انتونووا کے اس دعوے کی تردید میں کہ سترھویں صدی میں ہندوستان کے اقتصادی نظام میں سرمایہ دارانہ نظام کا کوئی عنصر موجود نہ تھا اور صنعتی نظام کو کبھی فروغ حاصل نہ ہوا، ڈاکٹر پاولوف، ڈاکٹر علاتف ــــ اور ڈاکٹر چیچیروف نے درست ــــ کیا ہے کہ اسی نکتے پر زور دیا ہے۔[76]

یہ اہم نکتہ تشریح طلب ہے کہ سرمایہ دارانہ اقتصادی نظام کی یہ کلیاں سترھویں صدی میں کھل کر پھول نہ بن سکیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ سارے ہندوستان کا پورا اقتصادی نظام جاگیرداروں کے پنجۂ غصب میں تھا۔ جان و مال غیر محفوظ ہونے کے سبب ہندوستانی تاجروں کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ ایسی تجارتی مہموں میں سرمایہ لگائیں۔ یوروپ کے ملکوں سے مقابلے کے ڈر نے بھی ان پر روک لگائی۔ یوروپی لوگوں نے جاگیرداروں کو مجبور کر کے مختلف سہولتیں حاصل کر لی تھیں اور اس لیے ہندوستانی معشیت میں دیسی تاجروں کے مقابلے میں ان کی حیثیت کہیں اچھی تھی۔ ہندوستانی مہم جو کو پیچھے ڈھکیلنے کے لیے تجارت کے علاوہ کچھ اور طریقے بھی استعمال کرتے تھے جیسے قوت کا استعمال۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی سرمایہ سود پر رقم دینے کے لیے صرف کیا جانے لگا۔ اس میں خطرات کم تھے اور منافع بھی بہت معمولی نہ تھا۔ یوروپی

لوگوں نے اس کی ہمت افزائی کی کیونکہ ان کے پاس سرمائے کی کمی تھی۔ ڈاکٹر پاولوف اور ڈاکٹر علائف نے صحیح کہا ہے کہ اس بات کی وجہ سے سترھویں صدی کی ہندوستانی معشیت میں سرمایہ دارانہ عناصر کی ترقی رک گئی۔

لہذا، مندرجہ بالا شہادت کی روشنی میں یہی نتیجہ نکالا جا سکتا، اور ہمیں نووے اسٹوریا انڈائی کے مصنفوں سے اس نتیجے پر اتفاق کر لینا چاہیے کہ مغلوں کے عہد میں جاگیردارانہ معیشت تبدیل ہو رہی تھی۔ سرمایہ دارانہ نظام کے عناصر جو کمزور تھے اور کبھی کبھی نظر آتے تھے، خود اس لائق نہ تھے کہ جاگیردارانہ معیشت کو مکمل طور سے بدل سکیں۔

مغل ہندوستان کے بعض سوویت مورخوں نے جن ماخذوں سے استفادہ کیا ہے ان پر ایک نوٹ :

ہندوستانی قاریوں کو شاید یہ جاننے کا شوق ہو کہ سوویت محققوں نے نتائج اخذ کرتے وقت کن ماخذوں کو لائق اعتبار سمجھا۔

سوویت محققوں نے اپنے مطالعے کی نوعیت کے اعتبار سے ہی کسی مخصوص ماخذ کی اہمیت کا تعین کیا ہے چونکہ سوویت مورخوں کی توجہ زیادہ تر سماجی اور اقتصادی پہلوؤں پر مرکوز تھی اس لیے وہ آئینِ اکبری جیسی کتابوں اور پیلزائرٹ، لٹور نیر، برنیر اور تھیونوٹ جیسے یوروپی سیاحوں کے سفرناموں کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

مغل ہندوستان کے مطالعے کے واسطے بہت زیادہ ماخذ موجود ہیں اور یہ بات کسی فردِ واحد کے لیے ممکن نہیں کہ وہ ان سب سے استفادہ کرے اس لیے ضرورت اس کی متقضی ہے کہ ان میں سے کچھ کا انتخاب کر لیا جائے اور مختلف سوویت مورخوں نے اپنی تحقیقوں کی نوعیت کے اعتبار سے کچھ مخصوص ماخذوں پر زور

دیا ہے۔

پروفیسر رائزنر نے اپنی کتاب نرو ڈونی ڈویز نیا وی انڈاق وی XVII تا وی وی XVIII میں سترھویں اور اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف میں مقبولِ عام تحریکوں اور ان کے اقتصادی بنیادوں کی جانچ پرتال کو اپنا موضوع بنایا ہے، اور چنانچہ انہوں نے خاص طور سے سترھویں صدی کے یوروپی لوگوں کے سفرناموں پر تکیہ کیا ہے۔ انہوں نے پیلزآنرٹ اور منوچی پر خاص طور سے تکیہ کیا ہے اورنگ زیب کے دور کی معلومات کے واسطے آخرالذکر بلاشبہ ایک ذخیرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ سکھوں کی تحریک کا حال لکھتے وقت پروفیسر رائزنر نے منتخب اللباب جیسے زورناموں پر بھی نظر رکھی ہے، اور اس کے فارسی متن سے استفادہ کیا ہے۔ مزید براں پروفیسر رائزنر نے مرہٹہ اور سکھ تاریخوں پر انیسویں اور بیسویں صدی میں کی جانے والی برطانوی اور ہندوستانی محققوں کی تحقیقوں سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر انہوں نے گرانت ڈف، کننگیڈ نند پرسینس، میکالف، الفنسٹن، کنگھم، ولیم اروِن، مورلینڈ، جارو ناتھ سرکار، ایس، این، سین اور چوکسے وغیرہ کی کتابوں سے استعادہ کیا ہے۔ انہوں نے ایل، آر، کرشن کی فرانسیسی میں لکھی ہوئی کتاب لاسکھس اور ریجنے ایٹ ریویلپمینٹ دی لاکلو نانتے سے بھی رجوع کیا ہے۔

سترھویں اور اٹھارویں صدی میں ہندوستانی برادریوں یعنی مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں کی زرعی تاریخ ازسرِنو لکھتے وقت، پروفیسر رائزنر نے ان ہندوستانی گزیٹیروں سے بہت استفادہ کیا ہے جو انیسویں صدی کے اواخر میں شائع کیے گئے تھے۔ اس کے باعث سترھویں اور اٹھارویں صدی پر بعد کے واقعات کا کسی حد تک عکس پڑ گیا ہے۔ یہاں یہ بتا دینا چاہیے کے پروفیسر رائزنر کے کام میں

ایک سخت رکاوٹ تھی۔ ان کی رسائی مقامی ماخذوں تک نہ تھی۔ پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ سترھویں صدی کے ہندوستان کی زرعی تاریخ لکھنے کے واسطے ضلع گزیٹیروں پر بھروسہ کرنا سوویت فن تاریخ نگاری کی ایک نمایاں خصوصیات ہے۔

اکبر کے عہد میں ہندوستان کی سماجی اور اقتصادی حالت پر ڈاکٹر (میڈم) انتونووا کا جو رسالہ 1952ء میں شائع ہوا تھا، اس میں انگریزی، فارسی، فرانسیسی، جرمن اور روسی، بہت سی زبانوں کے اولین اور ثانوی اہمیت کے ماخذوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ انہوں نے اولین اہمیت کے جو فارسی ماخذ استعمال کیے ہیں ان میں ابوالفضل کی آئینِ اکبری اور اکبر نامہ، بدایونی کی منتخب التواریخ اور نظام الدین احمد کی طبقات اکبری شامل ہیں۔ اکبر کے عہد کا درست ادراک حاصل کرنے کے خیال سے انہوں نے اس عہد سے پہلے اور بعد کے بعض دوسرے فارسی روزناموں سے بھی رجوع کیا ہے۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں — برنی کی تاریخِ فیروز شاہی شاہ نواز خاں کی معاصر رحیمی، نہاوندی کی معاصر الامراء، امین احمد رازی کی ہفت اقلیم، اور اور علی محمد خاں کی مراتِ احمدی۔ (یہاں یہ بتا دینا چاہیے کہ متذکرہ بالا روزناموں میں سے بعض روزناموں سے انہوں نے مسودوں کی شکل میں استفادہ کیا ہے جو تاشقند میں ادارۂ تحقیقات شرقیہ کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ اس کتب خانے میں ہندوستان سے تعلق رکھنے والے پرانے مسودوں کا بڑا عمدہ ذخیرہ موجود ہے۔ یہ ذخیرہ منتظر ہے کہ ہندوستانی محققین اچھی طرح اس کا مطالعہ کریں۔)

ڈاکٹر (میڈم) انتونووا نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات پر پارلیمانی کمیٹیوں کی ان رپورٹوں سے بھی استفادہ کیا ہے جو اکبر کے عہد کے زرعی مسائل پر بحث کرنے کے واسطے انیسویں صدی میں شائع کی گئی تھیں۔

انہوں نے جن دوسرے اولین اہمیت کے ماخذوں سے استفادہ کیا ان میں تلسی داس کی راماین (روسی زبان کا ترجمہ)، اوی گرنتھ (ای۔ٹرمپ کا ترجمہ)، ایلیٹ اور ڈاؤسن، اور یوروپی عصری سیاحوں کے سفرنامے شامل ہیں۔ پروفیسر راتزنر کی طرح وہ بھی پیلزائرٹ کی کتاب جہانگیرس انڈیا پر بے حد تک تکیہ کرتی ہیں تاکہ ہندوستانی کسانوں، کاریگروں اور عوام کی اقتصادی حالت کے بارے میں اپنے اخذ شدہ نتائج پر زور دے سکیں۔

ڈاکٹر (میڈم) انتونووا نے ثانوی اہمیت کے ایسے ماخذوں سے استفادہ کیا ہے جو جرمن، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں ہیں۔ انہوں نے جرمن زبان میں سہلر، گلیسینپ، ہورن اور وان نوءر کی کتابوں سے رجوع کیا ہے۔ فرانسیسی زبان میں انہوں نے تاسی اور منیانت کی کتابوں کے حوالے دیئے ہیں۔ اکبر پر انگریزی میں جو کتابیں دستیاب ہو سکی ہیں ان کا انہوں نے ہر پہلو سے استعمال کیا ہے۔ ان میں ونسینٹ اسمتھ، مورلینڈ، ابنِ حسن، جے، جے، مودی، کرشنا مورتی اور ورما وغیرہ کی کتابیں شامل ہیں۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر (میڈم) انتونووا نے طرح طرح کے بہت سے ماخذوں سے استفادہ کیا ہے۔

ڈاکٹر پاولوف نے اپنی کتاب ورری روذانی انڈائی اسکوئی برزو ہوازائی میں سترھویں صدی کے ہندوستان کی اقتصادی حالت کا احوال لکھتے وقت محض یوروپی سیاحوں کے سفرناموں پر تکیہ کیا ہے۔ انہوں نے یوروپی تجارتی کمپنیوں کی دستاویزوں کو نظر انداز کر دیا ہے اور ایسے اہم سیاحوں کے سفرناموں کو بھی انداز کر دیا ہے جیسے اطالوی سیاح پیٹرو ڈیلا والے اور فرانسیسی سیاح کارے نیز کچھ اور سیاحوں کو بھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مصنّف نے اقتصادی رجحانات کے بارے میں کچھ عاجلانہ نتائج اخذ کر لیے ہیں، جو ان کے پیش کیے ہوئے ثبوتوں

سے میل نہیں کھاتے ہیں۔ مزید براں، مصنّف سترھویں صدی کے بارے میں جو بیانات دیتا ہے ان کی تائید میں بڑی آزادی کے ساتھ سترھویں صدی کے آخر اور اٹھارویں صدی کے وسط تک کے ثبوت و شہادت پیش کرتا ہے۔

ڈاکٹر پاویوف کے برعکس ڈاکٹر علائف اپنی کتاب ازہان انڈیا میں ماخذوں کے بارے میں تفصیلات کا بے حد خیال رکھتے ہیں۔ انھوں نے جو دور منتخب کیا ہے یعنی چودھویں سے اٹھارویں صدی تک کا دور، وہ نہایت طویل ہے۔ اور اس کے بارے میں بہت سے اور مختلف قسم کے ماخذ موجود ہیں۔ ڈاکٹر علائف نے اولین اہمیّت والے طرح طرح کے ماخذوں سے استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے جیسے کتبے، سفر نامے، یوروپی کمپنیوں (خصوصاً انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی) کی چھپی ہوئی دستاویزیں اور عصری روز نامچے (انگریزی ترجمے)۔ انھوں نے ضلع گزیٹیروں، رسالوں، اور دوسری اطاعاتی تحریروں سے بھی استفادہ کیا ہے جو ان کے احاطہ تحقیق میں آتی ہیں اور جنھیں ملکی سرکار کے شعبے موجودہ اور پچھلی صدیوں میں وقتاً فوقتاً شائع کراتے رہے ہیں۔

ڈاکٹر علائف نے عملاً ان ساری طبع شدہ تحقیقوں سے استفادہ کیا ہے جو جنوبی ہند کے بارے میں کی گئی ہیں۔ اور ان کے دور تحقیق سے تعلّق رکھتی ہیں۔ یہ سب تحقیقیں انگریزی میں ہیں اور ہندوستانیوں یا یوروپی لوگوں کی ہیں۔ وہ اپنے نتائج کے بارے میں احتیاط برتتے ہیں اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے عصری ثبوتوں اور شہادتوں کی بنیاد پر نتائج اخذ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر علائف کا رسالہ درحقیقت ایک بڑا تفصیلی تحقیقی کام ہے۔

ڈاکٹر چیچیروف نے اپنا رسالہ اکونوی چیسکوئے رزوتیائی انڈائی پیریڈ انگلائی اسکم زوودوانیم لکھتے وقت اولین اور ثانوی اہمیّت کے سارے ماخذوں (یوروپی تجارتی

کمپنیوں کے طبع شدہ دستاویزات اور اس زمانے کے یوروپی سیاحوں کے طبع شدہ سفر نامے) کے علاوہ انہوں نے فارسی کے ان عصری روزناموں (فارسی میں) کا بھی مطالعہ کیا ہے جن کا ان کے موضوع سے کوئی تعلق ہے۔ انہوں نے بنگالی زبان کے کچھ ماخذوں سے بھی استفادہ کیا ہے تاکہ سماجی و اقتصادی حالت کے بارے میں ان کے نتائج کو تقویت حاصل ہو سکے۔ موضوع سے تعلّق رکھنے والے عصری کتبات کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ دوسرے سوویت مورخوں کی طرح انہوں نے حکومتِ ہندوستان کے مختلف محکموں کی شائع کی ہوئی رپورٹوں کا بھی مطالعہ کیا ہے تاکہ زرعی نظام کے بارے میں صحیح تناظر حاصل ہو سکے۔ ڈاکٹر چیچیروف نے تنقیدی طور سے عملاً ان ساری مطبوعات سے استفادہ کیا ہے جو اس مضمون پر یوروپی اور ہندوستانی محققوں نے انگریزی زبان میں طبع کرائی ہیں۔

لہٰذا اس مختصر بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مغل ہندوستان پر سوویت محقّقوں کی تحقیقیں اولین اہمیت والے طرح طرح کے ماخذوں پر مبنی ہیں۔ ان کی تعریف کرنا چاہیے کہ انہوں نے اتنی زبانوں اولین اہمیت والے اتنے بہت سے ماخذوں سے استفادہ کیا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ طبعی وجوہات کی بنا پر وہ مقامی اشیاء سے استفادہ نہ کر سکے۔

حوالہ جات

۱۔ Contributions of Indian Economic Hist-ory (Calcutta, 1960), p 98

2۔ آئی، ایم، رائزنر، نارڈونی ڈویز نیاوی انڈائی وی XVII تا XVIII وی۔ دی۔ موسکووا، 1961۔

3۔ ایضاً، صفحات 5 تا 6۔

4۔ ایضاً، صفحہ 7۔

5۔ ایضاً، صفحہ 11۔

6۔ ایضاً، صفحہ 14۔

7۔ ایضاً، صفحہ 15۔

8۔ ایضاً، صفحہ 16۔

9۔ ایضاً، صفحہ 17۔

10۔ ایضاً، صفحہ 18۔

11۔ ایضاً

12۔ ایضاً

13۔ ایضاً، صفحہ 19۔

14۔ ایضاً

15۔ ایضاً ، صفحہ 21 ۔

16۔ ایضاً

17۔ ایضاً ، صفحہ 22 ۔

18۔ ایضاً ، صفحہ 24 ۔

19۔ ایضاً ، صفحہ 25 ۔

20۔ ایضاً ، صفحات 26 تا 27 ۔

21۔ ایضاً ، صفحہ 27 ۔

22۔ ایضاً

23۔ ایضاً ، صفحہ 29 ۔

24۔ ایضاً ، صفحات 112 تا 113 ۔

25۔ ایضاً ، صفحہ 113 ۔

26۔ ایضاً ، صفحہ 178 ۔

27۔ ایضاً ، صفحہ 193 ۔

28۔ ایضاً ، صفحہ 223 ۔

29۔ ایضاً

30۔ کے ، اے ، انتونووا ، اوچرکی اوبشچستوینخ اوتنوشینی ، ای ، پولیٹی چسکوگو اسٹوری منگولسکائے انڈاق وریمن اکبارا (1556 تا 1605) ، موسکووا ، 1952 صفحہ 111 ۔

31۔ ایضاً ، صفحہ 113 ۔

32۔ ایضاً

33۔ ایضاً ، صفحہ 114

34۔ ایضاً، صفحہ 118 ۔

35۔ ایضاً، صفحات 118 تا ۱۱۹ ۔

36۔ ایضاً، صفحہ 120 ۔

37۔ ایضاً، صفحہ 123 ۔

38۔ ایضاً

39۔ ایضاً، صفحہ 125 ۔

40۔ ایضاً، صفحہ 128 ۔

41۔ ایضاً، صفحہ 134 ۔

42۔ ایضاً، صفحہ 135 ۔

43۔ ایضاً، صفحہ 136 ۔

44۔ ایضاً، صفحہ 138 ۔

45۔ ایضاً، صفحہ 139 ۔

46۔ ایضاً، صفحہ 140 ۔

47۔ اوجی جینیز یسے کیپیٹل ازماوی الٹرانیکس وومستکا، موسکووا، 1962، صفحہ 181 ۔

48۔ ایضاً

49۔ ایضاً، صفحہ 182 ۔

50۔ ایضاً، صفحہ 184 ۔

51۔ ایضاً، صفحہ 187 ۔

52۔ ایضاً، صفحہ 194 ۔

53۔ پاوبوف، فوریر دونی انداتی اسکوئی برژوازی، موسکووا، 1958،

صفحات 35 تا 36 ۔

54۔ ایضاً، صفحہ 35 ۔

55۔ ایضاً، صفحہ 32 ۔

56۔ ایضاً، صفحہ 16 ۔

57۔ علائف، ازبانِ انڈیا، موسکووا، 1960، صفحہ 59 ۔

58۔ اوجینیز پیے، صفحہ 176 ۔

59۔ ازبان، صفحہ 61 ۔

60۔ ایضاً، صفحات 65 تا 66 ۔

61۔ جینیز پیے، صفحہ 177 ۔

62۔ ایضاً، صفحہ 176 ۔

63۔ چیچیروف، اکنومے چسیکوئے زرویتی انڈائی پیریڈ انگلائی اسکم زوودانیم، ماسکووا، 1965، صفحہ 280۔

64۔ لزوے اسٹوریا انڈائی، موسکووا، 1961، صفحہ 55 ۔

65۔ ڈاکٹر عرفان حبیب نے اپنے مقالے " Banking in Mughal India " میں خاصی تفصیل سے بحث کی ہے۔ یہ مقالہ کتاب Contribution Indian Economic History میں چھپا ہے۔ جلد اوّل، صفحات 1 تا 21 ۔

66۔ The Cambridge History of India (Cambridge, 1937) Vol IV, P 57 K A Antova, Ocherki p 120

67۔ Pant, D , The Commercial policy the Mughal, (Bombay 1930), P 95, Ed Dauvers FC Letters ecived by the East India Co from its servants in the East 1602-13 (London 1896) Vol I p.32 Pelsaert, Jahargir s India, (Cambridge, 1925) p 19

68۔ ہم اس کا حوالہ بھی دے سکتے ہیں کہ اناج ہندوستان کے ایک حصے سے دوسرے حصوں میں بھیجا جاتا تھا۔ ان دنوں یہ ایک عام بات تھی۔

Irfan Habib the Agrarian System of Moghul India
London 1963

69۔ اس بیان کی تائید میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شہروں میں ملازموں کی بہتات تھی اور غلاموں کی تجارت زوروں پر تھی۔

70۔

The English Factories in India 1622 23 (Oxford 1908)
P 116 The English Factories in India 1661 64
(Oxford 1923) p 209 The Diaries of Streynsham
Master London 1911) Vol I p 113

71۔ Fryer A New Account of East India and Persia
(London 1909)Vol I p 122 Master Vol I p 135

72۔ The English Factories in India 1630-33 Oxford1910 33

73۔ Master Vol I pp 113 138 141

74۔ The English Factories in India 1646 (Oxford
1914)pp 27

75۔ The English Factories in India 1942 45 (Oxford 1913)
pp I 64 - 205

76۔ یہاں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جہاز سازی اور کان کنی میں صنعتی نظام کے جراثیم پہلے ہی موجود تھے۔ یورپی سیاحوں کے بیانات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

آنند کمار سوامی راجپوت مصوری
کے مورّخ کی حیثیت سے

بی۔ این۔ گوسوامی

راجپوت مصوری کے مورّخ کی حیثیت سے آنند کمار سوامی کے بارے میں لکھنا بیک وقت مشکل بھی ہے اور آسان بھی۔ آسان یوں ہے کہ اس کی ذات یا اس کی تحریکوں کے بارے میں شاید ہی کچھ ایسی باتیں ہوں جو معلوم نہ ہوں۔ وقت کے اعتبار سے وہ ہم سے اتنے نزدیک ہیں کہ ان کی زندگی کے بارے میں بہت کچھ اور ان کی تحریروں کے بارے میں شاید سب کچھ معلوم ہے، اور مزید یہ کہ، جن ماخذی اشیاء کو انہوں نے اپنے موضوعات کی بنیاد بنایا ہے وہ ایسی نہیں ہیں جن تک صرف انہی کی رسائی ہوئی ہے۔ اور پھر بھی ان کے کام کے بارے میں کچھ لکھنا نہ صرف اس لیے مشکل ہے کہ راجپوت مصوری پر حرفِ آخر ابھی لکھا نہیں گیا ہے ــــ ہر گزرتا ہوا سال نئے دستاویزوں پر روشنی ڈالتا ہے ــــ بلکہ اس لیے بھی مشکل ہے کہ ان کی تحریر کی روشنی دل میں گھر کر جاتی ہے اور وہ اتنے سلیقے سے لکھتے ہیں کہ جہاں انتہائی زور دے رہے ہوں وہاں بھی عمدگی کے ساتھ کسی نہ کسی طرح اصلاحات کی گنجائش چھوڑ دیتے ہیں تاکہ ان کے دعوے بھی اپنی جگہ قائم رہیں اور اصلاحات بھی باقی رہیں۔ وہ اتنے نفسِ کامل کے ساتھ لکھتے تھے اور ان میں قارئین

کو متاثر کرنے کی اتنی صلاحیت موجود تھی کہ آج بھی کوئی شخص ان کی کتاب پڑھتا ہے تو اس پر بے جانے بوجھے ان کا جادو چل جاتا ہے، اور ان کے بارے میں اس کا فیصلہ معطل سا ہو کر رہ جاتا ہے۔

آزاد فیصلوں کو اپنے حق میں بدل لینے کی اس لیاقت کا مظاہرہ انہوں نے اپنی ابتدائی تحریروں سے اس زمانے میں ہی کر دیا تھا جب انہوں نے علم معدنیات کو چھوڑ کر ہندوستان کے فن اور تہذیب کی ترجمانی شروع کر دی تھی، اور جب انہوں نے اپنی کتاب راجپوت پینٹنگ لکھی، جس سے پہلے اسی موضوع پر 1912ء میں وہ ایک مختصر مضمون لکھ چکے تھے[2]۔ تو مغربی دنیا میں جیسے طوفان آگیا۔

ان کی راجپوت پینٹنگ کی پہلی طباعت کو پچاس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس وقت سے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اور ابتدائی زمانے کی ان تحریروں میں ہندوستانی مصوری پر کی جانے والی تحقیقوں کے باعث بڑی اہم تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔ اس لیے اب وقت آگیا ہے کہ ڈاکٹر کمارسوامی کے کام پر اور خصوصاً اس کام پر جو راجپوت مصوری سے تعلق رکھتا ہے نئے سرے سے نظر ڈالی جائے۔ یہ نظر محض اس خیال سے ہی نہ ڈالی جائے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے فیصلے پختہ ہو گئے ہیں، بلکہ اس لیے بھی ڈالی جائے کہ گو یہ ایک رسم سی بن گئی ہے کہ کمارسوامی کے اخذ کردہ نتائج سے اختلاف کیا جائے، پھر بھی اس موضوع پر لکھنے والے تقریباً سارے ہی مصنف ... جب راجپوت مصوری کی روح تک پہنچنا چاہتے ہیں تو انہی کی تحریر سے مدد لیتے ہیں۔ وہ کتاب جس نے مصنفوں کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا تھا اب بھی باعث دلکشی بنی ہوئی ہے۔

آنند کمارسوامی کی کتاب کی خوبیوں پر اگر تفصیل سے گفتگو کی جائے تو ایسا لگے گا کہ جانی بوجھی باتوں کو بار بار کہا جا رہا ہے۔ صحیح معنوں میں انہوں نے ہی راجپوت

فن کی دریافت کی، اور اگر یہ کہا جائے کہ راجپوت مصوّری کے نمونے موجود تھے اور ان سے پہلے شائع بھی کیے گئے تھے[3]۔ تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان سے پہلے نہ ان نمونوں پر مجموعی طور سے نظر ڈالی گئی تھی اور نہ انہیں صحیح طور سے سمجھنے کی کوشش کی گئی تھی وہ ایک انبار کی شکل میں پڑے ہوتے تھے جنھیں دورِ وسطیٰ کی ہندوستانی مصوّری کا نام دیا جاتا تھا، اور اس بات کا سہرا ڈاکٹر کمار سوامی کے سر ہے کہ انہوں نے ان نمونوں کو ڈھونڈا، جھاڑا، پونچھا اور پھر اپنے لطیف محاوروں کے چوکھٹے میں جڑ دیا۔ اس کے بعد انہوں نے ہمارے واسطے راجپوت مصوّری کے جوہر کو چھان کر نکالا، اور اس مہم میں ان کے فکر و خیال کی وہ تابناکی اور اظہار خیال کی وہ روانی اور حسن کام آیا جو ان میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ ہندوستانی فن کے معاملے میں انہیں بلاشبہ آج تک کے سارے فصیح ترین مُصنّفوں میں شمار کیا جانا چاہیے۔ اس کے علاوہ انہوں نے پیہم کوششوں کے ذریعے نئی تحقیقات کے لیے ایک ماحول بنا دیا اور اس ماحول کو بیڈن پوول اور جیمس فرگوسن جیسے ماہرین، کی لغویت اور تعصب[4]، نیز ہندوستانی فن کو "دوبارہ زندہ کرنے والے" متعدد مُصنّفوں کی بے جا محبت اور بے جا جوش و خروش سے پاک کر دیا۔

ہمارا خاص مقصد بہر حال یہ ہے کہ آنند کمار سوامی نے مورّخِ فن کی حیثیت سے جو کام کیا ہے اس پر نظر ڈالیں، اور جب اس نظر سے دیکھا جاتا ہے تو ان سے بہت سے اختلافات بھی پیدا ہونے لگتے ہیں۔ چنانچہ اس مختصر مقالے کا ایک ضروری مقصد یہ بھی ہے کہ ان اختلافات کو ضابطہ تحریر میں لایا جائے۔ ایسا کرتے وقت غلطیاں بھی سرزد ہو سکتی ہیں، لیکن ذیل کے نکات اس لیے سامنے لائے گئے ہیں کہ مختلف نقطۂ نظر کا پیش کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

ابتدا ہی میں ہر شخص مجبور ہو کر یہ سوال پوچھ لیتا ہے کہ ڈاکٹر کمار سوامی کی

رائے میں وہ حدود کیا ہوتیں ہیں جن کا ایک مورّخِ فن کو احترام کرنا چاہیے۔ انہوں نے اپنی کتاب راجپوت پینٹنگ[5] میں لکھا ہے کہ "کسی کو مورّخِ فن ثابت کرنا ہو تو اس میں لیاقت ہونا چاہیے کہ وہ اپنے موضوع اور اپنے قاری کے درمیان ایک تعلّق قائم کر دے" اور اپنا جملہ جاری رکھتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ "میں نے بس یہی کوشش کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ اس معمولی بیان کا کوئی معمولی حصّہ نہ تھا جس بیان کے ذریعے انہوں نے اپنی ابتدائی کتاب کے "مستقبل کے طلبا" سے" ارادی اور غیر ارادی غلطیوں" کو نظر انداز کرنے کی درخواست کی تھی۔ یہ جملہ مورّخِ فن کی مقصد کی سوچی سمجھی تعریف تھا۔ کم و بیش اسی تعریف سے وہ آخری ایّام تک وابستہ رہے۔ اس ابتدائی زمانے کے سیاق میں دیکھا جائے تو یہ بات سمجھ میں آنے لگتی ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب راجپوت پینٹنگ میں اس مظہرِ حسن کی سماجی اور نفسیاتی تشریحات پر اتنا وقت کیوں صرف کیا۔ لیکن برسوں بعد بھی وہ یہی سمجھتے تھے کہ بحیثیت مورّخِ فن یہی تشریحات اُن کا موضوع سخن ہیں۔ مدرسہ ہائے فن میں امتیاز، مختلف طرزِ فن کا ارتقا، ان کا تجزیہ اور ان کے [illegible] آپسی تعلقات۔ ان سب باتوں کی اہمیت جیسا کہ ان کی کتاب میں ہے۔ بس معمولی رہی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے ان باتوں کو نظر انداز کیا [illegible] اور بصیرت کی ہمہ [illegible] کے ساتھ انہوں نے ایسے اشارے دیئے اور ایسے خطوط قائم کیے جنہوں نے بعد کی تحقیقوں پر بڑا گہرا اثر ڈالا، لیکن ان باتوں پر انہوں نے خاص طور سے سوچا ہو ایسا شاید ہی کبھی ہوا ہو۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا بیشتر وقت راجپوت مصوّری کی تاریخ لکھنے پر نہیں بلکہ اس کی ترجمانی پر صرف ہوا۔

آیئے اس کی ایک مثال لیں۔ آنند کمار سوامی نے راجپوت مصوّری کو راجستھانی اور پہاڑی دو بڑے خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ اپنی کتاب راجپوت پینٹنگ میں انہوں

نے اوّل الذکر کو جے پور، بنسا، اور چھا اور" غالباً اودے پور اور آجبّن" وغیرہ جیسے مقامی مدرسہ فن میں تقسیم کیا ہے، اور یہ تقسیم کرتے وقت انہوں نے مقامات کے درمیان محض فاصلے کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بارے میں کوئی طویل بحث نہیں کی ہے کہ وہ کیا چیزیں ہیں جو ایک سے دوسرے کو جدا کرتی ہیں۔ پہاڑی گروہ میں انہوں نے دو خاص مدرسوں جموں اور کانگڑہ کے درمیان لکیر کھینچی ہے، اور اس پورے علاقے کی مصوّری کے سارے نمونوں کو انہی دو مرکزوں سے وابستہ کر دیا ہے، لیکن ساتھ ساتھ اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ کچھ اور مرکز بھی ہو سکتے ہیں جیسے چمبا، کُولُو، منڈی، سوکیت، رامپور، گولیر جہاں زیادہ سرگرمی تھی[8]۔

راجپوت پینٹنگ کی اشاعت کے تقریباً دس سال بعد انہوں نے مقامی مدرسوں میں راجپوت مصوّری کی جو تقسیم کی تھی اس میں اور زیادہ مواد کا اضافہ کرنا چاہا، اور راجستھان گروہ میں بندیل کھنڈ، میواڑ، مغربی مالوہ اور گجرات نیز مرکزی راجپوتانہ (جس میں انہوں نے "جودھ پور، بیکانیر اور سب سے زیادہ یہ کہ جے پور" کو رکھا) کے مرکز شامل کر دیئے[9]۔ ہر چند کہ یہ تقسیم بڑی تفصیلی اور مؤثر معلوم ہوتی ہے، پھر بھی ان بنیادوں پر گفتگو کرنا خارج از دلچسپی نہ ہوگا جن کی بنیاد پر ڈاکٹر کمار سوامی نے ان میں تمیز کی اور فن کے نمونوں کو بعض مدرسوں سے منسوب کیا۔ ابتدائی راگ مالا مجموعے بندیل کھنڈ کے حصّے میں آئے۔ جس کے بارے میں ان کی رائے یہ تھی کہ "نمونوں میں دی ہوئی عمارتوں کا انداز عموماً ایک جیسا ہے، اور ان پر جو اشعار لکھے ہوئے ہیں ان کی زبان ایک جیسی ہے[10]"۔ لیکن ایسا لکھتے وقت انہوں نے ایمانداری سے اس ڈر کا بھی اظہار کیا کہ "یہ بنیاد کمزور بھی ہو سکتی ہے"۔

میواڑ مصوّری کے واسطے ان کے نزدیک خاص ثبوت یہ تھا کہ مصوّری کے نمونوں

میں شری کرشن کو شری ناتھ جی کے روپ میں دکھایا گیا ہے، اور چونکہ یہی چیز ناتھواڑہ کے مندر میں ملتی ہے اس لیے "فطری طور پر یہ فرض کیا جا سکتا ہے" کہ مصوّری کے یہ نمونے میواڑ میں تیار کیے گئے تھے۔ اُودے پور کے جھیل محلوں میں دیواری تصویریں بھی موجود تھیں، اور اُودے پور کے خاص محل کی دیواروں "زیادہ سی شبیہیں اور مصوّری کے دوسرے نمونے" موجود ہیں۔

ڈاکٹر کمار سوامی نے مزید کہا کہ جودھ پور کی مصوّری "ایک خاص قسم کے بڑے صافے[12]" کی وجہ سے پہچانی جا سکتی تھی؛ اور جہاں تک اجمیر اور کچھواہوں کے دارالحکومت آمبیر کا تعلق ہے، "بڑے معقول طور پر یہ فرض کیا جا سکتا ہے ..... پہلے ہی سولھویں اور سترھویں صدی میں راجپوت مصوّری کا خاص مرکز تھا۔" اس مفروضے کا ایک سبب تو یہ ہے کہ جے پور اور مغل دربار کے درمیان سیاسی تعلّقات کے باعث اس مصوّری نے ابتدائی مغل مصوری کو متاثر کیا تھا، اور دوسرا سبب یہ ہے کہ بیسویں صدی کے جے پور میں کاغذ اور دیوار دونوں پر مصوّری کی ایک قومی روایت موجود ہے۔[13]

ڈاکٹر کمار سوامی نے مصوّری کے تقریباً ان سارے مدرسوں کی بابت جو کچھ لکھا ہے اس میں خاص معقول باتیں بھی ہوں گی، لیکن ہر شخص کی توجّہ اس طرف مبذول ہو جاتی ہے کہ جن باتوں کی بنیاد پر وہ مختلف مدرسوں میں تمیز کرتے ہیں ان کا تعلّق طرزِ مصوّری کی اندرونی خوبیوں سے الگ ہوتی ہیں۔ کوئی بھی شخص یہ سوچ سکتا ہے کہ ڈاکٹر کمار سوامی نے جن باتوں کو ثبوت بنایا ہے وہ باتیں دراصل ہر مدرسہ فن کے مزید تجزیے کا آغاز بن سکتی ہیں، ایک ایسی ناقابل اعتراض بنیاد جس کی بنا پر کسی مخصوص مدرسہ فن کی مصوّری کے نمونوں کو یکجا کیا جا سکتا ہے۔ یہ بڑی فطری بات ہوتی ہے کہ کسی مدرسہ فن کے طرزِ مصوّری کے اجزائے ترکیبی کا بیان

اور تجزیہ کرکے اس مرکزِ فن کے انداز پر بنائے ہوئے مصوّری کے زیادہ سے زیادہ نمونے شناخت کیے جاتے اور پھر اس مدرسہِ فن کی نشوونما بیان کی جاتی۔ لیکن کام کا یہی زیادہ اہم حصہ تشنۂ عمل رہ گیا ہے۔

پہاڑی مصوّری کی بابت ڈاکٹر کمارسوامی کے بیان میں یہی بات نظر آتی ہے کہ وہ پنجاب کے پہاڑی علاقوں کی مصوّری کے نمونوں کو طرزِ مصوّری کی بنیادوں پر شناخت کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔ انھوں نے 1916ء میں پہاڑی مصوّری کے نمونوں کی جمّوں اور کانگڑہ دو گروہوں میں جو تقسیم کی تھی اس تقسیم کو انھوں نے اپنے کیٹلاگ میں قائم رکھا لیکن اس کے ساتھ یہ لکھ دیا کہ "ہو سکتا ہے کہ زیادہ صحیح علم حاصل ہونے پر پہاڑی مصوّری کے زیادہ نہیں تو کچھ نہ کچھ نمونوں کو کسی اور منصوبے کے تحت تقسیم کرنا پڑے[5]"۔ لیکن اس "منصوبے" میں اس سے زیادہ کچھ اور نہیں کہ روایتی بیانات کے مطابق پہاڑی ریاستوں کو سیاسی اعتبار سے مشرقی یا جالندھر کے قرب وجوار کی ریاستوں کے گروہ اور مغربی یا ڈوگرا ریاستوں کے گروہ میں تقسیم کیا گیا ہے، جس میں سے ہر گروہ میں گیارہ ریاستوں کے نام اور اُن پر حکومت کرنے والے خاندانوں کے نام دیے گئے ہیں جیسے کٹوچ، گلیریا، جاموال، جسروٹیا وغیرہ۔ اس بات کا یا تو معمولی سا ذکر ہے یا پھر کوئی ذکر نہیں ہے کہ کیا ہر خود مختار سیاسی اکائی سے لازمی طور پر یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہاں مصوّری کا اپنا ایک آزاد طرز موجود تھا، اور حالانکہ ڈاکٹر کمارسوامی کے خیال میں نور پور، گولر، کانگڑہ، منڈی، سکھیت جمّوں اور بندھرالٹا کے علاوہ دوسری ساری ریاستوں میں اپنے اپنے مدرسہِ فن تھے، لیکن اس وقت تک جو علم حاصل ہوا تھا اس کی روشنی میں ان کے لیے یہ بتانا مشکل تھا کہ کون سا نمونہ کس مدرسہ فن سے تعلّق رکھتا تھا۔[5]

یہ نتیجہ اخذ کرنا ہی پڑتا ہے کہ ڈاکٹر کمار سوامی نے مصوّری کے مقامی مدرسہ ہائے فن کا موجود قائم کرنے کے لیے سیاسی حدود اور سیاسی اثر کو مرکزی اہمیّت دی۔ کیونکہ اگر ایسا نہ سمجھا جائے تو پنجاب کے پہاڑی علاقوں کی ساری ریاستوں، اور جموّں نیز کانگڑہ سے تعلّق رکھنے والے فن کے دونوں مدرسوں کی وضاحت کرنا بڑا مشکل ہو جائے گا۔ آخر الذکر کے معاملے میں وہ بڑے معنی خیز انداز میں یہ تحریر کرتے ہیں کہ اگر اس مظہرِ حسن کی وضاحت انہیں کرنا پڑے تو وہ اس طرح کریں گے کہ "یہ بنا دیا جائے کہ اٹھارویں صدی میں جموّں اور کانگڑہ پہاڑی ریاستوں میں سب سے زیادہ طاقت ور اور دولت مند ریاستیں تھیں"۔[۱۶]

ڈاکٹر کمار سوامی نے جو بڑے بڑے فرق بتائے ہیں وہ اب بظاہر معقول نہیں لگتے، اور خوش قسمتی سے اب ہمیں مقامی مدرسہ ہائے فن کے بارے میں بہت زیادہ علم حاصل ہو چکا ہے، لیکن اس سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ بسوہلی، مانکوٹ، کُولُو اور بلاس پور جیسے مرکزوں میں فن کی نشو و نما کی جو اہمیّت ہے، اس زمانے میں اندازہ نہ لگا پانے کی وجہ سے میں انہیں مورد الزام ٹھہرا رہا ہوں۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ ڈاکٹر کمار سوامی نے جو تقسیم کی اس میں جلد بازی سے کام لیا، اور ثبوت و شہادت کے لیے جن اشیا کو بنیاد بنایا انہیں اور زیادہ بہتر طریقے سے بنیاد بنایا جا سکتا تھا۔

یہ بات ہمیں ان ماخذوں میں سے ایک ماخذ کی طرف لیجاتی جیسے ڈاکٹر کمار سوامی نے معلومات حاصل کرنے کے لیے لائقِ اعتبار سمجھا۔ یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ پہاڑی مدرسہ ہائے فن کے تجزیے کے واسطے انھوں نے خود پہاڑوں میں جاکر تحقیق کی یا شاہی ذخیروں کو دیکھا۔ انہوں نے اس علاقے میں صرف ایک دفعہ جانے کا ذکر کیا ہے اور وہ بھی پرانے کانگڑہ کے شہر میں۔ اس

لیے یہ نتیجہ اخذ کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نظر نہیں آتا کہ انہوں نے یہ موٹی تقسیم کچھ اس بنا پر کی کہ جمّوں اور کانگڑہ دولت اور قوت کے اعتبار سے اہم ریاستیں تھیں، اور کچھ اس معلومات کی بنا پر کی جو لوو اورات کے سوداگروں اور خصوصاً "امرتسر کے اس سوداگر"[17] نے فراہم کی تھی؛ جس کا ذکر وہ اپنی تحریروں میں بڑے نمایاں طور سے کرتے ہیں یہی وہ سوداگر تھے جن سے انہیں مصوّری کے وہ بہت سے نمونے اور تصویری خاکے دستیاب ہوئے، جن کی مدد سے ان کا عظیم الشان ذخیرہ وجود میں آیا۔ یہ وہ دن تھے جب سوداگر اپنے ساتھ مینا توروں کے انبار لیے پھرتے تھے، اور خوبیوں کا خیال کیے بغیر سارے نمونوں کے نہایت ہی کم رام مانگا کرتے تھے[18]۔ اگر کوئی گاہک دلچسپی دکھاتا تو یہ سوداگر ان نمونوں کی بابت "صحیح معلومات" فراہم کر دیتا، اور یہ نتیجہ اخذ کیے بنا نہیں رہا جا سکتا کہ ڈاکٹر کمار سوامی کے ثبوت و شہادت کا خاصہ بڑا حصّہ انہی سوداگروں کی فراہم کردہ معلومات پر مبنی ہے۔

بظاہر یہ بات قابلِ اعتراض نہیں لگتی؛ اور یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ یہ سوداگر اپنی جمع کی ہوئی چیزوں کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہوں گے۔ مصوّری کے نمونوں کی سخت تلاش میں وہ پہاڑوں کی آخری حدوں تک پہنچ گئے ہوں گے، اور ذخیروں کی بابت، جو نمونے حاصل کیے ہوں گے ان کے ساکھوں کی بابت، مصوّروں کی بابت، اور مصوّروں کی خاندانی روایتوں کی بابت انہیں معلوم ہوا ہوگا۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ساری معلومات وہ ہوگی جو انہوں نے مختلف اسباب کی بنا پر اپنے ہی تک محدود رکھی ہوگی۔ جو انہوں نے فراہم کی ہوگی وہ یا تو یہ سمجھ کر دی ہوگی کہ دوسروں کے لیے بات دلچسپی ہوگی یا پھر سوچ سمجھ کر اسے بدل کر پیش کیا ہوگا، کیونکہ جن لوگوں سے انہیں یہ نمونے ملتے تھے ان کا صحیح پتہ اس ڈر سے نہ دیتے ہوں گے کہ کہیں حریف سوداگروں کو نہ معلوم ہو جائے یا پھر خود

گاہک براہِ راست خریدنے پہنچ جائیں اور بعض صورتوں میں قانون کا خوف بھی رہتا ہوگا، کیونکہ ہمیں خوب اچھی طرح معلوم ہے کہ کم از کم فن سنگتراشی کے بہت سے نمونے ان قانونوں کو توڑ کر حاصل کیے گئے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ اہم یادگاروں کو محفوظ رکھا جائے۔ اس کاروبار میں ایسی بہت سی کہانیاں سننے کو ملتی ہیں کہ سوداگروں نے جو نمونے فراہم کیے ان کے بارے میں کس کس طرح محققوں کو دھوکے دیے، تاہم محققوں نے بڑی ہمت کے ساتھ اس "معلومات" کی تصدیق کی اور پھر اس کی بابت ایک نظریہ بنایا۔!

صرف ایک معاملہ ایسا پتہ لگا ہے جب ڈاکٹر کمار سوامی کو سوداگر کی معلومات پر کچھ شک گزرا، اور وہ بھی اس وقت جب اس سوداگر نے کچھ ایسی تصویروں کی تفصیلات بتائیں، جن کو وہ خود جموں طرزِ فن کا نمونہ سمجھ رہے تھے۔ امرتسر کے سوداگر نے انہیں "تبتی" کہا، اور ڈاکٹر کمار سوامی مصوّری کے ان نمونوں کی بابت دی جانے والی تفصیلات پر ہلکا سا شبہ کرتے ہوئے صرف یہ لکھتے ہیں کہ "یہ نام نہاد تبتی" تصویریں"[19]۔ مجھے ڈر ہے کہ باقی سارے معاملات میں انہوں نے اس راوی کی ہر بات کو بڑی سنجیدگی سے مان لیا، اور اس تیز فہمی کے ساتھ ثبوت و شہادت کی چھان بین نہ کی جو ان کے بیشتر کام کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔

مصوّری کے نمونوں پر جو تحریریں دی ہوئی ہیں، ان کو اہمیت دینے کے لیے کوئی بھی شخص اس لیے مجبور ہو جاتا ہے کہ کوئی دوسرا ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ لگتا ہے ان تحریروں کو پڑھتے وقت انہوں نے قدرے جلد بازی سے کام لیا۔ ٹکری تحریروں کو پڑھتے وقت غلطی ہو جائے تو کوئی الزام نہیں دے سکتا، کیونکہ یہ ایک ایسی لپی ہے جو ایک نہایت مستقل مزاج محقق کے لیے چنوتی بن سکتی ہے، لیکن مصوّری کے بیشتر راجستھانی نمونوں پر جو ناگری تحریریں ہیں ڈاکٹر کمار سوامی نے انہیں بھی پڑھنے میں

غلطیاں کی ہیں۔ اگر ذرا بھی صبر و تحمل سے کام لیا جاتا جو اس کام کے لیے ضروری ہوتا ہے تو یہ غلطیاں سرزد نہ ہوئی ہوتیں۔ ان میں سے بعض تحریروں کو کہیں اور پڑھنے کا مجھے موقع ملا ہے[20]۔ اور گو ایسے مختصر اور پر مغز عنوانات کے پڑھنے میں ہر شخص غلطی کر سکتا ہے جیسے عنوانات راجپوت مصوّری کے نمونوں پر اکثر لکھے نظر آتے ہیں، پھر بھی یہ بات نہایت ضروری ہے کہ جب تک تحریر کے بارے میں ہر شک و شبہہ رفع نہ ہو جائے اس کی بابت کوئی نظریہ نہ قائم کیا جائے۔

ممکن ہے کہ ڈاکٹر کمار سوامی نے راجپوت مصوری کو فن کے چند مخصوص مدرسوں میں بانٹنے کا جو سادہ سا منصوبہ بنایا تھا، اور انہیں ایسی ریاستوں یا مقاموں سے منسوب کیا تھا جو آسانی سے پہچانے جا سکیں، اس کا سبب یہ رہا ہو کہ وہ اپنے قاریوں کو ایک درجہ انتشار سے بچانا چاہتے تھے، کیونکہ یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ لکھتے وقت ان کے ذہن میں ایک خاص قسم کے قاری تھے۔ یہ بات صاف ہے کہ انہوں نے مغربی عوام کے لیے لکھا کہ — ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ راجپوت مصوّری کے بارے میں تشریحات اور بلاشبہ ان کے بہت سے دوسرے نظریات ان کتابوں میں ملتے ہیں جو زیادہ تر انگلستان اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں شائع ہوئی ہیں — اور غالباً وہاں کے لوگوں کے خیال سے اس تقسیم کو ضرورت سے زیادہ آسان بنایا۔ اور جانے بوجھے ناموں اور مظاہر حسن کی متوازی اصطلاحوں کا استعمال کیا۔ راجپوت پینٹنگ میں ہمیں جگہ جگہ اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ ایسے موضوعات اور ایسے رویّوں کے توسل سے مغربی دنیا کے سامنے راجپوت مصوّری کی وضاحت کر رہے ہیں جو ان کے جانے بوجھے موضوعات اور رویّے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں دیسی شاعری کے کلاسیکی دور کو "اس کے دانتے اور چوسر کا زمانہ[21]" کہا گیا ہے۔ راجپوت مصوری کا وہ نمونہ جس میں رادھا کرشن کا پیغام سُن رہی ہے، ان کو "ایک اعلان[22]" کی یاد دلاتا ہے۔ کانگڑہ مصوّروں کی دیہاتی

تصویریں انہیں وٹیو اور ملٹ کے برّی مناظر کی تصویروں سے مختلف لگتی ہیں۔[23]
حالانکہ اپنی تحریروں میں مغربی قاریوں کو خطاب کرکے انہوں نے ایک قابلِ تعریف مقصد حاصل کرلیا۔ مغربی عوام کا خاصہ بڑا حصّہ ہندوستانی فن کے حسن وجمال سے متاثر ہوگیا۔ اور مخصوص قسم کے قاریوں کے لیے لکھنا بھی کوئی بری بات نہیں، لیکن بدقسمتی یہ ہوئی کہ جوں جوں وقت گذرتا گیا ان کا یہ رویّہ اور پختہ ہوگیا۔ ڈاکٹر کمار سوامی نے جس منصوبے کے تحت راجپوت مصوّری کی تاریخ کی قدرے سارہ انداز میں ترجمانی شروع کی تھی وہ منصوبہ بعد کے برسوں میں ایک ایسا سانچہ بن گیا جس سے تاریخِ فن کے اصل جوہر کا کم ازکم کچھ حصّہ ضرور باہر رہ گیا۔ جب کوئی شخص ہندوستانی مصوری جیسے متعدد رخ والے مظہرِ حسن کی بات کررہا ہو تو سیدھے خطوط کھینچنے کا امکان کم رہ جاتا ہے اور نہ اختلافت پرزور انداز میں اور واضح طور پر بیان کیے جاسکتے ہیں، لیکن ڈاکٹر کمار سوامی نے اسے اس نظرے دیکھا جیسے یہ محض خالص اور واضح رنگوں کا معاملہ ہو۔

مثال کے طور پر مغل اور راجپوت مصوّری کے درمیان امتیاز کی بات لیجیے جس پر وہ بضد تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ ایک ایسا فرق تھا "جس پر مزید کسی دلیل کی ضرورت نہ رہ گئی تھی ..... کیونکہ ہماری معلومات میں جو بھی اضافہ ہوتا ہے اس سے یہ بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ فن کے شاید ہی کوئی دوسرے ہم عصر دو مدرسے ایسے ہوں جو مزاج کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہوں"[24] مغل مصوّری کو وہ میناتوری مصوری کا فن خیال کرتے تھے، جبکہ ہندو مصوّری ایک ایسا فن تھی جو مندروں، محلوں اور عام عمارتوں کی دیواروں سے نیچے اتر آئی تھی۔ پہلی شاہانہ شوق کی چیز تھی، دوسری عالمگیر چیز تھی۔ پہلی شکل کے اعتبار سے "امیرانہ اور پیشہ ورانہ" تھی جبکہ دوسری پجاریوں والی اور مقبولِ عام چیز

،اور اس اعتبار سے اکثر اوقات بنیادی طور پر بڑی تصوفانہ ہوتی تھی کہ اس
ذریعے بیشتر گھریلو واقعات کی لامحدود اہمیت کا اظہار ہوتا تھا۔" ڈاکٹر کمار
می اس موضوع پر اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ "مغل درباری ایک
، فن میں دلچسپی نہیں لے سکتے تھے جو گوالنوں اور گوالوں سے تعلّق رکھتا ہو،
یشنوں کو ایسی تصویروں سے دلچسپی ہو سکتی تھی جس میں ہاتھیوں کی لڑائی
ائی گئی ہو۔"[25]

ان بیانات میں گو لہجے کی شدت نظر آتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ باتیں
ت کچھ صحیح بھی ہیں۔ اور اس موضوع پر کہ فنِ مصوّری کے مغل اور راجپوت
درسوں میں کوئی فرق نہ تھا، ایک پل بھی سنجیدگی سے بحث کرنے کا امکان نہیں
ہے۔ دونوں مدرسہ ہائے فن کے مثالی نمونے ایک نظر میں شناخت کیے جاسکتے ہیں
ن دونوں مدرسہ ہائے فن میں جن باتوں پر زور دیا جاتا ہے، وہ اور ان کے
زاجوں کا اختلاف بھی شناخت میں آ جاتا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے
ہ اس بات پر بھی بحث کی جاسکتی ہے کہ یہ دو عالم ہیں جن کے رہنے والے
یک دوسرے کو پہچاننے کی اتنی سخت کوشش کریں گے؟ اگر یہ درست ہے کہ
ابتدا کے مثالی نمونوں کا فرق بہت واضح ہے تو کیا یہ بات بھی اتنی ہی درست
نہیں ہے کہ جیسے جیسے طرزِ فن ترقّی کرتے گئے نشو و نما کے خطوط متوازی رہنے کے
بجائے ایک دوسرے کی طرف قدرے جھکتے گئے؟ اس بات سے کیا نتیجہ اخذ کیا جاسکتا
ہے کہ مصوّری کے جو بہت سے نمونے ملے ہیں ان کو جب فن کے کسی مدرسے میں جگہ
دینا مشکل ہو گیا تو محقّقین نے اس مسئلے کا حل یہ ڈھونڈا کہ انہیں "راجپوت مغل"
کہنے لگے؟ اور پھر کوئی شخص ان حقائق سے کیسے منہ موڑ سکتا ہے جن کو دوسروں
نے بڑے غور سے دیکھا ہے، لیکن ڈاکٹر کمار سوامی نے محض حاشئے میں جگہ دی ہے

کہ جن مغل مصوّروں کے نام ہمیں معلوم ہیں ان میں سے بیشتر ہندو تھے، اور یہ کہ مسلمان مصوّروں کی ایک بہت بڑی تعداد بیکانیر اور میواڑ جیسے راجپوت درباروں میں مصروف کار تھی[27]، اور یہ کہ اگر مغل مصوّری کا حوالہ نہ دیا جائے تو اٹھارویں صدی میں مصوّری کے تقریباً ہر پہاڑی نمونے میں جو تبدیلی آئی اس کی وضاحت محض طرزِ فن کی بات کرکے ہرگز نہیں کی جاسکتی۔

یہ خطیبانہ باتیں نہیں ہیں جن کی تکرار کرکے محض ایک خاص نکتے پر زور دیا جا رہا ہے۔ جس بات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر کمار سوامی کا تجزیہ اس صورت میں جائز لگ سکتا ہے جب فن کے دو مدرسوں کے نکاتِ اختلاف پورے عزم کے ساتھ ابھار کر دکھائے جائیں، اور نکاتِ اتفاق و یکسانیت یا تو نظر انداز کر دیے جائیں یا ان کی اہمیت گھٹا کر دکھائی جائے۔ فن کے ان دونوں مدرسوں کی بابت یہ کہنا کسی طرح جائز نہ ہوگا کہ چند صدیوں تک ان کے درمیان فاصلہ بنا رہا اور یہ ایک دوسرے کی کارروائیوں کو خصیہ طور سے دیکھتے رہے، اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو اب عام طور پر مان لیا گیا ہے۔

مغل اور راجپوت فن کے مدرسوں کے درمیان مزاج اور احساس کا فرق اس وقت تیزی سے کم ہونے لگتا ہے جب ہم دونوں مدرسوں کے مضمون کے علاقے میں مراجعت کرنے لگتے ہیں۔ اس بات میں سچائی ہوسکتی ہے کہ گو مغل فن شبیہ سازی میں برتر تھا، لیکن راجپوت مصوّری نے "ہی شبیہیں بنائیں" حالانکہ یہ اس کے فن کا ایک اتفاقی پہلو تھا یا یہ کہ راجپوت مصوّروں کے مقابلے میں مغل مصوّروں نے اپنے اردگرد کے ماحول میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا جبکہ راجپوت مصوّروں کو یا تو سرے سے ایسی کوئی دلچسپی تھی ہی نہیں یا بہت معمولی سی تھی۔ لیکن ایک حد کے بعد ان خطوط پر بحث کرنا ناممکن ہو جاتا ہے حتیٰ کہ تعداد کے اعتبار سے بھی،

کوئی شخص یہ ثابت کر سکتا ہے کہ راجپوت ریاستوں کی ایسی تصویریں جو غیر
مذہبی کہی جا سکتی ہیں یا جو بالکل دنیاوی موضوعات پر بنائی گئی ہیں وہ ان کے
فن کا اتنا بڑا حصّہ ہیں جسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ صاف معلوم ہوتا
ہے کہ ویشنو لوگ ہاتھیوں کی لڑائی میں دلچسپی لیتے تھے، اور مغل ہمیشہ نہ سہی۔
لیکن کبھی کبھی ضرور روحانیت سے متعلّق موضوعات پر کام کرتے تھے۔ شبیہوں اور
درباری منظروں، موسیقی کی محفلوں اور گھوڑ سواروں کی ٹکڑیوں پر جو لاتعداد
تصویریں ملتی ہیں اور جن کا تعلّق راجستھانی اور پہاڑی دونوں مرکزوں سے ہے،
ایسے موضوعات فراہم کرتی ہیں جن میں مصوّر اور ان کے سرپرست دونوں کو ہی
بڑی خوشی حاصل ہوتی تھی، اور یہ موضوعات اس فن کا محض اتفاقی پہلو ہرگز
نہیں لگتے۔ ان منظروں میں کوئی خود شناسی نہیں ہے نہ کوئی جھجک ہے، بالکل
اس طرح جیسے راجپوت مصوّری کی خاصی بڑی تعداد کے ان نمونوں میں کوئی خود شناسی
اور جھجک نہیں ملتی جو علانیہ طور پر عاشقانہ ہیں اور جن میں رتی رہسیہ جیسی
کتابوں کے مناظر بڑے شوق سے شوخ رنگوں میں بنائے گئے ہیں۔[29]

ڈاکٹر کمار سوامی پوری راجپوت مصوری کے فلسفیانہ رجحان سے، اور اس
بات سے کہ وہ برابر تصوف کی طرف مائل رہی، اس درجہ متاثر ہیں کہ میرے خیال
میں وہ اس نکتے پر بعض اوقات حد سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ ہر کوئی دیکھ سکتا
ہے کہ راجپوت مصوری میں جو عاشق نظر آتے ہیں وہ سب کے سب کرشن اور
رادھا نہیں ہوتے۔ اکثر اوقات یہ عام لوگ ہوتے ہیں، فانی قسم کے نائک اور
نائکہ جن کے چہرے بعض اوقات مصوّر کے سرپرست کی اصل تصویر ہوتے
ہیں۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ تصویر میں کسی جانے بوجھے راجہ کا چہرہ نظر آتا ہے۔ جو
بانس کی چق کی پیچھے سے جھانک رہا ہوتا ہے یا کسی پوشیدہ مقام پر محبوب

سے ملاقات کرکے برآمدے سے نکل رہا ہوتا ہے، اور پھر ایسی صورتوں میں یہ بہانہ بھی کہ شاید یہ عاشق کرشن ہو ختم ہو جاتا ہے۔

اپنی کتاب راجپوت پینٹنگ میں ڈاکٹر کمار سوامی نے انیسویں صدی کی سنگی طباعت والی بچّوں کی ایک کتاب دل بہلاوا کا سرورق چھاپا ہے۔ اس میں ایک منظر دکھایا گیا ہے جس میں عورتیں کنوئیں سے پانی کھینچ رہی ہیں یا پانی لیجا رہی اور ایسی عام بات چیت کر رہی ہیں جس سے اس منظر پر دیے ہوئے عنوان کا کوئی تعلّق نظر نہیں آتا ڈاکٹر کمار سوامی اس تصویر کو "چاہِ محبّت" کہتے ہیں اور پھر کبیر اور ودیاپتی کے اشعار اس انداز میں لکھتے ہیں جیسے تصویر میں اس کنوئیں کو تصوف کی کسی علامت کی طرح دکھایا گیا ہو۔[30] میرے خیال سے یہ غلط ہے۔ یہ ایک سیدھا سادہ سا منظر ہے جس کی کوئی اہمیت نہیں ہے، اور اگر کوئی شخص یہ بتانا ہی چاہتا ہے کہ مصوّری کی راجپوت روایت میں اس کا اصل منبع کیا ہے، تو اس منظر کو اسی طرح کے ان سیدھے سادے منظروں سے وابستہ کر دے جن میں پیاؤ یا کوئی عمارتی سرگرمی دکھائی گئی ہو، یا کسی پڑاؤ میں یا جلتی ہوئی آگ کے گرد مسافروں کا مجمع دکھایا گیا ہو۔

اس معاملے میں اور دوسرے معاملات میں جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر منظر یا ہر صورتِ حال سے ڈاکٹر کمار سوامی جو معنی اخذ کرتے ہیں ان سب کو جوڑ کر ایک ایسی مکمّل تصویر بنا دیتے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی فن کی روایت ایک نہ ٹوٹنے والا تسلسل ہے، اور راجپوت مصوّری اس کا ایک نہایت اعلیٰ اظہار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ سارے وقت بہت سی دلیلیں اسی بات کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے دیتے رہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ہر شخص اُس بات سے واقف ہونے لگتا ہے کہ وہ بڑے لطیف انداز میں مستقل

مزاجی کے ساتھ ایک خاص نمونے کا تانا بانا بن رہے ہیں۔ چنانچہ اس بات کا سبب بھی ظاہر ہونے لگتا ہے کہ وہ مغل مصوّری اور راجپوت مصوّری کے درمیان اتنا فرق کیوں کر رہے ہیں، اور آخر الذکر کو دیسی فن اور عوام کا فن کیوں کہتے ہیں؛ وہ جو نمونہ بناتے ہیں اس میں مغل مصوّری کا کوئی حصّہ نہیں ہوتا۔ مغل فن" ہندوستانی مصوّری کی طویل تاریخ میں محض ایک واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے، جس واقعے سے ہندوستانی مصوّری نے کوئی اثر نہیں لیا۔ مغل مصوّری نے زندگی اور مذہب دونوں کو ایک ساتھ گلے سے نہیں لگایا اور لہٰذا وہ کوُر پر ہی رہی۔ انہوں نے ۱۹۱۵ء میں سر ولیم روتھنسٹائن کو لکھا تھا۔" ہندو یا راجپوت فن اجنتا کی نسل سے ہے، اس نے عروج وانتہا اور زوال میں کم از کم 1500 برس بیتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں غیر مذہبی مغل فن کے 200 برس ہوا کے ایک جھونکے کی حیثیت رکھتے ہیں[31]۔" ڈاکٹر کمار سوامی کو ہوا کے اس جھونکے سے کوئی گہری دلچسپی نہ تھی۔

اس بات پر زور دینا کہ راجپوت فن عوام سے وابستہ تھا اس اندازِ فکر کا ایک حصّہ تھا۔ عوام کے مذہب یا مقبول عام ڈرامے۔ یعنی شمال ہندوستان کی یاترا یا رسا، سے اس فن کا تعلق قدرے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے تاکہ یہ پتہ لگ سکے کہ اس فن کی جڑیں اس سرزمین میں کتنی گہری ہیں۔ آیا راجپوت مصوّری عوام کا فن تھی یا "امیر لوگوں کا فن" تھی، اس کا فیصلہ کرنے کے لیے تو تفصیلی مطالعے کی ضرورت ہے، لیکن اس کا مختصراً ذکر کرتے ہوئے یہ بات ضرور بحث طلب ہے کہ راجپوت مصوّری، کم از کم سولہویں سے اُنیسویں صدی تک کی وہ مصوّری جس سے ہم واقف ہیں، کیا اسی انداز میں عوام سے متعلق ہے جس انداز میں ڈاکٹر کمار سوامی سمجھتے ہیں۔ گو کوئی بھی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ فنِ مصوّری اور راجستھان

کے درباروں کے درمیان عام طور پر تعلقات تھے، لیکن پہاڑیوں سے تو اس بحث تعلق کے ایسے ثبوت ملتے ہیں جن کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ مجھے پچھلے چند برسوں میں پہاڑی فنکاروں کے متعدد خاندانوں کی نقل و حرکت دیکھنے کا موقع ملا ہے اور میں نے بڑی دلچسپی سے یہ عمل دیکھا ہے کہ جونہی کہیں سیاسی طاقت کا زوال شروع ہوا یک لخت وہاں کا فنِ مصوری بھی مضمحل ہونے لگا اور اس دربار سے جو مصور وابستہ تھے وہ شاہی سرپرستی کی تلاش میں کسی اور جگہ منتقل ہو گئے۔[33] اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ راجپوت مصوری کا عوام سے کوئی تعلق نہ تھا، لیکن کیا یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ مصوری کے ان نمونوں کے غیر رسمی پن، یا ان کے دیہاتی موضوعات کو جو اس بات کا ثبوت سمجھ لیا جاتا ہے کہ فن سرپرستی سے آزاد تھا، بعض اوقات غلط ہوتا ہے۔

لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ راجپوت مصوری بھی پورے طور سے نہیں تو خاصی حد تک ہی ایک ایسا فن تھا جو راجستھان اور پہاڑوں کے شاہی گھرانوں سے وابستہ لوگوں کے ہاتھوں وجود میں آیا تھا، تو پھر اس فن اور مغل فنِ مصوری کے درمیان جو فرق ہے وہ دھندلا پڑ جائے گا، اور دونوں فن اس طرح متوازی ہو جائیں گے کہ فرق کی بابت دی جانے والی دلیلیں متاثر ہو جائیں گی، اور اس طرح ڈاکٹر کمار سوامی کا وہ مقصد بھی متاثر ہو جائے گا جو انھوں نے اپنا رکھا تھا۔ وہ مقصد یہ ثابت کرنا تھا ہندوستان کے پاس قومی جذبات کے اظہار کے لیے ہمیشہ سے ایک اپنا ذریعہ موجود تھا، اور ایسی چیزیں جو اس فن کی روح سے میل نہیں کھاتی تھیں، انھیں کچھ عرصے تک تو برداشت کیا، لیکن بالآخر نکال باہر کر دیا۔

یہ بات جسے ہم نے ان کا "مقصد" کہا ہے ان کی کتاب راجپوت پینٹنگ کے آخری اس باب میں کھل کر سامنے آجاتا ہے، جسے بڑی معنی خیز اور قدرے غیر تاریخی انداز میں انھوں نے "آج اور کل" کا عنوان دیا ہے۔ یہاں انھوں نے بے تکلفی سے مورخِ فن کا رول ختم کر کے بڑی عمدہ اور فصیح زبان میں یہ کہا ہے کہ ہندوستان میں پھر سے زندگی اور مذہب کا اتحاد ہو جانا چاہیے

کیونکہ اسی اتحاد سے کُل فن پیدا ہوتا ہے' اور اسی کے ساتھ اپنے اس یقین کامل کا پُرزور اظہار کیا ہے کہ ہندوستان خواہ کتنی ہی مصیبتوں سے دوچار رہے لیکن وہ اپنی آواز پھر حاصل کرے گا۔ ان کے نزدیک راجپوت فن متصوفانہ، غنائی، مسلسل مظہر حسن تھا' جس کی بات انھوں نے ثابت کرکے دکھایا تھا کہ ایک پوری قوم کا فن تھا' یک وقت ان ساری قدروں کی علامت تھا جن قدروں کو ان کے زمانے میں بڑی زوردار اور تباہ کن قوتوں سے خطرہ لاحق تھا' اور ان ساری چیزوں کی علامت تھا جن چیزوں کو صنعتی نظام' دفترشاہی اور مغربی اصولوں کے بڑھتے ہوئے سایوں سے بچانے کی ضرورت تھی۔

ان دنوں اس انداز سے بات کہنے کے لیے بڑی ہمّت کی ضرورت تھی جس انداز سے آنند کمار سوامی نے اپنی بات کہی' کیونکہ انھوں نے برطانوی حکومت کے رویّوں پر کڑی تنقید کی' لیکن کیا یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ ایسا کرتے وقت انھوں نے اپنے خیالات کی تشہیر کی خاطر اپنے اندر کے مورّخ کو دبا دیا۔ کیونکہ جب ہم رواروی میں کوئی تصویر بناتے ہیں اور ماضی کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے وقت ان ثبوتوں اور شہادتوں پر نظر نہیں رکھتے جو موجود ہوتے ہیں تو شاید مورّخ کی حیثیت سے ہم اپنے فرض منصبی میں کچھ کوتاہی کرتے ہیں۔

حوالہ جات

1. Ananda K Coomaraswamy, Rajput Painting, 2 Vols, Oxford, 1916

اس تحقیق کے لیے کتاب کا مکمل عنوان باعث دلچسپی ہوگا۔ عنوان یہ ہے: "راجپوت مصوری، راجستھان اور پنجاب ہمالیہ کی ہندو مصوری کا احوال، سولھویں سے انیسویں صدی تک کا بیان جو اس زمانے کی فکر کی روشنی میں دیا گیا ہے"۔ ساتھ میں متن اور ترجمے دیے گئے ہیں۔ بعد میں اس کا نام مختصر کرکے صرف آر۔پی۔ لکھا جائے گا۔

2. Coomaraswamy, 'Rajput Painting', Burlington Magazine, Vol XX No 108, March 1912

3. Vincent Smiths' History of Fine Arts in India and Ceylon (oxford 1911) and E B Havells Indian Sculpture and Painting. (London, 1908)

مندرجہ بالا کتابیں 1912ء سے پہلے ہی شایع ہو چکی تھیں۔ ان میں مصوری کے بعض ایسے نمونے شامل تھے جو ملک سے باہر تھے، یا کم از کم ان کے بارے میں یہ کہا گیا تھا۔ ڈاکٹر کمار سوامی نے مصوری کے راجپوت نمونوں پر ذیل کے اپنے مقالوں میں توجہ دی تھی۔

Selected Examples of Indian Art (Broad Com-

-pden, 1910, Indian Drawings 2 Vols (London, 1910-12)

Arts and Crafts of India and Ceylon (Edinburgh, 1913)

لیکن برلنگٹن میگزین کا مضمون اور آکسفورڈ والی تحقیق کی دو جلدوں نے راجپوت مصوری کو نئے معنیٰ پہنا دیے۔

ڈاکٹر کمار سوامی نے ان 'اینگلو انڈین' مصنفین کے بارے میں بڑے طعن آمیز انداز میں لکھا ہے وہ انھیں اس نام سے پکارتے تھے۔ انھوں نے لکھا ہے:

4. "یہ بات کہ مصوری کے راجپوت مونے ان اینگلو انڈین مصنفوں نے بالکل نظر انداز کر دیے غالباً ای۔ بی۔ ہیڈل پاول کے اس فقرے سے واضح ہو جائے گی: اس طرح کے ملک میں ہمیں توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ کوئی ایسی چیز نظر آ جائے گی جو ذہن اور راجپوت کو گہرائی تک متاثر کر سکے گی۔ اینگلو انڈین مصنف کا عام طور پر یہی نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر فرگوسن یہ لکھتا ہے کہ "یہ بات حقیقتاً ایک لمحے کے لیے بھی نہیں مانی جا سکتی کہ ہندوستان اس اعلا معیارِ ذہنی پر پہنچ گیا تھا جس پر یونان پہنچ گیا تھا یا اخلاق کی اس بلندی پر پہنچ گیا تھا جس پر روم پہنچا تھا۔" یہ فیصلے صحیح ہیں یا غلط اس کا فیصلہ تو خود وقت کرے گا، میں اس سلسلے میں کم سے کم یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ان لفظوں سے کہ "ہمیں توقع نہیں رکھنی چاہیے" اور "یہ بات حقیقتاً ایک لمحے کے لیے بھی نہیں مانی جا سکتی" غیر سائنسی رویے کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر یہ اصول برتا جائے تو تحقیق کا پس ایک ہی مقصد رہ جائے گا کہ ہم نے جو فیصلے پہلے سے کر رکھے ہیں ان کی تصدیق کر دیں۔

5. Ibid, Vol. I, p 6

6. Ibid, Vol I, p 6

7. Ibid, Vol I, p 9

8. Ibid, Vol I, p 9

9. Ananda K Coomarswamy Catalouge of Indian collection in the Museum of Fine Arts Boston pt V Rajput Painting(Cambridge Mass 1926)

اس کے بعد اسے محض (Catalogue) p 3 لکھا جائے گا۔

10. Ibid, Pt V, p 3

11. Ibid, Pt V, p 4

12. Ibid, Pt V, p 4

13. Ibid, Pt V, pp 5-6

14. Ibid, Pt V, p 6

15. Ibid, Pt V, pp 6-7

16. Ibid, Pt V, p 8

17. Ibid, Pt V, p 7

18. رائے کرشن جی ان دلوں کی بہت سی یادوں اور بڑی پُرکشش معلومات کے حامل ہیں جب محققوں کی نظر پہلی بار مصوری کے پہاڑی نمونوں پر پڑی تھی۔ انھیں غیر معمولی وضاحت کے ساتھ یہ یاد ہے کہ اس صدی کی پہلی دو دہائیوں میں لوگوں کو ان نمونوں سے کوئی گہری دلچسپی نہ تھی، نمونوں کے سوداگر انھیں حاصل کرنے کے لیے کس طرح چکّر کاٹتے پھرتے تھے، اور ان سوداگروں میں مشہور سوداگر کون تھے۔ میں رائے جی کا بڑا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے بہت کچھ معلومات دی اور بڑی گرما گرم بحثیں کیں۔

19. (Catalogue), pt V pp 6-7

B N Goswami On some Rajasthani Portraits in the Museum of Fine Arts Boston Bulletin of the School of Oriental and African Studies .20

R P Vol 1 pp 2 3 .21

Ibid, Vol I, p 8 .22

Ibid, Vol I, p 24 .23

Ibid, Vol I, p 5 .24

ایسا لگتا ہے کہ یہ موضوع ڈاکٹر کمار سوامی کا پسندیدہ موضوع تھا، کیونکہ ان کی اس کتاب میں، اور ان کی ایک اور کتاب History of Indian & Indonesian Art میں اس مضمون پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ دونوں مدرسہ فن ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو رکھے جا سکتے ہیں۔

R P, Vol I, p 6 .25

.26 پورا نوٹ دلچسپ ہے اور اس طرح ہے:

"یہاں اس بات پر تفصیل سے بحث کرنا فضول ہے کہ اصل مغل مصوری میں کون کون سے راجپوت عناصر موجود تھے۔ ہندوستانی عناصر مختلف سمتوں میں ملتے ہیں۔

(1) سترہویں صدی کے پہلے پچیس برسوں میں ہندو موضوعات کی تصویروں میں۔

(2) "راجپوت دور" میں اکبر اور جہانگیر کے درباروں کے ہندو پہناوؤں میں۔

(3) اٹھارہویں صدی میں طرز فن اور موضوعات کی آمیزش میں، خصوصاً اودھ میں جب آمیزش کی بنا پر ملے جلے طرز فن سامنے آئے۔

(4) اس حقیقت میں کہ نصف سے زیادہ مغل مصور دیسی ہندو تھے۔

ان تمام حالات کی بنا پر مغل اور راجپوت مصوری میں یکسانیت پیدا ہوگئی، نمبر اور نمبر معاملات میں یہ یکسانیت بالکل سطحی تھی۔ نمبر اور نمبر معاملات میں یہ زیادہ بنیادی تھی۔

History of Indian and Indonesian Art, pp. 127-28, n 2

27۔ مسلمانوں مصوروں کا ایک پورا خاندان بیکانیر دربار میں کام کرتا تھا اور میواڑ میں مصور صاحب دین کا نام مشہور ہے۔ بیکانیر کے مصوروں کے تصویری خاکوں کا ایک پورا سلسلہ موتی چند خزانچی مجموعے میں موجود ہے اور زیادہ عرصہ نہیں گذرا جب یہ سلسلہ کارل کھنڈال والا، موتی چندر اور پرمود چندر کی ذیل کی کتاب میں شایع ہوا تھا:

A Catalogue of the Exhibition of the Shri Moti Chand Khajanchi Collection & Co (New Delhi 1960

میواڑ کے مصور کے لیے دیکھیے :

Douglass Barrett and Basil Gray painting of India [Lonsonne 1963] pp 139 - 140

28۔ مغل اور راجپوت مدرسہ ہائے فن کے درمیان تعلّقات کے موضوع پر آرنالڈ اور ولکسن نے "ہیگل کے انداز کے اس نتیجے پر" آلوّن اسٹیوکین سے اتفاق کیا ہے کہ ان دونوں مدرسوں کے درمیان بظاہر جو وسیع اختلافات نظر آتے ہیں ان کو ایک گہرا بنیادی اتحاد ختم کر دیتا ہے۔

دیکھیے :

The Library of A Chester Beatly : A Catalogue and C. [Oxford 1936] Vol I p ix

Basil Gray نے اس موضوع پر مندرجہ ذیل مضمون میں لکھا ہے:

Intermingling of Mughal and Rajput Art Marg Vol 1 1953 P 37

مغل مصوری کے نمائشی برآمدوں میں یہ (ہندوستانی قوت تخلیق) باہر نظر آنے لگتی اور پھر بھی اپنی رُوح کے اندرونی نظارے کو کھولتی نہیں، راجپوت مصوری کے نمائشی برآمدوں میں اندر چلی جاتی ہے، لیکن قدرتی دُنیا سے گہرے طور پر واقف رہتی ہے۔

میں غیر ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے ان بیانات کی تائید میں جو اس مقالے میں اس ضمن میں دیے ہیں، اس موضوع پر جو کل کام ہوا ہے اس سے حوالے دوں پچھلے کئی برسوں میں جو بڑے بڑے ذخیرے جانچے گئے ہیں اور شایع کیے گئے ہیں، اور اس موضوع پر جو اب تیار ہوا ہے، اس سے ہندوستانی مصوری کے طلبہ خوب اچھی طرح واقف ہیں۔

فن کے ان سب ذخیروں میں جو اب تک پہاڑوں میں موجود ہیں کوئی بھی شخص یہ دیکھ سکتا ہے مصوری کے نمونوں کے مجموعے کے مجموعے عاشقانہ، جذبات سے حامل ہیں اور ضلع کانگڑہ میں راجول کے چندو لال اور سملوتی کے پورن چند جیسے مصور جو ابھی حیات ہیں اپنی خاندانی روایتوں کے بارے میں واضح طور سے یہ بتاتے ہیں کہ یہ نمونے سرپرستوں کے کہنے پر خاص طور سے بنائے گئے تھے۔

30۔ R P Vol I p. 76

31۔ دیکھیے: K N Town drow Sir William Rathenstin Art and Letters xxv I 1961, p 18 R P Vol I p 2

32۔ R P. Vol I p. 2

"آج کل کا عوامی فن ایک ایسی روایت ہے جو براہِ راست ماضی سے حاصل ہوئی ہے۔ ہندوستان کی دیسی شاعری کی طرح راجپوت مصوری میں یہی عوامی فن اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ یہی وہ تہذیب ہے جو شاہوں اور کسانوں کی مشترکہ تہذیب تھی۔"

33۔ مباحثے کے لیے میرے یہ مضمون دیکھیے:

A study of New Documents Asian Review Vol 2 No 2 August 1985 1965 Sikh Painting An analysis of Patronage oriental arts

ہنری جارج کین

کے۔ کے۔ شرما

ایچ۔ جی۔ کین نے رگبی، آکسفورڈ اور ہیلے بری میں تعلیم حاصل کی تھی۔ 1847ء میں وہ انڈین سول سروس میں آئے اور 1882ء میں ریٹائر ہو گئے۔ سلطنت برطانیہ کے لیے جو خدمات انجام دیں تھیں ان کے باعث 1879ء کے قریب ان کا احترام کیا جانے لگا تھا۔ انھیں ٹی۔ ایچ۔ ایس۔ ایسکوٹ کی کتاب "سلطنت کے ستون" میں جگہ دی گئی تھی۔ ریٹائر ہونے کے بعد کین نے بہت لکھا، لیکن دورِ وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ کے مطالعے کے واسطے ان کا بڑا حصہ دی مغل امپائر (1867ء)، دی فال آف دی مغل امپائر (1876ء) اور دی ٹرکس ان انڈیا (1879ء) کی شکل میں پہلے ہی دیا جا چکا تھا۔ انھوں نے دورِ وسطیٰ کے ہندوستان کو کیوں فوقیت دی اس کی وضاحت ان کے اس فقرے سے ہو جاتی ہے جو کافی بعد میں تحریر کیا گیا تھا: "لفظ تاریخ کو اگر بالکل صحیح معنیٰ میں استعمال کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کا آغاز مسلم قوت کے قیام سے پہلے شاید ہی ہوا ہو" (ہسٹری آف انڈیا، 1893، 'I' ix)۔ یہاں بہرحال یہ بتا دینا چاہیے کہ کین ہندوستان کے پہلے برطانوی مؤرخ نہیں تھے جنھوں نے اس رائے کا اظہار کیا ہے۔

کین اپنے آپ کو اسٹوارٹ الفنسٹن کا "شاگرد" سمجھتے تھے۔ لیکن اس بنا پر

انھوں نے یہ نہیں کیا کہ اپنے سابق مورخوں کے خیالات قبول کرنے سے یا انھیں دُہرانے سے باز رہتے۔ یہ جانتے ہوئے کہ ہندوستان میں پڑھنے والے موجود ہیں، انھوں نے مناسب یہی سمجھا کہ اپنے وطن اور ہندوستان کے انگریز قاریوں کے لیے ایک عام مورخ کے انداز میں لکھیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ برطانوی طلبہ کے سامنے ہندوستانی تاریخ معقول انداز میں پیش کریں۔ ایسا اسی صورت میں ممکن تھا جب "واقعی عملی حقایق کا ذکر کیا جائے،" "اور اونچی حیثیت والے افراد کی جنگوں، محاصروں، یا سازشوں اور جُرموں کی ذرا ذرا سی تفصیلات بیان نہ کی جائیں" (ہسٹری آف انڈیا IX)۔ الفنسٹن اور حقیقتاً اپنے بیشتر سابق مورخوں اور ہم عصروں کی طرح، لیکن ترقی کے عمل میں یقین کرتے تھے اور ان کے نزدیک اہم ترین تاریخی مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ قبلِ برطانوی ہندوستان میں ترقی نہ ہونے کی وجوہات بیان کریں۔

"یہ بات بڑی قابلِ توجہ ہے کہ مشرقی آریوں نے جس جزیرہ نما پر قبضہ کیا تھا اس کا مقدر اس قدر مختلف کیوں رہا، اور یہ بات بھی کہ اس جزیرہ نما نے فرقوں اور خیالوں کو مخلوط کرنے اور ترقی کرنے کے رُجحانات کا اظہار کیوں نہیں کیا۔ اور یہ بات جانچ پڑتال کے لائق ہے کہ وہ مخصوص اسباب کیا تھے جن کے باعث یہ اختلاف رُونما ہوا، اور یہ بات بھی تصدیق طلب ہے کہ ہندوستان کے لوگوں نے اُوپر اُٹھ کر سماجی اور سیاسی ارتقا کے اس تصوّر کو کیوں نہیں اپنایا جو یورپ کی قوموں میں اب بھی ایک مفید عمل کی صورت میں بڑھ رہا ہے۔"

("میڈیول انڈیا" کلکتہ ریویو LXXV) الفنسٹن کے برعکس اور کسی قدر جیمس مل کی طرح، لیکن ہندوستانی تاریخ کے دَورِ وُسطیٰ کو دَورِ قدیم سے بہتر سمجھتے تھے ہندوؤں کا اپنا الگ تمدّن تھا لیکن، یہ "ایک فرسودہ تمدّن" تھا جو لگتا ہے کہ "ایک معیّن شکل اختیار کر چکا تھا اور اپنی ساری قوّت کھو چکا تھا" (دی مُغل امپائر)۔ ہندوؤں پر

جو سماجی جمود طاری ہو گیا تھا کیبن اسے ذات پات اور ملے جلے خاندان سے منسوب کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان دونوں نظاموں نے "انفرادیت کو آہستہ کر دیا تھا۔" اس نزاعی مسئلے پر کہ آیا ہندوؤں کی حالت میں گراوٹ مسلمانوں کی فتح ہند سے آیا تھا کیبن نے ذیل کا یہ دلچسپ تبصرہ کیا تھا:

"ان یورشوں سے جو بھی مصائب پیدا ہوئے ہوں، اور ان کے حملوں میں جو بھی تباہیاں آئی ہوں، اور حکومت کے اقدامات کتنے ہی جابرانہ، ان مانے یا جارحانہ رہے ہوں، اگر اس ملک کی ہندو آبادی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تھا تو ملک کی حالت اور زیادہ خراب ہو جاتی۔ اگر مسلمانوں کا غلبہ بذات خود ایک خرابی تھا تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ یہ خرابی ضروری تھی۔"

یہاں کیبن کا رویہ جیمس مل کے رویے کی یاد دلاتا ہے۔ کیبن نے ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے بارے میں زیادہ تر اپنے سابق مورخوں کے خیالات محض معمولی سی ترمیم کے ساتھ منظور کر لیے تھے اور انھیں آگے بڑھایا تھا۔ مثال کے طور پر الفنسٹن نے اس زمانے کے ملک ہندوستان کے بارے میں خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ محض ایک جغرافیائی اظہار ہے۔ اور انھوں نے ہندوستانی چیزوں کے بارے میں باہر کے رویے اور "آج کل کے انتہائی نازک مزاج انگریز غریب الوطن" (یہ الفاظ کیبن کے ہیں) کے رویے میں بھی یکسانیت پائی تھی۔ پھر الفنسٹن ہی کی طرح کیبن نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ پورے دورِ وسطیٰ میں ہندو ادارے قائم رہے، اور ہندو اور مسلمانوں کے درمیان دوستی اور بقائے باہمی کے جذبات کو سراہا ہے۔

"ترکمان اور پٹھان حکومتوں کے تحت ہندو پنجاب میں، ہندوستان میں اور بعض دور دراز صوبوں میں اپنے ضابطوں اور رواجوں پر عمل پیرا

رہے۔ جنوبی علاقوں میں انھیں اور بھی کم چھیڑا گیا۔ ان ممالک کے
بڑے حصّے میں بڑے عرصے تک ان کی خود مختار ریاستیں قائم رہیں اور
ان صوبوں میں بھی جو مُسلم حکومت کے تحت تھے ہندوؤں نے اعتماد
اور قوت کے عہدے حاصل کیے، اور دونوں نسلوں میں اکثر اچھے
تعلّقات رہے۔"

(ہسٹری آف انڈیا، 352)۔

الفسٹن ہی کی طرح کین بھی یہ پسند کرتے تھے کہ ہندوستان میں برطانوی
حکومت کے تحت قدیم رواجوں کا تحفّظ کیا جائے۔ ("میڈیول انڈیا" کلکتہ ریویو LXXV)۔
اپنے سابق مصنفوں کی طرح اور ہندوستان پر لکھنے والے تقریباً سارے ہی
برطانوی مصنّفوں کی طرح کین یورپ کو ایشیا سے اور برطانوی حکومت کو مُسلم حکومت
سے ہر طرح برتر سمجھتے تھے۔ حالانکہ ہندوؤں کے مقابلے میں مُسلم حکومت بہتر تھی، لیکن
وہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی: "یہی وہ مُلک
ہے جو حالانکہ لمبے عرصے تک مسلم حکومت کے تحت رہا ہے (اور اب بھی مُسلمانوں کے
زیرِ اثر ہے) لیکن اب ترقی کی راہ پر گامزن ہوا ہے۔"

("اسلام اِن انڈیا" کلکتہ ریویو LXXI)۔

گو بعض اوقات انھیں ہندوستان میں برطانوی حکومت کی خامیوں کا احساس
ہوتا تھا، پھر بھی وہ سلطنتِ برطانیہ کے سخت طرفدار رہتے تھے۔ "ان کے نزدیک ان
بہت سے آقاؤں میں جن کی ہندوستان نے اب تک تابع داری کی ہے سب سے زیادہ
ایماندار، بہادر اور لائق آقا بیشک و شبہ برطانوی تھے۔"

("انڈیا ان 1880" کلکتہ ریویو، LXXIII)۔

یہ بات بڑی باعث دلچسپی ہوگی کہ ہندوستانی لوگوں کے بارے میں کین کے

حیالات سابق کے سخت ترین مصنّف جیسے بھی نہیں تھے۔ان کے نزدیک تاریخ میں جتنی قومیں گذری ہیں ہندوستانی ان کے مقابلے میں سب سے زیادہ دھوکے باز اور فتنہ انگیز تھے: "مجھے ابھی تک ایک بھی ہندو ایسا نہیں ملا ہے جس میں کوئی ہو، اور ایماندار مسلمان یہاں نہیں بستے۔" ایسا لگتا ہے کہ بین 1857ء کے واقعات نہ بھلا سکے نہ معاف کر سکے۔ اور غالباً یہی وہ اہم ترین بات ہے جس کی مدد سے ہندوستانی دورِ وسطیٰ کی بابت ہم ان کے اندازِ فکر کو سمجھ سکتے ہیں۔

مغلوں کے محصولِ زمین کے انتظام کی بابت سرکار اور مورلینڈ کے خیالات

بی۔ آر۔ گروور

اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے دوران ہندوستانی منشیوں اور انگریز مستظم محققوں نے مغلوں کے محصول زمین کے انتظام پر مبصروں کے انداز میں نظر ڈالی تھی۔ لیکن اس مضمون پر کبھی کسی پیشہ ور مورّخ نے جامع انداز میں کچھ نہیں لکھا۔ بیسویں صدی کے پہلے نصف میں دو معروف محققوں، سرجے۔ این۔ سرکار اور ڈبلو۔ ایچ۔ مورلینڈ نے مغل ہندوستان پر کام کیا۔ یہ دونوں ہمعصر تھے۔ ایک ہندوستانی پیشہ ور مورّخ تھا اور دوسرا پہلے پہل ایک انگریز سول ملازم تھا جس کا تقرر ہندوستان میں کیا گیا تھا اور جو بالآخر ایک مورّخ بن گیا۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں سرجے۔ این۔ سرکار نے بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ مغل زمانے پر کام کیا اور اس دور کی سیاسی تاریخ پر بڑی عظیم الشان کتابیں لکھیں۔ سرکار نے مغل سلطنت کے انتظامی ڈھانچے میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا؛[1] لیکن اس سلسلے میں انھوں نے کوئی خاص کارنمایاں نہیں کیا۔ محصول کے سلسلے میں انھوں نے آئینِ اکبری، مراتِ احمدی، چند ایک دستور العمل اور سترہویں نیز اٹھارہویں صدی کے روزنامچوں پر تکیہ کیا۔ ان ماخذوں کے استعمال کے باوجود وہ مغلوں کے محصولِ زمین کی ان اصطلاحات کا صحیح طور سے تجزیہ نہ کرسکے جو ان ماخذوں کے فارسی متن میں

دی گئی تھی۔ مغل انتظام پر ان کی کتاب میں محصولِ زمین کے انتظام پر سرسری انداز میں لکھے ہوئے ابواب میں کوئی ربط نہیں ہے۔ اس میں عصری مسوّدوں سے لیے واقعات زیادہ ہیں، اور زرعی نظام کی مربوط تصویر پیش کرنے کی کوئی ایسی کوشش نظر نہیں جسے سراہا جا سکے۔ اورنگ زیب کے دَور کے وہ دو فرمان جو سرکار کو برلن کی رائل لائبریری میں ملے تھے، اور جنھیں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے میں چھپوایا تھا اور بعد میں اپنی کتاب مغل ایڈمنسٹریشن [2] میں شامل کر لیا تھا، ان میں سے وہ فرمان جو محمد ہاشم کے نام تھا کرنل گیلووے نے پہلے ہی صحیح طور سے استعمال کر لیا تھا۔ سرکار کو اس بات کا علم نہیں تھا۔ اس فرمانوں کے فارسی متن پر اور خصوصاً ان کی شرحوں پر کچھ زیادہ اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ محصول کی بابت اٹھارہویں صدی کے اواخر کا جو ادب برلن لائبریری میں موجود ہے وہ حالانکہ اٹھارہویں صدی کے بہار اور بنگال کی تاریخ کے واسطے نہایت ہے، لیکن مزید چھان بین کیے بغیر اسے سولھویں اور سترہویں صدیوں کے لیے منظور نہیں کیا جا سکتا۔ مزید برآں، بنگال اور شمالی ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں محصول کے طریقوں میں جو اختلافات تھے ان کو صاف طور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ حالانکہ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں بنگال کے ہندوستانی ماہرینِ محصول کی رسائی مغل زمانے کے بعض فرمانوں اور دستورالعمل تک ضرور ہو چکی تھی، لیکن ان کی لکھی ہوئی شرحوں میں اس عہد کے محصول کے طریقوں کے جو تجزیے کیے گئے ہیں وہ سارے کے سارے دُرست نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض شرحیں اس عظیم نزاعی مسئلے پر برطانوی منتظمین محصول کے خیالات اور تصورات کو تقویت پہنچانے کے لیے لکھی گئی تھیں جو مسئلہ مستقل بندوبست کے نفاذ سے پہلے بنگال میں زمینداروں اور حکومت کے درمیان حکومت کے اراضیاتی حقوق کی بابت اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اورنگ زیب کے دَور کے یہ دو مشہور دستاویز ہاتھ آجانے کے

بعدۂ اور محصول کی بابت اس تمام ادب سے لاعلم ہونے کے باعث جو برلن لائبریری میں موجود تھا، سرکار ان شرحوں کا پس منظر نہ دیکھ سکتے تھے جو اٹھارہویں صدی کے آخر میں بنگال میں لکھی گئی تھیں، اور نہ اس حیثیت میں تھے کہ کسی نتیجہ خیز حقیقت تک پہنچ سکتے۔ اس سب کے باوجود سرکار کا ترجمہ اور فرمانوں پر ان کی وہ شرحیں جو طبع ہو گئی تھیں بعد کے محققوں نے مسئلے کی مزید چھان بین کیے بغیر تسلیم کر لیں۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں بعض ہندوستانی منشیوں نے مغلوں کے محصولِ زمین کے انتظام کے خاص پہلوؤں پر اچھی طرح روشنی ڈالی تھی، لیکن محصول کی بابت جو ادب موجود تھا اس کے ان حصّوں کا احاطہ نہ کیا گیا۔ آئینِ اکبری کا ترجمہ ایچ۔ ایس۔ جیرٹ نے کیا تھا اور بلوخ مین نے اس کی شرح کی تھی۔ سرکار نے اس شرح پر بھی نظرِ ثانی کی اور اس کی شرح لکھی۔ لیکن اس میں بھی بڑی بڑی غلطیاں ہیں۔ ابوالفضل کی آئینِ اکبری کے تیسرے دفتر میں محصول کی بابت اصطلاحات پر مشتمل جو عبارتیں دی ہوئی تھیں ان کا ترجمہ زیادہ تر غلط کیا گیا ہے۔ سرکار نے تاریخی نوعیت کے جو نوٹ دیے ہیں اور محصول کی بابت اصطلاحات کی جو تعریفیں دی ہیں وہ مغل محصول سے متعلق دستاویزوں پر نہیں بلکہ زیادہ تر غیر ملکی اسلامی رواجوں اور پہلے کی لکھی ہوئی فرہنگ پر مبنی ہیں۔ لہٰذا مختلف قسم کے مباحث شروع ہو گئے ہیں اور مغلوں کے محصولِ زمین کے نظام پر جدید تاریخی تحریروں میں فرضی نتائج نظر آنے لگے ہیں۔

ڈبلو۔ ایچ۔ مورلینڈ پہلے مورّخ تھے جنھوں نے مغلوں کے زراعتی نظام کا گہرائی سے مطالعہ کیا، اور ان کی ابتدائی کتابوں کے باعث ہندوستان کی اقتصادی تاریخ کے طلبہ اس بنا پر ان کے بیحد احسان مند ہیں کہ انھوں نے مغل عہد کی مکمل تصویر پیش کرنے میں خاصے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ مورلینڈ معاشیات کے ایک ذہین طالب علم اور تربیت یافتہ انگریز سول ملازم تھے جن کا تقرر ہندوستان کے صوبہ

ہائے متحدہ (یو۔پی) میں ہوا تھا۔ اپنی ابتدائی کتاب دی ریونیو ایڈمنسٹریشن آف دی یونائٹڈ پروونسز (۱۹۱۱ء میں شایع ہوئی) میں انھوں نے دل سے یہ کوشش کی تھی کہ ہندوستان کے محصول زمین کے ورثے کا سراغ بالکل ابتدائی زمانے سے لگایا جائے، اور انیسویں صدی نیز بیسویں صدی کی ابتدا میں برطانوی حکومت کے تحت اس نظام کا ارتقا معلوم کیا جائے۔ مورلینڈ کا انداز نظر بنیادی طور پر ناصحانہ تھا۔ اس عمومی تاریخی خاکے کا مقصد یہ دکھانا تھا کہ زرعی مسائل بالکل ابتدائی زمانے کا ورثہ تھے اور ان میں آج تک ایک تسلسل تھا۔ اس بات سے قطع نظر، دورِ وسطیٰ کے محصول زمین کے نظام کا ہندوستان کے انیسویں، بیسویں صدیوں کے محصول زمین کے نظام سے مقابلہ کرنا، اور تاریخی مثالوں کے ذریعے اس بات پر زور دینا کہ پہلے کے انتظام میں برطانوی انتظام نے بہت سی اصطلاحات کیں، اس گہری خواہش کا اظہار تھا کہ سابقہ ہندوستانی انتظام محصول پر برطانوی انتظام محصول کی برتری دکھائی جائے۔ اس کتاب کا مقصد یہ بھی تھا کہ انگریز افسرانِ مال کو ایک ایسا دستی ہدایت نامہ مل جائے جس کی مدد سے وہ زمینداروں اور کاشتکاروں سے تعلق رکھنے والے بیسویں صدی کے ان زرعی مسائل سے نمٹ سکیں جن مسائل کو خصوصیت کے ساتھ تاریخی پسِ منظر میں سمجھنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ یہ بات بہرحال مشتبہ ہے کہ کیا مورلینڈ اس منزل پر ان نمایاں تبدیلیوں کو صاف طور سے سمجھ گئے تھے جو اٹھارہویں صدی کے دوران رونما ہوئی تھیں، اور کیا انھوں نے مغلوں کے محصولِ زمین کے انتظام کی خصوصیات کے نقش کو خاصی حد تک دھندلا دیا تھا۔ سولھویں، سترہویں صدی کے مغل انتظام محصول کا صحیح تجزیہ کرتے وقت انھوں نے جو بھی غلطیاں کی ہوں، مورلینڈ نے سیاسی اور فوجی واقعات کی اہمیت کم کر کے اس پیچیدہ مسئلے کو کہ کیا ہندوستانی تاریخ محض ان واقعات کا بیان ہے، خوب حل کیا۔ انھوں نے ہندوستانی تاریخ میں اقتصادی قوتوں کے رول پر زور دیا۔ انھوں نے اس

حقیقت پر زور دیا کہ کسی دیہی سماج میں لوگوں کا خاص پیشہ زراعت ہوتا ہے، اور یہ
ہندوستانی حکومت کی آمدنی کا یہی خاص ذریعہ تھا۔ گذرے ہوئے ہندوستانی سماج
میں بھی اقتصادی عنصر فیصلہ کن تھا۔ ان کی بعد کی ہر تحریر میں اسی پہلو پر زور دیا گیا
ہے۔

مورلینڈ نے منتظم کی حیثیت سے اقتصادی مورخ کی حیثیت تک جو ترقی کی وہ تدریجاً
ہوئی۔ جب مورلینڈ اور یوسف علی اپنا مشترکہ مقالہ اکبرس لینڈ ریونیو سسٹم آن دی بیسس
آف دی آئینِ اکبری شایع کرایا تو مورلینڈ کو مغلوں کے محصولِ زمین کے انتظام سے
حقیقی دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔ اسی موضوع کو تقویت پہنچانے کے انھوں نے 'انڈیا ایٹ دی
ڈیتھ آف اکبر' انڈیا فردم اکبر ٹو اورنگ زیب' اور اگریرین سسٹم آف مسلم انڈیا' جیسی
کتابیں لکھیں جو بنیادی طور سے تاریخی تحقیق پر مبنی کتابیں تھیں' اور اب مورلینڈ ایک
اعلا درجے کے اقتصادی مورخ بن چکے تھے۔ انھوں نے رفتہ رفتہ اخلاقی لہجہ ترک کر دیا اور
برطانوی حکومت اور مغل عہد میں کاشتکاروں کی حالت کا مقابلہ کرنا بھی ترک کر دیا لیکن
ہر چند کہ انھوں نے تاریخی تحقیق کا طریقہ اپنا لیا تھا، پھر بھی انھیں ہمیشہ اس بات
کا اشتیاق رہتا تھا کہ ایسی ماخذی اشیا ہاتھ لگ جائیں جو ان کے رجحانات اور
نوآبادیاتی نظریے سے میل کھا سکیں۔ ایک ماہر افسرِ مال ہونے کے باعث مورلینڈ کو
اس قدر تجربہ اور علم حاصل ہو چکا تھا کہ مالی مسائل کے دشوار پہلوؤں پر خوب اچھی
طرح لکھ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ آئینِ اکبری کے مختلف متنوں، عصری روزنامچوں
غیر ملکی سیاحوں کے سفرناموں، اور چند ایک فرمانوں نیز دستور العملوں کا تقابلی
مطالعہ کرنے لگے تھے۔ لیکن ان سب کے باوجود، ترجمانی کے بارے میں مورلینڈ کی تنگ
خیالی نے ان کے تاریخی تحقیق کے طریقے کو محدود کر دیا تھا۔ آئینِ اکبری کی تکنیکی عبارتوں
کا پڑھنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جب

مورلینڈ نے لکھنا شروع کیا تو مالیات سے تعلق رکھنے والی سترھویں صدی کی پرانی اشیائے
ماٰخذی دستیاب نہیں ہو پائی تھیں، اور مالیات کی اصطلاحات کے درست معنی سمجھے بغیر
ظریات قائم کر لینا دشوار بھی تھا اور پرخطر بھی تھا۔ ایسی صورت میں جب کسی دور کی دستاویزیں
وجود نہ ہوں تو تکنیکی مورخ کو تاریخ کی ترجمانی کرتے وقت سخت رویہ اپنانے سے گریز
رنا پڑتا ہے۔ یہ بات کہ مورلینڈ کو اپنے زمانے کی مالیات کا بڑا وسیع تجربہ تھا ایک لحاظ سے
ن کا عیب بھی ہے، کیونکہ مبہم عبارتوں کی ترجمانی کرتے وقت ان کے دل میں اپنے تخیل سے
ام کرنے کی بڑی خواہش پیدا ہوئی۔ یہ بات چند ایک مثالوں سے خوب اچھی طرح واضح
، جا سکتی ہے۔ مورلینڈ جمع دہ سالہ (دس سالہ بندوبست) کا مفہوم بیان کرتے وقت
کہتے ہیں کہ عبارت میں لفظ جمع اس مطالبے کے لیے استعمال نہیں کیا گیا ہے جس کا تعین
یا گیا ہو بلکہ یہ لفظ محض اس مسئلے کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ نئی قیمت کیا مقرر کی جائے۔[3]
ھیں ابوالفضل سے نفرت ہو جاتی ہے اور طیش میں آ کر وہ یہ کہتے ہیں کہ آئین اکبری ایک
ص کتاب ہے اور اس کے متن میں یقیناً کچھ خرابی ہے۔ یہاں ہمیں ایک ماہر مالیات
، حد سے بڑھے ہوئے اعتماد کی مثال ملتی ہے جو تاریخی تحقیق کے طریقے کو اپنی خواہش
، مطابق بدل دیتا ہے۔ جہاں تک اورنگ زیب کے دور میں حکومت کے مطالبے کا
لق ہے، رسک داس کروری (بہار والے) کے نام شاہی فرمان میں صاف طور سے
ا گیا ہے کہ مطالبے کا تعین صورتِ حال کے مطابق (زمین کی قسموں کے اعتبار سے)
$\frac{1}{2}$، $\frac{1}{3}$ اور $\frac{2}{5}$ (کل پیداوار کا) میں سے کسی دو کے لحاظ سے کیا جائے۔ مورلینڈ کہتے
ں کہ مذکورہ بالا فرمان مختلف متعینہ دروں کی بابت محض ایک نظریاتی بیان ہے، کیونکہ
ل مطالبہ کم سے کم رقم کے نزدیک نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ رقم کے نزدیک تھا۔ حالاں کہ
رلینڈ کے پاس کوئی ایسا عصری دستاویزی ثبوت موجود نہ تھا جس کی بنا پر فرمان
بیان کو رد کیا جا سکے، اور ایسا انھوں نے محض اپنے شعبۂ مالیات کے اس تجربے

کی بنا پر کیا تھا کہ سرکاری نقطۂ نظر سے حکومت کی آمدنی میں کس طرح اضافہ کیا جاتا ہے۔ پرگنوں کے اصل دستاویزات جو اب محافظ خانۂ راجستھان، بیکانیر میں موجود ہیں، اور جن میں مطالبہ حکومت کے متذکرہ بالا اختلاف کا ذکر ہے، یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مورلینڈ کا مفروضہ بالکل غلط تھا۔ مورلینڈ یہ سمجھ نہ پائے کہ محصول کا مطالبہ جو زمین اور فصلوں کی مختلف قسموں پر مبنی تھا مغل ضوابط کے تحت کس طرح نافذ کیا گیا۔ آئینِ اکبری اور اورنگ زیب کے فرمانوں بس ایک خاص قسم کا بیان ہے کہ ان دونوں بادشاہوں کے عہدوں میں کُل پیداوار کا بالترتیب $\frac{1}{3}$ اور $\frac{1}{2}$ محصول مقرر کیا گیا تھا۔ مورلینڈ نے محصول کے اس مطالبے کو ہر قسم کی زمین اور فصل کے لیے جو یکساں تصوّر کر لیا، وہ قدرے غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دراناج والی فصلوں پر مطالبۂ محصول کے سب سے اُونچے در تھے، اور مقررہ دروں کا جو گھٹتا بڑھتا ایک نہایت تفصیلی پیمانہ بنا گیا تھا اس پر کسی در کا تعین مخصوص علاقے کی زمین اور فصلوں کے مطابق کیا جاتا تھا۔ اور یہ در اتنے مختلف تھے کہ ایک ہی گاؤں میں کئی در نافذ کیے جاتے تھے۔ نقد فصلوں (جنس کامل) کے مقررہ در لازماً کافی کم تھے، حالانکہ یہ در بھی زمین کی تقسیم اور فصلوں کی نوعیت والے اصولوں پر مبنی تھے۔

اس بات سے بالآخر ہمارا وہ اندازہ ضرور متاثر ہوگا جو ہم اس ضمن میں لگائیں کہ مغل زمانے میں محصول کے مطالبوں سے کاشتکاروں کی حالت پر کیا اقتصادی اثر پڑا ہوگا۔ مورلینڈ نے آئینِ اکبری کے مطالبے کی بنا پر ضبطی اور نسق کے تعین کے طریقوں کا جو تجزیہ کیا ہے وہ بالکل صحیح نہیں ہے۔ مورلینڈ نے نسق کی تعریف یوں کی ہے کہ "گروہ کے محصول کا تعین" یا وہ "مجموعی رقم" جو گاؤں یا پرگنے پر مکھیاؤں کی مرضی سے لگائی جاتی تھی، اور مکھیاؤں کو آزادی ہوتی تھی کہ کاشتکاروں کی زمین کے مطابق اس مجموعی رقم کو ان پر تقسیم کر دیں۔ مورلینڈ کی نسق کی یہ تعریف غلط ہے۔ مغل دور میں تعینِ محصول کے ان متذکرہ بالا طریقوں کے عام ہونے کے بارے میں بھی مورلینڈ نے بہت سخت رویّہ اختیار کیا ہے۔ ان کے خیال

میں اکبر کے تحت تعینِ محصول کا سب سے زیادہ پسندیدہ طریقہ ضبطی تھا، اور نسق جس میں "گاؤں کے گروہوں کے محصول کا تعین" اور "محصول کا سالانہ سرسری تعین" شامل ہوتے تھے، اورنگ زیب کے عہد کے دوران رائج تھا۔ ان کے مطالعے کے دو مقررہ قطبین ہیں۔ ایک آئینِ اکبری اور دوسرے رسک داس کروڑی کے نام اورنگ زیب کا فرمان۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ محصول کے طریقے بادشاہوں کی مرضی سے اس طرح یک لخت ختم نہیں ہو جاتے۔ ضبطی طریقہ پورے مغل عہد کے دوران جاری رہا اور محصول کے تعین کے دوسرے طریقوں کے ساتھ چلتا رہا۔

مورلینڈ زمیندار اور رعایا جیسے لفظوں کی عمومیت سے اچھی طرح واقف تھے، اور انھوں نے یہ مناسب سمجھا کہ "کسانوں" کے لیے اصطلاح زرعی رعایا استعمال کریں۔ انھوں نے اچھا کیا کہ زمین کی ملکیت کے بارے میں جو نظریاتی اور قانونی ترجمانی کی جاتی ہے اس بحث میں نہ پڑے۔ بیشتر مصنفین اٹھارہویں صدی کے اواخر سے اس بحث میں غرق تھے[5] لیکن وہ کاشتکاروں کی ان مختلف قسموں کی تفصیلات پر بحث نہیں کر سکتے تھے جن کاشتکاروں کا زمین سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق تھا۔ مغل عہد میں زمینداری گاؤں اور ریاعتی گاؤں میں زمین کی ملکیت کی جو مختلف نوعیتیں تھیں وہ انھیں سمجھ نہیں سکتے تھے[6] ملکیتِ زمین کے مسئلے کی بابت وہ یہ سمجھتے تھے کہ کسانوں کو قبضہ رکھنے کا حق تھا، اور اس کے علاوہ ان کے پاس اس زمانے کے کوئی ایسے اعداد و شمار نہیں تھے جن کی مدد سے وہ اس مسئلے پر روشنی ڈالتے۔ انھوں نے اس اہم مسئلے کو حل کیے بغیر یونہی چھوڑ دیا۔ اس نازک بحث سے بچنے کے باوجود کہ آیا مغل نظام زمینداری کے اصول پر مبنی تھا یا رعیت واری کے اصول پر، انھوں نے دونوں طریقوں سے جو بھونڈی سے مماثلت دکھائی وہ کچھ مبہم سی ہے۔ یہ ان کی زبردست خواہش تھی کہ مسلم عہد کے دوران وقتاً فوقتاً اگر ایسے دور آتے ہوں جب حکومت نے براہِ راست یا "گروہ کے

محصول کا تعین" والے طریقے کے ذریعے گاؤں کے مُکھیا کی مدد سے (خصوصاً سترہویں صدی کے بعد سے) کسانوں کے معاملات میں دخل دیا ہو، تو اسے تحریر کریں۔ اس خواہش سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں اس بات کا ادراک نہیں تھا کہ مغل محصول کا انتظام کس طرح کرتے تھے، اور مغلوں کے زمانے میں حکومت اور رعایا کے درمیان تعلق قائم رکھنے والے ایسے لوگوں کا کیا رول تھا جو صاحبِ زمین بھی تھے۔ ان کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے اس روایتی سہ رخی تقسیم کو مان لیا کہ مغل علاقے تین طرح کی زمینوں میں تقسیم کیے گئے تھے، خالصہ، جاگیر اور نیم آزاد یا خود مختار سرداروں کی زمینیں۔ مورلینڈ یہ بات بھی اچھی طرح نہ سمجھ سکے کہ ہندو سرداروں (زمینداران عمدہ وغیرہ) کے علاقوں میں مغلوں کے محصول زمین کے ضوابط کس حد تک نافذ ہوئے تھے، عملی اور غیر عملی علاقوں کی حد بندی کس طرح ہوتی تھی، اور یہ علاقے مغل حکومت کی خدمات کے صلے میں خود سرداروں (زمینداروں) یا مغل حکومت کے عہدیداروں کو کس حد تک تفویض کیے جا سکتے تھے۔ 7

ان کا یہ یقین، کہ میواڑ جیسی ہندو زمینداری مغل نظام سے متاثر ہوئے بغیر خالص روایتی ہندو تصورات کی بنا پر اپنے محصول کا انتظام کرتی رہی، کسی دستاویزی ثبوت سے ثابت نہیں ہوتا۔ مورلینڈ اس بات کو نہ سمجھ سکے کہ مغل زمانے میں ہندو سرداروں کے علاقوں میں محصول کی تنظیم میں اندر سے کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں اور ہندو سرداروں کی حیثیت میں کیا فرق پڑا۔ اگر ہندو راجپوت سرداروں کے مختلف نوعیت کے علاقوں (زمینداران عمدہ، زمینداران، وغیرہ) کو مغل محصولات کا حصّہ نہ سمجھا جائے، تو مغل انداز کے محصول زمین کے انتظام کا پورا ادراک ہو ہی نہیں سکتا۔ مزید برآں، مورلینڈ کا یہ خصوصی دعوا، کہ ابتدائی مسلم حکومتوں کی طرح مغل حکومت بھی ملک کی سالانہ پیداوار اور زرعی ترقی کے واسطے سیاسی اور سماجی ماحول تیار کرنے میں ناکام رہی، بالکل غلط ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ بڑھا ہوا مطالبۂ محصول، کسانوں اور انتظامیہ کے درمیان

مستقل تصادم، اور کسی نہ کسی زراعتی علاقے میں آبادیوں کا اُجڑنا، وہ چیزیں تھیں جنھوں نے نظامِ محصول پر اس قدر اثر ڈالا کہ وہ خاتمے کی حد پر پہنچ گیا، اور سترہویں صدی کے وسط کے بعد پورا اقتصادی نظام بیٹھ گیا۔ یہ نتائج سب کے سب مشتبہ ہیں اور پُرانی عصری دستاویزوں کے ثبوت کی بُنیاد پر قائم نہیں کیے گئے ہیں۔ ان سارے مسائل کی ایسی مزید چھان بین ضروری ہے جو سائنٹفک انداز پر کی جائے، اور چھان بین کرتے وقت مغل سلطنت کے مختلف علاقوں کے سیاسی، عمرانی اور انسانی پسِ منظر پر نظر رکھی جائے۔ زرعی پیداوار کے بارے میں حکومت اور کسانوں کے کیا خیالات تھے؟ آبادی اور مزید کاشت کے لیے حاصل ہو جانے والی زمینوں کے درمیاں کیا تناسب تھا؟ زمین کی تفصیلی تقسیم کی بنا پر کتنا محصول مانگا جاتا تھا؟ نیز وہ دوسرے سماجی اور اقتصادی عناصر تھے جن کا مغل دَور پر غلبہ رہا تھا؟ ان سب باتوں پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔

کسانوں کی زندگی کے بارے میں غیر ملکی سیّاحوں کے بیانات پر مورلینڈ نے جو اس قدر اعتماد کیا ہے اس سے جانبداری ظاہر ہوتی ہے۔[8] غیر ملکی سیاح ملکیتِ زمین کے ہندوستانی تصوّر کو نہ سمجھ سکے، اور انھیں یہاں کے ادارے اپنے ملکوں کے اداروں سے مختلف نظر آئے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ جب تک زمین کی ملکیت طبقۂ امرا کے ہاتھوں میں نہ دی جائے گی زرعی خرابیاں رونما ہوتی رہیں گی۔[9] وہ یورپ کے دوسرے لوگوں کی طرح ذہنی پیچیدگیوں کے شکار تھے اور ہندوستانیوں کے بارے میں انھوں نے متضاد قسم کے بیان دیے۔ برنیر کا یہ بیان، کہ کسان مصائب اُٹھا رہے ہیں اور اپنی زمینیں چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں، یقیناً مبالغہ آمیز ہے۔ برنیر نے ایشیا کے ممالک کے زرعی سماج کی غلط تصویر اس مقصد سے پیش کی تھی کہ فرانسیسی حکومت یورپی اقوام کی برتری سے محفوظ ہو سکے، اور خصوصاً فرانس کی زمینی تقسیم نیز اس فرانسیسی تمدّن

کی برتری بے محفوظ ہو سکے جو ستّرہویں صدی میں یورپی تہذیب کی حدِ انتہا سمجھا جاتا تھا۔
جب تک سیّاحوں کے بیانات کی چھان بین، ان کے مقاصد اور اس بات کو ذہن میں رکھ کر نہ
کی جائے گی کہ وہ ہندوستان کے دیہی طریقۂ زندگی کو کس حد تک سمجھ سکتے تھے، اس وقت
تک مغل ہندوستان کے بارے میں ان کے تجزیے پر بھروسہ کرنا نہایت غلط ہو گا یہی مورلینڈ
کی سب سے بڑی خامی تھی۔ مورلینڈ نے دورِ وسطیٰ کے ہندوستان کے عمرانی اور انسانی پس
منظر کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے ان زمینداری بندوبستوں پر کچھ نہیں لکھا ہے
جو قبیلوں اور فرقوں کی بنیاد پر قائم تھے ـــــ یہی وہ اصل حقیقت ہے جس کے ذریعے مغل
ہندوستان کی زرعی تاریخ اور دیہی سماج کے ادراک کا اصل سُراغ ملتا ہے۔ مورلینڈ نے
پرگنے کی سطح سے نیچے جانے کی کوشش نہیں۔ حتیٰ کہ محصول وصول کی مشینری کے بارے میں بھی
ان کا بیان نہایت سرسری ہے۔ انھوں نے ان سماجی و اقتصادی عناصر کے تجزیے کی کوئی کوشش
نہ کی جو گاؤں اور قصبوں میں لوگوں کی زندگی پر اثر ڈالتے تھے۔ یہ گاؤں اور قصبے بہت سے
علاقوں میں پورے طور سے شہروں سے جُڑے ہوئے تھے۔ تجارت اور کاروبار کے پھیلاؤ کا نقد
فصلوں کی کاشت پر بہت بڑا اثر پڑا۔ دورِ نقدی کے ذریعے جو تعلقات بنتے ہیں، حکومت
کے محصولات جمع کرنے میں، ان تعلقات کے رول پر بھی بہت اثر پڑا۔ مورلینڈ کا خاص قابلِ
تعریف کام یہ تھا کہ انھوں نے مغلوں کے نظامِ محصولاتِ زمین کی وضاحت ہندوستانی تاریخ
کے دورِ قدیم اور ابتدائی دورِ وسطیٰ کے پس منظر کے ساتھ اس طرح کی کہ ہر زمانے کی زرعی
خصوصیات کی ایک مربوط تصویر سامنے آگئی۔ لیکن انھیں یہ احساس نہ ہو سکا کہ ستّرہویں
صدی کے دوران سماجی و اقتصادی قوتوں کی کیا رفتار تھی۔ مغل عہد کے دوران زرعی
مسائل کی بابت مورلینڈ کے بہت سے نظریوں اور نتیجوں میں بڑی ترمیم کی ضرورت
ہے۔

حوالہ جات

۱۔

J N Sarkar Mughal Administration Calcutta 1920 (4th edition 1952)

مندرجہ بالا کتاب مغل انتظام پر سرکار کی اکیلی کتاب ہے۔ جو دوسری کتاب انتظامی مسائل پر کچھ روشنی ڈالتی ہے وہ احکام عالمگیری کا ترجمہ ہے جس کا عنوان ہے: (Anecdotes of Aurangzeb) مندرجہ ذیل کتاب میں دیکھیے:

Studies in Aurangzeb's Reign

۲۔

J N Sarkar The revenue Regulations of Aurangzeb Studies in Auranzeb s Reign Journal and Proceedings of the Asiatic Society of Bengal New Series Vol II 1906 pp 223 237

۳۔

Moreland the Agrarian System of Muslem India Allahabad ed PP 248 49 251 - 54 Moreland and Ali Akdar s Land Revenue System as described in the Ain Akbari J R A S London 1918 pp 1 - 42.

اصل متن کے لیے دیکھیے:

Ain Akbari British Museum Add 6552 Folio146 a Mrs Hamilton Berlin Folio 136 Akbar Nama Br M Add 26 207 Fol 1199 Ms Br M O R 27 247 Fol 304a

Rajasthan Archives Jaipur [Now at Bikaner

اورنگ زیب کے دور کے پرگنہ دستاویزات دیکھیے جن کا تعلق مال وجہت و سیر جہت اور یادداشت حقیقت اراضی و افتادہ سے ہے۔
تفصیلات کے لیے :

Nature of Land Rights in Mughal India The Indian Economics and Social History Review Vol 1 July - Sept 1963 pp 1 23 F No 1 4

6۔ مغل زمانے میں نظام تعلقہ داری کے ارتقا کی تفصیلات کے لیے میرا ذیل کا مقالہ دیکھیے :

Nature of Dehati Taaluqa (Zamidari Villages) The Indian Economics and Social History Review Vol II No 2, April 1965 pp 166 - 177 Nature of Land Rights in Mughal India The Indian Economic and Social History Review Vol 1, II July 1965 pp 268 - 288

7۔ تفصیلات کے واسطے میرا ذیل کا مقالہ دیکھیے :

Nature of Land - Rights in Mughal India

, [vide F No 16] pp 10 14 F Nos 60 – 70

8۔ مورلینڈ پر تنقید کے لیے دیکھیے :

Beni Persad Hgrarian System The Modern Review June 1921 Brij Naryan Indian Economic Life Lahore 1929 pp 1 - 54